آئینہ

خاندان کے ہر فرد کا رسالہ

ماہنامہ نقش کوکن بمبئی

۲۴۲ جبیل روڈ ایسٹ، ڈونگری
بمبئی نمبر ۹

مدیر اعلیٰ:
عثمان حسین خان

حسن کار:
الیس ریاض

ٹیلیفون نمبر ۳۳۱۵۰۲

ادارت اعزازی

معاون مدیران
شبیہ احمد خان
محمد عبدالحق

طابع و ناشر
ڈاکٹر عبدالکریم نائیک

تحریر

مقام طباعت : اجمل پریس بمبئی ۳
ملکیت : نقش کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ
رجسٹریشن نمبر : 3006
تاریخ اشاعت یکم مئی ۱۹۷۱ء
جلد نمبر ۱۰ —— شمارہ نمبر ۵
مئی ۱۹۷۱ء

قیمت : ۶۰ پیسے

زر مبادلہ ہندوستان میں : چھ روپے
" بیرونی ممالک سے : ۱۵ شلنگ
برٹش پوسٹل آرڈر، اشتہارات، ترسیل زر اور دیگر امور کے بارے میں خط و کتابت منیجر ماہنامہ نقش کوکن ۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹ کے پتے پر کیجئے۔
رکن انڈین لنگویجز نیوز پیپر ایسوسی ایشن بمبئی تمام متنازعہ امور میں حق سماعت عدالت ہائے بمبئی کو ہوگا۔

ادا ریہ

اپنی باتیں

● — یکم مئی ہماری ریاست کا سب سے اہم دن ہے جسے ہم یوم مہاراشٹر کہتے ہیں۔ یہ دن کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس دن ہماری ریاست کا جنم ہوا۔ ہم نے اپنے وجود اور ماحول کو ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ یک جہتی کی ایک نئی اساس قرار پائی ایک ساتھ رہنے اور ترقی کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہوئے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ ہم سماجی، سیاسی، اقتصادی اور لسانی اعتبار سے اپنی ریاست کو ترقی کی نئی شاہراہوں پر گامزن کریں۔

● — اسی مہینے میں ایک اور اہم دن ہمیں منانا ہے۔ عید میلاد النبیؐ ہم ہر سال مناتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک مکمل انسان کی زندگی ہے۔ ہمیں صرف اس نمونہ کو اپنانا ہے۔ کردار کی تعمیر زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ جس نے کردار میں پختگی پیدا کر لی اس نے اپنی حیات کے مقصد کو پا لیا۔ عید میلاد النبیؐ صرف جلسے کرنے یا جلوس نکالنے کا نام نہیں ہے بلکہ علم کو عمل کا روپ دینے سے عبارت ہے۔ یہ جشن ہم اسی لئے مناتے ہیں تاکہ رسول کریم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دہرانے اور زیادہ سے زیادہ سمجھنے کا موقع مل سکے۔ سمجھنے کے بعد صرف اختیار کرنے کی منزل باقی رہ جاتی ہے۔

● — اور ہاں

پچھلے مہینے آپ نے

اپنے محبوب پرچے نقش کوکن کے کتنے خریدار بنائے ؟

شفیع ساغر

یوسف ناظم اور دیوارئیے

دیوارئیے یوسف ناظم کی نئی کتاب ہے۔

کہتے ہیں کہ یوسف ناظم اردو کے مشہور مزاح نگار کا نام ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ نام آپ کو نامانوس نظر آ رہا ہے تو اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہو سکتا۔ رخشِ عمر ہمیں اور آپ کو اتنی تیزی سے بھگائے لئے جا رہا ہے کہ باگ ہاتھ میں اور رکاب پاؤں میں نظر نہیں آتے۔ ایسے میں بیچارے یوسف ناظم کی کیا مجال کہ زد میں آنے کا تصور بھی کریں۔

یہی وجہ ہے کہ آج کل چھپنے والی زیادہ تر کتابوں میں مصنفوں کا لکھا ہوا کم اور مصنف پر لکھا ہوا مواد زیادہ ملتا ہے۔ دیوارئیے میں اس قسم کی چیزیں بھی نہیں ہیں اسلئے ہمیں یوسف ناظم کو دیوارئیے اور دیوارئیے کو یوسف ناظم کی مدد سے سمجھنا پڑے گا۔ کتاب کے آخری صفحہ پر (غالباً جگہ بچ جانے کی وجہ سے) مصنف کے کسی خیر خواہ نے یا غالباً کاتب ہی نے مصنف کا اصلی نام، تخلص، عمر، تعلیم اور پیشہ چند سطروں میں لکھ دیا ہے۔ اسی صفحے سے ان کے ماضی اور مستقبل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یعنی ان کی دو کتابیں کیہ [illegible] شائع ہو چکی ہیں [illegible] ان کی دو کتابیں [illegible] سامنے اور ہم سائے اور مزاح کی چوتھی کتاب زیرِ طبع ہیں۔ گویا دیوارئیے ماضی اور مستقبل کے دونوں پلڑوں کو خطِ مستقیم میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کتاب میں اکیس مضامین ہیں۔ اس میں صرف ایک مضمون ایسا ہے جس کا عنوان آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا اور وہ ہے دیوارئیے۔ مضمون کی ابتدا میں مصنف نے اس کی تشریح کر کے ہماری مشکل آسان کر دی ہے: "ہر وہ تحریر جو دیوار پر لکھی یا لٹکائی جائے دیوار یہ ہے۔"

اس مضمون میں مختلف قسم کے دیواریوں سے بحث کی ہے۔ دیوارئیے اخبار و رسائل کے اداریئے کی طرح بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ ہم میں اور یوسف ناظم میں یہی فرق ہے۔ ہم بھی دیوار یئے پڑھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ یوسف ناظم دیوارئیے پڑھ کر نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ ان کی قوت اختراع موجِ خرامِ یار کی طرح عمل کرتی ہے۔ آدمی پڑھتا چلا جاتا ہے، اچانک اسے کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ رک کر حیرت سے سوچنے لگتا ہے کہ ابھی ابھی تو میں اچھا خاصا چل رہا تھا یہی یوسف ناظم ہیں جو آپ کو ذرا دیر محو کر دینے کے بعد اچانک آپ کے سامنے آ جاتے ہیں اور آپ کی سمجھ میں فوراً نہیں آ پاتا کہ کیا ہو رہا تھا اور کیا ہو گیا۔۔

"یہی دیوارئیے تو پڑھنے والوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ جیسے [illegible]

دیپ چند کی طاقت کی گولیوں کا دیوار دیر پڑھ کر
آدمی ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اسے ایک دم
کچھ ہو گیا ہے اور بس اب دو چار جھٹکوں سے اسے
پر دکھا دے کی دعوت ملنے والی ہے۔ اسی نشے
کے عالم میں جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اس کے کانوں
میں یہ آواز آتی ہے نانا آگئے۔ نانا آگئے۔"

(دیوار سے)

سلیقہ سے ہنسنا بڑا مشکل فن ہے اور سلیقہ سے ہنسانا
اس سے بھی زیادہ مشکل۔ یوسف ناظم میں یہ سلیقہ شاید خداداد
ہے۔ بڑا ظلم ہوگا اگر اس موقع پر میں آپ کو "اپنی سعادت..." الا فرسودہ شعر سناؤں۔ اس ذہنی اذیت سے بچنے کے لئے
مناسب ہوگا اگر آپ فوراً سر ہلادیں کہ میں سمجھ گیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا
تھا کہ یوسف ناظم میں ہنسنے ہنسانے کا سلیقہ خداداد ہے۔ بات میں
اسے بیدار کرنا ان کا حصہ ہے۔ آپ نے تو وہ لطیفہ سنا ہوگا کہ اسکول کی
رپورٹ میں یہ پڑھ کر کہ ان کے لڑکے کی تحریر انتہائی بدخط ہے والد ماجد
نے اپنے فرزند کو بہت ڈانٹا۔ لڑکے نے ڈانٹ سننے کے بعد نہایت
سکون سے جواب دیا: "مجھے تحریر سے کیا، مجھے تو ڈاکٹر بننا ہے۔"
اسی مفہوم کو پیش کرنے کا انداز دیکھئے اور داد دیجئے۔

یہ بات بھی آپ کو معلوم ہی ہوگی کہ اگر کوئی ڈاکٹر
اپنی بیوی کے نام خط بھی لکھتا ہے تو یہ خط بیوی
بغیر کیمسٹ کی مدد کے نہیں پڑھ سکتی ــــــــ
کئی لوگ تو اسی لئے کیمسٹ بن گئے ہیں ۔"

(جنون لطیفہ)

کہتے ہیں اچھا ادیب اور شاعر وہی ہوتا ہے جس کا زندگی
سے براہ راست تعلق ہوتا ہے جس کے مضامین اور اشعار میں زندگی ملتی
ہے۔ میں نے یہ پیمانے کر بھی "دیوار پھے" کو جانچنے کی کوشش کی۔ لیکن
یوسف ناظم بہت چالاک ہیں۔ وہ کبھی کو کہیں ہو تو نہیں رہتے۔ انھوں نے

اپنے مضامین میں نے کہے کا ہے ایسے مسائل چھیڑ دیئے ہیں جن کا
زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ شاعری سے زیادہ شاعر کا تعلق مظلوموں
کی زندگی سے بہت گہرا ہوتا ہے، (مظلوم وہ ہوتے ہیں جو نہایت صبر سے
شاعر کی غزلیں سنتے اور ان کی داد دیتے ہیں)۔ ایک لڑکے سے جب
شاعر کی جمع پوچھی گئی تو اس نے جھٹ سے کہہ دیا "مشاعرہ"۔ یوسف ناظم
نے "لذیذ مشاعرے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ ہو سکتا
ہے اس کا عنوان مصنف نے "جدید مشاعرہ" رکھا ہو اور کتابت
کی غلطی سے وہ لذیذ مشاعرے ہو گیا ہو لیکن پھر مصنف کے اس
دعوے پر بھی یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

"لیکن معلوم نہیں شہر ممبئی کے خوش نویس
عابد زاہدی صاحب کو کتابت کی اس شہرہ آفاق
روایت سے کیوں دشمنی ہے۔ اس کتاب میں
بدقسمتی سے کتابت کی کوئی غلطی نہیں ۔"

ممبئی کے ایک پبلشر نے ایک دن باتوں باتوں میں
مجھ سے کہا تھا کہ اچھے ادیب اپنی بیویوں سے زیادہ کاتب سے
ڈرتے ہیں ــــ اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ مصنف کی شائع ہونے
والی کتابوں کے مسودے کاتب مذکور کے پاس بطور یرغمال محفوظ ہوں۔
لذیذ مشاعرے پڑھنے کے بعد جدید مشاعرے کا خیال
اس لئے آیا کہ مصنف نے مشاعرے کی اہم شخصیتوں میں صرف اناؤنسر
اور مہمان خصوصی کا ذکر کیا ہے اور اس طرح کہ رنگ بھون کے مشاعروں
کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ کر آجاتی ہے۔

"(اناؤنسر) شاعر کو عوام کے سامنے اس طرح
پیش کرتا ہے جیسے کوئی بانکا سپلیئر اپنے
بکاؤ مال کی نمائش کرتا ہو۔ شاعر کے کلام کا
معیار مقرر کرنا، اس کے وطن اور اس کے حسب نسب
کا اعلان کرنا۔ شاعر اور عوام کے درمیان قاضی کی
طرح تعلقات قائم کروانا۔ یہ جملے سے متعلقہ

ضروری کام انا ؤنسر ہی کرتا ہے۔"

مہمان خصوصی کے بارے میں کہتے ہیں :۔

"ــــــ اگر مہمان خصوصی مشاعرے میں
میر یا غالب کی غزل کے دو چار شعر غلط سلط
بھی پڑھ کر سنا دے تو مشاعرہ مشاعرہ نہیں
رہتا، معرکہ ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں معرکے
کا کوئی مشاعرہ ہو ہی نہیں سکا۔ کیونکہ ان
مشاعروں میں کوئی مہمان خصوصی شریک
نہیں ہوا۔"

شاعروں کا ذکر آیا ہے تو شاعری پر بھی گفتگو کرتے چلیں۔
یوسف ناظم خود شاعر ہیں اس لئے وہ شاعری اور اس میں
ہونے والے تجربوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسی لئے ان کی
باتیں وزن رکھتی ہیں۔ انھوں نے شاعری پر دو مضمون لکھے ہیں۔
نئی شاعری اور ایک خط۔ ایک خط میں انھوں نے علامتی
شاعری کو اپنا نشانہ بنایا ہے "علامتی شاعری میں جہاں تک میں دیکھ
پایا ہوں صرف علامتیں ہوتی ہیں، شاعری نہیں ہوتی" لیکن
ان کا مضمون نئی شاعری طنز کے بے پناہ نشتر لئے ہوئے ہے۔

"نئی شاعری بڑی عظیم ہے۔ اسے موافقین کی ضرورت
نہیں۔ بیماری کو کیا عارضہ ہو سکتا ہے۔ نئی شاعری
سے دنیا والوں کو کافی فیض پہنچا ہے اور بہتوں
نے شاعری سے توبہ کر لی ہے۔"

اور میرا خیال ہے "نئی شاعری" بہتوں نے نئی شاعری
چھوڑ دی اور سلیقے کی شاعری کرنے لگے۔ یوسف ناظم کی تبلیغ
کے باوجود جو شعرا باقاعدگی سے نئی شاعری کا دامن تھامے ہوئے
ہیں ان کی مثال بالکل ایسی ہے جن کے دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہے
اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ یوسف ناظم کو ان کی وجہ
سے اپنے مشن سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

سماج کا مسئلہ اناج کے مسئلہ کی طرح پیچیدہ ہے۔ ہم
اس کے خالق ہیں اور اسی کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ادیب کی مختلف
قسموں میں وہ ادیب بھی شامل ہیں جو صرف اناج یا صرف سماج کے
مسئلوں کو پیش کرتے ہیں۔ یوسف ناظم کے لئے اناج سے زیادہ
سماج کا مسئلہ اہم ہے۔ اس کی جھلک جا بجا دیوار پیٹے میں موجود
ہے۔ چند مثالیں پیش کرنے میں پبلشر کا کوئی نقصان نہیں۔

"طالب علم امتحان ہال میں جاتے وقت اپنے ساتھ
چاقو رکھیں تو ان کا فیل ہونا ناممکن ہے۔ ان کے
ڈیسک پر کھلا ہوا چاقو رکھا رہے تو نگران کار
کو اس کے سائے میں رکھی ہوئی کتاب بالکل
نظر نہ آئے گی۔"

(خنجر چلے کسی پہ......)

"ترقی یافتہ ممالک میں قوانین اور باشندوں
کی تعداد برابر برابر ہوا کرتی ہے۔"

(سقراطیات)

"لڑکے بھی تنگ آکر ایسی جگہ چھپ کر سگریٹ
پیتے ہیں جہاں آدمی تنہا ہی جا سکتا ہے۔ ان کے
والدین نے بھی وہیں سگریٹ پینا شروع کیا تھا۔"

(پاندان)

"کسی محفل میں اگر دو چار ننگیاں نہ ہوں تو ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے دسترخوان پر کوئی چیز کم
ہے۔ پہلے ننگی کلچر کے باہر تھی اب کلچر ننگی کے
اندر ہے۔"

(مستقبل روشن ہے)

"غالب کے دو تخلص تھے۔ اس زمانے میں
دو دو تخلصوں کا رواج تھا۔ ملک میں شاعر کم
اور تخلص زیادہ تھے۔ آج معاملہ اس کے برعکس ہے۔"

(نئی یادگار غالب)

حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے اور تلخی کا احساس بہت گراں گزرتا ہے۔ طنز و مزاح کے لکھنے والے اس سے واقف ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ انھیں اسی تلخی کا کاروبار کرنا پڑتا ہے۔ وہ کلوروفارم سنگھا کر آپریشن نہیں کرتے۔ انھیں تو اپنے نشتر سے کام لینا ہے۔ اس کے جھٹکے جس نے سہہ لئے اس کا علاج کامیابی سے ہو جاتا ہے۔ چیخنے چلانے والے مریض ان کا کچھ نہیں بگاڑتے، اپنی بیماری میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

نشتر چبھونے کے لئے بھی ماہر ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ طنز کرنے کے لئے موزوں الفاظ اور ان کے استعمال میں احتیاط برتنے کی سخت ضرورت ہے۔ طنز نگار تشبیہوں کا ماہر ہوتا ہے۔ اس ترکیب سے کتاب لکھنے والے کی سلامتی کو کم سے کم خطرہ پہنچنے کا امکان رہتا ہے۔ یوسف ناظم نے چند بڑی اچھی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ انتساب بذریعہ انتخاب (بہت ممکن ہے کہ آئندہ کتاب کا باب، انتساب بذریعہ قرعہ اندازی ہو) میں فرماتے ہیں:

" انتساب تو بس اس طرح کی بات ہے جیسے کسی مشاعرے میں شعر سناتے وقت شاعر کسی خاص شخص کو مخاطب کر کے کوئی پھسپھسا سا شعر سنائے اور خود ہی جھینپ جائے۔ "

دوسری چند تشبیہیں کچھ اس قسم کی ہیں:

" لطیفے کانچ کے سامان کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ لحاف یا رضائی نہیں کہ سردیاں آئیں اور پرانے لحاف اور رضائیاں باہر نکل آئیں۔ یہ تو کراکری ہے جو ہمیشہ بدلنی پڑتی ہے۔

(جنون لطیفہ)

"عورتوں اور تتلیوں میں بڑی قریب کی رشتہ داری ہے۔ عورتیں پھول کی طرح نازک اور چائے کی پتّی کی تلخ ہوتی ہیں۔" (سقراطیات)

"یہاں تو آدمی کے پورے جسم پر اعصاب اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے سمندر پر سطح سمندر۔" (٣١٣ بابا)

" خود پاندان ایک اعلیٰ درجہ کے مکان کی طرح ہوتا ہے جس میں کئی چھوٹے بڑے کمرے اور دالان ہوتے ہیں۔" ——(پاندان)

" پینگ لیتے وقت تم اوپر سے نیچے کی طرف آتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شیر کچھار سے نکلا ہو۔ اور جب تمھارا نیچے سے اوپر کی طرف جاتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے ہوائی فائر کیا ہو۔

(ابن سقراط کا خط بنت بقراط کے نام)

" ٹوپی کی طرح اب آداب بھی کوچ کرنے لگا ہے۔" (آداب عرض)

" غربت بہت ضروری ہے۔ یہ بنیائن کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔" (نئی یادگار غالب)

دیوار ٹیے میں یوسف ناظم کی اور بھی خصوصیات بکھری پڑی ہیں۔ اگر آپ انھیں گلدستہ کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے پڑھئے۔ خوشی اور مسرت کے چند لمحے بھی انسان کو کسی وقت میسر آجائیں تو اس عالم پر آشوب میں انھیں غنیمت سمجھنا چاہئے۔ کتاب کی قیمت تین روپئے ہے۔ ایک مضمون پندرہ پیسے سے بھی کم کو پڑا۔ ع

"ان داموں تو سستا ہے"

اس کتاب کو نقش کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ بمبئی نے چھاپا ہے۔ اور بیچنے کی ذمہ داری مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ نے اپنے ناتواں کاندھوں پر لی ہے۔ خدا دونوں پر رحم فرمائے اور انھیں اس کا اجر دے۔

آخر میں ہم مصنف کو یقین دلا دیں کہ "دیوار ٹیے" کی خوبیوں کی وجہ سے اس کے نسخے بہت زیادہ نہیں بچیں گے ...

مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

کوکن کے ایک گاؤں میں عیدالاضحیٰ

قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ زمین و آسمان میں آیات و نشانات خداوندی کی علامات بھری پڑی ہیں مگر اکثر لوگ ہیں کہ خدائی آوازوں کو سنتے نہیں۔ مناظر کو دیکھتے ہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح پاس سے گزر جاتے ہیں۔

عیدالاضحیٰ آتی ہے قربانیاں ہوتی ہیں۔ صاحب توفیق ایک سے زیادہ بھی قربانیاں کرتے ہیں۔ ذبح کرتے ہوئے تکبیریں بھی پڑھی جاتی ہیں جیسا کہ ذبح کرتے وقت ذبح کرنے والا ہر جانور پر تکبیر پڑھتا ہے۔ پھر قربانی کا گوشت کسی کو دینا جائز اور کسی کو دینا ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ خوشحال لوگوں کے ہاں گوشت زیادہ مقدار میں بھیجا جاتا ہے اور اڑوس پڑوس کے لوگوں میں گوشت بھیجنے میں دریادلی سے کام نہیں لیا جاتا اور جو گوشت بھیجا بھی جاتا ہے وہ کچا ہی بھیجا جاتا ہے اور خوشحال لوگوں کے گھروں میں رسماً آئے ہوئے گوشت کی وہ کثرت ہو جاتی ہے کہ ان کے ہاں ذرّہ برابر اس کی قدر نہیں ہوتی۔ بعض جگہ امراء کے ہاں مسلّم رانیں بھی جاتی ہیں جو میرے ہاں سے آپ کے ہاں اور آپ کے یہاں سے میرے ہاں چکر کاٹتی رہتی اور عموماً ضائع ہو جاتی ہیں۔ قرآن حکیم یہ تعلیم دیتا ہے کہ قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور اسطرح کھلاؤ جس طرح خود کھاتے ہو۔ مگر ضائع نہ کرو۔ غرض عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اہل توفیق لوگ قربانی ضرور کرتے ہیں مگر اکثر لوگ اس کو ایک رسم سمجھتے ہیں اور گوشت تقسیم کرنے کو بھی رسمی طور پر انجام دیتے ہیں۔

شریعت نے قربانی کے تین دن رکھے ہیں تاکہ قربانی کرنے والوں کو آسانی ہو اور قربانی کا گوشت ضائع نہ ہو۔ جن کو اللہ نے دین کی سمجھ دی ہے وہ خدا کی دی ہوئی نعمت کا ایک بال بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ خدا کے نام کی قربانی میں خدا کی مخلوق میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہاں تک اور جس طرح پہنچا سکیں گوشت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گزشتہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ایسی ہی ایک قربانی دیکھنے کا موقع ہمیں قلابہ ضلع (سابق ریاست جنجیرہ) کے ایک گاؤں میں ملا۔ چھوٹا سا گاؤں ہر طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا۔ ہریالی کا فرش بچھا ہوا۔ اِدھر اُدھر چھتنارے درختوں کے خیمے لگے ہوئے۔ لوگ محنتی اور جفاکش، عید کا دن آیا۔ گاؤں کی مسجد میں گاؤں کے سب بچے بڑے صاف ستھرے اور سادہ لباس میں جمع ہو گئے۔ جبہ پوش پیش امام صاحب نے نماز کے بعد عربی میں خطبہ پڑھا۔ دعا ہوئی اور لوگ مسجد کی دیوار کے ساتھ ساتھ قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور امام صاحب سے اور باہم ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ مل جل کر عید مبارک کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

عربی میں جو خطبہ پڑھا گیا اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد عطا ہوئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے پیارے بیٹے کو قربان کر رہا ہوں۔ بیٹا بڑا ہو گیا تھا اور اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکتا تھا۔ باپ نے تنہائی میں بیٹے سے کہا۔ "اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں" سعادت مند بیٹے نے جواب دیا "اے باپ! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو بجا لایئے۔ آپ مجھ کو صابر پائیں گے" جب باپ اور بیٹا خدا کی رضا پر راضی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آواز دی۔ "اے ابراہیمؑ! تو نے اپنا خواب پورا کر دیا" اور ابراہیمؑ نے سجدۂ شکر بجا لایا۔

پس زندگی کے ہر کام میں خداوند کریم کی رضا کو ہر وقت ملحوظ رکھنا ہی دین ہے۔

عام طور پر جس طرح ہم نے قربانیاں ہوتے دیکھی تھیں اس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ مگر اس گاؤں میں قربانی کا رنگ اور ہی دیکھا۔ قربانی کے لئے مخصوص کردہ جگہ کے گرد گھر کے ہی نہیں گاؤں کے چھوٹے بڑے لوگ بھی جمع ہو گئے بلکہ جو ادھر اُدھر تھے ان کو بھی بلایا گیا اور بچے سے بوڑھے تک سب کے سب نہایت خلوص نہایت سنجیدگی کے ساتھ تکبیر کہہ رہے تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کے دلوں میں نفسیاتی طور پر نہایت پاکیزہ اثر ہوتا تھا۔ قربانی کا خون ان کو دیا گیا جنھوں نے خوشی اور چاؤ سے لینے کی خواہش کی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ خون درختوں کے لئے کھاد کی طور پر ان کی جڑوں میں سینچا گیا۔ کچا گوشت کسی نہ کسی حد تک تقسیم کیا گیا۔ مگر اصل چیز یہ تھی کہ گوشت کی دیگ اور چاول کی دیگیں الگ الگ پکائی گئیں اور دعوت عام دی گئی۔ اور بلا تفریق عام دسترخوان بچھ گیا اور ایک ایک ریشہ گوشت کا اور ایک ایک دانہ چاول انسانی غذا بن گیا۔ اس دعوت میں خوشحال بھی تھے کنگال بھی تھے۔ مگر دونوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ سچ پوچھو تو حج کی قربانیوں کا بھی یہی انداز ہونا چاہیئے۔ لیکن اس تقریب میں ایک اور دلکش بات یہ تھی کہ ہر کام رضا کارانہ تھا۔ جانور کا ذبح کرنا، گوشت تیار کرنا، کھانا پکانا پروسنا، برتن لانا، برتنا، دھونا، پہنچانا، سب باہم رضاکارانہ تھیں جیسے ایک بھائی کے کام میں بخوشی بھائی شامل ہو کر خوشی منا رہے ہوں۔

قطعہ

کیف کاکوروی

بہت ہی ناز ہے فردوس کو تسنیم و کوثر پر
فلک کو ماہ و انجم پر زمیں کو لعل و گوہر پر
زہے تقدیر انساں کیوں نہ ہو انسانیت
حسین ابن علیؑ جانِ جہاں سبطِ پیمبر

عبدالمنان اعظمی
ایم۔ اے، بی۔ ایڈ

بمبئی کے تعلیمی افق پر چند نئے ستارے

جب سیلاب آتا ہے تو موتیوں کے ساتھ خس و خاشاک بھی بہالاتا ہے۔ لیکن اہلِ نظر موتیوں کو چن کر خس و خاشاک کو بہا دیتے ہیں اور کورانِ عقل و خرد انھیں خس و خاشاک کو حرزِ جاں بنا لیتے ہیں۔

بالکل یہی حال یورپ کے اس سیلاب کا ہے جو پندرہویں صدی میں "نشأۃ الثانیہ" کے نام سے ظہور پذیر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے روئے زمین کے چپے چپے میں پھیل گیا، اور زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہوگیا۔ ہر قوم نے اپنی اپنی بصیرت کے مطابق اس سے استفادہ کیا۔ بعض نے اس کے خس و خاشاک ہی کو گوہر ہائے گرانمایہ سمجھ کر حرزِ جاں بنالیا لیکن بعض ایسی بھی ہیں جنھوں نے بنی اسرائیل کے برخلاف سحرِ سامری کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر دیا۔ ایسی ہی قوموں میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ بھی ہے جس نے مغربی قدروں کو من و عن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد سلطنتِ اسلامیہ کا آخری مغل تاجدار ہی صرف اپنے تخت و تاج سے محروم نہیں ہوا بلکہ پوری ملت اسلامیہ اقتدار و حکمرانی سے محروم ہوگئی۔ اور اس کی محبوب قدریں پامال ہونے لگیں۔ جس کا اثر نظام تعلیم پر پڑنا ناگزیر تھا۔ ایسی حالت میں برطانوی نظام تعلیم کو من و عن قبول کر لینا قومی اور ملی خودکشی کے مرادف ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خاں کی ملی غیرت جوش میں آئی لہٰذا انھوں نے ایک نئے نظام تعلیم کا مطالبہ کر دیا تاکہ مسلمان انگریزی تعلیم کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم سے بے بہرہ نہ رہنے پائیں۔ یہ تحریک اس زور و شور سے شروع کی گئی اور اتنی معقول تھی کہ ملک کے گوشے گوشے نے اس انقلاب آفریں آواز کا استقبال کیا اور آخر کار ۱۸۷۲ء میں مسلمانوں نے اپنے قومی و ملی مزاج کے مطابق تعلیمی اداروں کے قیام کا حق حکومتِ وقت سے منوالیا۔

یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں میں تعلیمی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ۱۸۷۵ء میں مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۷۶ء میں انجمن اسلام، بمبئی کا قیام عمل میں آیا اور اسی قرن میں انجمن حمایت اسلام لاہور، انجمن اسلامیہ جبل پور، اور انجمن اسلامیہ مدراس وغیرہ وجود میں آئیں۔ اور یکے بعد دیگرے تعلیمی ادارے قائم ہونا شروع ہوگئے۔ ان ادارں

قیام کے ساتھ ہی مسلمانوں کا علمی جمود ٹوٹنا شروع ہوگیا اور
کا تعلیمی بائیکاٹ ختم ہوگیا، اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف راغب
نے لگے کیونکہ دراصل انھیں نفس تعلیم سے احتراز نہیں تھا بلکہ تعلیمی
وں کے مزاج و کردار سے نفرت تھی، اس لئے کہ وہ چند ٹکڑوں کی لالچ
اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں بھیج کر دین فروشی کروانے
لئے تیار نہ تھے۔ لہٰذا ہی علاقائی زبان والے اسکولوں میں شرکت کو
اکر سکتے تھے۔ دراصل مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی تاریخ اسی تاریخ
شروع ہوتی ہے۔

لیکن صرف ثانوی تعلیم کسی قوم کے لئے کافی نہیں اس لئے کہ
رسید سلیمان تعلیم میں پیچھے نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم میں پیچھے ہیں۔ اور اعلیٰ تعلیم
مسلم ادارے اس ملک میں بہت ہی ناکافی تھے۔ یہی وہ ضرورت تھی
کو مد نظر رکھتے ہوئے بمبئی کی چند انجمنوں نے اعلیٰ تعلیم کی طرف رجوع کیا
کا قوم نے اتنا شاندار استقبال کیا کہ یکے بعد دیگرے ایک دو
تین کالج وجود میں آگئے۔ جن کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے
وہ چند نئی انجمنوں کا ایک مختصر تعارف بھی پیش نظر ہے:

انجمن خیر الاسلام ہائر ایجوکیشن سوسائٹی (۱۹۸۶ء)

انجمن خیر الاسلام کی ابتدا ۱۹۲۶ء میں ایک یتیم خانہ
سے ہوئی۔ بعد میں مدنپورہ کے چند مخلص و جفاکش کارکنوں کی انتھک
کوششوں اور محمد علی مٹھا صاحب جیسے بے ریا شخص کی رہنمائی
میں اس نے ۱۹۶۰ء میں سکنڈری ایجوکیشن کی وادی میں قدم رکھا اور
مختصر مدت میں ریاست مہاراشٹر میں تعلیمی و فلاحی اداروں کا جال بچھایا
اس وقت اس کے دس اسکول، چار یتیم خانے بحسن و خوبی چل رہے ہیں۔

مہاراشٹر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس (۱۹۶۸ء)

۱۹۶۸ء میں انجمن نے کالج کے قیام پر غور کیا، لیکن چونکہ
کام اتنا بڑا تھا کہ کسی بڑے آدمی کی رہنمائی ناگزیر تھی لہٰذا انجمن نے
اس تجویز کو لے کر ریاست کے ہر دلعزیز رہنما ڈاکٹر رفیق زکریا کی طرف
رجوع کیا اور انھوں نے بخوشی اس کی سرپرستی قبول فرمالی۔ اور جنوری
۱۹۶۸ء میں خیر الاسلام ہائر ایجوکیشن کی تشکیل کی گئی جو ۵ اپریل ۱۹۶۸ء
میں رجسٹر ہوگئی۔ جس کے لئے حسب ذیل عہدیداران منتخب
کئے گئے:

صدر:۔ ڈاکٹر رفیق زکریا   وائس چیرمین: وائی اے پتھا بھائی
چیرمین:۔ ایچ ایچ اسمٰعیل۔   جنرل سکریٹری: محمد علی مٹھا ایم اے ایل ایل بی
جوائنٹ سکریٹری:۔ محمد حنیف خاں اور فاطمہ زکریا۔
اور خزانچی:۔ زین جی رنگون والا

کالج کے منصوبہ کا صرفہ پندرہ لاکھ روپیہ کا تھا، پھر بھی
خدا کے بھروسہ پر ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ء کالج کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔
اور ۱۶ جون ۱۹۶۸ء کو کالج شروع ہوگیا۔ غرضیکہ اس چار ماہ میں کالج
کی تین منزلہ عمارت تیار ہوگئی۔ پہلے ہی سال طلبہ وطالبات کی تعداد
چھ سو تک پہنچ گئی۔

صرف سنگ بنیاد کی تقریب میں چند گھنٹوں کے اندر
تین لاکھ بہتر ہزار روپیہ جمع ہوا۔ ۱۹ فروری کو عطیہ دہندگان کے
اعزاز میں ایک عصرانہ دیا گیا جس میں پھر دو لاکھ اڑتالیس ہزار روپیہ
جمع ہوا۔ یکم مارچ ۱۹۶۹ء کو کلچرل پروگرام میں ہز ایکسلنسی شیخ ہمدانی
نے پچاس ہزار کا عطیہ دیا۔ اور ستار مل والا نے اپنے بیٹے فاروق کے
نام پر ایک ہال کی تعمیر کا کل صرفہ برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔

اس وقت مارچ ۱۹۷۱ء میں کل ۱۵۲۰ طلبہ وطالبات
ہیں جن میں ۱۱۶۹ طلبہ اور ۳۵۱ طالبات ہیں۔ اسٹاف ممبر میں کل ۴۱
پروفیسر ہیں جن میں ۲۷ پروفیسر ۵ لیڈی پروفیسر اور غیر مسلم لیڈی پروفیسر
پرنسپل کی حیثیت سے جناب عبد القدوس عظیم الدین صاحب
منشی ایم اے کا تقرر عمل میں آیا۔ اور وائس پرنسپل کی حیثیت سے
جناب نصر اللہ ایم اے کوکشی والا ایم ایس سی کا تقرر کیا گیا۔

انجمن اسلام بورڈ فار ہائر ایجوکیشن

سنہ ۱۹۶۵ء میں کالج کے قیام کی تجویز سب سے پہلے بیرسٹر اکبر پیر بھائی کے ذہن میں آئی اور انھوں نے انجمن کی جنرل کونسل کے سامنے یہ تجویز رکھی اور انجمن نے اس کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد اس تجویز کو منظور کر لیا جس کے لئے انجمن اسلام ایجوکیشن ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ لہذا کالج کا آغاز ٹرسٹ کے ذریعہ کیا گیا لیکن اس کا انتظام انجمن اسلام بورڈ فار ہائر ایجوکیشن کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔

انجمن اسلام کالج آف کامرس اینڈ ایکنامکس (سنہ ۱۹۶۹ء)

۱۶ مئی سنہ ۱۹۶۹ء میں وائس چانسلر مسٹر گجیندر گڈکر نے کالج کا افتتاح کیا۔ فی الحال کالج انجمن اسلام جان محمد کمرشیل ہائی اسکول کی عمارت میں چل رہا ہے لیکن عنقریب ... نئی اور شاندار عمارت چھوٹا قبرستان میں تعمیر ہونے جا رہی ہے۔ ... کا نقشہ تیار ہے ۱۲ لاکھ روپیہ کا منصوبہ ہے۔

پہلے ہی سال تقریباً ۷۵۰ طلبہ اور طالبات داخل ... گئے اور جگہ کی قلت کی وجہ سے ۲۲۵ طلبہ کو داخلہ سے ... وم ہونا پڑا۔

۷ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء کو کالج کی عمارت کے تعمیری فنڈ کیلئے ... تفریحی پروگرام پیش کیا گیا جس میں تقریباً تین لاکھ ۳۰ ہزار ... پیہ کا عطیہ وصول ہوا۔

امسال مارچ سنہ ۱۹۷۱ء میں طلبہ و طالبات کی مجموعی ... راد بارہ سو کے قریب ہے۔ پروفیسروں کی تعداد پچیس ہے۔ لائبریری ... کتابوں کی تعداد تقریباً ساڑھے چار ہزار ہے جس کی قیمت کا ... نہ پچاس ہزار روپیہ سے زائد ہے۔

پرنسپل کی حیثیت سے سید عبد الباری کا تقرر کیا گیا جو ... تجربہ کار اور کہنہ مشق مصنف بھی ہیں۔

برہانی ایجوکیشن سوسائٹی

برہانی ایجوکیشن سوسائٹی ۱۲ مئی سنہ ۱۹۷۰ء میں تشکیل ہوئی۔ جس کے خاص خاص عہدیداران حسب ذیل ہیں:-

سوسائٹی کے بانی ہز ہولی نیس ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین صاحب اور صدر جناب صالح بھائی سیف الدین صاحب ہیں۔ اعزازی جنرل سکریٹری مسٹر ایس ایم جے تانیا والا اور مسٹر اے جی کا تھاوالا صاحب ہیں۔

برہانی کالج آف کامرس اینڈ ایکنامکس (سنہ ۱۹۷۰ء)

برہانی کالج ۱۶ جون سنہ ۱۹۷۰ء میں مجگاؤں پر طاہری اسکالرشپ سوسائٹی کی عمارت میں شروع کر دیا گیا۔ اس وقت فرسٹ ایر کامرس کے تین ڈیویژن ہیں اور انٹر کامرس کا ایک ڈیویژن۔ اس وقت مارچ سنہ ۱۹۷۱ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۴۲۱ اور طالبات کی تعداد ۳۸ ہے۔ اس طرح کل تعداد ۴۵۹ کے قریب ہے۔ اسٹاف ممبر میں دس پروفیسر اور ۵ لیڈی پروفیسر ہیں۔ کل تعداد ۱۵ ہے۔

جابر بھائی مالک الفرید ٹائلز کا گرانقدر عطیہ :-

ابھی حال ہی میں جابر بھائی نے کالج کے تعمیری فنڈ میں ڈھائی لاکھ روپیہ کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرما کر ایک مثال قائم کر دی۔ پرنسپل کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر عشرت حسین فاروقی ایم اے ایل ایل بی، ڈی ایس سی کا تقرر عمل میں آیا جو ہردوئی (لکھنؤ) کے باشندے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

دی میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی (سنہ ۱۹۳۳ء)

میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی سنہ ۱۹۳۳ء میں

کلکتہ میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی ہیں سر آدم جی حاجی داؤد جو میمن جماعت کے ایک مخیر فرد تھے۔

۱۹۵۳ء میں اس کا مرکزی دفتر بمبئی میں منتقل ہو گیا۔

۱۹۶۷ء تک اس کا مقصد صرف میمن جماعت کے طلبہ کو وظیفہ دینا تھا۔ اور ۱۹۶۷ء میں اس ادارہ نے دو لاکھ پچیس ہزار روپیہ کا وظیفہ دیا۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں تقریباً دو لاکھ روپیہ دیا تھا۔ اس کے وظیفوں کی دو خاصیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ صرف جماعت کے افراد تک محدود ہیں۔ دوسرے یہ کہ وظیفہ کی رقم واپس نہیں لی جاتی۔

فی الحال اس کے صدر جناب موسیٰ قاسم صاحب گانترا اور نائب صدر حاجی احمد احسن والا ہیں اور سکریٹری محمد یوسف صاحب پٹیل اور عبدالرؤف صاحبان ہیں۔

فاروق ہائی اسکول جوگیشوری (۱۹۶۸ء)

جون ۱۹۶۸ء میں اس ادارے نے جوگیشوری میں فاروق ہائی اسکول کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے۔ جس کی عمارت پر تقریباً ۴ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جس میں پرائمری اور گرلز دو سیکشن علیحدہ علیحدہ ہیں۔ طلبا اور طالبات کی کافی تعداد ہے۔ پرنسپل کی حیثیت سے آئی۔ وائی خاں صاحب کا تقرر ہوا۔ اس کے علاوہ جوگیشوری ہی میں ایک میمن کالونی کی تعمیر کی گئی ہے جس میں ۸ عمارتیں ہیں جن پر تقریباً ۲۰ لاکھ روپیہ صرف آیا ہے۔ جو میمن جماعت ہی کے افراد کے لئے مخصوص ہے۔

کیریر کونسل آف انڈیا (۱۹۷۰ء)

بلاسس روڈ بمبئی ۸

ایک خشک مگر عظیم الشان اسکیم پہلے پہل ڈاکٹر اے۔ یو۔ شیخ سکریٹری حکومت مہاراشٹر کے ذہن میں پیدا ہوئی۔ موصوف کے اکلوتے فرزند مسٹر آدم کا لندن میں اتنا جانکاہ حادثہ ہوا کہ وہ جانبر نہ ہوسکے۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے ذہن پر دنیا کی بے ثباتی کا اتنا شدید اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی بقیہ زندگی کو قومی خدمات کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ عظیم الشان قدم اٹھایا۔ جس کے چیرمین وہ خود ہیں اور صدر مسٹر یعقوب اے عدن والا ہیں۔ نائب صدر مسٹر محمد علی مٹھا اور پرنسپل اے۔ اے فتنی صاحبان ہیں۔

۸ فروری ۱۹۷۱ء کو فنڈ کی فراہمی کے لئے ہابو صدیق گراؤنڈ پر ایک پروگرام ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے دلیپ کمار نے بھی شرکت کی تھی جس صدر انجمن اسلام بیرسٹر اکبر پیر بھائی بھی شریک تھے۔ اس پروگرام کے ذریعہ تقریباً ایک لاکھ روپیہ وصول ہوا۔

کونسل کا یہ پروگرام بہت وسیع ہے جس کا اس مختصر مضمون میں تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مفصل تذکرہ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن میں کیا جائے گا۔

بمبئی ہائر ایجوکیشن سوسائٹی (۱۹۵۸ء)

سوسائٹی کے عہدیداران حسب ذیل ہیں:۔

چیرمین جناب مصطفےٰ فقیہ صاحب۔ وائس چیرمین مسٹر ایچ ایچ اسمٰعیل صاحب۔ بانی و اعزازی جنرل سکریٹری پروفیسر محبوب علی خاں صاحب پٹھان پروفیسر سدھارتھ کالج۔ خزانچی جناب زین جی زنگون والا صاحب ہیں۔

پروفیسر موصوف ایک انتہائی مخلص اور پر جوش کارکن ہیں۔ انھوں نے یہ سوسائٹی کالج کے قیام کی غرض سے قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اب تک کوئی معقول جگہ نہ ملنے کی وجہ سے یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اگر بقیہ حضرات بھی اس طرف توجہ کریں تو یہ کام کوئی مشکل نہیں۔

جمعیت اہل حدیث

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے وقت یوپی کے باشندوں کا بمبئی میں ورود ہونے لگا اور آج سے تقریباً ایک سو بیس سال قبل مومن پورہ کی مسجد اہل حدیث کی تعمیر ہوئی اور بعد ایک مدرسہ بھی ضیاء العلوم کے نام سے جاری کیا گیا، لیکن اب تک نہ ہی مدرسہ میں کوئی تبدیلی ہوئی تھی اور نہ ہی مسجد میں۔ لیکن ادھر گذشتہ چند برسوں میں جمعیت اہل حدیث نے اپنی تنظیم میں کافی تنوع اور استحکام پیدا کر لیا ہے۔ بیت المال کا نظام قائم کیا اور مسجد کی تین منزلہ عمارت تعمیر کیا جس تین لاکھ سے زائد صرف ہو چکا ہے ابھی مزید دو لاکھ اور ہوگا۔ اور ایک بہترین کتب خانہ قائم کیا جسے اسلامیات کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔

جمعیت اہل حدیث کے تمام تر منصوبے مولانا مختار احمد صاحب ندوی، خطیب جامع مسجد کے رہین منت ہیں۔ اور ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں چند نوجوان کارکن مثلاً عبدالعزیز صاحب انصاری اور عبدالحق صاحب مولانا کے دست راست ہیں۔ لیکن اس وقت کا کوئی منصوبہ تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا اگر جدید تعلیم کی طرف توجہ نہ کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے جدید تعلیم کیلئے ایک سوسائٹی کی تشکیل بھی کر دی ہے۔

جمعیت اہلحدیث ایجوکیشنل سوسائٹی، مومن پورہ (۱۹۷۰ء)

اس سوسائٹی کا مقصد ایک ایسے ہائی اسکول کا قیام ہے جن میں طلبہ جدید تعلیم حاصل تو کریں لیکن اسکے مسموم ماحول سے متاثر نہ ہوں۔ اس کے صدر شیخ محمد علی صاحب بجاج ہیں اور سکریٹری یہاں کی مشہور عالم شخصیت مولانا عبدالحکیم صاحب مرحوم کے صاحبزادے جناب نصرت الدین صاحب ہیں۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بمبئی میں مومنوں کی [illegible] کو رہتے ہوئے بھی تقریباً ایک صدی گزر گئی اور آبادی بھی بیشمار ہو گئی ہے لیکن آج تک ان کی کوئی تعلیمی انجمن قائم نہ ہو سکی تھی۔ بس دریوزہ گروں کی طرح ادھر ادھر کے دروازے کھٹکھٹانے پر اکتفا کرتے رہے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ان کی بھی متعدد وجود میں آ جاتی چاہئے تھیں۔ کاش! اب بھی آنکھ کھل جائے۔ ایسے حالات میں جمعیت اہل حدیث نے یہ اقدام کر کے دوسروں کے لئے مثال قائم کر دی۔ کاش! لوگ اب بھی اس کی تقلید، مسابقت میں اقدام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر غفلت اور آرام پسندی کا یہی حال رہا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس طبقہ کا حشر کیا ہوگا۔

ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ مدنپورہ کے ایک متمول تاجر الحاج عبدالغنی اطلس والے اور مسٹر اشفاق صاحبان ایک تعلیمی انجمن کے قیام کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ خدا کرے ان کی فکر عملی جامہ پہنے اور اس طبقہ کی دریوزہ گری ختم ہو جائے۔ (آمین)

تربیت

زندگی کچھ اور شئے ہے علم ہے کچھ اور شئے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

—علامہ اقبال رح

انیسویں صدی کے ظریف اخبار

اُسے و صحافت کی ١٩ ویں صدی کی معتبر اور ثقہی تاریخ آج
ئ حمولی میں ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ تو بیاضوں، تذکروں
ردوادین سے کسی نہ کسی طرح مرتب ہو ہی جاتی ہے۔ اگر چہ
ر منطقی تسلسل اور ضابطہ بندی کا حق ادا نہیں ہو سکا مگر
مدتک درخور اعتنا ضرور ہے۔ نثر کی اضافی تاریخ میں
ت کے خدوخال نمایاں نہیں رہ سکے یہی بات ہے کہ آج
م صحافت پر کچھ کام کرنے بیٹھتے ہیں تو بجائے بلاواسطہ
بالواسطہ ضمنی، ثانوی ماخذ کی دریوزہ گری کرنا پڑتی ہے۔
آج تک "اودھ پنچ" (اجراء جنوری ١٨٧٧ء) ہی پہلا
ہ اخبار تسلیم کیا جا رہا ہے اور سب بالاتفاق اسی پہ آمنّا
نا کرتے ہیں۔ مگر تحقیقی ماخذ کی روشنی میں یہ بات
قابلِ توجہ ہے کہ "اودھ پنچ" سے پہلے ایک نہیں بلکہ پانچ
زاحیہ نکلتے تھے۔

ردو کا پہلا مزاحیہ اخبار "مذاق" تھا جو ٹھ رسے پہلے
ر سے نکلتا تھا۔ نام اور شعر جو پیشانی پر لکھا رہتا تھا اس
سے اخبار کی پالیسی کا پتہ چلتا تھا۔ ؎

خود ہنسی اور ہنسانے کا پرچہ
چلتا پرزہ مذاق کا پُتلا

یہ چلتا پرزہ اور مذاق کا پُتلا رام پور سے نکلتا تھا
رام پور محلہ دریبہ ضلع مرادآباد ہفتہ وار بہت چھوٹے آٹھ ورق
پر یوم پنجشنبہ۔ سالانہ خریداران اخبار "سرور قیصری" سے ایک
روپیہ عام خریداران سے دو روپیہ سالانہ۔ مالک احمد رضا لکھنوی
ایڈیٹر مولوی عبدالجلیل نعمانی، پرنٹر سید تہور حسین از مطبع
احمدی اجراء، جنوری ١٨٤٥ء [1]

افسوس یہی ہے کہ "مذاق" اخبار کے کسی شمارہ کا آج
تک پتہ نہیں لگ سکا کہ اس کا مزاج کس انداز کا تھا۔ بایں ہمہ
اتنا ضرور ہم ثانوی ماخذ کی توثیق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس اخبار
کو "اودھ پنچ" پر تقدم حاصل ہے۔ مولف اختر شہنشاہی کے
کچھ تسامح کی بنا پر اگر چہ اس کے ثقہ ہونے پر حرف آتا ہے
لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر چہ اس نسخہ کا سہارا نہ
لیں تو صحافت کی اتنی تاریخ بھی نہیں مرتب ہو سکتی ہے۔
ہمارے پاس اختر شہنشاہی صرف ایک ایسی تاریخ ہے جس کی
بنا پر ہم اخبار کی تاریخ کا ١٨٨٨ء تک جائزہ لے سکتے ہیں۔
اس مقالہ میں اُردو کے مزاحیہ اخبار کی تاریخ مرتب کرنے میں
زیادہ تر اسی کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

---

[1] اختر شہنشاہی۔ صفحہ ٢٥١ مؤلفہ اختر الدولہ اشرف لکھنوی۔

"مدراس پنچ": مدراس سے ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا (اختر شہنشاہی صفحہ ۲۵۰) اخبار کا کہیں کوئی ریکارڈ کسی لائبریری میں کافی تجسس اور تفتیش کے بعد بھی نہ مل سکا۔

"روہیل کھنڈ گزٹ": مراد آباد سے ۱۸۷۰ء میں نکلا۔ اس کا بھی کوئی شمارہ کسی بھی کتب خانہ میں محفوظ نہ رہ سکا۔ مولف اختر شہنشاہی کی تحقیق کی بناء پر یہ اخبار مزاحیہ تھا۔

"بہار پنچ": پٹنہ سے ۱۸۷۶ء میں نکلا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا ایڈیٹر کون تھا۔

"فرحت الاخبار" یہ مزاحیہ پرچہ بمبئی سے ۱۸۷۶ء میں نکلا

"اودھ پنچ": جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ مطبع شام اودھ میں چھپ کر محلہ دوگا نواں سے نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر اردو کے مشہور انشا پرداز اور صحافی منشی سجاد حسین تھے۔ اخبار کے صفحات بالعموم بارہ ۱۲ ہوا کرتے تھے۔ اور قیمت پانچ ۵ روپے تیرہ ۱۳ آنے سالانہ تھی۔ یہ اخبار اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اردو ظرافت کا پہلا مشہور اور معیاری اخبار تھا۔ اور اسلوب کے اعتبار سے بھی اس کی افادیت مقدم ہے اس نے مروجہ اسلوب کے اتباع کی روایت کو ختم کر کے بے تکلف اظہار اور ابلاغ کی طرف توجہ کی اور ہر ادبی اور غیر ادبی مذاق کو اپنی طرف راغب کر لیا۔ اگرچہ اس کی ظرافت کو بہت سا حصہ ہنگامی، مقامی اور وقتی تھا مگر اب وہ تاریخی، سماجی، معاشی ثقافتی اور ادبی شعور اور اقدار کا ایک حصہ ہے۔ بقول پنڈت برج نرائن چکبست "اودھ پنچ" گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹیکل اور سوشیل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل پولیٹیکل اور سوشل مسلک تھا۔ اودھ پنچ نے بہت جلد اپنے لکھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر لیا جس میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد خاں آزاد، سید اکبر الہ آبادی، منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کھنڈوی، سید محفوظ علی وغیرہ شامل تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر خود منشی سجاد حسین ایڈیٹر اخبار" اودھ پنچ" کیا کسی سے کم تھے۔ ۳۶ برس کی عمر پا کر ۱۹۱۲ء میں یہ پرچہ بند ہو گیا۔ اور اس کے بعد مختلف اوقات میں "اودھ پنچ" کا احیاء ہوتا رہا مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی پھر کوئی منشی سجاد حسین جیسا مدیر مل سکا۔ ۱۹۱۵ء میں منشی سجاد حسین کا انتقال ہوا گویا یوں سمجھئے کہ اُن کے ساتھ اردو صحافت اور ظرافت کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔

سرپنچ:۔ سرپنچ کے نام کے چار اخبار مختلف اوقات میں مختلف جگہوں سے نکلتے رہے۔ اس نام کا سب سے پہلا اخبار یکم ستمبر ۱۸۷۷ء کو نکلا اور یہ ہفتہ وار لکھنؤ ہی سے ہمیشہ نکلتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر منشی امبکا پرشاد تھے۔ سالانہ قیمت سات روپیہ دس آنہ تھی۔

لاہور پنچ:۔ ۱۸۸۳ء میں سبحانی پریس لاہور سے چھپتا تھا۔ دفتر اس کا رنگ محل میں تھا۔ اخبار کی قیمت والیان ریاست سے بیس روپیہ۔ رؤسا اور امراء سے چھ روپیہ، عام شائقین سے چار روپے۔ طالب علموں کیلئے خصوصی رعایت تھی۔ ایڈیٹر اس کے عبدالرحمن تھے۔ دو صفحات ناول کیلئے وقف ہوتے تھے اور ایک صفحہ خبروں کے لئے وقف ہوتا تھا۔ جس کا عنوان "خبروں کا گلزار" ہوتا تھا۔ مقامی خبریں "لوکل" کے عنوان سے ایک کالم میں چھپتی تھیں۔ ان میں ظرافت نہ ہوتی تھی اس کے علاوہ اخبار کی بہت سی کارروائیاں منظوم مزاحیہ انداز میں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً چندے کی وصولیابی کے سلسلے میں یہ اشعار لکھے جاتے تھے۔

ہاتھ کو اپنے آپ کہہ بار کیجئے	للہ جلد قیمت اخبار دیجئے
للہ جلد قیمت اخبار دیجئے	اخبار کی اعانت و امداد کیجئے

یہ اخبار اپنے زمانے کا بہت ہی مشہور مزاحیہ اخبار تھا۔

اپنی پالیسی کے اعتبار سے سر سید اسکول اور حکومت برطانیہ کے خلاف تھا۔ دونوں پر چوٹیں کیا کرتا تھا۔ "تہذیب" کے عنوان سے ایک نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ملاقات کو ہو کوئی روبرو — کہو گڈ مارننگ اور ہاؤ ڈو یو ڈو
نہ سمجھو اگر تم کسی کا سخن — کہو بس وہیں بگ یور پارڈن
ہے کوٹ پتلون ہی زیب تن — ہے بوٹ پیروں میں اور ہو فٹن
ہے ایک کتا بھی پیچھے ذرا — کہ ہو بیٹ جو اپنی کل ریس کا
ہلا دیں پوا لوگ گرچہ زبان — نہ پا دیں جواب بس سوائے گو آن
لگاؤ سپائے سپاٹم سپاٹ — نہ ہو سیمی کولن نہ ہو فل اسٹاپ

(۷ اکتوبر ۱۸۹۶ء جلد ۱۶ شمارہ ۱۰)

لاہور پنچ کی ظرافت میں ۱۹ ویں صدی کے مزاح کے چٹخارے تو ہوتے تھے جو بشاشت اور ظریفانہ قہقہوں سے تخلیق ہوتی تھی۔ اس میں کوئی فکری تجسس اور احساس کی گہرائی نہ تھی۔

پنجاب پنچ:- ۱۸۷۸ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کا دفتر دہلی دروازے میں مسجد وزیر خاں کے متصل تھا۔ یہ اخبار بھی ہفتہ وار تھا اور جریدہ اخبارِ عام "قبلہ گاہ" کے ضمیمے کے طور پر چھپا کرتا تھا۔ اور کل چار صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ مولوی فتح الدین کی ادارت میں نکلتا تھا۔ لیکن جب ۱۸۸۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو اس کا نظم و ضبط فیروز الدین گھائل کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ ضمیمہ ۱۸۹۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ "نقوش" کے طنز و مزاح نمبر میں اس اخبار کو "غالباً" کے ساتھ پنجاب کا پہلا اخبار مانا ہے مگر مؤلف اختر شہنشاہی کی رو سے پنجاب کے مزاحیہ اخباروں میں "پنجاب پنچ" پر "لاہور پنچ" کو تقدم حاصل ہے۔

پنجاب پنچ کی ظرافت عامیانہ سطحی اور زیادہ تر ذاتیات پر مبنی ہوتی تھی۔ اخبار پنجاب پنچ کی پالیسی بقول اخبار کے یہ ہوتی تھی۔ "اخبار ایک سچی شہادت کا نام ہے۔ ملک کی خدمت کرنا اس کا کام ہے۔ منصب میں رعایا کا سفیر اور قدر و منزلت میں گورنمنٹ کا مشیر" ۱۸۹۳ء تک یہ اخبار نکلتا رہا۔ بعد میں منشی دین محمد نے پنجاب پنچ کا جب انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس کا نام بدل کر "صدائے ہند" رکھ دیا اور اخبار کو سنجیدہ بنا دیا۔ یہی 'میونسپل گزٹ' ہو کر چھپتا رہا۔

جالندھر پنچ:- یہ مزاحیہ اخبار ۱۸۷۸ء میں جالندھر سے نکلتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔

انڈین پنچ:- یہ مزاحیہ اخبار بھی ہفتہ وار تھا۔ یکم مئی ۱۸۸۰ء کو لکھنؤ سے منشی نوروز علی خان شیدا کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔ ۲ ستمبر ۱۸۸۱ء کو شیدا کا انتقال ہو گیا تو سری کرشن چند قیصر کے انتظام میں آگیا۔ اس پرچہ کی قیمت سالانہ روپیہ آٹھ آنہ تھی۔

دہلی پنچ:- یکم جون ۱۸۸۰ء کو لاہور سے نکلنا شروع ہوا اس کے مالک حسین علی فرحت تھے۔ اس کا دفتر ہیرا منڈی میں تھا۔ اس کو مولوی فضل الدین نے جاری کیا تھا۔ اس کے بارہ صفحے ہوتے تھے۔ سائز $\frac{20 \times 26}{4}$ تھا۔ قیمت سرکار اور والیانِ ریاست سے نو روپیہ بارہ آنے معہ محصول ڈاک لی جاتی تھی۔

اخبار کی پالیسی کے بارے میں عنوانِ ترغیب ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ ظریف اخبار ملک کے واسطے گلدستۂ ظرافت ہے اور آئینۂ فطرت ہی کا نام ہے۔ ایک نمکیں جملے میں ملک کی رائے ختم کرتا ہے اور بغلیں بجا بجا کر رعایا اور گورنمنٹ کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ کبھی بانتیجہ راگوں سے رعایا کو وجد دلاتا ہے اور ظریفانہ اشعار سے گورنمنٹ اور ملک دونوں کو جگاتا ہے نئے روپ بھر کر ملک کے سامنے آتا ہے اور ہر ایک فقرے میں اتنے پتے کی کہہ جاتا ہے۔ حروفِ زنانہ کا استعمال نہیں کرتا۔ خوشامدانہ

ہے نتیجہ مضامین نہیں بھرتا اور زبان کو چمکانے والا لفظ زبان قلم ہی سے محفوظ نہیں کرتا بلکہ مضامین کو تصویر کے لباس میں لاتا ہے جس میں سیکڑوں آرٹیکلوں کا مزا آتا ہے۔

اس اخبار میں کارٹون بھی ہوا کرتے تھے۔ مولوی اسمٰعیل پانی پتی کی تحقیق کے مطابق آگے چل کر یہی اخبار "وفادار" میں مدغم ہو گیا۔ [1]

بنگال پنچ:۔ یکم جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتہ سے نکلا۔ اس کے مالک اسفندیار خاں اور ایڈیٹر علام حضرت خاں تھے۔ اخبار ہفتہ وار تھا جس کی قیمت چھ روپیہ سالانہ تھی۔

باوا آدم پنچ:۔ یہ پرچہ بابو سندر داس نے بنارس سے ہفتہ وار جاری کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر اشفاق حسین تھے۔ سالانہ قیمت آٹھ روپیہ تھی۔

بنارس پنچ:۔ یہ ہفتہ وار اخبار ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو شہر بنارس سے نکلا۔ باوا آدم پنچ کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا تھا۔

راجپوتانہ پنچ:۔ یہ اخبار ۱۸۸۲ء میں اجمیر سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی مراد علی بیمار تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ "راجپوتانہ گزٹ" کا ضمیمہ تھا۔

ظرافت:۔ یکم جنوری ۱۸۸۲ء کو دہلی سے نکلا۔ دراصل یہ اخبار ماہنامہ "لٹن گزٹ" کا ضمیمہ تھا۔ اس کے مالک بلاقی داس تھے جو اپنے مطبع منٹو پریس سے چھاپ کر شائع کرتے تھے جس کی سالانہ قیمت چھ آنے اور ۴ صفحات کا ہوتا تھا۔

شوخ ہند:۔ ۲۲ مئی ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ سے سید تصور حسین کی ادارت میں نکلا۔ اخبار ہفتہ وار تھا۔ قیمت سالانہ سات روپے تھی اور صفحات کل بارہ ہوتے تھے۔

سرپنچ:۔ ۱ دسمبر ۱۸۸۲ء میں ہفتہ وار اخبار کی صورت میں سید پور ضلع غازی پور سے جاری ہوا اس کے مالک بابو شیو پرشاد آنریری مجسٹریٹ تھے اور ایڈیٹر مولوی محمد یٰسین شفق تھے۔ سالانہ قیمت تین روپے تھی۔ یہ اس اخبار کا نام "فرحت نشانہ" ضمیمہ "آئینۂ تہذیب" تھا۔

ظریف:۔ ۹ دسمبر ۱۸۸۲ء کو بنارس سے سدھو کر پا نے شائع کیا۔ محمد اشرف علی اس کے ایڈیٹر

سلطان الظرفاء:۔ ۴ جنوری ۱۸۸۳ء کو لکھنؤ سے ہفتہ وار نکلا۔ اسی اخبار کا عرفیت (انیسویں صدی میں دو نام رکھنے کی روایت نہ جانے کیوں چل نکلی تھی۔) "مسٹر پنچ" تھی۔ اس کی سالانہ قیمت ۱۲ روپے تھی۔

ابو الظرفاء:۔ یہ اخبار سلطان الظرفاء کی چوٹ بھنڈی بازار بمبئی سے یکم جون ۱۸۸۳ء کو نکلا۔ یہ بھی ہفتہ وار ہی تھا۔ منشی امیر علی اس کے مالک اور منتظم تھے۔ اس کی سالانہ قیمت عوام کے لئے تین روپے تھی۔ امراء اور والیان ملک میں مفت تقسیم ہوتا تھا کے طور پر رقم الگ سے ان لوگوں سے طلب کی جاتی تھی۔ اخبار آٹھ صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

سرپنچ:۔ "سرپنچ" نام کا یہ دوسرا اخبار بمبئی سے روز نکلتا تھا۔ ۵ مئی ۱۸۸۳ء اس کی صحیح تاریخ پیدائش ہے۔ یہ ماہ نیم پرچہ "ارمغان" تھا۔ اور انجمن درخشاں کے توصل سے شائع ہوتا تھا۔

فتنہ:۔ اختر شہنشاہی کے اعتبار سے "فتنہ" کا سن ۸ جولائی ۱۸۸۳ء ہے۔ حسرت موہانی" ا

---

[1] نقوش طنز و مزاح نمبر صفحہ ۲۳۶

یہاں تحریر فرماتے ہیں کہ "گورکھپور کا فتنہ مارچ ۱۸۹۹ء میں جاری ہوا۔ حضرت ریاض کی شوخ مزاجی اور برق طبعی نے "فتنہ" نام تجویز کیا۔ یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو اسی نظم کا حصہ بطور ضمیمہ بڑھا دیا۔ اور اس کا نام "عصر فتنہ" رکھ دیا اور اسی کے ساتھ سولہ صفحوں کا اور اضافہ کر دیا۔ مگر چندے یا قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ ریاض جب تک گورکھپور میں رہے "فتنہ" کو عبدالکریم برہم کے حال پر چھوڑ دیا۔ گورکھپور کے قیام میں ریاض نے برہم کو سارے داؤ پیچ سکھا دیے مگر ظاہر ہے ریاض کا ذہن اور قلم تو لکھنؤ میں ریاض الاخبار کے بین السطور میں اپنی شوخیاں اور رعنائیاں بکھیر رہا تھا اور فتنہ ریاض کے بِن سُونا ہو گیا تھا۔

اس طرح فتنہ کا دوسرا دور ۱۹۰۲ء سے غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء تک رہا۔ "اودھ پنچ" فتنہ کا معاصر تھا۔ ان دونوں کے انداز میں وہی ۱۹ ویں صدی کے مزاج کی جھلکیاں ملتی ہیں مگر جو فرق یا فصل ان دونوں کے طنز و مزاح میں تھا۔ وہ مسلک اور مزاج کا تھا۔ مذاق وہی تھا مگر انفرادیت کے اعتبار سے مختلف تھے۔ جس کا اثر ۱۹ ویں صدی کی صحافت اور ظرافت پر بہت گہرا پڑا۔ فتنہ کے طلوع ہوتے ہی ظرافت کے اُفق پر نہ جانے کتنے اور فتنے دکھائی دینے لگے اور اس کی صورت اور سیرت کے اتباع میں بہت سے پرچے نکلے اور اسی کے تلازم سے "قیامت" اور "حشر" جیسے نام رکھے گئے۔

کھیٹر پنچ:- یکم مئی ۱۸۸۳ء کو بدایوں سے نکلا۔ عشرہ وار ۸ ورق خورد، مہتمم مولوی امجد علی تھے۔ مطبع بدایوں سے شائع ہوتا تھا۔

ہریانہ پنچ:- جھجھر ضلع روہتک صوبہ پنجاب سے ہفتہ وار چار ورق اوسط سالانہ قیمت مختلف مطبع سلیمانی، المشتہر غلام احمد خاں اجرائے اشتہار کی تاریخ ۲۰ رفروری ۱۸۸۳ء ہے۔

کرناٹک پنچ:- یکم اپریل ۱۸۸۳ء کو مدراس لبے پیٹھ باغ سے عشرہ وار چار ورق خورد کا نکلا۔ قیمت اس کی معیار کے اعتبار سے تھی۔ مہتمم اس کے منشی محی الدین حسین خان خویشی نواب سپہ دار جنگ بہادر تھے۔ یہ مطبع حسینی میں چھپتا تھا۔

موج نربدا:- مئی ۱۸۸۲ء میں ہوشنگ آباد سے ہفتہ وار اوسطاً چار ورق کا نکلا کرتا تھا۔ پہلا شمارہ یکشنبہ ۸ تاریخ، اور اسی طرح ۱۵، ۲۲ اور ۲۹ کی مخصوص تاریخوں میں نکلا کرتا تھا۔ مطبع کا نام بھی "موج نربدا" تھا۔ مالک اس کے کوئی سوداگر ابوالفضل مرزا عبدالکریم تھے۔

جھجھر پنچ:- ستمبر ۱۸۸۲ء قصبہ جھجھر (ضلع روہتک) سے نکلا۔ ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر غلام محمد خاں تھے۔ اور مالک مولوی غلام احمد خاں۔

البنچ:- البنچ اپنے وقت کا بہت مشہور پرچہ تھا۔ یہ ہفتہ وار تھا۔ ۵ رجنوری ۱۸۸۵ء کو بانکی پور ضلع پٹنہ سے نکلا۔ ہر پنجشنبہ کو آٹھ ورق نکلتا تھا۔ اس کے مالک محمد اعظم تھے۔ ان کے بعد مولوی سید رحیم الدین نے اس پرچے کی تجدید کی۔ اس کے مزاج میں مقصد کا رنگ غالب تھا سیاسی اور معاشرتی مسائل اور حالات کو اپنے انداز کی ظرافت میں پیش کرتا تھا۔ اور کڑی تنقید کرتا تھا۔ قیمت صرف چھ روپے سالانہ تھی۔ دوسرے شہر کے لوگوں سے ذرا زیادہ تھی۔ یعنی آٹھ روپے۔ بہت کثیر تعداد میں چھپتا تھا۔

دکن پنچ:- یہ ہفتہ وار جنوری ۱۸۸۵ء کو مدراس سے اور مرزا قاسم بیگ کے انتظام میں جاری ہوا۔ ایڈیٹر اس کے منشی محی الدین تسنیم تھے۔

کرڑا پنچ:- چوک الہ آباد سے ۱۴ رفروری ۱۸۸۵ء کو طلوع ہوا۔ یہ بھی ہفتہ وار چار ورق کا تھا۔ مالک حافظ سید محمد اسمٰعیل، کاتب فصیح اللہ اور مطبع اسمٰعیلیہ تھا۔

ظریف ہند:- یہ ہفتہ وار اخبار یکم مارچ ۱۸۸۵ء کو دہلی سے نکلا قیمت سالانہ چار روپے تھی۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر افضل خاں شیدا تھے

جعفر زٹلی:- مشہور ہزل گو جعفر زٹلی کے نام سے شائع ہوا اس کے طلوع ہونے کی تاریخ یکم جولائی ۱۸۸۵ء ہے۔ جھجھر (ضلع روہتک) سے زیر ادارت غلام احمد خان جاری ہوا۔ اس کی ظرافت پست اور سوقیانہ انداز کی تھی۔ قیمت:- اس کی سالانہ صرف ایک روپیہ بارہ آنے تھی۔

فتح گڑھ پنچ:- یہ نصف ماہنامہ اخبار فرخ آباد سے طلوع ہوا۔ تاریخ اشاعت ۱۵ اگست ۱۸۸۵ء ہے۔ اوسط درجے کے چھ ورق ہوتے تھے۔ مالک بابو ذوقی رام تھے۔ ایڈیٹر منشی صدیق حسین منت تھے۔ مطبع کا نام "گلزار" تھا۔

پر کالہ آتش عرف قنوج پنچ :-

یہ نیم ماہنامہ اگست ۱۸۸۵ء کو قنوج سے جاری ہوا۔ منشی بھگو خان اس کے مدیر اور مہتمم تھے۔ دو روپیہ سالانہ قیمت تھی۔

شیخ چلی:- اکتوبر ۱۸۸۵ء کو سیالکوٹ سے ہفتہ وار نکلا اس کے مدیر مان سنگھ تھے۔ کل آٹھ صفحے کا ہوتا تھا اور سالانہ قیمت ۲ روپے تھی۔

بیربر:- یہ اخبار ۱۸۸۵ء میں چاندنی چوک دہلی سے ہفتہ وار نکلا۔ اس کے مدیر اور مالک افضل خان تھے جو ان کے مطبع افضل المطابع سے طلوع ہوتا تھا۔ اخبار کی قیمت ۴ روپے سالانہ تھی۔

ظریف الہند:- یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو پھر میرٹھ سے اسی نام کا ہفتہ وار نکلا۔ اس کے مالک منشی ثابت علی اور مدیر منشی حسین علی فرحت دہلوی تھے۔ سالانہ قیمت پرچے کی دو روپے چار آنے تھی۔

پولیٹکل سپاہی عرف ملکی مخبر:-

یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو ہفتہ وار لاہور سے نکلا۔ مو فضل الدین اس کے مالک تھے۔ آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار مطبع دہلی پنچ لاہور سے نکلتا تھا۔

تیس مار خان:- یہ ہفتہ وار اخبار ۱۷ جنوری ۱۸۸۶ء کو سردار علی اختر کی ادارت محلہ چہل بیبیاں لاہور سے نکلا جو آٹھ صفحات کا ہوتا اور اس کے مالک بھی سردار علی اختر تھے۔

پاٹے خان:- یہ لاہور سے ۱۷ جنوری ۱۸۸۶ء کو عبدا کی ادارت میں نکلا۔ اس کے مالک ہی تھے اور سالانہ قیمت دو روپے تھی۔ اس کا مذاق پست ت

چلتا پرزہ:- ۱۶ جنوری ۱۸۸۶ء کو اس اخبا ظہور ہوا۔ ہفتہ وار تھا اور اس ایڈیٹر مولوی عبدالرحمن راسخ تھے۔ سالانہ قیمت تین روپے اور کل آٹھ صفحات کا نکلتا تھا۔ یہ اخبار بھی پاٹے خاں، ٹلی اور ملّا دو پیازہ کے قبیل کا تھا۔

طوفان:- اصل میں یہ شیخ چلی کا ضمیمہ تھا جو ہفتہ وار سیا سے نکلتا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا مان سنگھ تھے۔ تاریخ اشاعت جنوری ۱۸۸۶ء ہے۔

برار پنچ:- اس اخبار کا اجرا مارچ ۱۸۸۶ء میں کولا ضلع امراوتی سے ہوا۔ اس کے مالک ایڈیٹر کرشن لال جوشی تھے۔

البیلا:- اس کا پہلا شمارہ یکم اپریل ۱۸۸۶ء کو نکلا۔ اس ایڈیٹر مولوی امجد علی زوّار تھے۔ اخبار ہفتہ آٹھ صفحات کا تھا اور بداؤں محلہ فرشوری ٹولہ سے نکلتا تھا۔

ر :- یکم اپریل ۱۸۸۶ء کو سیالکوٹ سے جاری ہوا۔ اس
لک منشی گیان چند تھے۔ ہفتہ وار اخبار تھا۔ قیمت اس
روپیہ آٹھ آنہ تھی۔

ظرافت :- ہوشنگ آباد سے ہفتہ وار ۸ ورق کا
یکم مئی ۱۸۸۶ء کو نکلا۔ مرزا عبدالکریم
ر اس کے مالک تھے۔ جنھوں نے مئی ۱۸۸۱ء میں اسی
سے "موج نربدا" نکالا تھا۔

زپور پنچ :- ہفتہ وار چار ورق خورد یوم دوشنبہ
۲۴ر اکتوبر ۱۸۸۶ء کو نکلا۔ مالک نیر زالدین
ع صدیقی پریس۔

پنچ :- تیسری بار اسی نام کا پرچہ ۱۸۸۶ء میں پھر میرٹھ سے
نکلا۔ اس کا دوسرا نام "قیصر ہند" تھا۔ مالک سید
الدین تھے۔ ہفتہ وار نکلتا تھا۔ سالانہ قیمت تین روپے تھی۔

ر پنچ :- یکم فروری ۱۸۸۷ء کو امجد صاحب کی ادارت
میں صدر بازار دہلی سے نکلا۔ یہ ہفتہ وار
صفحات کا ہوتا تھا۔

ر ٹلی :- ۱۴ر مارچ ۱۸۸۷ء میں پھر اسی نام کا ہفتہ وار
لاہور سے نکلا۔ ملا محمد بخش اس کے مالک
ڈیٹر تھے۔ اور محمد حسین اس کے ناظم تھے۔ شاہ عالمی کوچہ
میاں میں اس کا دفتر تھا۔ اس پرچے کا شمار معیاری پرچوں
ہوتا تھا۔

و پیازہ :- ۷ر مئی ۱۸۸۷ء کو لاہور ۴ ورق خورد
کا نکلا۔ ایڈیٹر میاں علاؤالدین، پرنٹر منشی
ش، پبلشر سید حسین شاہ، مالک منشی الہ الدین، مہتمم منشی
بخش اور مطبع جعفری پریس۔ اس میں نہایت ہی گھٹیا
ظرافت ہوتی تھی۔

نا پنچ :- یکم جون ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد دکن سے پھر اسی
نام سے کشن راؤ کی تحریک پر اجراء ہوا اور مولوی غریب الدین کی
ادارت میں شائع ہوا۔ اس ہفت روزہ کی سالانہ قیمت ۱۲ روپے
تھی اور اپنے ہی مطبع سے نکلتا تھا۔

شریر :- ۲۴ر جون ۱۸۸۶ء کو نکلا یہ پندرہ روزہ اخبار
"خادم ہند" کا ضمیمہ تھا۔ اسی کے محرک ادم
چند کپور تھے اور صرف ۴ صفحات کا نکلتا تھا۔ اس کا چندہ
۴ آنے اور ۶ آنے سالانہ محصول کل قیمت اس پرچے کی
۱۰ آنے سالانہ تھی۔

آگرہ پنچ :- ۴ر فروری ۱۸۸۸ء کو ہفتہ وار نکلا۔ اسکی قیمت
چھ روپیہ سالانہ تھی اور بارہ صفحات کا ہوتا
تھا۔ اس کے مالک امیر خاں تھے اور غالباً یہی ایڈیٹر بھی تھے۔

بے مثال پنچ :- یہ دہلی سے ۱۸۹۲ء میں نکلا۔ اس کے
مدیر مولوی عبدالرحمٰن راسخ تھے۔ شیخ
اسمٰعیل پانی پتی کی تحقیق کے مطابق یہ اخبار مزاحیہ تھا۔

ظریف :- ۱۸۹۶ء میں سہارنپور سے ہفتہ وار نکلا۔ پنڈت
راج نرائن ارمان اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے
مگر بعض قباحتوں کی بناء پر ادارت کے منصب سے الگ رہنا پڑا۔

نائب یا نائیک

کیفؔ کاکوروی

کریم کا تو کرم ہے ازل سے بندوں پر
یہ عبد اس کا تو بے شک اسی کا نائب ہے

مریض قوم ہو یا فرد پُر جراحت ہو
کرم کریم کا ہی دافع مصائب ہے

ہے امتیاز یہ عبدالکریم نائیک کا
کہ عزم پختہ اور ان کی رائے صائب ہے

ہے مستعد ہر اک طرح ڈاکٹر نائیک
میں اتنی بات ہے آرام سو وہ تائب ہو

بدیع الزماں خاور

غزل

کب تک وہ میرے ساتھ چلے گا
اِک دن وہ مجھ سے بچھڑے گا

کوئی شوخ آکر توڑے گا
پھول اگر ڈالی پہ کھلے گا

کب وہ دیوانہ لگتا ہے
کون اُسے پاگل سمجھے گا

کب تک سورج کے چولھے پہ
چاند اپنی روٹی سینکے گا

رات کی کالی شاخ پہ خاور
اِک پنچھی روتا بیٹھے گا

آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اردو کے محاورات و ضرب الامثال

ہر زبان میں اس کے اپنے مزاج کے مطابق محاورات و ضرب الامثال پائے جاتے ہیں۔ اردو زبان بھی اس معاملے میں تہی دامن نہیں۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہم اردو کے بعض محاورات سنتے اور پڑھتے ہیں مگر ان کے حقیقی معنوں تک پہنچنے میں ہمیں دشواری محسوس ہوتی ہے چنانچہ ادارہ نقش کوکن نے اردو زبان کے مشہور محاورات و ضرب الامثال کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے ساتھ اردو کے مشہور شعراء کے کلام سے اس کی سند بھی دی ہے تاکہ ان کے سمجھنے میں قارئین کو آسانی ہو۔ ممکن ہے کہ اردو کے تعلیم یافتہ حضرات کو اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئے لیکن اردو کے طالب علموں اور ایک عام قاری کے لئے یہ سلسلہ نہایت اہم و دلچسپ ثابت ہو سکے گا۔

محاورہ	معنی	استعمال
بھاڑ میں جانا	جل جانا۔ نیست و نابود ہونا	رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
دل کو لگنا	دل پر اثر ہونا	بات جو تو نے کہی دل کو لگا یہ اسی کافر کے منہ کی بات ہے
کفر ٹوٹنا	کام بننا۔ مصیبت ٹلنا	لائے اس بت کو التجا کر کے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

محاورہ	معنی	استعمال
رنگ میں بھنگ	خواہ مخواہ دخل اندازی ۔ مزے میں خرابی	کام بنتا خراب کر ڈالا ڈالدی آپ نے تو رنگ میں بھنگ
دل پہ نقش ہونا	دل پر اثر کرنا ۔ دل میں بیٹھ جانا	جتنی باتیں بھی آپ نے کی ہیں دل پہ سب نقش ہوگئیں میرے
ہاتھ اٹھا لینا	دستبردار ہوجانا ۔ الگ ہو جانا	جب سے ترے غم نے آلیا ہے ہر کام سے ہاتھ اٹھا لیا ہے
بازی لگانا	شرط لگانا	دنیائے عاشقی میں اگر نام چاہیئے جانباز بنئے ، جان کی بازی لگائیے
تین میں نہ تیرہ میں	جس کی کہیں بھی پرسش یا عزت نہ ہو	عزت جو آپ کی ہے وہ معلوم ہے ہمیں ہم جانتے ہیں آپ ہیں تیرہ نہ تین میں
جان میں جان آنا	تسلی ہونا ۔ اطمینان کا سانس لینا	تمھاری طرف سے جو تحریر آئی تسلی ہوئی ، جان میں جان آئی
خاطر میں لانا	اہمیت دینا ۔ خیال رکھنا	غم کو خاطر میں لاؤ گے جتنا اور نازل مصیبتیں ہوں گی
گل کترنا	چالاکی دکھانا ۔ عجیب کام کرنا ۔ سبقت لے جانا	نزاکت سے چڑھتی اترتی ہوئی اترنے میں سو گل کترتی ہوئی
وحشت برسنا	اداسی چھا جانا ۔ دیوانگی کا ظاہر ہونا	کیا کہوں اپنے جنوں کا احوال گھر میں بھی اب ہے برستی وحشت
ہوا کا دم بھرنا	محبت کا خواہاں ہونا ۔ دوستی کا دعویٰ کرنا ۔	دو چار دنوں کے اب ہیں مہماں کیا تیری ہوا کا دم بھریں ہم
لہو میں نہانا	خون آلودہ ہونا ۔ قتل ہونا ۔	بہت آرزو تھی گلی کی تری سو یاں سے لہو میں نہا کے چلے
کام کرنا	اثر کرنا	نالوں سے مرے رات کے غافل نہ رہا کر اک روز یہی دل میں ترے کام کریں گے

ارمغان تہنیت

[جناب ساحر لدھیانوی کو حکومت ہند کی طرف سے پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ اس مبارک موقع پر مہاراشٹر کالج بمبئی کی بزم اُردو کی طرف سے ۱۲ فروری ۱۹۷۱ء کو جلسۂ تہنیت منعقد ہُوا۔]

بشرف خدمت پدم شری ساحر لدھیانوی
(صدر جلسہ عالی جناب ڈاکٹر رفیق زکریا، وزیر صحت واوقاف حکومت مہاراشٹر)

مہمان مکرم

ہم اراکین بزم اردو آپ کی تشریف آوری سے شادان ہی نہیں نازاں بھی ہیں اور آپ کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں۔
ہمیں خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ صدر جمہوریہ ہند نے پدم شری کے اعزاز سے آپ کو نوازا۔ یہ سرکاری اعزاز آپ ہی کو نہیں آپکے واسطے سے اردو زبان کو بھی عطا ہوا ہے۔ ہماری طرف سے ارمغان تہنیت قبول فرمایئے۔ لیکن اس اعزاز سے قبل آپکے پیغام عمل نے لوگوں کے دلوں پر وہ سکہ جمایا تھا۔ اور آپ کو وہ اعزاز دے رکھے تھے جو ملک کے مقبول ترین شعراء کو ملتا ہے۔ صدر جمہوریہ نے آپ کی اسی مقبولیت کے نقش اول کو نقش ثانی کی صورت میں عطا کیا۔ ہمیں بجا طور پر فخر و مسرت ہے کہ حکومت ہند نے آپکے قدر شناسوں کے جذبات اور احساسات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ

ہندوستان کا وہ شاعر جو عوام میں اس قدر مقبول ہے!
حکومت بھی قبول خاص کی سند عطا کرے

جناب عالی، آپ نے اُردو زبان کے ذریعہ جس شاعری کو فروغ دیا اس میں آپکے تجربات و محسوسات کے علاوہ آپکے پیغامات کو بڑا دخل ہے۔ آپ نے رنگ و نسل اور ملک و قوم کے امتیازات سے بلند ہو کر سماجی زندگی کے تضاد کو نمایاں کیا۔ اس سماجی تضاد کا ہر زاویہ سے جائزہ لیا اور آج انسان کی آبادی اور اس آبادی میں معاشی نشیب و فراز کو فنکارانہ حسن کے ساتھ اُجاگر کیا۔

آپ کی شاعری کا شروع سے اب تک یہ کردار رہا ہے آپ نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جو انقلاب آفریں بھی تھی اور دل ریز بھی۔ وہ مظالم جو اردو زبان، غریب و نادار عوام، عورتوں بچوں، مزدوروں، کسانوں، سوکھے پچکے چہروں اور لاغر جسموں پر ہو رہے ہیں، ان کا پردہ چاک کیا اور تلخیاں، کی غزلوں ا

نظموں کے اعجاز سے زندگی بخشی۔

جناب عالی۔ آپ نے مصلحت کوشیوں کی راہ اختیار نہیں کی اور نہ ادھر مائل نظر آئے۔ بلکہ ایک اعلیٰ فنکار، ایک بلند ظرف انسان اور بڑے شاعر کی طرح آپ اجتماعی زندگی کی تہوں کو واشگاف کیا اور اس کی صداقت، حقیقت اور واقعیت کو پیش کیا۔ آپ کی شاعری آپ کی وسیع النظری، کشادہ دلی اور بے باکی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

جناب والا۔ غالب صدی کے موقع پر نثر و نظم کی دنیا میں ہر رنگ کی آواز ابھری اور سنائی دی۔ مگر آپ کی آواز سب سے الگ اور سب سے زیادہ حقیقت پسند تھی۔ یہ حقیقت پسندی شروع سے ہی آپ کے شاعرانہ مزاج کا جزو لازم رہی ہے اور آج جب آپ فلم کی دنیا سے بھی قریب ہیں اور لب و لہجہ اور اظہار خیال میں وہی حقیقت پسندی شامل ہے۔

آپ صرف ایک محب وطن اور جان نثار وطن شاعر ہی نہیں بلکہ آپ کی محبت اور جاں نثاری کے دائرہ نے ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ آپ نے انسانوں کے کرب کو صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ ان کے چھٹ جانے کی پُرزور خواہش کا اظہار بھی کیا۔ آپ کی نظمیں۔ کچھ باتیں، چکلے، مجھے سوچنے دو، مرے گیت، طلوع اشتراکیت، شاع فردا، پھر وہی کنج قفس، مرے گیت تمہارے ہیں، صاف کہے دیتے ہیں کہ آپ کے نزدیک دکھ بھری انسانیت کا علاج کیا ہے۔

آج بنگال میں جو ہنگامہ برپا ہے روح فرسا بھی ہے اور ہمت شکن بھی۔ آپ نے ۱۹۳۵ء میں قحط بنگال کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اس میں آپ نے اہالیان حکومت سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ پریشان حال عوام کا مدد، دسیاں طلب ہے۔

آپ نے ۱۹۴۶ء میں جہازیوں کی بغاوت کے موقع پر رہبران ملک و قوم کو جس انداز سے خطاب کیا تھا اس کی اہمیت اور حقیقت میں آج بھی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء کی خونریزی اور بربریت سے گھبرا کر آپ نے امن و تہذیب کی بھیک مانگی۔ اس بھیک کی مانگ آج بھی باقی ہے۔ اور آزادی کے بعد جب آپ کو تسکین و آسودگی نصیب نہیں ہوئی اور آپ نے محسوس کیا کہ حالات بدستور وہی ہیں تو پھر آپ نے اپنے لب و لہجہ اور آواز کو تیز کیا اور اپنی نظم "لہو نذر دے رہی حیات" میں بلند آہنگ میں اعلان کیا اور کہا کہ،

روان ہے قافلۂ ارتقائے انسانی

اور اسی نظم میں پھر آپ نے یہ کہا

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار کون روکے گا
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا

اور آپ نے اپنی شاہکار نظم پرچھائیاں میں جس اعتماد میں اعتقاد کے ساتھ تخریب کاری کے نتائج سے خبردار کیا ہے وہ فیضان مستقل کا سرچشمہ ہے۔

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

ارتقائے انسانی کے سلسلے میں یہ اعلان ایک حسین مستقبل کا خوش آئند اشاریہ ہے۔

ہزاروں برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

ہم آپ کے نیاز مند
اراکین بزم اردو
مہاراشٹر کالج

ترتیب کار
محمد عبدالحق

نتیجہ ثاقی انعامی مقابلہ نمبر ۵

اس مقابلے کے لئے کُل ایک سو ساٹھ (۱۶۰) حل موصول ہوئے جن میں کوئی بھی حل صحیح نہ تھا۔ اس لئے پہلا انعام ایک غلطی پر پانچ خوش نصیبوں کو دیا جا رہا ہے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) موسیٰ محمد بغدادی بمبئی نمبر ۹ (۲) عبیداللہ محمد حیات کرلا۔ (۳) زاہدہ خاتون کرلا۔
(۴) سلیمان اسمٰعیل بمبئی نمبر ۳ (۵) مجتبیٰ شمسی خالدی، سائن ممبئی۔

علاوہ ازیں دو غلطی والے حلوں پر خوبصورت اسناد جنھوں نے حاصل کی ہیں۔

(۱) محمد علی فخرالدین قاضی باندرہ (۲) نعمت اللہ عباس مجاور شرنگاؤں رتناگیری
(۳) اسلم داؤد بورکر، بمبئی نمبر ۹

صحیح حل

(۱) عبدمناف (۲) کنعان (۳) اسرافیل (۴) میرٹھ (۵) سوئنٹن (۶) ڈارون (۷) شنکر اچاریہ (۸) کوارٹزائٹ (۹) بہادر شاہ ظفر (۱۰) میرانیس۔

نوٹ:۔ ثاقی انعامی مقابلے کے تمام حلوں پر بھی حل بھیجنے والے کا نام لکھا ہوا ہونا چاہیئے۔ جس لفافے میں حل بھیجے جائیں اس پر "ثاقی انعامی مقابلہ نمبر" ضرور لکھا جائے۔ بغیر ٹوکن کا حل شریک مقابلہ نہ کیا جائے گا۔

مجیب احمد منوّر خان

دُنیا کے خطرناک حالات

(اور اُن سے متاثر ہونے والے افراد کی تعداد)

(۱) ۸ رمئی سنہ ۱۹۰۲ء ویسٹ انڈیز میں کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑنے سے ۳۰ ہزار افراد مرے۔

(۲) ۹ ستمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو ہانگ کانگ میں طوفان آیا اس میں ۵۰ ہزار افراد مرے۔

(۳) ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں جنوبی اٹلی اور سسلی کے زلزلے میں ایک لاکھ افراد مرے۔

(۴) سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک چین اور ہندوستان میں پلیگ سے ۱۵ لاکھ افراد مرے۔

(۵) ۱۱-۱۹۱۰ء منچوریا میں پلیگ سے ۶۰ ہزار افراد مرے۔

(۶) سنہ ۱۹۱۱ء چین میں یانگ سی ندی کے سیلاب کی وجہ سے ایک لاکھ افراد مرے۔

(۷) سنہ ۱۹۱۵ء میں سائبیریا میں ٹائیفائڈ کی وجہ سے ۲½ لاکھ افراد مرے۔

(۸) سنہ ۱۹۱۶ء میں انفلوئنزا کی عالمی وبا سے ۲ کروڑ افراد مرے۔

(۹) سنہ ۱۹۲۰ء ہندوستان میں پلیگ کی وبا سے ۲۰ لاکھ افراد مرے۔

(۱۰) سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں ہیضہ کی وبا سے ۵ لاکھ افراد مرے۔

(۱۱) ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء سے ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء تک مشرقی پاکستان میں طوفان سے ۱۰ ہزار افراد مرے۔

(۱۲) ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء میں ایران میں زلزلہ سے ۳ ہزار افراد مرے۔

(۱۳) ۲۸، ۲۹ رمئی سنہ ۱۹۶۳ء بنگال و مشرقی پاکستان میں طوفان اور سمندری تموج سے ۲۲ ہزار افراد مرے۔

(۱۴) ۱۳ اگست سنہ ۱۹۶۱ء کو ایران میں زلزلہ سے ۱۲ ہزار افراد مرے۔

(۱۵) ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۷۰ء کو مشرقی پاکستان میں سمندری موجوں اور طوفان سے ۵ لاکھ افراد مرے۔

محمد عثمان شمشیر علی

دلچسپ معلومات

پودے زمین کے بغیر بھی اُگائے جاسکتے ہیں

زمین میں اُگنے والے پودے زمین کے علاوہ کہیں اور نہیں اُگ سکتے کیونکہ پہلے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ پودوں کی جڑیں مٹی کھاتی ہیں۔ لیکن اب تحقیق کے بعد یہ پتہ چلا ہے کہ جڑیں زمین سے نمی جس میں معدنیات موجود ہوتی ہیں حاصل کرتی ہیں۔ ماہرین نباتات برسہا برس کی کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پودوں کی نشو و نما کے لئے پوٹاشیم، کیلشیم میگنیشیم، نائیٹروجن فاسفورس اور گندھک ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ لوہا، بورون میگنیز، جست اور شاید تانبا بھی معمولی مقدار میں نشو و نما کے لئے مفید ہے۔ پودوں کو سر سبز و شاداب رکھنے کے لئے ان تمام عناصر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تمام عناصر محلول کی شکل دستیاب ہونا چاہئیں کیونکہ پودے صرف محلول جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کیلیفورنیا کے ایک ڈاکٹر ولیم ایف گیرک نے زمین میں پیدا ہونے والے پودوں کو پانی کے ٹبوں میں اگانے کا نیا طریقہ دریافت کیا جسے (HYDROPONIC) کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ ریت میں پودے اگانے کا ہے۔ صاف اور شفاف ریت میں پودوں کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ اور نباتاتی غذا کا محلول چھوڑا جاتا ہے۔ جو چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ مختلف پودوں کے لئے مختلف مقدار میں محلول دیا جاتا ہے۔ ایک ہی پودے کو مختلف موسموں میں الگ الگ مقدار میں محلول کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ٹماٹر کی عمدہ پیداوار کے لئے موسم سرما کے تاریک اور چھوٹے دنوں میں نائیٹروجن کی کم مقدار کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ گرمیوں میں زیادہ نائیٹروجن دینا پڑتی ہے۔

پانی میں اگائے ہوئے بعض کھیت بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں لیکن اس طریقے کو اپنانے کے لئے کیمیائی اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے جو مہنگی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ محلول بھرنے کے لئے ٹبوں کی ضرورت پڑتی ہے جو کافی لاگت سے بنائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے بڑے پیمانے پر کاشت کرنے کے لئے بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔

کتّا بیٹھنے سے پہلے چکر کیوں لگاتا ہے :-

کتوں میں یہ عادت نسل در نسل چلی آرہی ہے اور اس زمانے کی یادگار ہے جب کتے جنگلوں میں خونخوار زندگی گزارتے تھے۔ جنگل میں انھیں جب آرام دہ بستر کی تلاش ہوتی تھی تو وہ گھاس کے فرش پر کئی مرتبہ ادھر سے اُدھر گھوم پھر کر گھاس کو پیروں سے خوب روند ڈالتے تھے تاکہ گھاس ہموار ہو جائے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا کتوں کی نسلوں کو سدھا کر پالتو بنالیا

ا ہے ۔ اور اب وہ چٹائی ۔ فرش یا صوفے پر سوتے ہیں لیکن اب
ی اپنے آبا و اجداد کی طرح بیٹھنے سے پہلے ایک دو چکر ضرور
لگا لیتے ہیں حالانکہ اب اس کی بالکل ضرورت نہیں رہی ۔ یہ
مل ان سے غیر دانستہ طور سے سرزد ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھول
جاتے ہیں کہ اب حالات ، اور ماحول بدل چکا ہے ۔

شہد کی مکھی بھنبھناتی کیوں ہے :۔

شہد کی مکھیاں بھنبھناہٹ کی آواز اپنے پروں اور بازوؤں
سے پیدا کرتی ہے ۔ مکھی جب اڑتی ہے تو اس کے پروں میں بڑی تیزی سے
ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور یہی ارتعاش لہروں کی شکل میں تبدیل
ہو کر ہوا کے ذریعہ آواز کو ہمارے کانوں تک پہنچاتا ہے ۔ پرندوں
کے پروں میں بھی اڑتے وقت ارتعاش پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن اس
کی رفتار بہت کم ہوتی ہے ۔ جس کی وجہ سے بہت ہلکی آواز پیدا
ہوتی ہے ۔ شہد کی مکھی ایک سکنڈ میں چار سو سے زیادہ مرتبہ
اپنے بازو آگے پیچھے کرتی ہے ۔ کبھی کبھی یہ رفتار بڑھ کر فی منٹ
۲۶ ... تک پہنچ جاتی ہے ۔ یہ رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ ہم علٰحدہ
علٰحدہ آوازیں نہیں سن پاتے بلکہ لگاتار ایک بھنبھناہٹ
سنائی دیتی ہے ۔

نیوزی لینڈ میں جانور کس طرح آئے :۔

نیوزی لینڈ آسٹریلیا کے جنوب مشرق میں واقع ایک جزیرہ
ہے جہاں خشکی پر پائے جانے والے جانور بالکل ناپید تھے ۔ نہ
سانپ پائے جاتے تھے اور نہ ہی پھل دار درخت ، گھاس اور
دالوں سے لوگ آشنا تھے ۔ صرف ایک مکڑی کی طرح کا زہریلا
کیڑا جھاڑیوں میں پایا جاتا تھا ۔ جب ماؤرس (MAORis)
جزیرے میں آئے تو اپنے ساتھ کتے اور چوہے بھی لائے
۔ جن کا آج نام و نشان بھی باقی نہیں ۔ صرف چند چوہے دکھائی
دے جاتے ہیں ۔ جب انگریز یہاں آکر آباد ہوئے تو انھیں
اپنے ساتھ تمام پالتو جانور لانا پڑے ۔ اس کے علاوہ گھاس
اور دوسرے نباتات جو چارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۔
اپنے ساتھ لائے ۔ گھاس کی پیداوار اور اس کی بار آوری کے
لئے شہد کی مکھیاں بھی لائی گئیں تھیں ۔

آج نیوزی لینڈ بھیڑ پالنے اور اون مہیا کرنے والے
ملکوں میں سب سے آگے ہے ۔ پھل دار درختوں کی بہتات ہے ۔ باہر
سے لائے ہوئے جانوروں اور پرندوں میں ہرن ، خرگوش ، نیولا
میٹھے پانی کی مچھلی اور تیتر بہت زیادہ تعداد میں ہیں ۔ لیکن بدقسمتی
سے یہ جانور لوگوں کے لئے مصیبت بن گئے ہیں ۔ خرگوش
کھیتوں اور فصلوں کو اتنا نقصان پہنچانے لگے تھے کہ حکومت کو
انھیں ختم کرنے کے انتظامات کرنا پڑے ۔ بلی اور نیولے
بھی دیہات کے کسانوں کے لئے پریشانی کا باعث بن گئے تھے
اور نیوزی لینڈ کے مشہور بغیر بازوؤں والے پرندے "KiWi"
اور دوسرے پرندوں کو چٹ کرنے لگے تھے یہاں تک کہ حکومت
کو ان پرندوں کی حفاظت کا انتظام کرنا پڑا ۔ آج نیوزی لینڈ
میں بے شمار خوش گلو پرندے پائے جاتے ہیں ۔ دریائی پرندوں
کی بھی بہتات ہے ۔

رخسانہ ابراہیم موڈک

جانور

اور اُن کی تیمارداری

انگریزی مثل ہے کہ آپ گھوڑے کو پانی کے پاس لے جا سکتے ہیں۔ لیکن زبردستی پانی پلا نہیں سکتے۔ یہی بات دوسرے جانوروں کے ڈاکٹروں کو بخوبی ہے۔ جانوروں کے ڈاکٹروں کو عجائب گھر کے جانوروں کا علاج کرتے وقت کبھی کبھی بڑی عجیب اور دلچسپ صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایسے ہی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جانوروں کے مرض کی تشخیص اور دواؤں کی تجویز کوئی مشکل کام نہیں۔ سب سے بڑی مصیبت جانوروں کو دوائیں کھلانا ہے ڈاکٹروں کو دوائیں کھلانے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں کرنا پڑتی ہیں۔ جن میں کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناکامی۔ کیونکہ بعض جانور ضرورت سے زیادہ چالاک ہوتے ہیں اور ترکیب فوراً سمجھ جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک ہاتھی بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے ایک کڑوا پوڈر دوا کے طور پر دینا چاہا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ پوڈر ہاتھی کو کھلایا کس طرح جائے۔ ڈاکٹروں نے ایک ترکیب سوچی۔ اس ہاتھی کو آلو بہت پسند تھے۔ ایک بڑا سا آلو لے کر اس کے دو ٹکڑے کئے گئے اور ایک ٹکڑے کے اندر کا گودا کھرچ کر نکال دیا گیا اور اس کے بجائے وہی پوڈر بھر کر دوبارہ آلو کے دونوں ٹکڑوں کو جوڑ دیا گیا۔ پھر اس آلو کو دو دوسرے سادے آلوؤں کے ساتھ ملا کر ٹرے میں رکھ کر ہاتھی کے آگے رکھ دیا گیا۔ ہاتھی نے چند سادے آلو کھانے کے بعد پوڈر بھرا ہوا آلو اٹھایا اور ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر گیا۔ ڈاکٹروں کی ترکیب کامیاب ہوگئی۔ لیکن ہاتھی نے پوڈر والا آلو کھانے کے بعد سوچا ضرور ہوگا کہ اس میں کچھ گڑبڑ ضرور تھی کیونکہ اس آلو کے بعد اس نے دوسرے آلو کو منہ نہیں لگایا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہاتھی کبھی کبھار ہی بیمار ہوتے ہیں اور جب کبھی بیمار ہوتے ہیں انھیں دوائیں مزیدار ہی دی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک جانور کو پیٹ کے درد کے لئے میٹھی دوا دی گئی تھی۔ وہ دوا اسے اتنی اچھی لگی کہ اچھا ہونے کے بعد بھی کئی روز تک درد کا بہانا بنا کر میٹھی میٹھی دوا مزے سے کھاتا رہا۔ ڈاکٹروں کو بعد میں اس کی چالاکی کا پتہ چل گیا۔

جانوروں کی تمام دوائیں میٹھی اور مزےدار نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی کڑوی دوا دینی ہوتی ہے تو اسے شکر میں ملا کر کھلایا جاتا ہے۔ کچھ جانور مٹھاس کے اتنے شوقین ہوتے ہیں کہ وہ دوا کے کڑوے یا کسیلے ہونے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

ایک دفعہ زرّاف بیمار پڑا تو اسے بڑی بدمزہ دوا شکر میں ملا کر دن میں تین تین بار دی گئی لیکن زراف کڑواہٹ کے باوجود شکر کے ساتھ بڑے مزے سے دوا کھاتا رہا۔

چند سال ہوئے ایک عجائب گھر میں ایک چیونٹی خور (ANT-EATER) کو کیسٹر آئل پلانا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے کس طرح پلایا جائے۔ بڑی سوچ کے بعد ڈاکٹروں کی سمجھ میں ایک طریقہ آ ہی گیا۔ کیا یہ گیا کہ چیونٹی خور کے سر پر کیسٹر آئل چھڑ دیا گیا جسے اس جانور نے اپنی لمبی تاگے جیسی زبان سے چاٹنا شروع کر دیا۔ اس طرح اسے تیل پلا یا گیا۔

ایک مرتبہ ایک پرندہ جس کا نام اسپون بل (Spoon Bill)

ہے۔ اچانک بیمار ہو گیا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں دوا کے طور پر اسے کیسٹر آئیل دیا تھا۔ لیکن عام طور پر آدمیوں کی طرح پرندے بھی کیسٹر آئل ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ کیسٹر آئیل غذا کے ساتھ ملا کر دیا جائے اس پرندے کی مرغوب غذا مچھلی ہے اس لئے صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ مچھلی کے پیٹ میں تیل بھر کر دیا جائے یہ کام بڑا دشوار تھا لیکن کسی نہ کسی طرح سے انجام دیا گیا اور تیل بھر کر مچھلی پرندے کی طرف اچھالی گئی۔ پرندہ جھٹ مچھلی نگل گیا۔ اس طرح اسے دوا کھلائی گئی۔ اور ایک دو روز ہی میں پرندہ صحت یاب ہو گیا۔

ابو المنصور

پکوان جو پہلوان بنے

ریڈیو پر "ناری جگت" کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ ایک خاتون ہنڈیا جلنے کی بو سونگھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور باورچی خانہ جاتے ہوئے شوہر سے کہنے لگی: "یہ بیٹھے کاغذ اور قلم، ابھی کھانے پکانے کی ترکیبیں نشر ہوں گی، ذرا نوٹ کر لینا۔" شوہر نامدار کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے۔ جونہی ترکیبیں نشر ہونا شروع ہوئیں ریڈیو پر دو اسٹیشن آپس میں ٹکرائے۔ دونوں اسٹیشنوں سے آوازیں آنے لگیں۔ ایک اسٹیشن سے جسمانی ورزش کے طریقے نشر کئے جا رہے تھے تو دوسری طرف کھانے پکانے کی ترکیبیں سنائی جا رہی تھیں۔ مگر شوہر صاحب کو اتنا ہوش کہاں، وہ تو بیگم صاحبہ کے حکم پر ہمہ تن گوش بنے ریڈیو سن رہے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انھوں نے نوٹ کیا وہ اس طرح ہے:۔

ایک پیالی بھر میدہ لے کر اپنے کاندھوں تک اٹھا۔ گھٹنوں کو خم دے کر ایڑیوں پر زور ڈالئے اور پھر انھیں دودھ کی پیالی میں خوب ملائیے۔ چھ دفعہ اس عمل کو دہرائیے۔ آدھ چمچہ خمیر کے ساتھ سالم کی طرف کھینچئے۔ ٹانگیں پھیلا کر دو انڈوں کی زردی پھینٹیے، اسی کے آرام سے سانس لیں اور پیالیوں میں ڈال دیں۔ اب سیدھے کھڑے ہو اور اس کے بعد فرش پر لیٹ کر انڈے کی سفیدی اچھی طرح پھینٹ ڈال دیں پھر دس منٹ تک آگ پر رکھ کر خوب مالش کریں۔ بیس سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے ملائی کے ساتھ کھائیں۔

★ ★ ★

ثانی انعامی مقابلہ نمبر ۹

حل موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء شام کے پانچ بجے تک

(۱) قرآن مجید میں کل مدنی آیات ـــــ ہیں۔ (۶۲۱۴ - ۶۳۱۴ - ۶۱۱۴)
(۲) اسلام کے بنیادی ارکان ـــــ ہیں۔ (پانچ - چار - چھ)
(۳) قلوپطرہ ـــــ قبل مسیح میں مصر میں پیدا ہوئی (۲۱۳ - ۲۱۲ - ۲۲۱)
(۴) نپولین بوناپارٹ شاہِ فرانس کا انتقال ـــــ ء میں ہوا۔ (۱۸۲۲ء، ۱۸۲۳ء، ۱۸۲۱ء)
(۵) ایکس رے ـــــ نامی ایک جرمن کی ایجاد ہے۔ (جونسن۔ رونجن۔ بنجامن)
(۶) موازنۂ انیس و دبیر کے مصنف مولانا ـــــ ہیں۔ (حالی، شبلی۔ ذکاء اللہ)
(۷) آیات و نغمات ـــــ کا مجموعۂ کلام ہے۔ (جوش ملیح آبادی، اثر لکھنوی۔ فیض احمد فیض)
(۸) ہماری زمین سورج سے ـــــ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (......۹۳ - ......۹۲ - ......۹۴)
(۹) زمین کی سطح کا ـــــ فی صد حصہ پانی سے گھرا ہوا ہے۔ (۷۲ - ۷۳ - ۷۱)
(۱۰) چھوٹے بچے ایک منٹ میں اوسطاً ـــــ مرتبہ تک سانس لیتے ہیں۔ (۳۲ - ۳۱ - ۳۰)

اپنے حل اس پتے پر بھیجئے۔ ثانی مقابلہ نمبر ۹، ماہنامہ نقش کوکن، ۴۴ جیل روڈ ویسٹ، ڈونگری، بمبئی نمبر ۹

ثانی مقابلہ کی شرائط:۔ (۱) اس مقابلہ میں حصہ لینے کی کوئی فیس نہیں ہے (۲) ایک شخص کئی حل بھیج سکتا ہے لیکن ہر حل کیساتھ انعامی مقابلہ کا ٹوکن آنا ضروری ہے (۳) آپ کے حل ہمارے دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کی شام کے ۵ بجے تک پہنچ جانے چاہئیں۔ اس کے بعد موصول ہونیوالے حل مقابلے میں شامل نہیں کئے جائیں گے (۴) حل بھیجنے والے کو دس روپے کی کتابیں بھیجی جائیں گی۔ اگر صحیح حل ایک سے زائد ہوئے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائیگا اور اگر صحیح حل دس سے زائد ہوئے تو انعام دس خوش نصیبوں کو قرعہ اندازی کے ذریعہ دیا جائیگا (۵) اگر کوئی بھی صحیح حل موصول نہ ہوا تو انعام ایک غلطی والے حل پر دیا جائیگا۔ (۶) ایسے صحیح حل بھیجنے والوں کو جنھیں قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام پانے میں ناکامی ہوئی ہے۔ ادارہ نقش کوکن کی جانب سے ایک اعزازی سرٹیفکیٹ بھیجا جائیگا۔ اگر کوئی شخص ایسے پانچ سرٹیفکیٹ پیش کرے تو اس کو ادارہ کی جانب سے ایک خصوصی انعام دیا جائے گا (۷) انعامات بذریعہ پوسٹ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیج دیئے جائیں گے (۸) صحیح حل بھیجنے والے تمام امیدواروں کے نام خواہ انھیں انعام ملا ہو یا سرٹیفکیٹ نقش کوکن میں شائع کئے جائیں گے (۹) صحیح حل صرف اُسے مانا جائیگا جو ادارہ نقش کوکن کے دفتر میں محفوظ حل سے مطابقت رکھتا ہوگا۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی خط و کتابت نہیں کی جائیگی اور ادارہ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا (۱۰) اس مقابلے میں ادارہ کے ارکان حصہ نہیں لے سکتے (۱۱) اس مقابلے میں ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے خواہ وہ ادارہ نقش کوکن کا خریدار ہو یا نہ ہو (۱۲) انعامی مقابلے کا ٹوکن رسالے کے ساتھ میں منسلک ہے۔

ثانی انعامی مقابلے میں حصہ لیکر دلچسپ کتابیں اور خوبصورت سرٹیفکیٹ حاصل کیجئے۔

کیا آپ عازم سفر ہیں ؟
خان صاحب اینڈ سنز
بیرونی ممالک بالخصوص افریقہ لائن پرشین گلف کے پاسپورٹ کا انتظام،
ہر قسم کی سفری معلومات نیز ہوائی جہاز اور بحری سفر کی تمام سہولتیں اور ٹکٹوں کی
بکنگ کا بہترین انتظام اور بمبئی کے دوران قیام میں رہائش کا معقول انتظام ہے
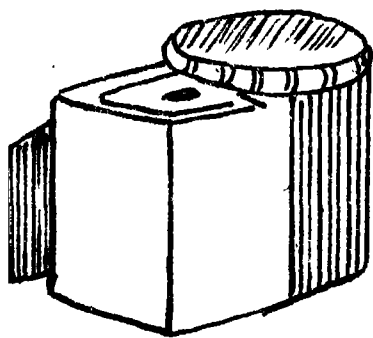
ٹن فیکٹری

تبصرے

تبصرہ کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔

شریف زادہ

مصنف:۔ مرزا محمد ہادی رسوا

قیمت:۔ ۲/۵۰ — لائبریری ایڈیشن ۔/۳

صفحات:۔ ۲۰۰

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ پرنس بلڈنگ۔
جے جے اسپتال۔ بمبئی ۳

مرزا رسوا اپنی جس ناول کے سہارے زندہ ہیں وہ ان کی شہرہ آفاق تصنیف "امراؤ جان ادا" ہے۔ "شریف زادہ" مرزا رسوا کے سہارے زندہ ہے۔ شریف زادہ کا سالِ تصنیف ۱۹۰۰ء ہے۔ اس لحاظ سے یہ اس دور کا ناول ہے جب اردو زبان میں ناول نگاری اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مرزا رسوا میں گردشِ روزگار نے بہت سی خصوصیات جمع کر دی تھیں۔ ان میں حاصل کرنے کا مادہ بھی بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ وہ کبھی ایک جگہ جم کر نہیں رہے۔ ان کی طبیعت ایک مقام کی خوگر نہیں تھی۔

شریف زادہ نذیر احمد کے ناولوں کی طرح ایک حد تک اصلاحی ہے۔ اس کے پلاٹ کے بارے میں مختلف رائیں ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس میں پلاٹ سرے سے ہے ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ غیر دلچسپ اور میکانکی ہے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ حقیقت واقعہ ہے کہ ان کا یہ ناول "امراؤ جان ادا" کے پایہ کا نہیں۔ تاہم ادب میں اس کا ایک درجہ ضرور ہے۔ اردو ناول کے ارتقا اور اس کی تکنیک "شریف زادہ" کے ذکر کے بغیر نامکمل سی محسوس ہوتی ہے۔ اسے پڑھے بغیر ہم بہت اچھے اور ناقص ناولوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ ریاست جموں و کشمیر کے اشتراک سے فوٹو آفسیٹ پر چھپے ہوئے اس ناول کی قیمت بھی بہت کم ہے۔ اردو اور اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والوں کے لئے یہ ایک نعمت سے کم نہیں۔ جبکہ اسکے پرانے ایڈیشن بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔

انتخاب میر

قیمت:۔ ۳/۶۰ لائبریری ایڈیشن:۔ ۴/۵۰

صفحات:۔ ۲۸۷

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ پرنس بلڈنگ۔
جے جے اسپتال۔ بمبئی ۳

خدائے سخن میر تقی میر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ سوز و گداز اور حرمان و یاس کے اس عظیم شاعر نے جن کا نام آج بھی اردو شعرا میں سرفہرست رکھا جاتا ہے، جو کلام چھوڑا ہے اس میں رطب و یابس کی کمی نہیں۔ میر کے کلام کا اچھا انتخاب کوئی معمولی بات نہیں۔ اس انتخاب سے پہلے بھی چند اچھے خاصے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ اس انتخاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اچھا انتخاب ہونے کے باوجود نہایت سستا ہے۔

سوز و گداز میر کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ اس انتخاب میں بیشتر ایسے اشعار ہیں جو براہ راست دل پر اثر کرتے ہیں۔ اور روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ تاہم کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو میر کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوئے۔ اس سے انتخاب کرنے والوں کا یہ مقصد بھی ہے میر کی شاعری کا ہر پہلو پڑھنے والوں کے سامنے آجائے۔

کتاب کے آخر میں میر کی دو مشہور مثنویاں بھی شامل کر دی گئی ہیں تاکہ میر کی وہ صلاحیتیں بھی سامنے آجائیں جو انھیں ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے قدرت نے ودیعت کی تھیں۔

مختصر یہ کہ یہ انتخاب معیاری اور خوبصورت چھپا ہوا ہے۔ شاعری کے دلدادہ اس سے محظوظ نہ ہوں تو یہ ان کی بدقسمتی ہے۔

کینسر وارڈ

مصنف:۔ الیکزنڈر سولزنسٹین
مترجم:۔ گوپال متل
صفحات:۔ ۴۵۸ —— قیمت:۔ ۱۳ روپے
ناشرین:۔ نیشنل اکاڈمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج دہلی نمبر ۶
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی ۳

کینسر وارڈ ایک جدید روسی ناول ہے۔ اس میں پوری کہانی کینسر کے ایک مریض کے گرد گھومتی ہے۔ کینسر جیسا موذی مرض جس کے نام ہی سے لوگ لرز جاتے ہیں، اس ناول کا مرکزی نقطہ ہے۔ پوری کہانی کینسر سے منسلک ہے حسرت و یاس کا امید سے کتنا گہرا تعلق ہے وہ پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ الیکزنڈر سولزنسٹین کے اس ناول میں روس کی معاصر زندگی کی دھڑکنیں بہت قریب سے سنائی دیتی ہیں۔

ناول نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت کردار نگاری ہے۔ اس کے کردار زندگی کے چلتے پھرتے جیتے جاگتے کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ روس کی داستان نہیں ہندوستان کی کہانی ہے صرف نام بدلے ہوئے ہیں۔ پیول نکولائے واچ کا کردار الکزنڈر سولزنسٹین کا لافانی کردار ہے ___ اس ناول کا شمار دنیا کے اعلیٰ درجہ کے

اطلاعات و معلومات

۱۶ میونسپل اساتذہ کو میئر کی طرف سے انعامات

بمبئی عظمیٰ کی میونسپل کارپوریشن کی تاریخ میں پہلی بار میونسپل پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کے ۱۶ اساتذہ کو بطور انعام نقد ۵۰۰،۵۰۰ روپے کا انعام دیا گیا۔ تقسیم انعامات کی یہ رسم بمبئی کے میئر ڈاکٹر شانتی پٹیل نے ادا کی تھی۔

انعام یافتہ ۱۶ اساتذہ کا (جن میں مراٹھی کے ۶ گجراتی کے ۲ اردو کے ۲ ہندی ۲ جنوبی ہند، انگریزی اور سندھی کے ۲ اور سکنڈری کے لئے ۲۔ انتخاب ۱۶ ہزار میونسپل اساتذہ میں سے کیا گیا تھا جو بمبئی کے ۱۰۴۰ پرائمری اور ۲۷ سکنڈری اسکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ ان اساتذہ کا انتخاب کمشنر کی طرف سے مقررہ کردہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی نے کیا تھا۔

میئر کی طرف سے ہر سال بہترین ٹیچر کو انعام دینے کا یہ جو نیا طریقہ رائج کیا گیا ہے اس کا مقصد اساتذہ کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ تاکہ بچوں کی تعلیم کے معیار میں اضافہ ہو۔ اور اساتذہ اپنے طلبہ کی تعلیمی، سماجی اور جسمانی بہتری کی طرف توجہ دے سکیں۔ انعام یافتہ اساتذہ میں اردو سائڈ کی طرف سے اما مباڑہ اردو اسکول ۱ کی صدر معلمہ مسز شمس النساء بیگم محمد علی اور ساؤتھ اسٹریٹ اردو اسکول کے صدر مدرس جمال الدین شرف الدین شامل ہیں۔

طبیہ کالج اسپتال کے ٹرسٹی صاحبان اور انجمن

خیر الاسلام کے عہدہ داران کا ایک مشترکہ جلسہ ہسپتال کی عمارت میں منعقد ہوا تاکہ طبیہ کالج اور اسپتال کو انجمن خیر الاسلام کے انتظام میں دے دیا جائے۔ ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا پرنسپل طبیہ کالج، حکیم محمد مختار اصلاحی صاحب وغیرہ نے تقریریں فرمائیں جس میں انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے کالج اور اسپتال کو ا

یقین کے ساتھ انجمن خیرالاسلام کے حوالے کر رہے ہیں کہ اب یہ ادارہ ترقی کرے گا۔

بارا پاڑا ہائی اسکول

بارا پاڑا (پنویل کے قریب) ثانوی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے غریب طلبہ عدم استطاعت کی بنا پر تعلیم کی نعمت سے محروم رہتے تھے۔ گذشتہ سال "پنویل ایجوکیشن سوسائٹی" کی جدوجہد سے ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اور آٹھویں جماعت سے تعلیم کا آغاز ہو کر بالعموم مضافات اور بالخصوص بارا پاڑا اور آپٹہ کے بچوں کو اس سے مستفیض ہونے کا بہترین موقع میسر آیا ہے۔ امسال محکمہ تعلیم کی جانب سے نویں کلاس جاری کرنے کی اجازت مل گئی ہے اس طرح سال بہ سال کلاسوں کے بتدریج اضافہ کے پیش نظر سر دست دو تین کمروں کی اشد ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے یہاں تعمیری کمیٹی کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔ مخیر اور دردمند حضرات امدادی رقومات" صدر تعمیری کمیٹی ہائی اسکول بارا پاڑا تعلقہ پنویل ضلع قلابہ کے پتہ پر ارسال فرما کر شکرگزاری کا موقع عنایت فرمائیں۔" (اقبال مرو ڈکر ہیڈ ماسٹر اینگلو اردو ہائی اسکول بارا پاڑا)

لجت پاپڑ کی مقبولیت

مہیلا گرہ اودیوگ امداد باہمی کے اصولوں پر کام کرتے ہوئے جس طرح ترقی کے منازل طے کر رہا ہے اس کی مثال کاروباری حلقوں میں کم ملتی ہے۔ اس مرکز کی طرف سے تیار کردہ لجت پاپڑ نہ صرف ہندوستان بلکہ برطانیہ، امریکہ روس جاپان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں بھی بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ مہیلا گرہ اودیوگ کے سربراہ ڈاکٹر پوپٹ اور مسٹر دلال نے ایک اخباری ملاقات میں بتایا کہ گزشتہ سال برطانیہ میں ۸ لاکھ روپے کی لاگت کے لجت پاپڑ برآمد کیے گئے۔ امریکہ میں بھی اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور اس سال لاکھ روپے کے پاپڑ جانے کا امکان ہے۔ برآمدی اضافہ سب سے بڑی رکاوٹ اُرد کی دال کے بڑھے ہوئے دام ہیں۔ کے علاوہ پاپڑ بنانے کے کام میں آنے والے دوسرے مسالے بھی مہنگے ہو رہے ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں حکومت کی طرف کوئی مدد ملے تو پاپڑ کی برآمد سالانہ ایک کروڑ روپے تک پہنچ سکتی ہے۔

ڈاکٹر پوپٹ نے کہا کھادی اودیوگ کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے لجت پاپڑ انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

بمبئی شہر کی آبادی ۵۹ لاکھ ہو گئی

شہر بمبئی کی آبادی موجودہ مردم شماری کے مطابق ۵۹۳۱۹۸۹ ہے۔ مہاراشٹر میں کسی بھی مقام کی آبادی میں اس تیزی سے آبادی میں اضافہ نہیں ہوا۔ گزشتہ دس سال میں ۴۲،۸۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

مردم شماری کے ڈائرکٹر شری آر بی چاری نے مردم شماری کے عارضی اعداد و شمار کا اعلان کیا۔ پورے مہاراشٹر کی مجموعی آبادی ۵۰۲۹۵۰۸۱ افراد ہے جن میں ۲۶۰۲ ۲۶۰۲ ۴۱۴۶ اور ۲۴۲۷۰۹۳۵ عورتیں ہیں۔ گذشتہ دہائی میں ۲۷،۱۶ فیصد اضافہ آبادی ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں آبادی کا اوسط فی کیلو میٹر ۹ تھا جبکہ ۱۹۷۱ء میں ۱۶۳ ہو گیا ہے۔

ترقی کی اسکیم جاری

حکومت مہاراشٹر نے امداد باہمی زراعتی پروسیسنگ سوسائٹی کی تنظیم سے متعلق اسکیم یکم اپریل ۱۹۷۱ء سے ایک سال کی

کے لئے جاری رکھی ہے۔ یہ اسکیم دھان، کپاس، تلہن، دال
پھل اور سبزی ترکاری سے متعلق کام اور کولڈ اسٹوریج کے
قیام تک محدود ہے۔

ایسے زراعتی پروسیسنگ یونٹ اور کولڈ اسٹوریج جن
کا قیام ۱۹۷۱ء کے دوران عمل میں آئے گا یا موجودہ یونٹ
جو اپنی پروسیسنگ یا اسٹوریج کی صلاحیت بڑھائیں گے۔ برابر
بنیاد پر اصل لاگت کے بیس فیصدی حصّہ کی حد تک سرکاری حصّہ
سرمایہ کے مستحق ہوں گے۔

سومیشور میں "گناہ کی قیمت"

انجمن فروغ اردو مدرسہ سومیشور (رتناگیری) کی مالی
اعانت کے پیشِ نظر ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء کی شب کے ۱۰ بجے
"ذاکر ڈرامیٹک کلب سومیشور" کے فنکاروں نے حکیم احمد
شجاع کا تحریر کردہ تین ایکٹ کا دلچسپ اردو ڈرامہ
"گناہ کی قیمت" پیش کیا جسے دیکھنے کے لئے مضافات تیز
کرلا، راجیوڈا، مرکر واڑہ، پاونس، بھاٹیہ، نوسال وغیرہ
قصبات سے تقریباً ۱۵۰۰ افراد حاضر تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ
ڈرامہ نہایت موثر اور کامیاب طریقے پر پیش کیا گیا خصوصاً
ڈرامہ کے دوران رکھے گئے برمحل پلے بیک فلمی گانوں نے
حاضرین کے دلوں کو مسحور کر دیا۔

شالہ سدھار اسکیم کے تحت مذکورہ بالا ڈرامہ کے
ذریعے تقریباً ۱۵۰۰ روپے جمع کئے گئے جس کا سہرا ذاکر
ڈرامیٹک کلب کے اداکاروں اور مدرسین اسٹاف کے سر ہے
انجمن ہٰذا کے عہدیداران ان تمام کے شکر گزار ہیں۔ (نامہ نگار)

وہ مرکر بھی امر ہو گئے

۱۴ اپریل ۱۹۴۴ء ایمونیشن سے لدے ہوئے ایک
جہاز میں آگ لگنے سے بمبئی کی گودی میں جو ہلاکت خیز دھماکہ
ہوا تھا اس میں آگ بجھانے والے عملے کے ۶۶ افراد ہلاک
ہوئے تھے۔ مرحومین کی جانبازی اور قربانی کو یاد کرکے ہر
سال ۱۴ اپریل کو فائر سروس ڈے منایا جاتا ہے مگر
امسال بمبئی پورٹ ٹرسٹ کے مقبول و معروف جنرل منیجر شری
گووند سیٹھ صاحب نے اسے ایک یادگاری حیثیت عطا
فرمائی ہے۔ وکٹوریہ ڈاک کے نمبر ۲ شیڈ کے سامنے والی
کھلی جگہ میں ۹ میٹر بلند ایک یادگار مینار تعمیر کیا گیا جو سادگی
اور پُرکاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مینار کے ساتھ ہی سنگ
مرمر کے تختیوں پر مرحومین کے نام کندہ ہیں۔ مہاراشٹر کے
وزیر اعلیٰ شری وسنت راؤ نائیک نے اس یادگار
تقریب کا افتتاح فرمایا اور انہی کے ہاتھوں ۲۵ سال کی
ملازمت مکمل کرنے والے ۸ افسران کو میڈل بھی دیے گئے۔

آئیڈیل گرلز ہائی اسکول کی پہلی بیچ

آئیڈیل ایجوکیشن سوسائٹی کے اراکین مبارکباد کے مستحق
ہیں کہ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم کا پہلا
اردو میڈیم گرلز ہائی اسکول رتناگیری میں قائم کیا جو مختصر سے
وقت ترقی کے منازل طے کرتا ہے۔ اس وقت اس
"آئیڈیل گرلز ہائی اسکول" میں ۱۲۵ طالبات زیرِ تعلیم
ہیں اور پروفیسر آڈتے صاحب کی رفیقۂ حیات بیگم حمیدہ
آڈتے جیسی قابل معلمہ اس ادارہ کی پرنسپل ہیں۔ امسال اس ہائی
اسکول سے پہلی بیچ ایس ایس سی امتحان میں شریک ہوتی ہے
اور یہ کامیابی کارکنان کے لئے یقیناً باعثِ مسرت ہوگی۔ نامساعد
حالات اور اداریل کی دشواریوں کے باوجود آئیڈیل برقی کارکنان
کے عزم و ہمت کا پتہ دیتی ہے اسی طرح تعلیم نسواں کے باب میں
یہ ہائی اسکول ایک مینارۂ نور اور تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں

کے لئے روشن مثال ہے اور اس اعتبار سے عالیجناب اسمٰعیل حکیم صاحب اور ان کے رفقاء کار قابلِ صد ستائش ہیں۔

انجمن اسلام کے زیر اہتمام سالانہ جشن قوالی

بمبئی کے مشہور تعلیمی ادارہ انجمن اسلام کے زیر اہتمام ۱۰ اپریل کی شب میں صابو صدیق پالی ٹیکنک گراونڈ میں قوالی کا ایک شاندار پروگرام منعقد ہوا جس میں ہزارہا مہمانوں کی موجودگی میں مالیر کوٹلہ (پنجاب) کے رحمت قوال اور ان کی پارٹی نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

انجمن اسلام جو ایک ترقی پذیر ادارہ ہے ہر سال اپنے مختلف اسکولوں اور کالج کے فروغ کے لئے قوالی کا یہ پروگرام منعقد کرتا ہے۔ امسال یہ قوالی انجمن کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس کی زیر تعمیر عمارت کیلئے فنڈ کی فراہمی کی غرض سے تھی۔ مولانا شوکت علی روڈ پر واقع اس کالج کی مقبولیت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ طلبہ و طالبات کو تجارتی تعلیم فراہم کرنے کے لئے اس کالج کی توسیع دینا ناگزیر ہو گیا ہے۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انجمن اسلام کے صدر جناب بیرسٹر اکبر پیر بھائی نے کہا کہ اس پروگرام میں رسمی طور پر کسی بڑی شخصیت کو مہمان خصوصی نہیں بنایا گیا اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ سب سامعین جو اس نیک مقصد میں ہاتھ بٹانے کے لئے آج یہاں تشریف لائے ہیں ہمارے خصوصی مہمان ہیں۔ آپ نے اعلان کیا کہ ٹکٹوں کی فروخت سوونیر کے اشتہارات اور دیگر عطیات کے ذریعے امسال انجمن اسلام کو ۱½ لاکھ روپیہ جمع کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سلسلے میں انھوں نے انجمن کے انتظامیہ انٹرٹینمنٹ کمیٹی کے اراکین اور مشتہرین اور عوام کا شکریہ ادا کیا۔

انجمن کامرس کالج کے پروفیسر ابراہیم دنگانے مسٹر اکبر پیر بھائی کی انگریزی تقریر کا اردو ترجمہ سنایا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ قبل ازیں انٹرٹینمنٹ کمیٹی کے چیرمین مسٹر عزیز احمد بھائی نے اردو مضمون نگاری کے تحریری مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلبہ وطالبات کو انعامات تقسیم کئے۔ اردو مضمون نگاری کا یہ مقابلہ ہر سال منعقد کیا جاتا ہے۔ امسال پہلے انعام کے معیار پر کوئی مضمون نہیں اترا اور دوسرے انعام کا مستحق دو طلبہ کو قرار دیا گیا چنانچہ مہاراشٹر کالج کے طالب علم نصیب خاں صاحب کو ڈھائی سو روپے اور سینٹ زیویرس کالج کی طالبہ مس رقیہ محی الدین نردیل کو ڈھائی سو روپے نقد انعام ملا۔ قوالی کے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں انجمن کالج کے اسٹاف وطلبہ انٹرٹینمنٹ کمیٹی کے ممبران مسٹر ایس ایس دسنوی پرنسپل ایس اے باری اور مسٹر بادشاہ نے نمایاں جدوجہد کی۔

گولکوٹ ویلفیر سوسائٹی (رجسٹرڈ) کا سالانہ جلسۂ عام

گولکوٹ ویلفیر سوسائٹی کا جلسۂ عام ۲۷ مارچ ۸۱ء شب میں ۹ بجے جناب عباس ہلدے صاحب کے دولت خانہ پر جناب ابراہیم چوگلے صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی ابتدا جناب عبدالرحمٰن خطیب صاحب کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوئی۔ بعد سوسائٹی کے اراکین جناب عیسیٰ چوگلے ان کے بھائی ابراہیم چوگلے، جناب عبداللہ گھارے اور جناب عبدالرحمٰن تُروے ان چاروں حضرات کی ناگہانی اموات پر دو منٹ کے لئے خموشی اختیار کر کے دعائے مغفرت کی گئی۔

اس کے بعد سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب عمر مقادم صاحب نے گزشتہ جلسۂ عام کی روداد اور سالانہ رپورٹ پیش کی۔

ازاں بعد صدر جلسہ اور سوسائٹی کے روح رواں محترم جناب

ہیم عبدالغفور چوگلے صاحب نے اپنا صدارتی خطبہ
ھا جس میں جس میں آپ نے ایک قلیل عرصہ میں سوسائٹی
ے ترقی کے جو مدارج طے کئے ان کا ذکر کیا۔ صدارتی خطبہ
بعد سوسائٹی کے نائب صدر جناب علی میاں میر (ایم اے)
ے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اخیر میں مندرجۂ ذیل عہدیدارا
ر ممبران مینیجنگ کمیٹی بمبئی کا انتخاب سال رواں کے لئے
مل میں آیا۔

صدر، جناب ابراہیم چوگلے، نائب صدر علی میاں میر۔ جنرل
سکریٹری عمر مقادم۔ جوائنٹ سکریٹری "یوسف ناخودا (۲)
غیاث الدین مقادم۔ خزانچی: عبداللہ قطب الدین چوگلے۔
ممبران: (۱) جناب اسمٰعیل خطیب (۲) حسن میاں خطیب
(۳) عبدالرحمٰن خطیب (۴) حسن میاں چوگلے۔ (۵) جناب
داؤد عمر گھڑے۔

بیرسٹر اقبال گابا مہاراشٹر کانگریس کے سکریٹری

بیرسٹر اقبال گابا صاحب کو مہاراشٹر کانگریس کمیٹی کا
جنرل سکریٹری نامزد کیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ وسنت راؤ نائیک
اور وسنت راؤ پاٹل کے مشورے سے یہ نامزدگی عمل میں آئی

اردو نامہ کو مدد:- ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے انجمن
ترقی اردو بمبئی کے پندرہ روزہ اخبار "اردو نامہ" کو سالانہ
چھ سو روپے کی مدد دلانے کا وعدہ فرمایا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ
"وشال غزل" کے انعقاد کے بعد انجمن کی جانب سے ہر
ماہ ادبی نشستیں ہوں گی۔ جن میں مشہور ادیبوں اور شاعروں
کو مدعو کر کے ان سے ان کے فن اور حالات زندگی سے
آگاہی حاصل کی جائے۔

انجمن ترقی اردو بمبئی کی جانب سے تہنیتی جلسہ:- انجمن ترقی

اِنتقالِ پُرملال

- تاجر عطر و تیل حافظ محمد زکریا کے بھائی کلکت
کے مشہور تاجر عطریات الحاج محمد عیسیٰ صاحب
یکم اپریل ۱۹۷۱ء کو انتقال کر گئے۔

- افغان ستو بنانے والے مسٹر ای ایف پاٹن
اور ایچ ای پاٹن والا کی والدہ مسز فاطمہ بائی پاٹن
کا ۲ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز بعمر ۸۰ سال مختصر سی علا
کے بعد انتقال ہو گیا۔

- سربراہ انقلاب جناب عبدالحمید انصاری۔
جواں سال فرزند شاہد انصاری کا ۲ اپریل ۱۹۷۱
کار کے ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ کاروباری
میں مرحوم اپنے والد بزرگوار کے دست راست تھے

- موضع مجگاؤں رتناگیری کے سابق سرپنچ
حسین داؤد مقدم کا یکم اپریل ۱۹۷۱ء کو انتقال
مرحوم اچھے سماجی کارکن تھے اور ہندو مسلم
میں یکساں مقبول و محترم تھے۔

- ملن سپاری کے مالک جناب شیر محمد سید
۴ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز بعمر ۴۳ سال انتقا
ہو گیا۔ مرحوم بڑے مخیر اور بڑی خوبیوں کے مالک

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؀

اردو بمبئی کی جانب سے ۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء کو شب میں
ہال، صابو صدیق میں ایک تہنیتی جلسہ ہوگا جس میں جناب
لدھیانوی اور سکندر علی وجد کو حکومت ہند سے پدم شری
ملنے پر انھیں مبارکباد پیش کی جائے گی۔

[...]SH-E-KOKAN (BOMBAY) MAY 1971 Regd. No. MH-723
Licensed to post without prepayment under Licence No. 203, Bombay

Printed at Ajmal Press, Bombay-3 and Published from 44, Jail Road (East), Bombay-9.
By Dr. A. M. Naik M.B.B.S for "Naqsh-e-Kokan" Publication Trust Bombay-9.
Title Cover Printed at Amin Art Printing Press, Bombay-9.

١١(١)

JAN. 1972

60 PAISE

آئینہ

خاندان کے ہر فرد کا رسالہ

ماہنامہ **نقش کوکن** بمبئی

مدیر اعلیٰ
عثمان حسین خان

ادارت اعزازی
معاون و مدیران: بشیر احمد خان
محمد عبدالحق

ٹیلیفون نمبر ۳۳۱۵۷۲

۴۴ جیل روڈ ایسٹ، ڈونگری بمبئی ۹

طابع و ناشر — ڈاکٹر عبدالکریم نائیک

مقام طباعت: اجمل پریس بمبئی ۳
ملکیت: نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ
رجسٹریشن نمبر 3006
تاریخ اشاعت: یکم جنوری سنہ ۱۹۷۲ء

جلد ۱۱ ——— شمارہ ۱
جنوری سنہ ۱۹۷۲ء

قیمت ۶۰ پیسے

• زر مبادلہ ہندوستان میں: چھ روپئے۔ بیرونی ممالک سے ۱۵-۱ شلنگ برٹش پوسٹل
• اشتہارات، ترسیل زر اور دیگر امور کے بارے میں خط و کتابت مینیجر ماہنامہ نقش کوکن ۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹ کے پتے پر کیجئے۔
• رکن انڈین لنگویجز نیوز پیپر ایسوسی ایشن بمبئی
• تمام متنازعہ امور میں حق سماعت عدالتہائے بمبئی کو ہے

۷۸۶

اداریہ

اپنی باتیں

اپنی بقا اور تحفظ کے لئے لڑنا جانوروں کا شیوہ ہے لیکن اعلیٰ اقدار اور عظیم مقاصد کے لئے برسر پیکار ہونا صرف انسا
ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سچائی اور خلوص کی جیت ہوئی ہے۔ ظلم و استبداد میں اب کسی قسم کا بھیس بدل
طاقت نہیں رہی اور وہ اپنی تمام مکاریوں اور فریبوں کے ساتھ دنیا کی آنکھوں میں عریاں ہو چکا ہے۔ ہماری جیت ہماری جیت
ہے بلکہ سچائی اور صداقت کی جیت ہے، خلوص اور بھائی چارہ کی جیت ہے۔ یہ جیت ان کمزور اور بے بس عوام کی جیت ہے جو اپنے
بھائیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ لیکن حق اور سچائی کا سہارا لے کر اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔ یہ جیت کوئی نئی جیت نہ
اور بقول فیضؔ ؏ نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسلام جو ساری دنیا کو اخوت، حلم اور محبت کا سبق سکھاتا ہے، جس نے دشمن سے بھی بھائیوں کا سا سلوک کیا
اسی مذہب کی آڑ بنا کر مظالم ڈھائے گئے۔ اپنے ہی بھائیوں کو "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کا درس بھلا کر موت کے گھاٹ ا
ہم نے جب حق کی آواز سے آواز ملا کر ساری دنیا کو بتلانا چاہا تو اپنی غلطیوں کو چھپانے اور ہماری آواز دبانے کے لئے ہم پر جھنجھلا ک
میں حملہ کر دیا گیا۔ لیکن حق کی آواز دبائی ہے نہ دبائی جا سکتی ہے۔ اسے جس قدر دبایا جائے اسی قدر زور ابھرتی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ جس ملک نے خود کو جمہوریت کا علمبردار اور مظلوم قوتوں کا حامی ظاہر کیا تھا وہ اب ظالموں کے
صف آرا ہو گیا۔ آج ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن کے اصول اور انسان دوستی ان کے اخلاف کے ہاتھوں دفن ہو چکا
اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے والے ملک کو نہیں معلوم کہ خلیج بنگال کی بیڑوں کو جنھیں غرور و مکاری نے طاقت بخشی ہے اپنی تہہ میں
دے سکتا ہے۔ ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا ان کے ماننے والوں نے اسے اپنے عمل سے باطل قرار دے

ہمارا ملک ہمیشہ سے سچائی اور اہنسا کا پجاری رہا ہے۔ ہم نے اپنے اصولوں کی بہت بڑی قیمتیں چکائی ہیں اور حال
میں بھی اس سے گریز نہیں کریں گے۔ ہمیں خدا پر بھروسہ ہے اور اپنی قوت ارادی پر یقین ہے۔ ہم ہر قربانی کے لئے تیار
اور اپنے اصولوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

★

شرف کمالی

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

"چو کفر از کعبہ برخیزد"

"دنیا گول ہے"

گیلیلو نے انکشاف کیا۔ نصاب کی کتابوں میں مع
وت لکھا گیا۔ ہم ٹھیرے کتابی کیڑے، جو کچھ چھپا ہوا نظر آیا
ستند سمجھ کر چاٹ لینا اپنی فطرت کا تقاضا ہے۔ اپنے طور پر
ور و فکر کی عادت ڈیڑھ سو سالہ غلامی کے بعد ہم میں کیونکر باقی رہتی؟
قین مانئے اپالو گیارہ کا ارض قمر مسخر کر کے زمین پر واپس لوٹنے
الا فاتح قمر آرم اسٹرانگ اگر یہ کہہ دیتا کہ دنیا کو میں نے چاند سے
چھی طرح دیکھا، یہ گول نہیں ہے، چوکون ہے، تو اس پر ریسرچ
رک شروع ہو جاتا اور نئی محققین تحقیق کے عجیب گل کھلاتے
ور ہمارے سامنے ایسے بیانات آتے: "دنیا کو انسانی دماغ کی
لط فہمی کی وجہ سے مدتوں گول سمجھا گیا لیکن جدید تحقیقات و مشاہدات
نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ دنیا جب عالم وجود میں آئی تو مستطیل نما تھی۔
ہزار برس ... سال بعد اس کی ہیئت گھٹتے گھٹتے مربع نما ہو گئی اور
قیاس ہے کہ اور کروڑوں سال بعد وہ مثلث نما ہو گی۔" پھر یہی
بیان ۲۰۰۱ء کی درسی کتابوں میں شائع ہوگا۔ کتابی کیڑے اس
بیان کو من و عن چاٹ لیں گے، اور دنیا کو گول کہنے والوں کو تعجب
نہیں، سزائے موت دی جائے گی!!

یہی کچھ مجنوں کے بارے میں ہے۔ کسی عقلمند نے
تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ واقعی اس نام کی کوئی شخصیت حقیقۃً
کبھی روئے زمین پر عشقِ لیلیٰ میں سوکھ کر کانٹے کی صورت بن گئی تھی
یا یہ محض ایک افسانہ ہے۔ ہمارے شعرائے کرام نے سینکڑوں اشعار
گھڑ ڈالے۔ کسی نے کہا ؎

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ارے بھئی سینکڑوں نہیں لاکھوں مجنوں کے باپ
بال بڑھائے عجیب سی صورت بنائے بمبئی میں ہر کوچے، ہر گلی میں
نظر آتے ہیں۔ کالجوں میں جائیے وہاں بھی موجود۔ یہ مجنوں آپ کو
[illegible] کپڑوں میں ملبوس نظر آئیں گے۔ بیچارے تنگ پتلون کی وجہ سے
آرام سے بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ کان سے اتر کر آدھی گال تک خط پہنچا
ہوا ہے، گیروے رنگ کی لنگی تن زیب ہے۔ لیکن ہم ٹھیرے مردہ
پرست، زندہ مجنوؤں کو نہیں مانتے۔ وہی فرضی مجنوں کے عشقِ صادق
پر [illegible] ہمارا ایمان — مجنوؤں کا قصہ چھوڑیئے۔ مجنوؤں کی طرح
لیلائیں بھی سڑکوں پر رواں دواں نظر آتی ہیں۔ موڈرن لیلیٰ کی پہچان
لنگی ہے۔ بالکل بمبئی لنگی مارٹ کی ملباری لنگی۔ کبھی کبھی یہ لیلیٰ خود

ہی کوچۂ مجنوں کا طواف کرتی ہے۔ یہاں تک کہ پالکٹ بھی مار سکتی
ہے اور مجنوں سے اسی وقت تک محبت کر سکتی ہے جب تک وہ
اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے قابل ہے۔ ورنہ پھر اللہ اللہ خیر سلا۔
تاریخ نویسی کا برٹش عہد میں یہی عالم ہوا۔۔۔ اپنی
Devide and rule پالیسی کو مدِ نظر رکھتے
ہوئے انھوں نے تاریخ لکھی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان
بادشاہ ہمیشہ ہندو رعایا پر ظلم ڈھاتے رہے، اور ہندو مہاراجے
مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچاتے رہے۔۔۔ اور کتابی کیڑوں نے جس طرح
دنیا گول ہے کے ثبوت چاٹ لئے، جیسے لیلیٰ مجنوں پر بلا سوچے
سمجھے ایمان لایا۔ بعینہٖ ان تاریخی کتابوں پر بھی وہ ایمان لے آئے
اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برٹش پالیسی کی وجہ سے ایک
ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی اور ڈیڑھ سو سالہ غلامی کی لعنت میں
گرفتار دماغ جو اس مکر و فریب کے پھانسے میں آئے آپس میں خوب
خوب لڑے۔ فرقہ پرستی کا عفریت بار بار مشتعل ہوتا رہا اور حصولِ
آزادی کے بعد جلیانوالہ باغ کو شرما دینے والے واقعات کبھی
جلگاؤں، کبھی بھیمڑی نیکر سامنے آتے رہے۔۔۔ دراصل ہماری
تاریخ اپنی جگہ خلوص و محبت کی آئینہ دار ہے۔ چھترپتی شیواجی
مہاراج کا لباس اور حلیہ ملاحظہ فرمائیے، اسلامی جھلک نظر آتی ہے۔
خود ان کے والد بزرگوار کا نام "شاہ جی" اور "شریف جی"۔۔۔ کون
انھیں ہندو نام کہہ سکے گا۔۔۔؟ چھترپتی کے باڈی گارڈ مسلمان
تھے۔ چھترپتی خود حضرت یعقوب شاہ سردری کے معتقد تھے۔
جن کے لئے سینکڑوں ایکڑ زمین انھوں نے وقف فرمائی۔
شہزادہ سلیم راجپوتوں کا بھانجا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی
مندروں کو عطیات دئے ہیں۔۔۔ یہ حقائق ہیں جن پر عمداً پردہ
ڈالا گیا۔ ہمایوں اور رانی کرناوتی کا راکھی بندھن کا واقعہ مشہور
ہے۔۔۔ یہ ہوئیں راجگان ہند کی حقیقتیں! ہر گاؤں کی ہندو
دیوی کے زیورات کے محافظ مسلمان رہے۔ گوول کوٹ کی مشہور

دیوی کر نجیشوری کے زیورات مسلم جیرگالے خاندان میں رہے اور
ہر سال مقررہ تاریخ پر اعزاز کے ساتھ لے جائے جاتے تھے
۔۔۔۔ اور وہ مسلمان عشیرتاً ہم سے زیادہ اچھے ثابت ہوئے
کوئی دھرم بھرشٹ نہیں ہوا۔ سینکڑوں ہندو امام حسین کے عاشق
بن کر محرم میں تعزیہ داری کرتے رہے۔ حضرت حاجی ملنگ کی درگاہ
کا مجاور کیتکر نامی برہمن خاندان برسوں سے ہے۔ میرج کے حضرت
میران شمنا اور خواجہ شمس الدین کے دربار میں پہلا صندل مو چیوں
کا آج بھی چڑھایا جاتا ہے۔ قومی یک جہتی سے بھرپور ہماری تاریخ
۔۔۔ لیکن یہ سارے حقیقی قصے بھلا کر فرضی قصے ان کی جگہ لائے
گئے اور کتابی کیڑوں کو چٹوائے گئے۔۔۔ تعجب اس بات پر ہے کہ انگریز
نے جو کچھ کیا ٹھیک بات ہے، ان کو ہمیں غلام بنا کر ہم پر حکومت
کرنی تھی۔۔۔ لیکن اب حصولِ آزادی کے بعد سرکاری منظور شدہ
تاریخوں میں جب فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے والا مواد نظر آتا ہے
تو حیرت ہوتی ہے کہ گورے خدا کی نقل کالے خداؤں کو کیوں
سوجھی ہے؟ ذرا فرصت میسر ہو تو ہمارے پرائمری مدارس میں
پڑھائی جانے والی درجۂ چہارم کی ایک تاریخ کی کتاب چھترپتی
شیواجی کا مطالعہ فرمائیے۔ اسی کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ مشتعل
ضرور ہوں گے۔ اگر آپ ہندو ہیں تو مسلمان پر آپ کو غصہ آئے گا
اور اگر مسلمان ہیں تو ہندوؤں پر آپ دانت پیسیں گے۔ شیواجی
جہاں تعریف کی تعریف کی گئی ہے حضرت افضل خان رحمۃ اللہ
کو "ذلیل و توہین والا مسلم سردار" کہہ کر عقیدت مندان افضل خان
کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔۔۔ یہ کتاب اسی متن کے ساتھ ہندوستان
کی مختلف زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہماری گورنمنٹ کا محکمہ
ایسی کتابوں کی طرف خصوصی توجہ دے اور خلوص و محبت، ہندو
اور مسلمان، دونوں کا، جس میں احترام ہو، ایسی زبان میں اگر
پیش کیا جائے تو افادیت بخش ہوگا۔ جماعت چہارم میں
زہریلا انجکشن ملنے کے بعد قومی یک جہتی کی بنیادیں کس

مضبوط ہوں گی؟ اب یہ غلط تاریخ نویسی کا ذمہ دار کون ہے؟ اب ہم برٹش کو الزام نہیں دے سکتے۔ یہی کہنا پڑے گا برٹش چلے گئے، اولاد چھوڑ گئے۔ ہماری موجودہ حکومت مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں ہر طرف سدھار پیدا کر رہی ہے۔ یہ سدھار اسی وقت ممکن ہے جب ہماری سمجھ میں یہ بات آ جائے کہ بگاڑ کہاں پیدا ہوا ہے! اللہ کرے ہمارا نیا نظام تعلیم ان سدھاروں کو ساتھ لے کر آئے اور ہمارے رہنماؤں سے ہمیں یہی امید ہے کہ وہ ان باتوں کو ادگھاٹن کی تقریبات سے زیادہ اہمیت دیں گے۔ ہمارے موجودہ نصاب تعلیم سے جو پروڈکٹ تیار ہو رہا ہے وہ حد درجہ مایوس کن ہے۔ محکمۂ تعلیم آمدنی کا محکمہ نہیں اس لئے یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہونا مناسب نہیں ہے۔ ایک تازہ مثال جو میرے سامنے ہے پیش خدمت ہے۔ ضلع کی کچہری میں میرا اپنا ایک کیس گذشتہ تین سال سے ہے۔ میں گذشتہ ماہ تفتیش کے لئے حاضر ہوا تو متعلقہ افسر صاحب نہایت اخلاق سے پیش آئے لیکن فرمانے لگے آپ کا معاملہ التوا میں پڑنے کے آپ ہی خود ذمہ دار ہیں۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کلرک کو سامنے کھڑا کر کے کہنے لگے: "یہ ایس ایس سی کامیاب حضرت آپ کے مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کی ٹیبل پر آپ کا فائل گذشتہ تین سال سے پڑا ہوا ہے، پر وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اسٹڈی کر کے کیس آگے بڑھائیں اور نتیجہ تک پہنچائیں۔" اب بات بڑھانا مناسب نہ تھی، میں نے کلرک صاحب ہی سے پُرخلوص درخواست کی کہ آپ ایمانداری اور دیانت سے کام کیجئے اور میرا معاملہ حل فرمائیے۔ لیکن بحیثیت سیکنڈری ٹیچر میں یقیناً موردِ الزام نہیں ہوں بلکہ آج کا نصاب تیار کرنے والے ماہرین موردِ الزام ہیں — لیکن کس کس کا ماتم کیجئے۔ بگاڑ اب ذمہ داروں کی سمجھ میں آ رہا ہوگا۔ سدھار کی امید یقیناً ہے۔

ہندوستان کی تعریف میں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے بہت کچھ کہا ہے لیکن علامہ اقبال نے جتنے جامع و مانع انداز میں اپنے تاثرات پیش کئے ہیں شاید ہی کوئی دوسرا اس معراج تک پہنچے۔ کتنے میٹھے اور رس بھرے الفاظ میں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس ترانہ کا ہر ہر شعر معنی خیز ہے اور واقعی ہندوستان ہے بھی صحیح معنوں میں ایک ایسا ملک جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ یہ بات اور ہے کہ فرقہ واریت کا عفریت جب مشتعل ہوتا ہے تو صدہا بندگانِ خدا جبر و تشدد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے کچھ رہنما اس قسم کے ہیں جنھیں دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ؎

نگہباں چور ہوں خود ہی تو ہو کیسے نگہبانی
چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

یہاں بھوک ہے، افلاس ہے، وحشت ہے، بربریت ہے۔ اگر ان تمام باتوں کو ہم سچ مان ہی لیں پھر بھی اس سے ہمارے ملک کی اچھائی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو شخصی خامیاں ہیں۔ ان کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ دور کے ڈھول سہانے۔ ہندوستان کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ ہمارا ملک اتنا اچھا نہیں ہے جتنا امریکہ ہے یا روس۔ درحقیقت یہ خیال غلط ہے۔ ہمیں دراصل یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اخلاقی طور پر ہم اتنے اچھے نہیں ہیں جس قدر امریکہ یا روس کے لوگ ہیں! انگلینڈ کے لوگوں کے اخلاق کا اندازہ اتنی ہی ایک بات پر کیا جا سکتا ہے کہ روزانہ اخبارات چوراہوں پر انبار کی صورت میں رکھے جاتے ہیں اور نقدی کے لئے پاس ہی ایک ڈبہ رکھا رہتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، اپنی کاپی اٹھاتے ہیں اور مناسب قیمت ڈبوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر بالفرض یہی تجربہ بھنڈی بازار یا جے جے اسپتال کے ناکے پر یا گرگام و دادر کے کسی چوک میں کیا جائے تو کیا کامیاب ثابت ہوگا؟ آپ اس بیوقوفی پر ہنسیں گے یعنی ایمانداری ہمارے یہاں بے وقوفی کے مترادف ہے۔ اگر بالفرض کسی نے یہ تجربہ کر کے دیکھ لیا تو نہ ہی وہاں اخبارات ہوں گے اور نہ ہی نقدی کا ڈبہ، دونوں ایسے غائب ہوں گے

جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔!!

آپ کتنی ہی احتیاط سے چلیں سینکڑوں پاکٹ مار ہیں جو اپنا کام نہایت عمدگی کے ساتھ کئے جا رہے ہیں۔ دن دھاڑے لوٹ کھسوٹ، جعل، فریب، جھوٹ، دغا، مکر و فریب جیسے یہ سب ہمارے گھٹی میں ملا ہوا ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں جہاں حکومت کی طرف سے سینکڑوں پولیس اسٹیشن عوام کے تحفظ کے لئے مقرر ہیں لیکن یہ بات بھی روز روشن کی طرح صاف ہے کہ بیچارے غریب پولیس والوں میں بھی ایمانداری کا فقدان ہے۔ مادن کمیشن کا فیصلہ بھی اس پر شاہد ہے ! رشوت اور لی کی کسی بڑی کی میتوں کا واقعہ بھی ابھی تازہ ہے۔ ... نے جو راہے پر پولیس گاڑی روک دیتا ہے۔ ٹرک ڈرائیور ایک روپیہ دیتا ہے اور گاڑی حسب دستور آگے بڑھتی ہے۔ اسمگلروں کو بُرا کہنا احسان فراموشی ہے یہی وہ مخیر حضرات ہیں جو کئی انجمنوں کی سرپرستی کرتے ہیں، خیراتی ادارے چلاتے ہیں سماجی بھلائی کے کام کرتے ہیں۔ اور یہ سب اسمگلنگ وغیرہ ناجائز کام اس لئے کر سکتے ہیں کہ حکومت کے مقتدر حضرات ان سے ملے ہوئے رہتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں پولیس اور ان کسٹم کے حکام اعلیٰ کا ان کے ساتھ اشتراک بھی ہوا کرتا ہے بغیر ان کے اشتراک کے اکیلا چنا بھاڑ کبھی نہیں پھوڑ سکتا۔ اب مسئلہ یہی تو ہے کہ یہ جو ہر قسم کے حکام آخر ہمارے بھائی ہی ہیں اور بے ایمان ہیں، بددیانت ہیں اس لئے ناجائز و ممنوع قسم کے کام کھلے بندوں ہوا کرتے ہیں۔ فورٹ کے علاقہ میں جائیے جہاں غیر ملکی ساری اشیاء، سڑک پر دکانیں لگی ہوتی ہیں جاپان کا کپڑا خریدنا ہو تو صابو صدیق مسافر خانے کی گلی میں تشریف لائیے !! حاصل مطلب یہ ہے کہ ہندوستان ملک بُرا نہیں ہے بلکہ یہاں کے ہم عوام منافقت کے شکار ہیں۔!!
"آپ شوق اعظم اکبر اور رہو کے اس ملک کو سارے جہاں سے اچھا بنانے کے لئے کیا کرنا ضروری ہے؟" اس سوال پر ہمارے رہنما خود سوچیں تو یقیناً ہم دنیا کے بہترین باشندے بھی کہلا سکتے ہیں۔ ہم میں صلاحیت موجود ہے نہیں ہے تا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
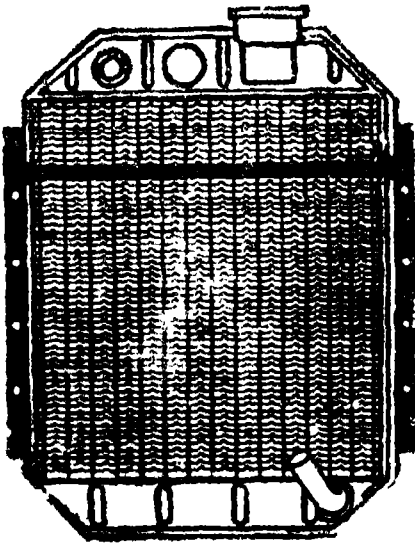
جلال ملیح آبادی

جنگ، گرمی، تپش، آگ، شعلہ دھواں
جنگ، آہ و فغاں، شور و غل ہا و ہو
جنگ، بےکس یتیموں کی آہ و بکا
جنگ، بغض و ریا، جنگ مکر و دغل
جنگ، بیوہ کی آنکھوں میں تفسیرِ یاس
جنگ، شہروں میں توپوں کی خونی گرج
جنگ، اٹھتی ہوئی قلبِ شیطاں سے لو
جنگ، سر پہ کڑکتی ہوئی بجلیاں
جنگ، مظلوم کا خوں بہاتی بدی
جنگ، توپوں سے شعلے لپکتے ہوئے
جنگ، سفاکیاں، جنگ خونریزیاں
جنگ، دار و رسن، جنگ گور و کفن
جنگ، دل غم کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے
جنگ، انساں کشی، جاں کنی، سنسنی
جنگ، نارِ جہنم کی چنگاریاں
جنگ، مزدور و مفلس کے دل کا لہو
جنگ، انساں پہ شمشیر تولے ہوئے

امن، شبنم، کلی، چاندنی، کہکشاں
امن، موسیقی و نغمۂ آب و جو
امن، پچھلے پہر بانسری کی صدا
امن، ابرو کا خم، امن زلفوں کا بل
امن، دوشیزہ ہونٹوں کی پہلی مٹھاس
امن، فرقِ نگاراں پہ دستارِ کج
امن، گوری کلائی میں کنگن کی ضو
امن، جھولوں میں گاتی ہوئی لڑکیاں
امن، برکھا میں دھومیں مچاتی ندی
امن، پھولوں میں جگنو چمکتے ہوئے
امن، گل پاشیاں، امن گل ریزیاں
امن، شمشاد و گل، امن سرو و سمن
امن، سبزے پہ چشمے ابلتے ہوئے
امن، تاروں بھری رات کی راگنی
امن، قصرِ تمدن پہ گل کاریاں
امن، ساز و صدا، امن جام و سبو
امن، پرچم محبت کے کھولے ہوئے

موت کی بے خطاؤں پہ بارش ہے جنگ
چند سرمایہ داروں کی سازش ہے جنگ

عبدالحئی اثیم

میں دیکھتا چلا گیا!

جمالِ کوکن ، آفریں　　نیاز مند ہے جبیں
قسم خدا کی برِ زمیں　　تو ایک جنتِ حسیں
نظر اٹھ ٹھہر گئی جہاں　　میں کیا بتاؤں وہ سماں
ہر اک قدم پہ یہ گماں　　یہ خوبصورتی کہاں
ہزارہا بکھرتے رنگ　　ہر ایک شب ، شرابِ امنگ
کوئی شریکِ بادہ ہو　　تو لطف اور زیادہ ہو
کسے یہ آئے گا یقیں　　اودھ کی شام ہے حسیں

نظارہ ہائے دلنشیں
میں دیکھتا چلا گیا

فضائے خوشگوار ہو　　ہوائے مشکبار ہو
بہار ہی بہار ہو　　تو کیوں نہ اس سے پیار ہو
نمودِ صبح کیا کہوں　　چراغِ پُر ضیا کہوں
جمالِ دلربا کہوں　　کہ جلوۂ خدا کہوں
پہاڑیوں کے سلسلے　　بلند جن کے حوصلے
یہ کھیت ہیں، یہ چشمے ہیں　　خدا کے سب کرشمے ہیں
عجب یہ ماہِ جون ہے　　ہوائے مانسون ہے

سکون ہی سکون ہے
میں دیکھتا چلا گیا

یہ حُسن لازوال ہے　　تمہارا کیا خیال ہے
جمال ہی جمال ہے　　جو رشکِ نینی تال ہے
مگر یہ اک سوال ہے　　بُرا کسی کا حال ہے
مصیبتوں کا جال ہے　　بشر بشر نڈھال ہے
اور اس قدر ملال ہے　　کہ زہر بھی حلال ہے
یہ بھوک یہ فلاکتیں　　یہ جیتے جی ہلاکتیں
یہ آدمی کی حالتیں　　یہ سانس لیتی میّتیں

ہر ایک چہرہ ہمنشیں
میں دیکھتا چلا گیا

سیاہ نیم شب ہوئی　　اِک آہ زیرِ لب ہوئی
اُجالے کی طلب ہوئی　　یہ بات بھی عجب ہوئی
نجوم و کہکشاں مگر　　سُنا رہے ہیں یہ خبر
تو جستجوئے شوق کر　　اندھیری رات سے نہ ڈر
کٹھن سہی یہ راستہ　　تجھے سفر سے واسطہ
بلند اگر ارادہ ہے　　یہ مرحلہ بھی ہوگا طے
سحر سے غم کی شام سے　　گذر کے ہر مقام سے

بڑے ہی اہتمام سے
میں دیکھتا چلا گیا

ڈاکٹر فقیر محمدؒ گلے

اسلام کا تصورِ وحدانیت

اور

اسلام میں پیر پرستی کا مقام

(نقشِ کوکن میں اشاعت کی غرض سے ایک مراسلہ بھیج رہا ہوں جس کا مقصد شرف کمالی صاحب سے بحث در بحث کا سلسلہ شروع کرنا یا اس کی اہانت نہیں ہے۔ اسلام کا تصورِ وحدانیت اور اسلام میں پیر پرستی کا مقام ایک مشکل موضوع ہے جس پر سیر حاصل گفتگو ایک مراسلے میں ممکن نہیں ہے۔ اس مراسلے سے قارئین کے ذہن میں شرف کمالی صاحب کے مضمون سے موحدین کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کا ازالہ مقصود ہے۔ میں اختلاف کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھتا ہوں، اور شرف کمالی یا کسی اور صاحب کے مجھ سے مختلف الرائے ہونے سے مجھے کوئی عناد نہیں۔ ممکن ہے میرا مخالف ہی صحیح عقیدہ رکھتا ہو اور اس کے دلائل جاننے کے بعد میں اپنا موقف چھوڑ دوں لیکن علمی میدان میں بغیر دلائل کے اقبالؒ کے کچھ شعر من مانی منطق کے تحت ٹانک کر اہلِ علم اور صاحب الرائے لوگوں سے متعلق بے دھڑک صادر کرنا کچھ اچھا وطیرہ نہیں ہے۔

——— خیر طلب فقیر گلے ———

نقشِ کوکن (عید نمبر — نومبر، دسمبر ۱۹۷۰ء) میں
رف کمالی صاحب کا مضمون جو مستقل عنوان "ذرا نم ہو تو
ٹی بہت زرخیز ہے ساقی" کے تحت شائع ہوا ہے، ایسے کئی
ہلو رکھتا ہے جن پر کام کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہی بات قابلِ غور ہے کہ اقبال نے
قل و دل، جنون و خرد — دردِ سر — دردِ جگر وغیرہم کی اصطلاحات
ا اتنی ہی سہل انگاری سے استعمال کی ہیں جتنی آسانی سے
رف صاحب صرف لفظ "عشق" میں سارا کا سارا اسلام
سمیٹے لے رہے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ "اسلام کی بنیاد دراصل
عشق پر ہی ہے۔" اور اس "عشق" کی اہمیت جتانے سے
شرف صاحب کو ذہن نشین یہ کرانا مقصود ہے کہ "عقلی
استدلال سے اسلام کی تبلیغ کرنے والے زاہدانِ خشک کا مطالعہ
فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں اس قسم کے لوگوں نے کوئی ٹھوس کام
نہیں کیا۔" جملے کی گرامر سے قطعِ نظر، ذرا غور کیجئے کہ ائمہ صالحین،
محدثین کرام، مفسرینِ عظام اور علمائے وقت کی اس سے بڑی
کیا توہین ہو سکتی ہے؟ پھر اس جملے میں جو دعوے ہیں اس پر بھی

غور کیا جائے :-

دعویٰ نمبر ۱ :- عقلی استدلال سے اسلام کی تبلیغ کرنے والے زاہد کم از کم دو قسم کے ہیں، زاہدانِ خشک اور زاہدانِ غیر خشک (شاید "رنگین")۔

دعویٰ نمبر ۲ :- زاہدانِ خشک نے کبھی ٹھوس کام نہیں کیا۔

دعویٰ نمبر ۳ :- عقلی استدلال اور زاہدانِ خشک اسلام کی تبلیغ کے حق میں مفید نہیں۔

دعویٰ نمبر ۴ :- شرف صاحب نے یہ دعوے ایسے زاہدانِ خشک کے مطالعہ کرنے کے بعد پیش کئے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو شرف صاحب مطالعہ کے سلسلے میں بھی قارئین کی رہنمائی کرتے تاکہ ہم جیسے شکی مزاج اپنے اطمینان کے لئے خود حوالوں کو دیکھنے کی زحمت اٹھاتے۔ زیر بحث جملے سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان زاہدان سے کوئی ٹھوس کام اس لئے نہیں ہوا کہ وہ "خشک" تھے یا اس لئے کہ "عقلی استدلال" کا استعمال کرتے تھے یا ان کی ناکامی کی وجہ ان کی "خشکی" اور "عقلی استدلال" دونوں ہی تھے۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ زیر بحث جملے میں جو دعوے آگئے ہیں ان کا کہیں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔

اس مضمون کا طرز استدلال بھی قابل اعتراض ہے۔ مثلاً اسلام کی راہ میں صعوبتیں اٹھاکر بھی ثابت قدم رہنے والے صحابۂ کرام کے اسلام سے والہانہ عشق کا ذکر کرنے کے بعد شرف صاحب اقبالؒ کا یہ شعر پیش کرتے ہیں :-

آگ توحید کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

اور فوراً اپنی قیمتی رائے صادر فرماتے ہیں کہ "اقبالؒ کے شعر سے بھی یہی مطلب نکلتا ہے کہ عشق ہی اصل میں سب کچھ ہے"۔ (خیال کی شدت کے لئے "بھی" "یہی" "ہی" اور "اصل میں" پر غور کریں)۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ جس آگ کا اقبالؒ ذکر کر رہے ہیں وہ توحید کی آگ ہے جو سوائے خدائے واحد کے آستانے کے کہیں اور مومنِ صادق کو جھکنے نہیں دیتی۔ مدد کے لئے مومن کو خدا سے دعا مانگنے پر اکساتی ہے۔ لیکن کسی اور کو حاجت روا گردان کر مشکل کشائی کے لئے آواز نہیں دیتی۔

شرف کمالی صاحب کو ان لوگوں سے اختلاف ہے جو یا محمدؐ، یا غوثؒ وغیرہ پکارنے والوں کو "نفرت سے دیکھتے ہیں" کسی کو غلطی پر سمجھنا اور کسی سے نفرت کرنا دو الگ چیزیں ہیں موحدین ایسے تمام لوگوں کو جو اسلام اور وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے خدائے واحد کے سوا کسی اور کو حاجت روا سمجھتے ہیں غلطی کا مرتکب گردانتے ہیں اور اگر ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے کہ ان سے اختلاف کے باوجود "نفرت" نہیں کرتے۔ یہاں ایک علمی بددیانتی کا بھی شرف صاحب شکار ہوئے ہیں وہ ان نفرت کرنے والوں کو برملا ان لوگوں میں گن لیتے ہیں جنھوں نے ایک نماز کیا پڑھنا شروع کی بس دین وفقہ کے عالم بن دوسروں کی "کم مائگی" اور "بے بضاعتی" کا دھڑلّے سے ذکر کر وقت شرف صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ چونکہ آسان مذہب ہے لہٰذا اس کے بارے میں قلم اٹھاتے وقت علم تحقیق کی بالکل ضرورت نہیں پڑتی اور اگر پڑتی بھی ہے تو آپ صرف اس کے اہل ہیں بلکہ حق تحقیق ادا کرنے کے بعد قلم اٹھا

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام وحدانیت کے بارے میں واقعی "کٹر" ہے۔ ہر نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہر مسلمان خدا سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" اور اگر کسی اور سے مدد مانگتے ہوئے یا کسی اور کو حاجت روا سمجھتے ہوئے کوئی مسلمان ذرا نہیں سوچتا کہ ابھی ابھی مالک سے کیا دعویٰ (عہد) کرکے آیا ہوں، تو ایسے شخص نے اس کے تقاضوں پر ذرا بھی غور نہیں کیا ہے۔ سوائے خدائے بزرگ و برتر کے کوئی اور حاضر وناظر نہیں ہے۔ بشر بہر حال بشر ہے

قرآن کی شہادت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ بشر تھے، اور بشر ہونے کے ناطے
خدائی صفات کے حامل نہیں تھے۔ ہر بشر مرنے کے بعد تو اپنی بشری
زندگی کی صلاحیتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ کسی زندہ یا متوفی
کو حاجت روا سمجھنا سراسر شرک ہے۔ مسلمان عقیدتِ رسول ﷺ
میں غلو کر بیٹھیں اس خیال سے رسولِ خدا نے نہ صرف قبروں کو اونچی
بنانے سے منع فرمادیا بلکہ خود اپنے معاملہ میں بھی رعایت نہیں دی۔
اسلام میں مرنے والے کو ۱/۳ حصۂ جائیداد پر وصیت کا حق حاصل ہے۔
لیکن وصیت اگر سنگِ مرمر کی قبر بنانے کی ہو تو اسے رد کیا جائیگا۔
کہیں کسی دروازے سے شخصیت پرستی اور شرک کو اسلام میں گھسنے
کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے
کہ شرک بے علمی کی وجہ سے یا شرک کی نیت کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔
اس مراسلے میں کسی کو مشرک ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی
ہے۔ مقصد اسلام کے تصورِ وحدانیت کی سختی بتانا ہے اور بس۔

اسلام کی صحیح اور مجاہدانہ اسپرٹ کو عام کرنے کی سعی میں
علمائے کرام نے اپنی زندگیاں کھپائیں اور ہم جیسے تن آسانوں کے
لئے ناقابلِ فراموش علمی ورثہ چھوڑ گئے۔ اس کا امکان ضرور
ہے کہ کوئی فردِ جوشِ اسلام میں کسی غیر نفسیاتی طریقۂ کار پر عمل پیرا
ہوا ہو۔ لیکن کسی ایک یا چند افراد کی کوتاہی کے لئے تمام مورخین
کو قارئین کی نظر میں مشکوک بنا کر پیش کرنا، انھیں فتنہ انگیز گرداننا
وغیرہ زیادتی ہے۔

شرف صاحب نے شاید اس پر بھی غور نہیں کیا کہ جوشِ
بحث میں وہ شیواجی تک کو سچے مورخین سے برتر مان گئے ہیں۔ وہ
فرماتے ہیں:

"..... اور حسنِ عقیدت سے سینکڑوں ایکڑ ناقابلِ کاشت
زمین حضرت یعقوب سروردی کے لئے پیر انھا عقیدت مند
وقف کر دیتا ہے نہ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

گویا شیواجی کا یہ عمل اہلِ اسلام کے لئے حجت ہے۔ قرآن اور حدیث
صرف ثواب حاصل کرنے کے لئے بلا سوچے سمجھے پڑھتے رہنے کی
چیزیں ہیں۔ اس پر مستزاد وہ مصرعہ جو آخر میں ٹانکا گیا ہے۔

اس کے بعد "عقلی استدلال" اور "زاہدانِ خشک" کی
خبر لینے کے لئے شرف کمالی صاحب اقبال مرحوم کے ایک موکل کا قصہ
بیان کرتے ہیں جو مولوی ہے اور باپ کی جائیداد ہضم کرنا چاہتا ہے۔ گویا
اسلام کا کل سرمایۂ عقلی استدلال بس ایسے چند مولویوں کا مرہونِ منت ہے؟

مجھے یقین ہے کہ شرف کمالی صاحب کی نیت ائمۂ اسلام اور
تعلیماتِ اسلام کی تضحیک ہرگز نہیں ہے۔ شکایت صرف یہ ہے کہ
اسلام پر قلم اٹھانے سے پہلے انھوں نے نہ اپنا جائزہ لیا اور نہ اسلام کے
نقش کو کن بڑھتی عمر کے ان جوان سالوں کے ہاتھوں میں جا سکتے
جو کسی دور افتادہ دیہات میں ہوں اور اسلام کے بارے میں تحقیقی ارادہ رکھتے
ہوں۔ انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے بجائے ان کی نظر میں عالم
اور مولوی یا کسی طبقے کو گرانے سے کچھ حاصل نہیں۔

ای۔اے ملاّ اپالو یونین موٹر لانچ سروس، اپولو بندر، بمبئی نمبر ۱

AZAD
BAREL CO,

خالی ڈرمس (بیرل) کی خرید فروخت

نیز

صفائی، مرمت اور رنگائی کیلئے
ہماری خدمات حاصل کیجئے

مالکان:-
• داؤد بھائی پاؤسکر
• ابراہیم موتی والا

فون نمبر:- 379486

آزاد بیرل کمپنی

میسنٹ روڈ، گرین ڈپو، فوٹ برج، بمبئی ۳۳

محمد عبد الحق
(بی۔اے آنرز)

اُردو شاعری میں طنز و مزاح

سرسری جائزہ

ہنسنا اور رونا دو ایسے افعال ہیں جو روزِ آفرینش سے
نسانی زندگی کا جزوِ لازم بنے ہوئے ہیں۔ انسان نے اپنی ارتقائی
نزلوں سے بہت سی خصوصیات کھوئیں اور بہت سی پائیں۔ لیکن
نسوؤں اور قہقہوں کی کیفیات میں کوئی تغیر نہ ہو سکا۔ کاروانِ حیات
بے خوب تر کی جستجو میں آگے بڑھتا رہا۔ انسان نے جذبات کے
ظہار کے لئے زبان ایجاد کی۔ جب زبان لکھی گئی تو ادب کی بنیاد پڑی۔
ب زندگی کی مختلف تصویروں کو محفوظ کرنا شروع کیا۔ ان تصویروں
ں زندگی کی ہر کیفیت کی جھلک ملتی ہے۔ ان میں درد بھی ہے، کرب
ی نظر آتا ہے، مسرت و شادمانی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ قہقہے بھی
نائی دیتے ہیں، آنسو بھی ڈھلکتے ہیں، طنز کے تیروں کی چبھن بھی محسوس
وتی ہے۔ غرض ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر طرح کی تصویریں
ھرتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔

اردو ادب میں بھی زندگی کی عکاسی ہونے لگی۔ ہر دور میں
شی و انبساط اور رنج و الم کی وارداتیں نظر آتی ہیں۔ مگر ہم اس وقت
رف طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کا سرسری جائزہ لیں گے۔

اردو ادب ابتدا میں زندگی کی پرخار راہوں سے اجتناب
رتا ہوا تصوری مخمل و کمخواب کی پارہ دری میں محوِ خرام تھا یا خانقاہوں کے
بوریے پر تصوف کی رفعت کا نقیب بنا ہوا تھا۔ اور مسائلِ حیات
کی اونچ نیچ کھا بڑ دیاں ناصح و زاہد، شیخ و محتسب کی خشک نصیحتوں
سے بوجھل معلوم ہوتی تھیں۔ ابھی تک ادب میں کوئی ایسا پیدا نہیں
ہوا تھا جو شیخ کی کھڑکی دار پگڑی اور محتسب کی سفید ریشِ مبارک
کی طرف پرتبسم دیکھ سکے۔

کشتیٔ ادب اسی گرداب میں چکر کھاتی رہی، لٹکے ہوئے
نوالے اور چھچھوری ہوئی ہڈیوں پر ادب پروان چڑھتا رہا۔ رفتہ رفتہ ادب
کے نظریے میں تبدیلی ہونے لگی۔ دامِ الفت کا اسیر، طائرِ تخلیق تمام
شکنجوں کو توڑ کر وادیٔ زنگار رنگ میں اتنی بلندی پر پرواز کرنے لگتا ہے
کہ اسے حیاتِ انسانی کے نشیب و فراز اور سطح و ناہموار گوشے
صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر اب بھی روایت پرستی کے صنم توڑنے پر
کوئی کمربستہ نہیں ہوتا۔ اکّا دکّا تیرِ نیم کش زاہد کی جانماز پر گرتے ہیں جن کو
ذاتی پرخاش پر محمول کیا جاتا ہے۔ میرؔ کے دل خراش نالے اور
شہر آشوب کی جگر پاش داستان خون کے آنسو رلاتی ہے۔ مگر سماج
کی ناہمواری اور معاشرے کی خرابی کی اصلاح نہیں کرتی۔ لیکن میر روتے
روتے ہنستے ضرور ہیں۔ دیکھئے ؎

مت مل اہلِ دول کے لڑکوں سے ۔۔۔ میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا ، رات کو تھا میخانے میں
جبہ خرقہ کرتا ، ٹوپی مستی میں انعام کیا

سودا کی پھبتیاں شیخ کی دستار میں پھلجھڑیاں چھوڑتی
، اور سماجی ، سیاسی اور مذہبی ناہمواریوں کی بڑی ہمدردی سے
ی کرتی ہیں۔ سودا ہجو میں انفرادیت سے اجتماعیات کی طرف مائل ہوتے
، اور حکیم شیخ عالم اور زاہد کا مضحکہ اڑا کر اس پوری جماعت کی
یوں اور برائیوں پر لعن تشنیع ڈالتے ہیں۔ جیسے حکیم غوث کی ہجو میں
دا کہتے ہیں ؎

صدر کے بازار میں ہے اک دبنگ
عار اطبا و طبابت کا ننگ

شکل ہے شیطان کی اور غوث نام
جنگ میں ہلاکو کا ہے قائم مقام

ہے متوطن وہ لعین روم کا
بستی میں رکھتا ہے اثر بوم کا

طنز و مزاح اپنے ابتدائی دور میں باقاعدہ صنف
کی شکل میں موجود نہ تھا۔ بلکہ کبھی کبھی شدتِ جذبات ادیب کے
قلم سے ایک آدھ نشتر ہنسی ہنسی میں نکلوا دیتے تھے۔ قاری پھڑک
اٹھتا، قہقہہ لگاتا اور اچانک سنجیدہ ہو کر گال سہلانے لگتا۔ ادب میں
مزاح کی اہمیت رفتہ رفتہ مسلم ہوتی گئی اور اس کے سہارے ادیبوں
کے باشعور حلقے نے اپنے عمیق مشاہدے سے سماج کی برائیوں کو دور
کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور زندگی کی ناہمواریوں کا فنکارانہ ڈھنگ سے
اظہار اس طرح کرنا شروع کیا کہ باتوں ہی باتوں میں اصلاح ہو جائے۔
مزاح کافی مقبول ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قلمی پھلجھڑیاں سنجیدگی
سے بند توڑ کر شکست و مایوسی کے صدموں سے انسانیت کو نجات دلاتی
ہیں۔ کبھی شاعر اور ادیب دوسروں پر حملہ کرتا ہے، کبھی خود اپنے دام میں
پھنس کر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ تماشہ بین بھی ہے اور تماشہ بھی۔ اس
کی فلسفیانہ تحلیل کے غیر منظم اجزا مربوط اور منظم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح
مزاح ایک ذہنی کھیل ہے جس میں مزاح نگار اور قاری دونوں برابر کے
شریک رہتے ہیں۔ مزاح پیدا کرنے کے لئے شاعر مختلف ہتھیار استعمال
کرتا ہے۔ کبھی عمل کی تکرار سے تبسم افشانی کرتا ہے۔ کہیں تقلیب کی مہتاب
چھوڑ کر فضا کو رنگین کرتا ہے۔ کسی جگہ مبالغے کی جوہری توانائی سے ذرے
آفتاب بنا کر محتسب کا منہ چڑھاتا ہے۔ دل میں آئے تو ہفت اقلیم کی
وسعتوں کو گھٹا کر دیدۂ نرگس کے کوزے میں بند کر دیتا ہے۔

سودا کے بعد ظرافت کے میدان میں انشا اور مصحفی
آتے ہیں۔ لیکن ان کے قدم کچھ ایسے غلط پڑے کہ ظرافت اور شوخی چھوڑ
گالی گلوج پر اتر آئے۔ البتہ انشا کی ظرافت کی جولانی ریختی میں پورے
شباب پر ہے اور انھوں نے بیگماتی زبان میں خوب خوب گل کھلائے۔
غالب شوخ اور ظریفانہ طبیعت لے کر آئے تھے۔ غالب
کی شوخیٔ طبع انھیں نچلا بیٹھنے نہیں دیتی۔ وہ غزل کی وادی میں
انار چھوڑتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور محبوب سے لے کر زاہد تک کی وہ
بناتے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ ہونٹوں پر تبسم آ ہی جاتا ہے۔ حالی نے
حیوانِ ظریف لکھا ہے اور غالب کا کلام اس کی تصدیق کرتا ہے۔ غالب
کی شوخی ملاحظہ ہو، وہ کس طرح واعظ کی ٹانگ گھسیٹتے ہیں ؎

کہاں میخانے کا دروازہ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شیخ جی کا حال دیکھئے ؎

شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

غالب محبوب کی جفاؤں کو جس شوخی سے بیان کرتے ہیں وہ انھیں کا حصہ

۱۔ قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

۲۔ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

۳۔ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

۴. دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

۵. سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

۶. بوسہ دیتے ہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
دل میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

غالب میں بذلہ سنجی اور شگفتگی خداداد ہے۔ وہ روتے بھی ہیں تو ہنستے ہوئے گلہ کرتے ہیں تو شرارت کے انداز میں۔ اپنی مایوس زندگی کی تصویر کھینچتے ہیں تو شوخ رنگوں سے۔ غرض شوخی و ظرافت ان کے خمیر میں رچی بسی ہوئی تھی۔ ثبوت کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

۱. چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے

۲. دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

۳. جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

۴. قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غالب کے بعد ظرافت کی فضا میں بھی ایک جمود کی کیفیت تی ہے۔ غدر کے بعد شکستہ دلوں میں نہ ہنسنے کی تاب باقی تھی اور نہ داستان کے چہکنے کے لئے کوئی آشیانہ گلزار تھا۔ لکھنؤ اور دہلی دونوں خاموش تھے لیکن دور ویرانے میں ایک نغمۂ ابدی زندگی کا پتہ دے رہا تھا۔ رس کاروان تھے اکبر الہ آبادی مرحوم — اکبر نے اصلاح قوم کے لئے یقہ جذبات اور غزل و قصیدہ کا فرسودہ میدان چھوڑ کر ظرافت کا ارا لیا۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ناصحِ مشفق بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لوگوں کو ہنسا ہنسا کر رلایا جائے اور کسی ذات کو مخصوص نہ کیا جائے۔ بلکہ اپنا مخاطب ایک مخصوص انداز سے عام کر دیا جائے۔

اکبر نے ظرافت کے ترکش میں ایسے تیر جمع کئے تھے کہ قاری شکار ہوتے ہی مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ ان کی ظرافت میں ابتذال اور سوقیانہ پن نام کی کوئی چیز نہیں نظر آتی۔ اکبر کا دل خالص مشرقی ہے۔ ہمدردی اور خلوص نے کلام میں اثر پیدا کر دیا ہے۔ اکبر بظاہر زندگی کی ناہمواری پر ہنستے ہیں لیکن ان کا دل روتا ہے۔ وہ قوم کی بے راہ روی اور اندھی تقلید پر تڑپتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے پرستاروں کے ہاتھوں مائل بہ زوال قدروں کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہی ہمارا سرمایہ ہیں۔ اکبر کی آواز اردو شاعری میں پہلی آواز تھی جس نے اصلاحِ قوم کے لئے آنسوؤں کے بجائے قہقہوں کو چنا۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

۱. ان کو کیا کام ہے مروت سے
اپنے رخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

۲. ہوئے اس قدر مہذب کبھی صورت نہ دیکھی گھر کی
کٹی عمر ساری ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

۳. بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

۴. مسٹر جو اٹھے گزٹ لیکر تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسہ نہ ملا

۵. شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مریدہ آوارہ ہیں
بی بیاں اسکول میں ہیں اور شیخ جی دربار میں

۶. طفل سے بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

۷. تعلیمِ دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

اکبر نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کو بامقصد بنا کر پیش کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جو کام متانت اور سنجیدگی سے نہیں ہو سکتا وہ ظرافت انجام دے سکتی ہے مگر اس کے لئے خلوص اور وسیع النظری شرط ہے۔

ظریف اکبرآبادی کے کلام میں بھی ظرافت اور شوخی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن وہ اکبر کے رنگ سے بالکل مختلف ہے۔ مثلاً ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

ظریف نے ہزل گوئی کو اصلاح کا آلہ بنایا اور لوگوں کی بدمذاقی کا مذاق اڑا کر انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی ظریف نے مبالغے کی غیر ضروری طوالت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

۱۔ ایک ٹھوکر سے اڑا دے جو مزارِ عشاق
وہ تو معشوق نہ ہوگا کوئی ہاتھی ہوگا

۲۔ خیالی ہجر میں فرضی مریضِ غم کا مر جانا
یہ سب کیا ہے سلامت جھوٹ کے پل سے اتر جانا

۳۔ کہتی ہے سدا صاحبِ مقدور کی اولاد
ترکہ ملے ہم کو ارے جلدی کہیں مر بھی

شاعرِ مشرق علامہ اقبال جیسا مفکر شاعر بھی دقیق اور بوجھل مضامین کی وادی میں جب داخل ہوتا ہے تو کبھی کبھی ایک پیر سنجیدگی اور دوسرا ظرافت کی رکاب میں ہوتا ہے۔ جیسے ؎

(۱) میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

(۲) اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

موجودہ دور کے مزاحیہ شاعروں میں چند نام نظر آتے ہیں لیکن ان میں وہ بات نہیں جو غالب اور اکبر کے یہاں پائی جاتی ہے جدید مزاحیہ شاعری میں احمق پھپھوندوی، سید محمد جعفری، علاؤالدین صابر، راجہ مہدی علی خاں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ احمق پھپھوندوی کی غزلیں کافی مشہور ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کب تک کھلائے گا تو قلابازیاں مجھے
عاشق ہوں میری جان کوئی بندر نہیں ہوں

علاؤالدین صابر نے بولی اور بمبئی کی ملی جلی زبان میں ظرافت کے تیر چھوڑے ہیں۔ نمونے کے طور پر دیکھو ؎

کوئلیا چلاوت ہے کو کو! ہر پیڑ پہ بیٹھے ہیں اُلّو
ہر شاخ پہ قبضہ کون کا اب جشنِ بہاراں کا ہو رہے
یہ بھی اک ہوئے گی پیر کا چکر روج کیامت ماں
جو میں جنت پہنچیوں تو مولانے کہاں جیہیں

راجہ مہدی علی خاں مرحوم موجودہ دور میں ظرافت کے آخری علمبردار تھے۔ انھوں نے بہت سی مزاحیہ نظمیں اور پیروڈی وغیرہ لکھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ ان کی خرگوشوں کی غزل کے اشعار سنیے ؎

کوئی شکاری بار بار بن میں ہمارے آئے کیوں
چونکیں گے ہزار بار کوئی ہمیں ڈرائے کیوں
گھر نہیں جھونپڑی نہیں کٹیا نہیں مکاں نہیں
بیٹھے ہیں جنگلوں میں ہم کوئی ہمیں بھگائے کیوں

اس کے بعد پھر ایک بار ظرافت کا میدان خالی نظر آتا ہے کوئی بھولی بھٹکی تبسم کی کرن نظر آجاتی ہے پھر اندھیرا چھا جاتا ہے ان شاعرانہ بذلہ سنج کی جنھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا خوش بیانی کے بعد گلستانِ شاعری اداس ہے اور کسی غالب، اکبر یا ظریف کا منتظر ہے۔ ۔ ۔

محمد رشید الدین طاہر
ریٹائرڈ صدر مدرس ۔ بالاپور

بیماریاں سینکڑوں قسم کی ہیں اور آئے دن نئی بیماری کی خبر ملتی ہے۔ عام طور پر بیماریوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے ــــ
اعصابی بیماریاں (۲) دماغی بیماریاں ــــ

دماغی بیماریاں زیادہ خطرناک سمجھی جاتی ہیں، کیونکہ ان کو ہر ڈاکٹر سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے، اور مریض بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ دراصل ذہنی انتشار سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان امراض کا منبع وہ ناآسودہ خواہشات ہوتی ہیں جو دبا دی جاتی ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات سماج کی بندشیں ان کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ ہمیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کبھی یہ خواہشات دبائی بھی گئی تھیں۔ ان کا علم ان اشارات و کنایات سے ہوتا ہے جو ذہنی امراض کے مریضوں سے ظہور میں آتی ہیں۔ دیوانگی یا پاگل پن کی صحیح تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن ایسا انسان جس کے عادات و اطوار ماحول سے مطابقت نہ رکھتے ہوں پاگل یا دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ پاگل پن بقول ڈاکٹر برل کئی قسم کا ہوتا ہے۔ فی الحال تین قسم کے پاگل پن کا اظہار مقصود ہے۔

(۱) مینک ڈپریسیو سائیکوسس (Manic depressive psychosis) یہ ایک بہت عام قسم کی دیوانگی ہے۔ جنونی بعض اوقات بہت جوش میں ہوتا ہے۔ کبھی بہت زیادہ خوش، کبھی بے چین اور کبھی بالکل پژمردہ ــ یہ جذبہ اکثر

دو ماہ سے چھ ماہ تک رہتا ہے۔ کبھی کبھی چند دن یا چند ہفتے یہ کیفیت رہتی ہے۔ اس کے بعد اس کے جذبات میں سکون پیدا ہو جاتا ہے لیکن چند دن ہی میں پھر وہی جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ ایسے مریضوں پر پچیس و تیس سال کے دوران میں پندرہ بیس دورے پڑ جاتے ہیں۔ ایسے مریض ابتدا میں بالکل پژمردہ، سست و کاہل ہوتے ہیں۔ انھیں کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی۔ اپنے ہی خیال میں مست رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد بالکل صحت مند نظر آتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مریض اب تندرست ہو گیا ہے اور اسے علاج کی ضرورت نہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پھر اس مرض کا حملہ ہوتا ہے جو پہلے کی نسبت زیادہ شدید ہوتا ہے۔ مریض پھر وہی حرکات شروع کر دیتا ہے۔ الغرض یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس مرض کو مالیخولیا سمجھا جاتا تھا۔ قدیم اطباء کا خیال تھا کہ یہ مرض معدہ کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ مریض کو جلاب دیتے تھے۔ لیکن اس نظریہ کو اب غلط ثابت کر دیا گیا ہے
ایسے مریضوں کے متعلق یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ کہیں خودکشی نہ کر لیں۔ آئے دن اخبارات میں خودکشی کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں۔ اگر ان کے حالات کا تجزیہ کیا جائے تو تقریباً ۸۰ فیصدی اس مرض کی وجہ سے خودکشی کرنے والے لوگ ملیں گے۔ اس مرض کے جنونی دور میں مریض کا بہت خیال رکھنا ضروری ہے، ورنہ بہت سے دیگر

خطرات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایسے مریض پر جب مرض کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ متواتر بولتا رہتا ہے یا کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اسے چین و سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اکثر ایسے مریض دوسروں کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ متواتر حرکات سے ان میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی بڑھتی ہوئی نقاہت کا خاطر خواہ علاج نہ ہو تو اکثر مریض کو موت لاحق ہو جاتی ہے۔

(۲) دوسری قسم SCHIZOPHRENIA ہے۔ یہ سب سے زیادہ عام ہے۔ بعض ماہرین نفسیات نے اسے عالم شباب کا ذہنی انتشار سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ یہ مرض عموماً سولہ سے تیس سال کی عمر کے درمیان لاحق ہوتا ہے۔ دراصل یہ مرض رفتہ رفتہ سرایت کرتا جاتا ہے اور جب جذباتی انتشار عروج پر ہوتا ہے اور مریض اس کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے تب کہیں اس مرض کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے مریض دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے گھر والوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسے نہانے اور لباس تبدیل کرنے کی بھی فکر نہیں ہوتی۔ جب تک مرض کا پتہ نہیں چلتا مریض کی یہ بیزاری کاہلی پر محمول کی جاتی ہے۔ جب مرض کا غلبہ شدید ہوتا ہے تو ایسے مریض کی آنکھوں کے سامنے اگر یکلخت تیز روشنی کر دی جائے تو بھی وہ آنکھیں نہیں جھپکاتا۔ اگر اس نے اپنی زبان باہر نکالی ہو اور آپ سوئی اس میں چبھونے کی کوشش کریں تب بھی وہ زبان باہر ہی رکھے گا۔ فوری جذبہ سے جو حرکات ایک عام انسان سے سرزد ہوتی ہیں وہ اس مریض میں مفقود ہو جاتی ہیں۔ قوت احساس مردہ ہو جاتی ہے۔

اس مرض کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اگر ایسے مریض کو کوئی کام کرنے کو کہا جائے تو وہ کوئی توجہ نہیں دیتا، گویا اس نے سنا ہی نہیں۔ اگر کرے گا تو بالکل ایک مشین کی طرح۔ آپ اس سے مصافحہ کریں گے تو اس کے ہاتھ بالکل بے جان اور سخت

پائیں گے۔ بعض مریض ایک ہی جگہ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں یا کبھی ایک ہی کام بار بار کرتے رہیں گے۔ ایک پاگل خانہ میں ایک مریض تھا جو ہر دم اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کی مالش کرتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر کے بال گرنے لگے تھے اور وہ گنجا ہو گیا تھا۔ کوئی دھوپ میں کھڑا سورج کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ اُسے زبردستی پکڑ کر دھوپ میں سے ہٹایا جاتا ہے کہ کہیں اسے دھوپ (SUN STROKE) نہ لگ جائے۔ ایسے مریض کھانے کی فکر نہیں کرتے لیکن جب کھانے لگتے ہیں تو ایسے جلدی جلدی بڑے بڑے لقمے لیتے ہیں گویا مدت سے فاقہ کر رہے تھے۔ بعض اوقات بڑے لقمے حلق میں پھنس جاتے ہیں اور ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایسے مریضوں کا مینٹل اسپتال میں خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ایسے آلات رکھے جاتے ہیں جو بوقت ضرورت فوراً استعمال کئے جا سکیں۔

ڈاکٹر برل لکھتا ہے کہ ایک مینٹل ہسپتال میں ایک نوجوان لڑکی تھی، جو تمام دن گھٹنوں میں سر دئیے ہوئے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتیں۔ گویا وہ کسی کی بات بڑی توجہ سے سن رہی ہو۔ اسے صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ کبھی کوئی الفاظ اس کے منہ سے نکلتے بھی تھے کوئی مفہوم نہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر برل اس کے پاس بیٹھ گیا اور لگاتار اس سے باتیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا۔ لڑکی بڑی توجہ سے خاموشی سے سنتی رہی۔ آخر کار ڈاکٹر نے اس سے کہا: تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تمھیں اپنی حالت دیکھ کر شرم نہیں آتی۔ اٹھو کپڑے تبدیل کرو ہم سیر کرنے جائیں گے۔ راستہ میں مزید گفتگو ہوگی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیا۔ ڈاکٹر اسے اپنے ہمراہ سیر کو لے گیا۔ لڑکی نے بتایا کہ ایک لڑکے نے اسے گھر سے اغوا کیا تھا اور اس کے پاس بیٹھ کر خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ گو وہ یکدم غائب ہو گیا لیکن اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے

باتیں کر رہا ہے اور دوستی رہتی ہے۔ اس کا رویہ ڈاکٹر کے ساتھ
بالکل نارمل انسان کی طرح ہوگیا۔ دو دن لڑکی اچھی حالت میں رہی،
کیونکہ ڈاکٹر اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ جوں ہی ڈاکٹر نے یہ سلسلہ ختم کیا
لڑکی کی حالت پھر پہلے جیسی ہوگئی۔ اگر یہ عمل جاری رہتا تو لڑکی کی حالت
نارمل ہوتی۔ لیکن ڈاکٹر کی ہمت نے جواب دے دیا تھا۔

ایک اسپتال میں ایک مریض تھا، جو بالکل خاموش
تھا۔ کھانا اسے زبردستی ٹیوب کے ذریعہ دیا جاتا تھا۔ اس کا رنگ زرد
پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اس کا آپریشن کیا جائے اور اس کے
معدہ کا تیزابی مادہ نکالا جائے۔ جب اسے کلوروفارم دیا جانے لگا
تو اس نے اچانک بات چیت شروع کردی اور اس نے درخواست
کی کہ اس کا آپریشن نہ کیا جائے، اور بیہوش ہوگیا، لیکن جب ہوش میں
آیا تو ٹھیک طور پر بات چیت شروع کردی۔ جب اس سے خاموشی کی
وجہ دریافت کی گئی تو وہ مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ وہ چند دن اسپتال
میں بالکل صحت مند رہا۔ جب ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ تم اب بالکل
تندرست ہو، تمھیں اپنے گھر بھیج دیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی اس کی
پھر وہی حالت ہوگئی۔

ایک عورت کو کنکریاں جمع کرنے کا خبط تھا۔ وہ
جمع کرکے تھیلوں میں بھر کر رکھتی تھی۔ جب اس کا خاوند اسے حرکت
سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ لڑنے لگتی تھی۔ اسی طرح ان
دونوں کے تعلقات نہایت ناخوشگوار ہوگئے تھے۔ آخر میاں نے
ایک ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے بتایا کہ بیوی کو
اولاد کی خواہش ہے اور میاں مانع حمل کے طریقوں پر کاربند ہے
اس لئے عورت پر یہ خبط سوار ہے۔ اگر عورت کو یقین ہو جائے کہ وہ
مانع حمل کے طریقوں پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کی جائے گی تو یہ خبط جاتا رہے گا۔
چنانچہ جیسے ہی عورت کو یقین ہوگیا کہ وہ ماں بننے والی ہے، اس کی حالت
درست ہوگئی۔ اور میاں بیوی کے تعلقات نہایت خوشگوار ہوگئے۔

مندرجہ بالا دونوں قسم کے پاگل پن میں فرق یہ ہے کہ

SCHIZOPHENIA میں مریض عام حالات میں بالکل سنبھل
جاتا ہے اور اس وقت مرض کا کوئی نشان اس کے ذہن پر نہیں ہوتا۔
حالانکہ مرض موجود ہوتا ہے۔ اگر ایسے حالات میں اس کا ڈاکٹری معائنہ کرایا
جائے تو اسے صحیح الدماغ سمجھا جائے گا۔ اگر کچھ دماغی انتشار ہو تو
اسے صرف جذباتی انتشار سمجھا جاتا ہے۔

دوسرے قسم کا مریض جب نارمل حالت میں آجاتا ہے تو
دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ مریض بالکل تندرست ہوگیا لیکن ماہر نفسیات
اسے فقط ردعمل سمجھتے ہیں۔

(۳) تیسرے قسم کا مرض PARANOIA ہے۔ اس کے
اثرات بچپن ہی سے دماغ میں موجود ہوتے ہیں۔ ایسے بچے خود کو بالکل
الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنا بالکل
پسند نہیں کرتے۔ وہ نہ کسی کو اپنا دوست بناتے ہیں اور نہ کسی کا دوست
بننا پسند کرتے ہیں۔ اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ بعض خود کو
سب سے اعلیٰ اور بعض خود کو کمتر سمجھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ
INFERIORITY COMPLEX یا
SUPERIORITY COMPLEX کا شکار ہوتے ہیں
جب ایسے بچے جوان ہوتے ہیں اور ان کے جذبات ابھرنے لگتے
ہیں تو ان کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہ پاکر دل ہی دل میں گھٹنے لگتے ہیں
وہ ہر ایک کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی آپس میں ان کو دیکھ کر بات
کرے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ وہ ہر دم چوکنا
رہتے ہیں۔ ان کو دماغی سکون کبھی میسر نہیں آتا۔ ہر چیز پر وہ
شک کرتے ہیں۔ ان کی تمام تر دلچسپی خود میں مرکوز ہوکر رہ جاتی۔
یہ بالکل نیوراتی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے
اگر ایسے کسی ڈاکٹر سے واسطہ پڑ جائے تو وہ ڈاکٹر کو اپنی اصلی دماغی
کیفیت سمجھنے کا کبھی موقع نہیں دیتے۔ ہوشیار ڈاکٹر بہت غور سے حالات
کہ کے ان کے منہ سے کوئی غیر معمولی بات نکل جائے تو اس سے مرض
کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مرض کو ... قسم ...

جن کا مطالعہ و معائنہ کرنا ازحد دشوار ہوتا ہے۔

والدین کو چاہئے کہ اپنے بچوں کا بچپن ہی میں گہرا مطالعہ کریں۔ اگر یہ دیکھیں کہ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور میل جول پیدا کرنے سے کتراتے ہیں تو محبت و شفقت سے انھیں آمادہ کریں۔ خود کو ہمدرد و بہی خواہ ثابت کریں تاکہ یہ مرض جڑ نہ پکڑ سکے اور بچہ میں خود اعتمادی کا جذبہ بدرجۂ اتم پیدا ہو جائے۔ اگر وہ خود کچھ نہ کر سکیں تو فوراً کسی ماہر نفسیات کی طرف رجوع کریں۔ ایسے بچوں کا صحیح مطالعہ گھر سے بہتر مدرسہ میں کیا جا سکتا ہے، جہاں بچوں کو دیگر بچوں کی صحبت حاصل ہوتی ہے۔ والدین بچے کے استاد سے یہ معلومات بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔

آج کل دیوانگی کے مریض زیادہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جہاں کسی شخص میں دیوانگی کے اثرات ظاہر ہوئے کہ اس پر کسی بدروح یا جنات کے سایہ کا خیال کیا جانے لگتا ہے اور گنڈے، ڈورے، تعویذ، جادو ٹونے شروع کر دئے جاتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں کارگر ثابت نہیں ہو رہی ہیں تب کہیں ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عرصہ میں مرض جڑ پکڑ لیتا ہے اور صحتیاب ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کئی زندگیاں تباہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بقیہ:- پیغمبروں کی دعائیں

میں جہاں کسی چیز کا نام و نشان نہیں۔ میں نے اپنی اولاد تیرے قابل احترام گھر کے پاس لاکر بسائی ہے کہ نماز قائم کریں۔ بس تو ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف ہو جائیں اور ان کے لئے زمین کی پیداوار سے رزق مہیا کرے تاکہ تیرے شکر گذار ہوں۔ (ابراہیم)

آئیے، ان واقعات و حالات کی آگاہی کے بعد بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو کر مغفرت و معافی کے لئے التجا کریں۔

محمد احمد دلکش ایم۔اے

عید الاضحیٰ

خانۂ خدا، کعبہ کے بانی، پیغمبرِ حق حضرت ابراہیمؑ کی
کی پیروی میں مسلمانانِ عالم عید الاضحیٰ کی تقریب مناتے ہیں۔
ار بھی مسلمانوں کے لئے خوشی کے جشن کے ساتھ شکرِ خداوندی کے
ہار کا موقع ہوتا ہے۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد دس ذی الحجہ کو حاجی
ت اظہارِ مسرت اور سنتِ ابراہیمؑ کے اتباع میں قربانی کرتے ہیں۔
رح حج کم از کم زندگی میں ایک بار ہر صاحبِ استطاعت مسلمان کیلئے
ہے اسی طرح ہر صاحبِ نصاب مسلمان کے لئے قربانی ضروری ہے
ان چاہے تو سال بھر تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے اس گرانی
مانہ میں بھی اس سنت کو ادا کر سکتا ہے کیونکہ ایک بڑے جانور کی قربانی
سات حصہ دار شریک ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کی مشترک قربانی اس
دلیل ہے کہ اسلام میں افراد ارکان کی ادائیگی کر سکتے ہیں اور اس
کی معمولی کوششوں سے وہ اسلام کی تعلیمات پر آسانی سے عمل پیرا
سکتے ہیں۔ حج کے لئے تو واقعی نیکی اور محنت کی کمائی میں سے معقول
اگر کوئی پس انداز کر سکے تب بھی وہ اس فریضہ کو ادا کر سکتا ہے، اور
کے لئے اور ... وسائل کے انسان کو زندگی بھر کوشش کرتے رہنا
ئے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ بندوں کی نیت کو بھی دیکھتا ہے اور
، واعمال دونوں کا اجر بندے کو ملتا ہے۔ بلکہ غریب مسلمان کے
لئے تو خوشنودی کا حصول خدا نے اور بھی آسان کر دیا ہے۔ حدیث
ہے کہ اگر مسلمان نماز کو جماعت سے ادا کرنے کے لئے گھر سے وضو
کر کے چلے تو اسے ایک حج کا ثواب ملتا ہے۔ اس طرح ہر امیر و غریب
ذرا سا اہتمام کر کے اس عظیم ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، تو گویا ہر مسلمان
زندگی میں اس طرح لاتعداد حجوں کا ثواب حاصل کر سکتا ہے اور آسانی تھوڑی
سی رقم ڈال کر بڑے جانور کی قربانی میں بھی شریک ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے
کسی کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ دین کی رسوم کی پابندی ہمیشہ استقامت
دین اور تازگیٔ ایمان کا باعث ہوتی ہے۔

دین کی یہ رسوم بڑی بڑے اہم اوصاف کی حامل ہوتی ہیں۔
اور انسان میں خلوص، قربانی اور جہاد کے جذبہ کو اجاگر کرتی ہیں۔ حق پر
قائم رہنے والوں اور حق کی دعوت دینے والوں کو دنیا میں ہمیشہ آزمائشوں
سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اسی خاطر ترکِ وطن کرنا پڑا۔
اور نارِ نمرود میں بلا تکلف کود جانا پڑا تھا۔ جیسا کہ حضرت اقبالؒ نے فرمایا ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

لہٰذا دین کے معاملہ میں انسان کو قلبِ صادق کے
جذبۂ جری سے کام لینا چاہئے اور عقل کوتاہ اندیش کے پس و پیش سے
اجتناب کرنا چاہئے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دین کا گلزار، دل کی زرخیز
مٹی میں کھلتا ہے نہ کہ دماغ کی سنگلاخ وادی میں، اور اس ایمان کے

...ں ہوتے پر ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کیلئے
...سی واسطے نارِ نمرود گلزار بن گئی تھی اور اللہ نے ان کو بچا لیا تھا۔ حضرت داغ
...نے اسی واقعہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

نارِ نمرود کو کیا گلزار دوست کو یوں بچا دیا تو نے

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر ہمیں کسی سے دعوئ الفت
ہے تو محبوب ہماری محبت کو کسی بھی وقت آزما سکتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ
خلیل اللہ تھے، لہٰذا اللہ نے ان کو بھی آزمایا۔ ایک رات آپ نے خواب دیکھا
...ابراہیم تمھیں جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہو اسے ہماری راہ میں قربان کر دو۔
حضرت ابراہیمؑ کو اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ سے زیادہ بھلا اور کیا عزیز تر
ہو سکتا تھا چنانچہ آپ نے اس مسئلہ میں حضرت اسمٰعیل سے بھی مشورہ کیا
اور پیغمبر ابن پیغمبر حضرت اسمٰعیل نے ایک فرمانبردار اور سعید فرزند کی حیثیت
سے اپنے والد حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے فرمایا کہ بسم اللہ آپ مجھے راہِ خدا
میں قربان کر دیجئے۔ اب جب حضرت ابراہیم نے بیٹے کو قبلہ رخ لٹا کر اپنی
آنکھوں پر پٹی باندھی اور بیٹے کے گلوئے مبارک پر چھری پھیری تو حضرت
جبرئیل نے حکمِ ربی سے ایک دنبہ حضرت اسمٰعیل کی جگہ لا کر رکھ دیا جس کو
چھری نے ذبح کر ڈالا اور حضرت اسمٰعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ سلامت
رکھا۔ پس اس طرح راہِ خدا میں عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کی سنتِ
ابراہیمی قائم ہو گئی جس کی پیروی میں قربانی میں ہر چھوٹے بڑے کے لئے
ایک سبق موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ

"ہمیں رضائے الٰہی اور تائید و تحفظِ حق کے لئے
ہر قربانی کے واسطے یہ سوچ سمجھ کر آمادہ رہنا چاہئے
کہ یہ سب کچھ ہم راہِ خدا میں کر رہے ہیں"۔

دوسری بات آج کل کے نوجوانوں (لڑکوں، لڑکیوں)
کے لئے یہ ہے کہ انھیں اپنے والدین اور بزرگوں کے حکم کی تعمیل، خوشنودیٔ
الٰہی کا موجب سمجھ کر اس کے لئے ہر حال میں مستعد رہنا چاہئے۔

"بھٹک رہا ہے
اندھیروں میں آدمی اب بھی"

قدم سے قدم ملاؤ کہ وقت نازک ہے
یقیں کو عزم بناؤ کہ وقت نازک ہے

مقامِ دار بھی طے کر چکے ہیں اہلِ جنوں
خرد کی خیر مناؤ کہ وقت نازک ہے

نکل کے ظلمتِ کہنہ سے تیرہ بختوں کو
پیامِ وقت سناؤ کہ وقت نازک ہے

سفینۂ غمِ جاں اور دلوں کی جوئے رواں
جنوں کو پاس بلاؤ کہ وقت نازک ہے

بھٹک رہا ہے اندھیروں میں آدمی اب بھی
سحر کی شمع جلاؤ کہ وقت نازک ہے

افق پہ آگ لگی ہے فضا دہکتی ہے
شعاعِ مہر بجھاؤ کہ وقت نازک ہے

جلا کے وقت کی شمعیں روش روش پہ امید
غزل کدوں کو سجاؤ کہ وقت نازک ہے

علی عباس امید

تبصرہ

تبصرہ کیلئے کتاب کی دو کاپیوں کا آنا ضروری ہے

مکتبہ جامعہ ملیہ کی دو معیاری مطبوعات

"انتخاب ولی"

مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی۔ شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی نمبر ۲۵۔ بسلسلہ "معیاری ادب"

قیمت لائبریری ایڈیشن تین روپیہ۔

طلبہ ایڈیشن ڈھائی روپیہ۔

مکتبہ جامعہ نئی دہلی اردو ادب کی نمائندہ کتابوں کی بقا اور اشاعت عام کے لئے قابل رشک کام کر رہا ہے۔ کتاب اچھی، مضمون اچھا، اس کی افادیت مسلم۔ مگر اہل مذاق میں کتاب کی طرف سے ایک قسم کی مایوسی۔ اس لئے کہ یا تو کتاب کا بازار میں وجود ہی نہیں یا اگر ہے تو بدخط اور غلطیوں سے پُر۔ اگر اتفاقاً کوئی اچھی کتاب ملتی ہے تو قیمت اتنی زیادہ ہے جو متوسط درجے کے وسائل کے آدمی کے لئے اندازے سے زیادہ ہے۔ ان سب امور کو دیکھتے ہوئے۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے حکومت کشمیر کے تعاون سے یہ انتظام کیا ہے کہ مفید کتابیں مناسب اہتمام اور کافی احتیاط سے چھاپی جائیں اور قیمت کو دیکھتے ہوئے مقابلتہً ارزاں قیمت میں فروخت کی جائیں۔ پھر یہ نہیں کہ پیش نظر کتاب مطلوبہ کا جو نسخہ بھی ہاتھ لگا، جوں توں لکھوا کر اسے چھپوا ڈالا۔ نہیں یہ نہیں۔ بلکہ یہ کیا کہ ہر کتاب جسے شائع کرنا چاہا، اسے ملک کے کسی نہ کسی جانے پہچانے اہل علم سے مرتب کرایا۔ تب اسے ممکن احتیاط سے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

اسی معیاری ادب سلسلہ کی پچیسویں کڑی زیر تبصرہ کتاب انتخاب ولی ہے۔

ولی کو ہماری اردو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ گو اس بارے میں مختلف آوازیں ادھر ادھر سے اٹھ رہی ہیں لیکن عام رجحان یہی ہے کہ اولیت میں ولی کا درجہ سب میں فائق ہے دوسری بحث ولی کی وطنیت و شخصیت کے بارے میں ہے۔ آب حیات وغیرہ کی روایت یہی ہے کہ ولی دکنی تھے۔ اور اہل دکن کو بھی اصرار ہے کہ ولی دکنی تھے۔ مگر اردو ادب کی تاریخ کے محققوں کا ایک دوسرا گروہ ہے جو ولی کو گجراتی احمد آبادی بتاتا ہے۔ اس گروہ کے سرخیل ہمارے عزیز فاضل دوست ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ہیں موصوف نے سالہا سال کی تلاش و جستجو اور بڑی کنجکاوی کے بعد یہ بات ثابت کر دی ہے کہ شمس ولی اللہ اورنگ آبادی ایک اور شاعر تھے اور اردو شاعری کے باوا آدم ولی جن کا نام ولی محمد تھا ایک دوسرے بزرگ ہیں۔ آخر الذکر بزرگ شاعر چھٹی پشت میں احمد آباد کے عالم و صوفی وجیہ الدین علوی کے بھائی شاہ نصر اللہ کے اخلاف میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی سلسلہ میں "ولی گجراتی" کے نام سے ولی کی محققانہ سوانح عمری بھی لکھی ہے جس کا دوسرا ایڈیشن زیر طباعت ہے ڈاکٹر صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ ولی شاعر ہی نہیں عالم و صوفی بھی تھے آپ کا کلام مجاز و حقیقت کا مرقع ہے۔ "انتخاب ولی" پڑھتے ہوئے قدیم اردو سے ناواقفوں کو کچھ لفظ نامانوس معلوم ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے تمام الفاظ کی فرہنگ تیار کر دی ہے۔ اس کا مطالعہ اردو ادب و شعر کے طالب علم کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہے۔

"گذشتہ لکھنو"

یہ کتاب مکتبہ جامعہ کے معیاری ادب کے سلسلہ کی بیسویں کڑی ہے۔ ضخامت چار سو اٹھاسی صفحات۔ قیمت لائبریری ایڈیشن دس روپئے۔ طلبہ ایڈیشن ساڑھے آٹھ روپئے۔

یہ کتاب ہماری زبان کے مشہور و معروف عالم و فاضل مورخ، ادیب و مصنف مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی مرحوم کی تاریخ

ادبی، سماجی زندہ رہنے والی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ابتداءً مولانا شرر کے رسالہ دلگداز میں قسط وار چھپی تھی۔ پھر اسے دلگداز پریس ہی نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اب ہماری زبان کے نئے محقق نقاد جناب رشید حسن خان صاحب نے مکتبۂ جامعہ کے لئے مرتب کیا ہے۔ کتاب کا اصلی نام تھا "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"۔ یہ کتاب مولانا شرر کے ذاتی مشاہدات کی تصویر ہے۔ لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ مرحوم کا زمانہ مولانا شرر نے پایا تھا۔ لکھنؤ سے جلاوطنی کے بعد واجد علی شاہ ٹیا برج کلکتہ میں نظر بند تھے۔ مرحوم نے اسے لکھنؤ کا ہر چیز میں نمونہ بنا دیا تھا۔ مولانا شرر بھی بچپن میں اپنے والد مولوی حکیم تفضل حسین مرحوم کے ساتھ اسی ٹیا برج میں مقیم اور واجد علی شاہی ملازموں میں شامل تھے۔ مولانا شرر نے وہاں لکھنؤ کی زندگی کے سبھی رنگ اور اسی رنگ میں رنگین لوگ دیکھے۔ وہ زندگی پر حوصلہ، قابلِ رشک زندگی نہ تھی بلکہ خود فرموشی کے مسلسل عمل کا دکھاوا تھا۔ اگرچہ یہ داستان صرف لکھنؤ کے آخری دور کی ہے، مگر کتاب کا نام عہدِ آخر کی اکثر ریاستوں کی جھلک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان کی قابلِ ذکر ریاستوں کا کیا حال تھا۔ اور اسی سلسلہ میں اگر بیسویں صدی کے نصف اول کی کئی بڑی ریاستوں کے امراء کی سماجی حالت دیکھنی ہو تو اس کتاب کے ساتھ صدق جائسی مرحوم کی کتاب "دربارِ دُربار" کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے جس سے معلوم ہوگا کہ فرمانرواؤں کے جانشینوں نے اپنے فرائض کو فراموش کر کے عیش کوشی میں کس طرح خود کو محو کر دیا تھا۔

(ریویو نگار مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی)

حضرت مولانا مفتی محمد ضیاء الحق صاحب دہلوی

قربانی کے مسائل

مَاھٰذِہِ الْاَضَاحِی ؟ — یہ قربانی کیا ہے ؟

یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:
سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ — یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت ہے۔
(ان کی قربانی کی یاد تازہ کراکے ایثار و قربانی کا جذبہ اور ولولہ پیدا کیا جاتا ہے) صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا قربانی کرنے میں ثواب بھی ملتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں ہر بال کے بدلے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جانور کے بدن پر جس طرح بال بے شمار ہیں اسی طرح بے حد و نہایت ثواب بھی ملتا ہے — ایک دوسری روایت میں فرمایا: "مَا مِنْ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ یَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَی اللہِ مِنْ اِھْرَاقِ الدَّمِ" (حدیث) ایام قربانی میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل قربانی کا کرنا ہے۔

ربانی کن لوگوں پر واجب ہے ؟

شریعت نے مالی عبادات کے لئے مال کی ایک
دار مقرر کی ہے۔ جسے نصاب کہتے ہیں۔ اور جس کے پاس اتنی
ار ہو اُسے صاحبِ نصاب کہتے ہیں۔ جس طرح زکوٰۃ کی فرضیت
لئے ایک نصاب ہے صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے ایک نصاب
، اسی طرح قربانی کے وجوب کے لئے بھی ایک نصاب ہے۔

ربانی کا نصاب

جس مسلمان کے پاس قربانی کے دنوں میں ۷½ تولے
ہو یا ۵۲½ تولے چاندی ہو یا ۵۲½ تولے چاندی کی قیمت
ہو یا اتنی قیمت کا تجارتی سامان ہو تو اس پر قربانی واجب ہے۔

اگر ان میں سے کسی چیز کا پورا نصاب نہ ہو۔ دو تین چیزیں ہیں مگر ہر ایک نصاب سے کم ہے تو پھر ان کی قیمت لگا کر دیکھیں گے۔ اگر ان کی قیمت ۵۲½ تولے چاندی کے برابر بن جاتی ہے تو بھی قربانی واجب ہے۔ اسی طرح اگر گھر میں فالتو (روزمرہ کی ضرورت سے زیادہ) سامان ہے اور اس کی قیمت ۵۲½ تولے چاندی کی قیمت ہے تو بھی قربانی واجب ہے۔

قربانی صرف اپنی طرف سے کرنا واجب ہے۔ بیوی اور بچوں کی طرف سے نہیں۔ وہ خود اگر صاحبِ نصاب ہوں تو کریں ورنہ نہیں۔ یوں نفلی طور پر حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف سے صحابۂ کرام، ازواج مطہرات اور بی بی فاطمہ کی طرف سے، شہداء اسلام

کی طرف سے، اپنے مرحوم والدین کی طرف سے ایک جانور یا متعدد جانوروں کی قربانی کرکے ثواب بخشے تو جائز ہے۔ کوئی شخص اگر مقروض ہے تو قرضہ منہا کرکے دیکھے۔ اگر پھر بھی صاحبِ نصاب ہے تو قربانی کرے ورنہ نہیں۔ غریب پر (یعنی جو اتنی مقدار کا مالک نہ ہو) اور مسافر پر (جو اپنے وطن سے ۴۸ میل دور ہو اور پندرہ دن سے کم وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہو۔ بالفاظِ دیگر جو قصر نماز پڑھ رہا ہو) قربانی واجب نہیں ہے۔

عقیقہ اور قربانی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات کہ عقیقہ نہ ہوا ہو تو وہ پہلے عقیقہ کرے، پھر قربانی ہو سکتی ہے ورنہ نہیں بالکل غلط ہے۔ اس غلط بات کے مشہور ہو جانے کی وجہ سے بہت سے مسلمان یا تو زیر بار ہوتے ہیں یا قربانی ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

قربانی کے دن اور وقت

قربانی کی تین تاریخیں ۱۰-۱۱-۱۲ ذی الحجہ مقرر ہیں ان تاریخوں میں قربانی کرنا عبادت اور موجب اجر و ثواب ہے۔ قربانی کا وقت ۱۰ تاریخ کو صبح ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے مگر جس بستی یا شہر میں عید کی نماز ہوتی ہو وہاں نمازِ عید ہو جانے کے بعد قربانی کی جائے۔ البتہ ان گاؤں میں جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی علی الصبح بھی قربانی کر سکتے ہیں۔

قربانی کا وقت ۱۲ تاریخ کو غروبِ آفتاب کے وقت ختم ہو جاتا ہے۔ غروب سے پہلے پہلے قربانی سے فارغ ہو جانا چاہئے۔ قربانی صبح و شام ہر وقت کر سکتا ہے۔ رات میں قربانی کرنے سے اس لئے منع کرتے ہیں کہ کوئی رگ وگ کٹنے سے نہ رہ جائے۔ اگر روشنی کا کافی انتظام اور احتیاط سے ذبح کیا جائے مضائقہ نہیں۔

قربانی کے لئے افضل پہلا دن ہے اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ کسی پر قربانی واجب تھی مگر کسی وجہ سے ان تین دنوں میں قربانی نہ کر سکا، دن گزر گئے تو اب ایک بکرے یا بھیڑ کی قیمت خیرات کردے۔ اور اگر جانور خرید رکھا تھا تو وہ زندہ کسی غریب کو دے دے۔ اگر کوئی شخص ۱۱ یا ۱۲ تاریخ کو غریب تھا یا مسافر تھا لیکن ۱۲ کو غروبِ آفتاب سے پہلے وہ [illegible] مالدار ہو گیا یا مسافر مقیم ہو گیا یا وطن لوٹ آیا تو اس پر بھی قربانی واجب ہو جائے گی کیونکہ وقت باقی ہے۔

قربانی کے جانور

قربانی صرف تین قسم کے جانوروں کی ہو سکتی ہے۔

(۱) بکرا، بکری، بھیڑ، دنبہ، مینڈھا (نر اور مادہ)۔ (۲) گائے، بیل، بھینس اور بھینسا۔ (۳) اونٹ اور اونٹنی۔

جانوروں کی عمر

بکرا اور بکری (بال والے جانور) جب تک ایک سال کے پورے نہ ہوں ان کی قربانی درست نہیں ہے۔ گھر کا پلا ہوا جانور ہے تو دو دانت دیکھنے کی ضرورت نہیں، اور اگر بازار سے خریدیں تو دیکھ لیں کہ اس نے آگے کے دو دانت توڑ کر دوسرے نکال لئے ہوں۔ یہ علامت ہے اس کے ایک سال کے ہو جانے کی۔

بھیڑ، دنبہ، مینڈھا (اون والے جانور) اگر چھ ماہ کے ہو چکے ہوں اور فربہ ہوں تو ان کی قربانی جائز ہے۔ چھ ماہ سے کم عمر کے نہ ہوں۔ بھینس اور بھینسا کم از کم دو سال کے ہوں۔ یہ دو سال میں اگلے دانت توڑ کر دوسرے نکال لیتے ہیں۔ اونٹ اور اونٹنی کم از کم پانچ سال کے ہوں۔ یہ پانچ سال میں اگلے دانت توڑ کر دوسرے نکال لیتے ہیں۔

جانور سلیم الاعضاء ہو

قربانی کا جانور اچھی طرح دیکھ کر خریدیں۔ اس کے دانت، اس کی آنکھیں، کان، سینگ، دم، ٹانگیں، وغیرہ خاص طور پر دیکھ لیں۔ بعض عیب ایسے ہیں کہ اگر جانور میں ہوں تو اس کی قربانی درست نہیں ہوتی۔ کم قیمت دیکھ کر لالچ میں نہ آئیں۔

دُم :- اگر ایک تہائی سے زیادہ کٹی ہوئی ہو تو نہ خریدیں

کہ اس کی قربانی درست نہیں۔

کان:- اگر ایک تہائی سے زیادہ کٹے ہوئے ہوں یا سرے سے ہوں ہی نہیں تو نہ خریدیں کہ اس کی قربانی درست نہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہوں تو مضائقہ نہیں۔

دانت:- اگر زیادہ گر گئے ہوں کم باقی ہوں تو نہ خریدیں کہ اس کی قربانی درست نہیں۔

سینگ:- اگر جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں تو نہ خریدیں کہ اس کی قربانی درست نہیں۔ البتہ اگر نکلے ہی نہ ہوں یا تھوڑے تھوڑے ٹوٹ گئے ہوں یا گھس گئے ہوں تو قربانی درست ہے ـــ

جانور اگر اتنا لنگڑا ہو کہ چلتے وقت ٹانگ ٹکاتا ہی نہ ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔ البتہ اگر اس ٹانگ سے سہارا لے کر چلتا ہو تو قربانی درست ہے۔ جانور اگر اندھا یا کانا ہو تو اس کی بھی قربانی درست نہیں۔

خصی (بدھیا) جانور کی قربانی درست ہے۔ خواہ خود گھر میں خصی کرایا ہو یا بازار سے خصی خریدا ہو خصی ہونا جانور میں عیب نہیں ہے۔

بکرا بکری (چھوٹا جانور) میں شرکت نہیں ہو سکتی۔ ایک آدمی کی طرف سے ایک جانور ہوگا۔ البتہ بھینس اونٹ (بڑے جانور) میں زیادہ سے زیادہ سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں جن کی نیت یا تو قربانی کرنے کی ہو یا عقیقہ کی ہو۔ اگر کوئی ایسا شخص شریک ہوگیا جس کی نیت نہ قربانی کی ہے نہ عقیقے کی تو دیگر شرکاء کی بھی قربانی درست نہ ہوگی ـــ سات آدمیوں سے کم تو شریک ہو سکتے ہیں زیادہ نہیں۔ عقیقہ کرنے والے کو لڑکے کیلئے دو حصے اور لڑکی کیلئے ایک حصہ لینا ہے۔

گابھن جانور کی قربانی بہتر ہے نہ کرے لیکن اگر کر دے تو درست ہو جائے گی۔ پھر اگر بچہ نکل آئے تو اسے بھی ذبح کر دے۔ قربانی کا جانور دیکھ کر سلیم الاعضاء خریدا تھا اس کے بعد کوئی ایسا عیب پیدا ہو گیا کہ قربانی درست نہیں ہوتی مثلاً یہ کہ آنکھ پھوٹ گئی، سینگ جڑ سے ٹوٹ گیا تو دوسرا جانور خرید لے۔ (پہلے جانور کا جو چاہے کرے) ہاں، اگر یہ غریب آدمی ہے اور یونہی قربانی کے شوق میں جانور خرید لیا تھا تو اس عیب دار ہی کی قربانی کرلے ـــ

قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر غریب آدمی (جس پر شریعت نے قربانی واجب نہیں کی ہے) جانور خرید لے تو اس کیلئے اسی جانور کا ذبح کرنا ضروری ہے۔

اگر خود ذبح کرنا جانتا ہو تو بہتر ہے کہ اپنے ہاتھ سے چھری پھیرے ورنہ کم از کم خود سامنے کھڑا رہے۔ قربانی کے لئے جب جانور لٹائے تو یہ دعا پڑھے:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ اللَّهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ ـــ پھر ـــ بِسْمِ اللهِ اللهُ أَكْبَرُ پڑھ کر چھری پھیرے اور خدا سے دعا کرے

اللَّهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِيبِكَ مُحَمَّدٍ وَمِنْ خَلِيلِكَ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِمَا الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔

ان دعاؤں کو یاد کرے اور پڑھے تو بہتر ہے ضروری نہیں ہے۔ اگر اپنی طرف سے قربانی کر رہا ہے تو تَقَبَّلْهُ مِنِّي کہے، اور اگر کسی اور کی طرف سے قربانی کر رہا ہے تو تَقَبَّلْهُ مِنْ کہہ کر اس کا نام لے۔ اگر عربی میں نہ کہہ سکے تو اردو میں اس طرح دعا کرے: "اے اللہ اس قربانی کو میری طرف سے قبول فرمالے جس طرح تو نے اپنے حبیب حضرت محمدؐ اور اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ کی قربانیوں کو قبول فرمایا تھا۔"

قربانی کا گوشت مسلم غیر مسلم سب کو دیا جا سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ گوشت کے تین حصے کرکے ایک اپنے لئے رکھ لے، ایک دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے اور ایک غریبوں اور مسکینوں پر تقسیم کر دے۔ گوشت کچا دے یا پکا کر کھلائے جائز ہے ـــ قربانی کے جانور کی کھال اپنے کام میں لائے یا رشتہ دار کو دے، خواہ مسجد کے متولی یا مدرسہ کے مہتمم یا مسجد کے امام و مؤذن خواہ کسی جماعت کے ذمہ دار کو دے کہ وہ بجنسہ اس کھال کو کام میں لائیں یا فروخت کر کے قیمت خرچ میں لائیں سب جائز ہے۔

لیکن اگر قربانی کرنے والا کھال کو خود فروخت کر دے تو اب اس کی قیمت کے مستحق فقراء و مساکین ہیں۔ نہ اپنے صرف میں لا سکتا ہے نہ مسجد و مدرسہ پر صرف کر سکتا ہے۔ البتہ زکوٰۃ کی طرح حیلہ تملیک کرکے جملہ مصارف میں صرف ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ وہی روپئے غریبوں کو دے۔ قصائی کو مزدوری کی اجرت قربانی کا گوشت نہ دے۔ اپنے پاس سے علٰحدہ دے ـــ بقیہ مسائل مقامی علماء سے دریافت کرلیں۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

بشکریہ جمعیۃ ٹائمز (ہفت روزہ) دہلی
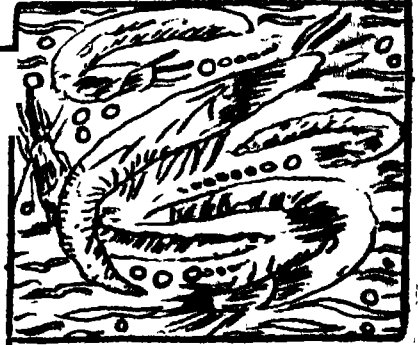
انجم عباسی

وہم ایک ایسی بیماری ہے
جو ہر انسان کو لاحق ہوتی ہے۔

اگر جہالت اور کم علمی کے کاشانوں پر وہم و گمان کی بالادستی ہے تو دانش و فراست کے دولت کدوں پر بھی اس کی یورش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ اپنے وہم یا شک پر بہت زیادہ دھیان دے کر اپنی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں، اور کچھ لوگ اسے اپنا "دماغی خلل" سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دراصل بذلہ سنج اور خوش مزاج لوگ ہی جہاں بہت سارے کڑے غموں کو ہنسی کے پہلے نے میں گھول کر پی جاتے ہیں وہاں وہم یا تشکیک کو بھی رندانہ سر خوشی سے نوش کر جاتے ہیں۔ پھر چاہے وہ بوجھ ڈھونے والے مزدور ہوں یا بھاری تصنیفات کو جنم دینے والے مفکر۔

خوش مزاج کے فقدان پر اوہام کی یلغار سے ادراک نہ اقبال کے امارت خانے جس قدر شکستہ و خستہ ہو چکے ہیں وہ دنیائے انسانیت کا ایک المیہ ہے۔ اس "المیئے" کے آئینے میں انگریزی کے مشہور شاعر شیلے اور مشہور مفکر جوئین کے جسم بُری طرح مجروح دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کا گمان تھا کہ انھوں نے بد روحیں دیکھی ہیں اور "ہو بگا ہے یہ روحیں انھیں پریشان کرنے کے لئے آتی ہیں۔ نتیجتاً

جب وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں جُٹے رہتے تو کبھی کبھی خوف سے کانپ اٹھتے۔

ڈاکٹر جانسن کو بھی یہ وہم تھا کہ اگر وہ کسی مکان میں داخل ہوتے وقت اپنا دایاں پاؤں اندر نہیں رکھے گا اور راہ کے کھمبوں کو ہاتھوں سے نہیں چھوئے گا تو وہ کسی نہ کسی مصیبت کا شکار ہوگا۔ فرانس کی ملکہ میری انٹوئنیٹ تو زندگی کی معمولی معمولی باتوں سے خوفزدہ رہتی۔ ورسیلز کے محل میں جو آئینہ نصب تھا اُس پر سر کے سوا سارا جسم نظر آتا تھا۔ جب ملکۂ فرانس نے اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اسے یقین کی حد تک وہم ہو گیا کہ اس کا سر کٹ جائے گا۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ فرانس کی مشہور بغاوت میں واقعی اس کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا۔ وہ باغیوں کے ہاتھوں تہ تیغ کی گئی۔

وہم اور تشکیک انسانی ذہنوں کو دنوں اور تاریخوں سے بھی خوفزدہ کرتے ہیں۔ پیانو کا مشہور ماہر ونبیٹن جمعہ کے روز سفر کرنے سے ڈرتا تھا اور مشہور جرنیل بسمارک نومبر کی ۱۳ تاریخ سے گھبراتا تھا۔ شکنتلا کا مصنف کالی داس سنیچر کے دن کسی اہم کام کو انجام دیتے وقت خائف رہتا۔ ان بڑے بڑے بتوں کی اوہام پرستی اس بات کی غماز ہے کہ عقل و ادراک کے دریچے وا ہونے کے باوجود یہ دماغی خلل باعث آزار بن سکتا ہے ۔۔۔ ••

پاکستانی حملہ اور ہندوستان

"کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی"

سنہ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہماری سرحدوں پر حملہ کیا تھا تو جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہماری لڑائی چینی عوام کے خلاف نہیں ہے بلکہ مہم باز چینی حکمرانوں کے خلاف ہے، تو جواہر لال کی بیٹی اور ہماری قومی لیڈر اندرا گاندھی کے لفظوں میں ہماری لڑائی پاکستان کے عوام کے خلاف نہیں، اس ملک کے سرپھرے اور جنگ باز حکمرانوں کی جارحیت اور انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف ہے۔ ہمیں جواہر لال نہرو کے الفاظ کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ہمارا ملک ہمیشہ سے امن، صلح و آشتی کا علمبردار رہا ہے۔ لیکن ہماری آزادی کے بعد کم از کم پانچ مرتبہ ہماری امن پسندی کو چیلنج کیا گیا اور ہمیں اسلحہ اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔ موجودہ لڑائی پچھلی چار لڑائیوں سے مختلف ہے۔ اس لڑائی کا مقصد صرف ہماری سرحدوں اور سرزمین کی حفاظت اور ہماری علاقائی سالمیت کو بچانا ہی نہیں بلکہ بنگلہ دیش کے کروڑوں عوام کو ظلم و ستم سے آزاد کرانا بھی تھا۔ یہ لڑائی کوئی علاقہ فتح کرنے اور کسی علاقے کے لوگوں کو محکوم بنانے کے لئے نہیں تھی جیسا کہ پاکستان کے فوجی حکمران پروپگنڈہ کر رہے تھے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے الفاظ ہیں:

"ہندوستان امن کا علمبردار ہے لیکن بعض اوقات
قیامِ امن کے لئے جنگ لڑنا پڑتی ہے۔"

"مظلوموں کو حق ملا اور ظالموں کو سبق ملا"

پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور آزاد ہندوستان نے جمہوری سیکولرزم کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نظریاتی اختلاف اور ہندوستان کے خلاف پاکستانی حکمرانوں کی مسلسل مہم کے باوجود جواہر لال سے لے کر اندرا گاندھی تک ہمارے تمام قومی لیڈروں نے اس تمام عرصے میں پاکستان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی کوششیں کیں، لیکن راولپنڈی ہر حکمراں گروہ نے دوستی کی خاطر بڑھایا ہوا ہمارا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس لئے کہ ہندوستان سے دوستی اور تعاون سے زیادہ انہیں اپنے اور چند سرمایہ داروں کے مفاد عزیز تر تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے مغربی پاکستان کا ایک گروہ حکومت، صنعتوں، بینکوں اور کاروباری اداروں پر چھا گیا تھا اور اس نے مشرقی بنگال کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھا تھا۔ لیکن جب مشرقی بنگال نے جمہوری طریقہ کار سے ملک کی قومی اسمبلی کے لئے

اپنے نمائندے منتخب کیے اور وہ اقتدار کے مستحق قرار پائے تو مغربی پاکستان کے مذکورہ بالا گروہ نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے ذریعہ اپنے ہی ملک کی اکثریت کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا اور پھر وہاں جمہوری تحریک کو دبانے کے لئے وہ فوجی کارروائی شروع کر دی جسے دیکھ کر ہٹلر کی روح بھی لرز اٹھی ہوگی۔ ہندوستان کے سینے پر ایک کروڑ پناہ گزینوں کا بوجھ آپڑا اور دنیا کے ممالک پاکستان کی اکثریت کو فوجی بوٹوں تلے پستے ہوئے دیکھتے رہے اور کچھ نہ کرسکے۔

اقوام عالم کی خاموشی نے پاکستان کو اور بے لگام کر دیا اور اس نے ہندوستانی سرحدوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس کا حملہ اور مشرقی پاکستان میں ہونے والی جارحیت کا ہندوستان نے دنداں شکن جواب دیا۔ ایسا جواب جس نے تاریخ عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور بنگلہ دیش "پاکستان کے چنگل سے آزاد ہوگیا۔

"عجلت کے تئیں ذلت ملی
غفلت کے تئیں عبرت ہوئی"

حالیہ ہند پاک جنگ کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ ایک خیال تو یہ ہے کہ اس کا سب سے بڑا ذمہ دار امریکہ ہے جس نے پاکستان کی فوجی حکومت کو شہ دے کر اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اور کچھ لوگ اس کا ذمہ دار چین کو بھی قرار دیتے ہیں۔

لیکن حقیقت وہی ہے جو مسز اندرا گاندھی نے بیان کی ہے۔ یہ جنگ ٹالی جا سکتی تھی اور برصغیر اس زبردست حادثہ سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ دونوں ممالک اس بے پناہ معاشی بوجھ سے بچ سکتے تھے جو جنگ نے ان پر لاد دیا اور ہزاروں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں بشرطیکہ عالمی برادری نے اپنی ذمہ داری محسوس کی ہوتی اور بروقت قدم اٹھایا ہوتا۔

وزیر اعظم نے اطالوی ٹیلیویژن کو دئے جانے والے اپنے اس انٹرویو میں کہا کہ امن عالم کو اسی وقت خطرہ لاحق ہوگیا تھا جب ساڑھے سات کروڑ عوام کی نسل کشی کی مہم شروع کی گئی تھی۔ ہندوستان نے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اگر اس کے جواب میں دنیا کی حکومتوں نے کوئی تحریک کی ہوتی تو یہ جنگ ہرگز شروع نہ ہوتی

ہندوستان نے ہر ممکن کوشش کی کہ بنگالی پناہ گزینوں کا مسئلہ حل ہو جائے کیونکہ ایک کروڑ پناہ گزینوں نے ہندوستان کی معیشت پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا تھا۔ لیکن دنیا نے پناہ گزینوں کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی ظاہر کی نہ ہی مشرقی بنگال کے عوام کی تحریک آزادی سے۔

جنگ شروع ہونے کے بعد دنیا کے ممالک نے جنگ بندی کے لئے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اگر جنگ سے قبل بگڑتی ہوئی صورت حال کو قابو میں رکھنے کے لئے اس کا مظاہرہ کیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی — یہ جنگ اقوام عالم کے لئے ایک سبق ہے۔ اگر دنیا کو درحقیقت قیام امن سے دلچسپی ہے تو اسے ابتدا ہی سے مسائل کو پُرامن طور پر حل کرانے میں مدد کرنی چاہئے اور عالمی امور کو صحیح پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو غیر اہم یا غیر متعلق سمجھ کر نظر انداز کیا جانا کسی بھی وقت پر خطر ثابت ہو سکتا ہے۔

روتے ہوئے بچے کو چچا نے سمجھاتے ہوئے کہا:
" اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس طرح ہرگز نہ روتا "
بھتیجے نے روتے ہوئے جواب دیا:
"آپ جس طرح چاہیں روئیں مگر میں تو
اپنے ڈھنگ سے ہی روؤں گا۔"

حکیم منظور محمد قریشی اوجین

بکری کے دُودھ کے فوائد

"صرف بکری ہی ایک جانور ہے جسے کبھی دِق نہیں ہوتی"

مغربی تہذیب و تمدن کے اثر سے جہاں ہماری سادہ زندگی اور بے تکلف بود و باش کی خصوصیات مٹ رہی ہیں وہاں ہماری اچھی عادتیں بھی خراب ہو رہی ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان چائے کافی، مکھن سے چپڑے ہوئے ٹوسٹ وغیرہ کو غذا کا اصلی جزو سمجھنے لگے ہیں۔ دودھ، دہی، لسی بخصوصاً بکری کے دودھ کو گنوار دیہاتیوں اور غیر تعلیم یافتہ غریب طبقے کے لئے مخصوص خیال کیا جانے لگا ہے۔ میں آج اس غریبانہ نعمت سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اور صحت و تندرستی کے خواہش مندوں کو مخلصانہ نیت سے پرزور مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ناشتہ اور دوپہر کی چائے کی جگہ کم از کم ایک مہینے بکری کا دودھ استعمال کر کے عجائب قدرت کا تجربہ کریں۔ اس تبدیلی سے نہ صرف آپ کی صحت اور تندرستی میں نمایاں ترقی اور اصلاح ہوگی بلکہ اخراجات میں بھی کافی کفایت ہو سکے گی۔ امریکہ کے مشہور ماہر خوراکیات ڈاکٹر ڈگلس تھامس نے بکری کے دودھ کو تمام دوسری پینے کی چیزوں کے مقابلے میں افضل اور فائدہ مند پایا ہے۔ اس میں ایسے نمکیات پائے جاتے ہیں جو تندرستی قائم رکھنے کے لئے ہر وقت کافی مقدار میں موجود رہنے ضروری ہیں۔ بکری کے دودھ میں فلورین کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہ ہڈیوں کی نشو و نما اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔

آنکھوں کے باریک و نازک طبقوں کی پرورش کے لئے بھی فلورین ضروری ہے، اور اس نمک کی کمی سے آنکھوں کے بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسرا اہم جزو میگنیشیم ہے جو بکری کے دودھ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بغیر ہڈیوں کا ٹیڑھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری صحت کی عمدگی کا دار و مدار، ریڑھ کی ہڈی کی مضبوطی پر ہے۔ اس کی مضبوطی کے بغیر زندگی بے لطف ہوتی ہے۔ بکری کے دودھ کے علاوہ میگنیشیم سیب، بادام، مالٹا، لیموں، کوکونٹ، کھجور، انجیر، انگور، آلو، بھٹے گندم، پالک اور انڈوں کی زردی میں پایا جاتا ہے۔ یہ سالٹ قسم کے زہریلے مواد ٹوکسینز کو تحلیل کر کے گردے اور مثانے کے راستے خارج کرتا ہے۔

سوڈیم جسم کے اندر نائم اور میگنیشیم کو سیال حالت میں رکھتا ہے۔ اگر سوڈیم یہ کام نہ کرے تو جسم کے اندر لائم اور میگنیشیم سخت ہو کر گردے اور مثانے کی پتھری کی شکل میں بہت تکلیف دے۔ یہی بڑا باعث ہے کہ اپنی خوراک میں کافی مقدار میں سوڈیم استعمال نہ کرنے والے ہزاروں لاکھوں اشخاص پتے، گردے اور مثانے کی پتھریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو ایسی چیزیں کثرت سے استعمال کرنی چاہئیں جن میں سوڈیم کافی مقدار میں موجود ہو۔ اس طریقے سے کنکریاں

گھل کر خارج ہو سکیں گی۔ اس مقصد کے لئے بکری کا دودھ غذا کے علاوہ کارگر دوا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کھیرا، گاجر، مولی، کھجور، انجیر، بادام، انگور، پالک کا ساگ اور کچے انڈوں کی زردی میں بھی سوڈیم موجود ہوتا ہے۔ وہ وقت عنقریب آنیوالا ہے جب بہت سی بیماریوں کا علاج صرف موزوں غذا کے ذریعے سے کیا جائے گا۔ یورپ اور امریکہ میں علاج بالغذا روز بروز ترقی کر رہا ہے، اور یہ علم گذشتہ پچیس تیس سال میں حیرت انگیز ترقی کر چکا ہے۔ یونانی اطبا اور آیورویدک حضرات کو بھی توجہ کر کے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ مزید معلومات بہم پہنچانے کی خدمت میں دے سکتا ہوں۔ صرف بکری ہی ایک جانور ہے جسے ٹی بی (دق) نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کا تازہ دودھ اُبالے اور جوش دئے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو بھی یہ دودھ گرم کئے بغیر دینا چاہئے۔ براہ راست تھنوں سے دودھ پینا ہی اس کے استعمال کا بہترین طریقہ ہے۔

بکری کے تھن اگر موند دئے جائیں اور انھیں روح کیوڑا ملے ہوئے پانی سے دھویا جائے یا دودھ میں چند قطرے روح کیوڑا کو ملا لیا جائے تو بکری کے دودھ کی بو کا سدباب ہو جاتا ہے۔ بکری کے دودھ میں قدرتی نمکوں کے علاوہ حیاتین بھی بکثرت ہوتی ہیں اور خاص ضرورتوں کے لئے حسب مرضی خاص سبزیاں اور پتے کھلا کر دودھ کی تاثیر اور خواص میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ شکر شامل کئے بغیر پھیکا دودھ نہ استعمال کر سکتے ہوں وہ چینی کی بجائے شہد خالص یا شیریں پھلوں کے رس کا اضافہ کر کے اسے زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ بنا سکتے ہیں۔

آپ اپنے معمول کے ناشتے میں مکھن، ٹوسٹ، چائے، کافی اور اوولٹین وغیرہ کے ساتھ بکری کے دودھ کا بھی اضافہ کر لیں۔ بلکہ حقیقی فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنے سابقہ ٹوس اور دیر ہضم ناشتے کے بجائے اس ہلکی اور مفید غذا اور دوا کی عادت ڈالیں۔ اس رنگ میں تبدیلی بالآخر کیے پسند آئے گی۔

شوکت تھانوی (مرحوم)

بناسپتی دودھ

آجکل نہ جانے کتنے نوجوان ایسے ہیں جو بجائے اپنی ماں کے گلیکسو کمپنی کے کاؤ اینڈ گیٹ کا۔ یا اور ہارلکس کمپنی سے دودھ بخشواتے پھرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ جب شیرخوار تھے تو اپنی ماں کا دودھ ہی نہیں پیا۔ پھر والدہ محترمہ سے دودھ بخشوائیں کیوں۔ جن کمپنیوں کا دودھ پی کر وہ پروان چڑھتے ہیں ان کمپنیوں کے دودھ کے حق کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر ضرورت پیش آجائے تو ان ہی سے وہ دودھ بخشوا سکتے ہیں۔ جو ان کی ماں کی قائم مقامی کرتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس شیشی کے دودھ پینے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بچے بڑھ کر ٹیڈی گرل، اور ٹیڈی بوائے بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو بوتل کی شکل کا بنائے پھرتے ہیں۔ ان میں اپنی ماں کے اوصاف کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ جس کا دودھ پیا ہے اسی کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

اب آپ دودھ کی شیشی کی شکل اپنے ذہن میں رکھ کر کسی ٹیڈی بوائے یا ٹیڈی گرل کو دیکھئے اور سچ سچ بتائیے کہ یہ انسان سے زیادہ دودھ کی شیشی سے مشابہ نظر آتے ہیں یا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک قد آدم شیشی ہے اور جو پھدکتی پھر رہی ہے۔ ٹیڈی بوائے اور ٹیڈی گرل کی تخلیق کی وجہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو ہنسی میں ٹال دیا جائے۔ اگر اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔ ورنہ انسان کا ایک دم سے بوتل نما بن جانا اور کیا معنی رکھتا ہے۔

بچے تو بچے اب تو ہم بالغ بزرگوں کو گائے بھینس کے بجائے عجیب عجیب چیزوں کا دودھ پینے کو ملا کرے گا۔ مثلاً پالک کے ساگ کا دودھ، گھاس کا دودھ، لوکی اور کدو کا دودھ — اور ہم دودھ والوں سے جا کر کہدیں گے کہ آدھ سیر شلجم کا دودھ دے دو۔ اور وہ جواب دیا کرے گا کہ شلجم کا دودھ تو ختم ہو گیا ہے کہئے تو ٹنڈے کا دودھ دیدوں یا تھوڑا سا گوبھی کا دودھ بھی ہے۔ اور اب ان ترکاریوں اور سبزیوں کا دودھ پی کر ہم چرندے اور پرندے بنتے رہیں گے، اس لئے برطانوی سائنس دان ان سبزیوں کے تحقیقاتی ادارے کے سربراہ ڈاکٹر فرینکلز کی سرکردگی میں سبزیوں سے دودھ دوہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ ہر قسم کی سبزیوں سے دودھ نکالا جا سکتا ہے۔ اگر ان سائنس دانوں کے یہ تجربے کامیاب ہو گئے تو وہ دن دور نہیں ہے جب ہم کو یہ بتا دیا جائے گا کہ چائے میں ڈالنے کے لئے کریلے کا دودھ بہترین ہوتا ہے۔ پڈنگ کے لئے ٹماٹر کا دودھ اچھا ہے۔ مٹھائیاں شہتوت کے دودھ کی بہترین ہوتی ہیں۔ اور دماغ کے لئے گھاس کا دودھ نہایت ہی مفید ہوتا ہے۔

گھی تو خیر ہم نہ جانے کب سے اسی قسم کی الّم غلّم چیزوں کا کھا رہے ہیں کبھی بنولے کا گھی کھا کر بیل بنتے گئے کبھی سبزیوں کا گھی کھا کر سبز ہوتے رہے۔ کبھی کسی اور قسم کا مصنوعی گھی کھا کر اپنے آپ کو

بناسپتی تیا تے رہے۔

یہ کھی تو اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایک بیمار دوست کی عیادت کو جو گئے تو معلوم ہوا کہ ان بیچارے نے ذرا سی بدپرہیزی کر لی ہے کہ کہیں سے خالص مکھن آگیا تھا وہ تھوڑا سا دال میں ڈال کر کھا لیا ہے بس یہ سارا فساد اسی کا ہے۔ بات یہ ہے کہ عادت تھی بناسپتی گھی کی اور کھا لیا خالص گھی۔ کہنے لگے کہ اس گھی کا کھانا تھا کہ گلا تو فوراً جکڑ لیا۔ پھر معدے نے بھی اس گھی کو کھانے سے انکار کر دیا۔ اور سارا نظام ایسا بگڑ گیا ہے کہ اس گھی پڑی دال کھانے کے بعد عناصر میں اعتدال ہی باقی نہ رہ سکا۔

اب یہ ترکاریوں اور سبزیوں کا دودھ جب عام طور پر بکنے لگے گا اور ہم آپ سب اس دودھ کے عادی ہو جائیں گے تو یہ گائے بھینس کا دودھ بھی اسی طرح نقصان پہنچانے لگے گا۔ بلکہ یہ دودھ تو اب بھی بعض اوقات نقصان پہنچا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم عادی ہو چکے ہیں گائے بھینس کے دودھ سے زیادہ پانی کے دودھ کے۔ لہٰذا اگر کبھی اتفاق سے خالص دودھ مل جاتا ہے تو معدہ ایسا خراب ہوتا ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ پہلے تو ہمیں دودھ میں پانی ملا کر پلایا گیا۔ اس کے بعد پانی میں دودھ ملا ہوا پیتے رہے جتنی کہ ہمارا معدہ پیراکی کا شوق پورا کرتا رہا۔ لہٰذا اب اگر کبھی خالص دودھ پی لیتے ہیں تو ہمارا آب رواں کا بنا ہوا معدہ اس بوجھ کا تحمل ہی نہیں کر سکتا اور ہم بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ہم تو بس اس قابل رہ گئے ہیں کہ ایک بالٹی پانی میں ایک پیالی دودھ ملا کر ہم کو دیدیا جائے تو دودھ پی کر ہم ورزش کرتے رہیں۔ اگر اس دودھ میں پانی کی ذرا بھی کمی کی گئی تو اچھی خاصی اور ہلکی پھلکی صحت خراب ہو کر رہ جاتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سبزیوں کا دودھ کس حد تک ہمیں موافق آتا ہے۔ مگر ان میں بھی ہلکے اور بھاری قسم کے دودھ ہوں گے۔ مثلاً گوبھی کا دودھ ظاہر ہے ثقیل ہوا کرے گا اور لوکی کا دودھ ہلکا اور زود ہضم ہوگا۔ بھنڈی کا دودھ معدے میں چپک جایا کرے گا اور کریلے کا دودھ خون صاف کرنے کے لئے بہترین تسلیم کیا جائے گا۔ اور لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر فوراً سمجھ لیا کریں گے کہ اس شخص نے کس سبزی اور کس ترکاری کا دودھ پیا ہے۔ مثلاً کوئی صاحب اگر نیم کے درخت پر بیٹھے نظر آئے تو سمجھ لیا جائے گا کہ انھوں نے کریلے کا دودھ پیا ہے اور یہ کریلا اور کریلا کا دودھ ان کو نیم پر چڑھائے ہوئے ہے۔ کوئی صاحب اگر آپ کے پاس آکر چپک جائیں اور کسی طرح آپ کا پیچھا نہ چھوڑیں تو سمجھ لیجئے گا کہ انھوں نے بھنڈی کا دودھ پیا ہے۔ کوئی صاحب آپ کی ہر بات کا احمقانہ جواب دیں تو آپ خود سمجھ لیں گے کہ یہ گھاس کا دودھ پی کر آئے ہیں۔

اور اسی طرح ہر ترکاری کا دودھ الگ الگ کیفیات و صفات رکھتا ہوگا۔ بہر صورت اب تو انہی ترکاریوں کا دودھ پینا ہوگا اس لئے کہ مویشی تو کاٹ کاٹ کر ہم سب کھا چکے ہوں گے۔ لہٰذا اب تو سبزیوں ہی کے دودھ پر ہی قناعت کرنا پڑے گی اور اسی دودھ سے دودھوں نہانا اور پوتوں پھلنا پڑے گا۔

محمد عبد الحق

ٹافی

بچوں کا محبوب صفحہ

محمد عثمان

تیسرے درجے میں ریل کا سفر

دوستو! یہ ان دنوں کی بات نہیں ہے جب ہم انگریزوں کے غلام تھے اور ریلوں میں کالوں اور گوروں کے ڈبے الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ آج ہم آزاد ہیں۔ ریلیں ہماری ملکیت ہیں۔ ریلوے ملازمین ہمارے ملازم ہیں۔ اب سفر کرتے ہوئے ہمیں انگریزوں کے بجائے ٹھگوں کا خوف رہتا ہے۔ اب ہر چیز خالص سودیشی ہے۔ ریل سے لے کر ڈرائیور تک۔

حال میں مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں جس اسٹیشن سے روانہ ہونے والا تھا وہاں سے دہلی کے لئے ایک خالی رزرویشن ڈبہ لگتا ہے۔ میں ٹکٹ گھر کے بابو کو، دس رزرویشن ٹکٹ پانچ روپئے زیادہ دے کر حاصل کرنے کے بعد، سامان لئے اسٹیشن پر کھڑا گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی آنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ میں ایک بک اسٹال پر اخبار دیکھ رہا تھا کہ "گاڑی آگئی" کا شور مچ گیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو واقعی گاڑی آرہی تھی۔ میں گاڑی وقت سے پہلے آنے پر خوش ہوا۔ میں سامان لے کر لپکا اور ڈبے میں گھسنے کے لئے پر تولنے لگا کہ اسٹیشن ماسٹر کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دی، کہ مسافروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ یہ دہلی جانے والی گاڑی ہے مگر کل والی، جو کسی وجہ سے ساڑھے تیئیس ۲۳ گھنٹے لیٹ آئی ہے۔ جن مسافروں کے پاس کل والی گاڑی کے ٹکٹ ہوں وہ اس گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ آج کی دہلی جانے والی گاڑی صرف چار گھنٹے دیری سے آرہی ہے۔

چار گھنٹے جوں توں کاٹے اور خدا خدا کر کے وہ گاڑی آئی جس کے ٹکٹ ہم نے لئے تھے۔ گاڑی رکی تو خالی ڈبہ دیکھ کر سبھی گھس پڑے۔ جب ہم نے یہ لوٹ مار دیکھی تو ہم بھی کسی نہ کسی طرح ڈبے میں داخل ہو گئے۔ ٹکٹ نکال کر سیٹ نمبر تلاش کیا تو ہماری سیٹ پر پہلے سے ایک مہاشے کو براجمان دیکھا۔ جو بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے کچھ راجپوت قسم کے لگ رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں بہت گھبرایا کہ یا خدا اس دیو سے کس طرح کہیں کہ یہ ہماری جگہ ہے۔ تھوڑی دیر تک تو ہم ڈبہ کا جغرافیہ دریافت کرتے رہے، پھر احتیاطی تدبیریں سوچنے کے بعد چہرے پر مسکراہٹ لا کر بڑی میٹھی آواز میں آہستہ سے کہا بھائی صاحب یہ جگہ شاید ہماری ہے۔ آپ غلطی سے اس پر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ دیکھئے ٹکٹ پر یہی نمبر لکھا ہے۔ اس دیو نے ہماری طرف نظریں جو اٹھائیں تو ہم بیہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ کچھ اس کی آنکھوں کا جلال کچھ ہمارا اضمحلال تھا کہ ہم اچھے خاصے رعشہ کے مریض بن گئے۔ ہم نے اپنی اس حالت کا فائدہ اٹھایا اور جھٹ پینترا بدل کر کمزور سی آواز میں لرزتے ہوئے کہا شرما جی! اگر میں اس مرض میں مبتلا نہ ہوتا تو آپ کو کبھی تکلیف نہ دیتا۔ وہ دیو یہ سن کر کچھ پسیجا اور ہماری سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور ساتھ ہی اپنا صندوق جو اوپر کی برتھ پر رکھا تھا اتار کر ہماری سیٹ کے نیچے جہاں ہمیں پیر رکھنا تھا رکھ دیا اور اس پر بیٹھ کر کھڑکی کے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ اب تو ہم اور بھی سٹپٹائے کہ اب کیا کیا جائے۔ ڈر یہ تھا کہ اب اگر کچھ کہتے ہیں تو کہیں مار نہ بیٹھے۔ لیکن ہمیں دہلی تو جانا ہی تھا اور اسی سیٹ پر بیٹھ کر جانا تھا اس لئے ایک مرتبہ پھر سارے ہوش و حواس

جمع کئے اور آنکھوں پر چشمہ چڑھا لیا تاکہ کچھ رعب پڑے اور کہا جناب یہ ریزرویشن ڈبہ ہے۔ آپ اس طرح بیٹھیں گے تو میں کہاں بیٹھوں گا ؟ اتنا کہنا تھا کہ اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ وہ گرج کر بولا دیکھو جی تم نے سیٹ رزرو کرائی ہے ڈبہ نہیں۔ میں تمھاری سیٹ پر نہیں اپنے صندوق پر بیٹھا ہوں۔ سمجھے۔ میں ڈر کے مارے سہم گیا۔ اور جوتے اتار کر اپنی سیٹ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ کیونکہ پیر لٹکانے کی جگہ ہی نہ تھی۔ خدا خدا کر کے گاڑی روانہ ہوئی اور کئی گھنٹے اسی طرح گذر گئے اور کوئی نیا واقعہ درپیش نہیں ہوا۔ ہماری گاڑی میل تھی پسنجر نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے ملک میں میل اور پسنجر میں کوئی فرق ہی نہیں ہے پسنجر ہر اسٹیشن پر رکتی ہے اور میل ہر دو اسٹیشنوں کے بیچ میں۔

ہم اکڑوں بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے اور وہ راجپوت دو سیٹوں کے درمیان پیر رکھنے کی جگہ پر بستر بچھا کر خراٹے لے رہا تھا کہ ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ہمارے سر پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہم نے آخری وقت سمجھ کر آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا لیکن جب روح حلق میں پھنس کر رہ گئی تو آنکھیں کھول کر دیکھنا پڑا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پیٹی کھڑکی کے ذریعہ ہمارے سر پر رکھی جا چکی ہے، اور اس پر دوسری تہہ جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہم نے معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا اور لگے چیخنے۔ ہماری چیخ پکار سن کر راجپوت کی آنکھ کھل گئی۔ وہ غراتا ہوا اٹھا۔ شاید اسے ہم پر رحم آگیا تھا یا ان کو اپنی آرام دہ جگہ خطرے میں محسوس ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی ہو، اس نے پوری قوت سے پیٹی کو کھڑکی سے باہر ڈھکیل دیا۔ ہم نے ویسی ہی آواز باہر سنی جو ہم اپنے سر پر محسوس کر چکے تھے۔ پھر سکون ہو گیا۔ وہ خراٹے اور میں سسکیاں بھرتا رہا۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی یہاں تک کہ دہلی آگیا۔ اب جو ہم پیروں پر کھڑے ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم چھ مہینے تک زمین دوز رہنے کے بعد آج اٹھے ہیں۔ پیر باقاعدہ لرز رہے تھے۔ کھڑا رہنا محال تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ کمر کی ہڈی غائب تھی۔

ہم نے بہتر یہی سمجھا کہ انٹرویو میں جانے سے پہلے اسپتال ہو لیں تو بہتر ہوگا۔

ننھی منی کہانیاں

مرسلہ زاہدہ خاتون

"آزادی کا دھوکا"

ایک رند مشرب فقیر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا مولوی بابا! ہمیں شراب پلوا دو۔ شاہ صاحب نے ایک روپیہ نذر کیا اور کہا جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پیو۔

فقیر بولا ہم نے تو آپ کا بڑا نام سنا تھا، آپ تو قید میں ہیں۔ شاہ صاحب نے کہا قید میں تو آپ بھی ہیں — فقیر نے کہا نہیں" شاہ صاحب نے فرمایا اگر قید میں نہیں ہو تو غسل کرو اور جبہ اور عمامے آراستہ ہو کر مسجد میں نماز پڑھو، ورنہ یوں سمجھ لو کہ تم رندی کی قید میں ہو اور ہم شریعت کی قید میں۔ تمھاری آزاد خیالی خام ہے۔

یہ سن کر فقیر نے شاہ صاحب کے قدم پکڑ لئے اور بولا مولوی بابا! بے شک۔ ہمارا قول غلط ہے اور آزادی کا دم بھرنا خیال خام ہے۔

مالک اور غلام

کسی امیر سے اس کے ملازم نے نماز کے لئے اجازت مانگی اور مسجد میں جا بیٹھا۔ دیر ہوئی تو مالک نے پکارا کہ اتنی دیر سے کیا کر رہا ہے؟

غلام نے اندر سے جواب دیا: "باہر جانے نہیں دیتے"۔

"کون؟" مالک نے پوچھا۔

"وہی جو آپ کو اندر آنے نہیں دیتے"۔ غلام کا جواب تھا۔

سخی لڑکا

کسی کنجوس دولت مند کا ایک ہی لڑکا تھا۔ کنجوس مر گیا تو تمام دولت لڑکے کے ہاتھ آئی۔ لڑکا بڑا سخی تھا۔ اس نے مسجدیں

کنوئیں اور تالاب بنائے، حاجت مندوں کو دیا اور بھوکوں کو کھلایا۔
ایک دن کسی نے لڑکے سے کہا تمھارے باپ نے یہ دولت بڑی محنت سے جمع کی ہے مگر تم اسے بڑی بے دردی سے خرچ کر رہے ہو۔
لڑکے نے جواب دیا، میرا باپ دولت کا چوکیدار تھا، قبر میں کیڑوں کی خوراک بنا ہوا ہے۔ میں تو اس دولت کو خدائی بنک میں جمع کر رہا ہوں جہاں ایک ایک کے ستر ستر ملیں گے۔

★

مہاراشٹر کالج

انجم عباسی

نیا افق ہے
نیا فلک ہے
زمیں کچھ نکھر رہی ہے لیکن
بہار سازوں نے جس کو آدابِ گلستانی سکھا دیئے ہیں
ہوائیں عنبر فشاں بنی ہیں
فضائیں اب زر نگار سی ہیں
کلی کلی پر نکھار سا ہے
نئی جوانی پرانے جسموں میں دوڑتی ہے
چلو رگوں کا لہو نچوڑیں
اور اس کو رشکِ ارم بنائیں

پیغمبروں کی دعائیں

ابراہیم قاضی
شیر گاؤں، رتناگیری

قرآن حکیم کی متعدد آیات شاہد ہیں کہ جب کبھی خدا کے عظیم پیغمبر آزمائش، امتحان یا ابتلاء سے دوچار ہوئے یا انھیں کسی دکھ، مصیبت یا غم نے آگھیرا تو انھوں نے صرف فاطر السموات و الارض ہی کو پکارا اور انکساری و عجز سے مملو دعائیں مانگیں۔ اس سے ایک سبق ملتا ہے کہ کسی نبی اور پیغمبر نے اپنے زمانے سے پہلے کے نبی یا پیغمبر کو یا اس کے تقدس، قرب اور عظمت کو واسطہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہستی کو پکارا۔ اور اسی کو مسبب الاسباب جانا۔ پیغمبروں کی ان دعاؤں میں ہمارے لئے سبق ہے۔ آیئے ہم غور کریں۔

حضرت آدم کی دعائیں

حضرت آدم اور ان کی زوجہ حضرت حوّا کو جنت کی سرمدی نعمتوں سے محظوظ ہونے کا حکم ملتا ہے: "اے آدم! تم اور تمھاری بیوی بہشت میں رہو، پھر جس جگہ سے چاہو کھاؤ اور پیو اور اس درخت کے پاس مت جاؤ۔" (سورہ بقرہ) شیطان درخت کے قریب جانے کا وسوسہ پیدا کرتا ہے اور آخرکار ہبوطِ آدم کا سانحہ پیش آتا ہے۔ اس عالمِ بے بسی میں دونوں دونوں خدائے وحید کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں اور اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں۔

"اے ہمارے رب، ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو نے ہماری مغفرت نہ کی تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔" (اعراف)

آج بھی اسی قسم کے الفاظ ہر وہ شخص کہتا ہے جو خطا کر کے شرمندہ ہوتا ہے اور پھر قلب و ضمیر کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا ہے۔

حضرت نوحؑ کی دعائیں

جب طوفان نمودار ہوا اور لوگ پانی میں غرق ہونے لگے تو حضرت نوحؑ نے جوشِ پدری سے مغلوب ہو کر اپنے بیٹے کو پکارا کہ کشتی میں آجاؤ۔ لیکن سرکش اور مغرور بیٹے نے کہا "میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں۔ وہ مجھے غرقابی سے بچا لے گا۔" (ہود)

"اے نوح! یہ تیرے اہل میں سے نہیں۔ یہ بدکردار ہے۔ پس تجھے ایسا سوال نہ کرنا چاہئے جس کے بارے میں تجھے علم نہ ہو۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن۔"

فرمانِ خداوندی سنتے ہی مغفرت و رحمت کے لئے التجا کرتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ بدکردار اور نافرمان اور سرکش بیٹے، بیٹے نہیں رہتے اور رضائے حق پر راضی ہو کر سربسجود ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں

آپ وہ جلیل القدر پیغمبر ہیں جنہوں نے اس وقت توحید کا پیغام سنایا جب خدا کا نام لیوا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ جس قوم میں آپ پیدا ہوئے وہ مشرک اور بت پرست تھی۔ آپ کا اپنا خاندان بت پرستی اور بت سازی میں مشہور تھا۔ آپ نے دعوتِ حق کی ابتدا گھر سے شروع کی۔ اپنے والد کو بت پرستی اور بت تراشی سے منع کیا۔ باپ نہ مانا۔ آپ نے گھر کو خیرباد کہا اور قوم کو ہدایت دینے کے لئے قریہ قریہ پھرنا شروع کیا۔ پروہت اور مذہبی پیشواؤں نے حضرت ابراہیمؑ کو سخت ترین سزا دینے کا فیصلہ کیا یعنی یہ کہ ان کو زندہ آگ میں جلا دیا جائے۔

آگ روشن کی جاتی ہے اور یہ آگ کئی روز تک جلتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی تپش سے پتھر بھی دہکنے لگتے ہیں۔ نمرود خود موقع پر موجود رہتا ہے اور حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ادھر غیب سے ندا آتی ہے: "اے آگ، ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا۔" حضرت آگ سے صحیح سلامت نکل آتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی ہو چکی تھی لیکن کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے علام الغیوب کی بارگاہِ اقدس میں دعا مانگی: "اے میرے رب، مجھے کوئی نیک لڑکا بخش۔" (الصافات) جلیل پیغمبر کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ہم نے خوشخبری دی اس کو ایک حلیم لڑکے کی" (الصافات)

اور پھر خواب دیکھتے ہیں تو اپنے لختِ جگر کو رضائے الٰہی کی خاطر قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور خدا کی راہ میں اس عظیم الشان قربانی کو ساری امت کے لئے دستور بنا دیا۔ عید قربان حضرت اسمٰعیل کی قربانی ہی کی ایک یادگار ہے۔

پھر خداوند کریم حضرت ابراہیمؑ کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیتا ہے۔ روئے زمین پر یہ پہلی عبادت گاہ بنی تھی۔ جس کی تعمیر میں آپ کے فرزند جلیل حضرت اسمٰعیل بھی شریک تھے۔ قرآن مجید منظر کشی کرتا ہے: "اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے تھے اور دعا کرتے تھے: اے ہمارے پروردگار ہم سے قبول فرما، بیشک تو ہی سمیع و علیم ہے۔ اے پروردگار ہم کو اپنا حکم بردار بنا اور ہماری اولاد کو بھی اپنی فرمانبردار جماعت بنا۔ اور ہمیں حج کے قاعدے بتا اور ہم کو معاف کر۔ اے خداوند کریم اسی جماعت کے اندر ایک رسول بھیج جو ان لوگوں کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی باتیں سکھلائے اور انہیں اس طرح پاک کرے۔ بیشک تو ہی عزیز الحکیم ہے۔"

سورہ شعرا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کی مغفرت کے لئے اس انداز فکر سے دعا مانگتے ہیں: "اور میرے باپ کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور پھر جس روز سب زندہ ہو کر اٹھیں گے اس روز مجھے رسوا نہ کرنا جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، صرف قلبِ سلیم رکھنے والوں کی بات..."

حضرت ابراہیم کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کو مکہ چھوڑ آئیں۔ اس وقت یہ ایک غیر آباد اور بے آباد علاقہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے بچے اور بیوی کو وہاں لے جا کر چھوڑ دیا۔ لوٹتے وقت ایک گھاٹی پر کھڑے ہو کر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگی: "اے ہمارے رب! ایک ایسے علاقے...

(باقی صفحہ ...)

مکتی باہنی

ذیل کے مضمون میں ہندوستان ٹائمز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر شری جی. ایس بھارگو کی ایک ریڈیائی تقریر کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں مشرقی بنگال میں مکتی باہنی فوج کی سرگرمیوں اور اس کے طریق کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تقریر شری بھارگو نے آل انڈیا ریڈیو کے اسپاٹ لائٹ پروگرام میں نشر کی تھی۔

پاکستان کے فوجی ارکان کو جب بھی بحری جہاز کے ذریعے مشرقی بنگال بھیجا گیا تو ان سے یہی کہا گیا کہ بھارت کی طرف سے فوجی خطرہ بڑھ رہا ہے چنانچہ یہ فوجی ارکان یہی سمجھتے تھے کہ مشرقی بنگال میں یا تو انہیں بھارتی فوج سے واسطہ پڑے گا یا پوربی بنگال کے سپاہیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ مگر جب وہ مشرقی بنگال پہنچے تو وہاں یہ سب کچھ دیکھنے میں نہیں آیا۔ انھیں ان کی بجائے ایک ایسی ان دیکھی فوج کا سامنا کرنا پڑا جو سب جگہ ہے اور کہیں نہیں ہے۔ اس فوج اور دیہات میں کام کرنے والے ماہی گیروں اور کسانوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے کیونکہ اس میں عوام کے سبھی طبقوں کے لوگ شامل ہیں۔ یہی مکتی باہنی فوج ہے۔

مکتی باہنی کا طریق کار

بہت سے لوگ یہ جاننا چاہیں گے کہ مکتی باہنی کیا ہے اور یہ کیسے اپنا کام کرتی ہے۔ پاکستان کی فوج تقریباً تین ہفتے کی فوجی کارروائی کے بعد پوربی بنگال میں اپنا کنٹرول قائم کر سکی اور وہاں کے عوام جس طرح کھل کر مزاحمت کا ثبوت دے رہے تھے اور اس میں کچھ عارضی کمی آئی۔ مگر پوربی بنگال کی رجمنٹ کے جوانوں نے خود کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی اور اس طرح مکتی باہنی فوج بن گئی۔ اس میں ایسٹ پاکستان رائفلز کے بنگالی جوان بھی شامل ہو گئے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس کی طرح ایک جمعیت ہے۔ اس میں کچھ بنگالی بھی شامل ہو گئے۔ مجاہدین کی جماعت شہری دفاعی تنظیم کا نام ہے۔ اس طرح مکتی باہنی وجود میں آئی۔ اگرچہ اس میں ابتدا میں کم ہی لوگ تھے مگر بعد میں ہزارہا لوگوں نے اس میں اپنی خدمات پیش کیں۔ بعد ازاں پاکستانی بحریہ اور فضائیہ کے عملے میں پوربی بنگال کے جو ارکان تھے وہ بھی مکتی فوج میں شامل ہو گئے۔

تاہم مکتی باہنی کے افسروں یا جوانوں کی آسانی سے نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ اس فوج کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ ہی اس کا اپنا کوئی یونیفارم۔ اس فوج کے دستے گاہ بہ گاہ اپنا ٹھکانہ بدلتے رہتے ہیں تاکہ یہ دشمن کی نگاہ میں نہ آ سکیں۔ انھیں اپنے سامان کی نقل و حرکت کے لئے پکے پلوں یا ڈامر وغیرہ کی سڑکوں کی ضرورت نہیں۔ پانی بھرے میدانوں اور دلدل اور کیچڑ والے علاقوں اور گلیوں سے وہ اپنا راستہ

بنا لیتے ہیں۔ ان کے پیروں میں جوتا بھی نہیں ہوتا کیونکہ ربر کے سلیپر جو وہ پہنتے ہیں وہ اس علاقے سے گذرنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ان کے پاس ایسی گاڑیاں بھی نہیں جن کے لئے پیٹرول درکار ہو یا جن کی دیکھ بھال یا مرمت کی ضرورت پڑے۔ ان کا مواصلاتی نظام بھی براہ راست آدمیوں سے متعلق ہے۔ یہی کوئی انھیں رسد پہنچاتے ہیں خواہ وہ کہیں بھی متعین ہوں۔ منجملہ دیگر مقاصد کے ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ فوج کے مقابلے میں اپنے عوام کا حوصلہ بلند رکھیں۔ وہ رنگین لنگی باندھتے ہیں۔ وہ سفید کرتا پہننے سے اس لئے گریز کرتے ہیں کہ مبادا رات کے وقت وہ دشمن کی نگاہ میں آجائیں۔ وہ اپنے ہمراہ ہلکا سامان رکھتے ہیں تاکہ اسے وہ اپنے کندھوں پر ساتھ رکھ سکیں۔ بالعموم ان کے پاس ہلکی مشین گن اور ہتھ گولے ہوتے ہیں۔ مکتی باہنی کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تنظیم سے بھی عاری ہے۔ مکتی باہنی مختلف حلقوں میں بٹی ہوئی ہے اور یہ حلقے دراصل وہ ہیں جہاں وہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ہر سیکٹر یا حلقے کا کمانڈر اپنے آدمیوں کو مخصوص کارروائیوں کے لئے ترغیب دیتا ہے۔

چونکہ مکتی باہنی کے جوان ڈھاکہ اور کومیلا ایسی جگہوں پر سرگرم عمل ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں سبھی جگہوں پر جاری ہیں۔ مکتی باہنی میں جن نوجوانوں کو بھرتی کیا گیا ہے وہ لڑائی میں پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے سپاہی نہیں ہیں۔ ان کی خاص ذمہ داری چھاپہ مار قسم کی سرگرمیاں ہیں۔ اگرچہ چھاپہ مار کی اصطلاح اس کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جو انتہائی ہوشیار گوریلا ہو اور اپنے کام کا ماہر ہو۔ یہ چھاپہ مار پل اڑا دیتے ہیں، بجلی کے پلانٹ تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ چھاپہ مار ایسی جگہوں پر جہاں کہ فوج رہتی ہو دھاکے کیا کرتے ہیں۔ البتہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے سابق تربیت یافتہ افراد پاکستانی فوج سے براہ راست ٹکر لیتے ہیں۔ مکتی باہنی کے ارکان ایک خاص کاز کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مکتی باہنی کے تربیت پانے والے ارکان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک طالب علم اسحاق بھی ہے۔ یہ پوربی بنگال کی جدوجہد آزادی کی تحریک کا حامی ضرور تھا مگر ایک عام آدمی کی طرح۔ لیکن جب پاکستانی فوج نے ان کے والدین کو مار ڈالا اور اس کی بہن کی بے عزتی کی تو اس نے قسم کھائی کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لےگا۔ اپنے ملک کی جدوجہد آزادی کے تئیں اس کے جذبے کی شدت اس وجہ سے اور بڑھ گئی کہ اسے پاکستانی فوج کے تئیں نفرت ہو گئی۔ اب وہ موت کے خوف سے بالکل آزاد ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے ایک دو پاکستانی فوجیوں کو ہلاک کر دے۔ اسی طرح مکتی باہنی کے ارکان میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کو پاکستانی فوج کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار ہونا پڑا ہے۔

"ہم ہند کے سپاہی"

سعید کنولؔ ترناگردی

"ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی"

○

یوں دشمنوں کے حق میں تلوار ہو گئے ہیں
چنگاریاں نہ سمجھو انگار ہو گئے ہیں
مجبوریاں کہاں کی مختار ہو گئے ہیں
ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی

اپنے وطن پہ جانیں قربان کر رہے ہیں
دشواریوں کو اپنی آسان کر رہے ہیں
اپنی خوشی سے ہم یہ اعلان کر رہے ہیں
ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی

بیجا ستم کسی پہ کرتے نہیں وہ ہم ہیں
وعدوں سے اپنے ہرگز پھرتے نہیں وہ ہم ہیں
تلوار، توپ و بم سے ڈرتے نہیں وہ ہم ہیں
ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی

یہ کس نے کہہ دیا ہے آسان ہم کو جانو!
دریائے قہر کا اک طوفان ہم کو جانو
فتح و ظفر کی ہم ہیں پہچان ہم کو جانو
ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی

دیکھا نہیں ہے ہم کو دیکھے وہ آزما کے
رکھ دیں گے ہم نشان ظلم و ستم مٹا کے
رکھتے نہیں قدم ہم پیچھے کبھی ہٹا کے
ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی

میدانِ جنگ میں ہم جوہر دکھا رہے ہیں
بنکر فتح کے بادل ہر سمت چھا رہے ہیں
پیغام یہ کنولؔ کا ہر سو سنا رہے ہیں
ڈرتے نہیں کسی سے ہم ہند کے سپاہی
دے دینگے جاں خوشی سے ہم ہند کے سپاہی

جمہوریت میدانِ عمل میں

(ایک نامہ نگار کے قلم سے)

اگر آپ جمہوریت کو میدانِ عمل میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کی توثیق کرنا چاہتے ہیں تو اتوار یا چھٹی کے سوائے کسی بھی دن آپ وزیر اعظم کی قیام گاہ پر چلے جائیے، آپ رنگا رنگ کپڑوں میں ملبوس کثیر سے راس کماری تک کے باشندوں کو اس عمارت میں داخل ہوتے دیکھیں گے۔

زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مختلف عمر کے یہ لوگ پیدل چل کر یا بیل گاڑیوں، بسوں اور کاروں میں سوار ہو کر اپنی وزیر اعظم کو دیکھنے آتے ہیں۔ دنیا کی عظیم ترین جمہوریت کی وزیر اعظم سے بیز اُن سے وقت لئے ملاقات کو آنے والے لوگوں کو اس طرح آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھنا یقیناً ایک یادگار اور قابلِ دید نظارہ ہوتا ہے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ہر صبح پونے نو بجے اپنے مکان سے متصل اُس عمارت کی طرف چل دیتی ہیں جہاں سبزہ زاروں پر سینکڑوں لوگ ان سے ملاقات کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہ عمارت گذشتہ چند مہینوں سے وزیر اعظم کے دفتر کی حیثیت سے استعمال کی جا رہی ہے۔

ان ملاقاتوں میں اُن یاتریوں کی ایک پارٹی بھی ہو سکتی ہے جو بھارت کے تمام مقدس مقامات کی زیارت کے لئے نکلے ہیں، اور وہ نوشادی شدہ جوڑے بھی ہو سکتے ہیں جو وزیر اعظم سے اُن کا آشیرواد لینے آتے ہیں تاکہ ان کی زندگی کا سفر خوشگوار رہے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قومی فنڈ میں اپنے عطیات دینے آتے ہیں جنھیں وزیر اعظم شکر گذاری سے قبول کرتی ہیں۔

ارے ہاں! ان وفود کو تو بھول ہی گئے جو وزیر اعظم کی خدمت میں اپنی عرضداشتوں میں میونسپل باڈیز سے لے کر حکومت تک تمام سرکاری اداروں کے خلاف شکایتیں درج ہوتی ہیں۔ بھارت کی ۵۴ کروڑ آبادی کے مسائل کے علاوہ وزیر اعظم ان کی مشکلات کو بھی سنتی ہیں۔ بھارت اور غیر ملکوں کے سیاح جو راجدھانی آتے ہیں ان کے سفر نامے میں وزیر اعظم کی قیام گاہ کے دورے کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ چھوٹے وفد جو پہلے سے وقت لے کر آتے ہیں اکثر دفتر کے بجائے وزیر اعظم کے مکان ہی میں بلا لئے جاتے ہیں۔

جب ایک غیر ملکی خاتون سے اُن کی رائے مانگی گئی تو انھوں نے کہا: "جمہوریت کو میدانِ عمل میں دیکھنا کس قدر خوش آفریں ہے"۔ بھارت کے ایک دور دراز مقام کے ایک ضعیف العمر باشندہ نے بھی وزیر اعظم کو دیکھ کر اتنی ہی خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے بڑی جذباتی آواز میں بتایا کہ وزیر اعظم کو دیکھ کر اس کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو گئی ہے۔

اس شمارہ میں

"منظر پس منظر" اور "پتے کی بات" شامل اشاعت نہیں ہیں۔ ہمارا ملک ہندوستان جن ہنگامی حالات سے دوچار ہوا ان کے پیشِ نظر ہم کوئی نیا منظر اور اس کا پس منظر پیش نہیں کر سکے۔ اسی طرح سب باتوں کی ایک بات بلکہ "پتے کی بات" یہ ہوئی کہ تیرہ راتیں تاریکی میں گذارنے کے بعد جب ہم نے اُجالے کی طرف قدم بڑھایا تو دنیا کے نقشے میں ہمیں ایک نیا دیش نظر آیا "بنگلہ دیش"۔ ہم اس دیش کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اسی دیش کے لئے ہم نے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔ زیر نظر شمارہ میں مذکورہ دو مستقل عنوانات کی عدم موجودگی بھی ایک قربانی ہے۔

ادارہ

اطلاعات و معلومات

ہم کیا کریں کیا نہ کریں

ہندوستان ایک غریب ملک ہے جس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ پیٹ بھرنے سے بھی قاصر ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں دعوتوں اور شادی بیاہوں میں لاکھوں روپئے پانی کی طرح بہادئے جاتے ہیں۔ یہ رجحان عام حالات میں بھی قابلِ نفریں ہے اور موجودہ ہنگامی حالات میں تو ایسا کرنے والے بلاشبہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔ ملک کی محبوب لیڈر مسز اندرا گاندھی اپنی تقریباً ہر تقریر میں عوام سے یہی اپیل کرتی ہیں کہ وہ کفایت شعاری سے کام لیں اور ملکی و قومی وسائل کو ضائع نہ کریں — وقت آگیا ہے کہ وہ قوم اور ملک سے محبت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے غیر اہم اخراجات میں کمی کرکے قومی دفاعی فنڈ کو مضبوط بنائیں۔

یومِ حقوقِ انسانیت

حسبِ فرمائش گورنمنٹ آف مہاراشٹر مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو رتناگیری کے مشہور و معروف مستری ہائی اسکول میں یومِ حقوقِ انسانیت بڑے کرّوفر سے منایا گیا جس میں اسکول کے طلبہ کے علاوہ اور لوگوں نے بھی شرکت کی۔ جلسے کی صدارت کے فرائض جناب آدم نصرت صاحب نے انجام دیئے اور حقوقِ انسانیت پر ایک تفصیلی اور بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اسکول کے صدر مدرس جناب سولکر صاحب نے جلسے کی غرض و غایت اور آدم نصرت صاحب کا تعارف پیش کیا۔ جلسے کے اختتام پر جناب پٹھان صاحب (رہبر) نے حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

نمایاں کامیابی

حسبِ سابق رتناگیری کے مشہور و معروف مستری ہائی اسکول کے ۱۲ طلباء نے امسال بھی "ملک مہاراشٹر زندہ باد" کے ابتدائیہ امتحان میں شرکت کی اور ان میں سے ۹ طلبہ امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوگئے۔ جن میں حمزہ حبیب اللہ قاضی نے ۸۹ مارکس حاصل کرکے اسکول کا نام اونچا کیا۔ لہٰذا صدر مدرس جناب سولکر صاحب اس سلسلے میں محترم پٹھان صاحب اور محترمہ تاج بی آپا کے شکرگذار ہیں انھوں نے شب و روز کی محنت و توجہ سے اس زرّیں کامیابی کے حصول میں تعاون فرمایا۔ (نامہ نگار آئی اے سولکر)

بمبئی کی نئی شریف بیگم نصراللہ

مہاراشٹر اسٹیٹ مہیلا کونسل کی صدر مسز محبوبہ نصراللہ کو آئندہ کے لئے شریف آف بمبئی مقرر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو شری شادی لال جین سے اپنے نئے عہدہ کا چارج لیا۔ مسز محبوب نصراللہ سابق پریسیڈنسی مجسٹریٹ شری نصراللہ کی رفیقۂ حیات اور عظیم سماجی کارکن ہیں۔

برموقع و برمحل

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا پارلیمانی فیصلہ نہ صرف بروقت بلکہ دانشمندانہ اور تاریخی بھی ہے۔ اس کے لئے ہماری محبوب

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی مبارکباد کی مستحق ہیں۔
جنگ کے اس نازک موقع پر یہ لازم ہے کہ اپنے اپنے
علاقہ میں امن وامان اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھیں — جہاں
بلیک آؤٹ ہے۔ وہاں بلیک آؤٹ کی سختی کے ساتھ پابندی کریں اور
سول ڈیفنس کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

بمبئی عظمیٰ کی کسی عبادت گاہ میں قابل اعتراض چیز نہیں ملی

بمبئی عظمیٰ کے پولیس کمشنر نے وضاحت کی ہے کہ
بمبئی عظمیٰ میں کسی عبادت گاہ میں کسی بھی وقت کوئی ٹرانسمیٹر پایا نہیں
گیا۔ لوگوں سے درخواست کی جاتی ہے وہ اس معاملہ پر بھی کسی افواہ کو
کوئی اہمیت نہ دیں۔

دس سال کے بعد پھر سے پہلی بار کرندڈا مسجد میں اجتماعی نماز عید الفطر

کرندڈا تعلقہ سنگمیشور کے مسلم جماعتوں میں دس سال
سے تفرقہ پڑا ہوا تھا۔ خدا کے فضل وکرم سے کارپردازان کونڈ ورا
کی کوشش نے باہمی تفرقہ کو مٹا دیا اور فریقین نے ربط، اتحاد اور
پرخلوص نیت سے نماز عید الفطر مسجد میں پہلی بار ادا کی۔ یہ قدم قابل مبارکباد ہے۔

اردو اسکول بھانبرڈا کا افتتاحی جلسہ

اردو اسکول بھانبرڈا تعلقہ رتناگیری کی نئی عمارت کا
افتتاح ایجوکیشنل کمیٹی ضلع پریشد رتناگیری کے صدر جناب داداصاحب
شروے کے ہاتھوں کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت رتناگیری کے مشہور تاجر
اور سماجی کارکن جناب ایم۔ ڈی نائیک صاحب نے کی، اس کی اہمیت

اور غرض وغایت پر گرام پنچایت کے چیئرمین جناب راجپورکر صاحب،
دھامنکر، عباس مجرم وغیرہ معزز حضرات نے روشنی ڈالی۔ اختتام
جلسہ پر جناب مقام صاحب نے حاضرین اور معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

کردھنڈا میں عید اور کار سعید

عید کا دن یوں بھی خوشی اور انبساط کا دن ہے۔ پھر اس
دن لوگوں کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہو جائے تو خوشیوں کا کیا ٹھکانہ؟
باشندگان موضع کردھنڈا بھی عید کے روز ایسی ہی دوہری خوشیوں
سے ہمکنار ہوئے۔ جبکہ ان کے گاؤں میں اسی روز بجلی کی روشنی کا افتتاح
عمل میں آیا۔ سارا گاؤں بجلی کے قمقموں سے جگمگا اٹھا اور اس خوشی کے
عالم میں بعد نماز ظہر گاؤں والوں کا ایک جلوس جناب عبدالکریم اجی
(سرپنچ) کی قیادت میں نکلا اور عید ملن کے ایک شاندار جلسہ میں
تبدیل ہوا۔ اسی موقع پر گاؤں کے ایک مخیر جناب الحاج عبدالکریم
داؤد اجی (جنھوں نے مسجد کے لئے لاؤڈ اسپیکر مرحمت فرمایا
تھا) بحرین سے اپنے وطن مالوف تشریف لائے جس سے حاضرین
کی خوشیاں دوبالا ہوئیں۔ (نامہ نگار عباس حسن پانگی)

انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول پہنالے کی جیت

اتوار ۱۳ دسمبر ۷۱ء کو انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول پہنالے کی
کرکٹ ٹیم کا ہیردلی کرکٹ کلب سے میچ ہوا۔ جس میں انجمن نے ۳۰۵ رن اور
ایک اننگ سے ہیردلی کلب کو شکست دی۔ انجمن کے ریاض قادری نے
سب سے زیادہ رن بنائے۔

فجندار ہائی اسکول (دھور) میں شاندار جلسہ

ہائی اسکول کے ایک سابق طالب علم اور حلقہ کے
مشہور سماجی کارکن جناب اسمٰعیل انوری کے اعزاز میں ۲۰ نومبر ۷۱ء
کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ہائی اسکول کے پرنسپل جناب

واسد صاحب نے فرمائی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جناب سید اقبال احمد نے معزز مہمان کی سماجی، دینی اور صنعتی خدمات کو سراہا اور خلیل صاحب نے ان کی قومی خدمات پر روشنی ڈالی۔ عزت افزائی کا جواب دیتے ہوئے جناب اسمٰعیل انوری نے طلبہ سے علمی ذوق و شوق کی اپیل کی، اور چند ہدایت آموز باتیں کیں۔ آخر میں ہائی اسکول کے لیے سائنس لیبارٹری کے لئے سامان اپنی طرف سے دینے کا وعدہ فرمایا اور جناب اسمٰعیل شیخناگ کے ادائیگی شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

پاکستان کے مزید ٹکڑے ہوں گے
بیرسٹر انتولے کی پیش گوئی

مہاراشٹر کے وزیر تعلیمات بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے نے پیش گوئی کی کہ اس دہائی کے اختتام تک سندھ، بلوچستان اور پختون بھی ایک علیٰحدہ مملکت کی حیثیت میں وجود میں آئیں گے — بمبئی شہر سی۔ بی تعلیم کے زیر اہتمام جہالت ہٹاؤ ہفتہ کے سلسلے میں وزیر موصوف ایک پر ہجوم تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کی کچھ انتہائی ترقی یافتہ مملکتوں کو جن کے پاس دولت کا انبار ہے ہندوستان سے انسانیت اور تہذیب کا سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

انھوں نے پاکستان کی فوجی ٹولی کو بنگلہ دیش میں انتہائی ظالمانہ نسل کشی کا ذمہ دار قرار دیا ـــــ اس سے قبل بمبئی شہر سماجی تعلیم کمیٹی کے صدر مسٹر ایم۔ جی۔ مانے نے مسٹر انتولے کا خیر مقدم کیا اور کمیٹی کے سکریٹری جی۔ کے گاڈ کر نے شکریہ ادا کیا۔

صحیح لیڈرشپ

جب سے پاکستان نے بنگلہ دیش کے ساتھ اپنی جنگ کو ہندوستان پر مسلط کیا تب سے وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنی قوم برابر اس پر زور دیا ہے کہ اس تصادم کے نام پر ہندوستان کی کسی اقلیت کو پریشان نہ کیا جائے۔ وزیر اعظم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ امن و چین برابر قائم رکھا جائے اور کسی طبقے کی وفاداری پر شک نہ کیا جائے۔ چیف منسٹر مسٹر نائیک نے بھی اس معاملے میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کی راہ کو اپنایا اور اقلیتی فرقے کے رہنماؤں کو اعتماد دلایا کہ ان پر شک و شبہے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مسلم اداروں کے ایک اجتماع میں جو بمبئی میں ہوا تھا مختلف مسلم رہنماؤں نے حکومت کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا، جناب اے۔ کے حافظکا، جناب معین الدین حارث صاحب و مصطفےٰ فقیہ صاحبان نے جو کچھ کہا وہ دراصل مہاراشٹر کے مسلمانوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ حج کمیٹی کے چیئرمین جناب احمد زکریا نے پوری صاف گوئی سے کام لیتے چیف منسٹر سے راست مخاطب ہو کر کہا کہ آپ وزیر اعلیٰ بھی ہیں اور وزیر داخلہ بھی۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں کچھ ایسی گرفتاریاں ہوئی تھیں جن پر شکایت پیدا ہوئی تھی۔ اس بار ایسا نہ ہونے دیا جائے ـــ اس پر چیف منسٹر نے یقین دلایا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ہمیں خوشی ہے کہ مسلم رہنماؤں نے ملک کا فرض ادا کیا اور وزیر اعلیٰ شری نائیک نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا ہے۔

ملک میں تعلیمی پروگرام

"بھارت کا نظام تعلیم ایک کار عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ہر سال تعلیمی نظام پر ۹۵۰ کروڑ روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ یہاں تقریباً ۴۴ تا ۴۲ لاکھ استاد درس و تدریس کے کام میں مصروف ہیں۔ یہاں کے تعلیمی اداروں میں تقریباً ۸ کروڑ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے بسرعت فروغ کے پیش نظر نظام تعلیم کو اس پر عامل کرنا ہے کہ ہر شخص کو کم خرچ پر اس کا فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔" یہ ہیں وہ الفاظ جو تعلیم اور سماجی بہبود کے نائب مرکزی وزیر شری ڈی پی یادو نے مشرقی خطے کے ریاستی تعلیمی اداروں کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں، اسکولوں کے انسپکٹروں اور ڈائرکٹروں کی تجدیدی

کانفرنسوں کی صدارت کرتے ہوئے ایک تقریر کے دوران کہی۔ وزیر موصوف نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں اور انسپکٹر آف اسکولس کی توجہ ملک میں بڑھتی ہوئی ناخواندگی کی طرف بھی مبذول کرائی۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ خواندگی کا تناسب بڑھ رہا ہے اور اب ۱۹۷۱ء میں یہ ۲۹٫۴۵ فیصد ہے۔ جبکہ ۱۹۶۱ء میں یہ ۲۴٫۰۲ فیصد اور ۱۹۵۱ء میں ۱۶٫۶۷ فیصد تھا۔ لیکن ناخواندہ افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ناخواندہ افراد کی تعداد ۲۹ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی۔ جو ۱۹۶۱ء میں بڑھ کر ۳۳ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی۔ ۱۹۷۱ء میں مردم شماری کے مطابق یہ ۳۸ کروڑ ۶۰ لاکھ افراد تک پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے اس صورت حال پر تشویش ظاہر کی اور کہا کہ ملک سے ناخواندگی کے خاتمے کے پروگرام کو لازمی طور پر ترجیح دینی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں ناخواندہ لوگ زیادہ تر ۱۵ تا ۴۴ سال کی عمروں کے لوگ ہیں جبکہ ملک میں بلحاظ عمر اس زمرے کے افراد کی تعداد لگ بھگ ۱۵ کروڑ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ضلع کی سطح پر پرائمری تعلیم کے اہم پروگراموں کے ساتھ تعلیم بالغاں کے پروگرام کو خاص اہمیت دینی ہوگی۔

بمبئی مرکنٹائیل کوآپریٹیو بنک کی اورنگ آباد شاخ کا افتتاح

مورخہ ۱۸ ردسمبر ۱۹۷۱ء سنیچر کی صبح بمبئی مرکنٹائیل کوآپریٹیو بینک کی اورنگ آباد شاخ کے افتتاح کے موقع پر ایک مختصر تقریب میں منیجنگ ڈائرکٹر جناب زین جی رنگون والا نے قومی بچت اسکیم میں ایک لاکھ کا چیک اورنگ آباد کے کلکٹر کے حوالے کیا۔ اس موقع پر شہر اورنگ آباد کے ممتاز سیاسی و سماجی کارکنوں کے علاوہ اعلیٰ حکام کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اس افتتاحی تقریب کے لئے مہاراشٹرا کے وزرائے عزت مآب ڈاکٹر رفیق زکریا، شری دائی بھی موہتے شرکت کرنے والے تھے مگر ہنگامی حالات کی بنا پر وہ شریک نہیں ہو سکے۔

افتتاح سے پہلے نئی شاخ کے دفتر میں مقامی اخبارات کی پریس کانفرنس میں جناب رنگون والا (منیجنگ ڈائرکٹر) نے بتایا کہ اس بنک نے ابتدا میں نہایت معمولی رقم صرف دس ہزار چھ سو روپیے سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ بنک کا بنیادی مقصد چھوٹے کاروبار کرنے والے ہاکروں اور معاشی طور پر پسپت افراد کی مدد کرنا ہے۔ انھیں مقاصد کی تکمیل کے ساتھ بنک نے زبردست ترقی کی ہے اور کوآپریٹیو پیمانہ پر چلنے والے بنکوں میں سرفہرست ہے۔ بنک کا موجودہ سالانہ کاروبار تین سو کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ اس موقع پر جناب رنگون والا نے اورنگ آباد کی مقامی شاخ کے لئے پانچ لاکھ روپیوں کے شیئرز مختص کئے جانے کا اعلان کیا۔

وزیر اعظم اندرا گاندھی مہاراشٹر کا دورہ کریں گی۔

وزیر اعلیٰ مہاراشٹر مسٹر وی پی نائیک نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی مہاراشٹر کا دورہ کریں گی ۔ وزیر اعظم کئی اور ریاستوں کا بھی دورہ کرنے والی ہیں۔

کرٹ والڈہیم اقوام متحدہ کے نئے سکریٹری جنرل ہونگے

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل ۲۱ ردسمبر کو اوتھانٹ کی جگہ پر نئے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے آسٹریا کے سفیر کرٹ والڈہیم کی سفارش کرنے پر رضامند ہو گئی۔ آسٹریا کے سابق وزیر خارجہ ۵۲ سالہ کرٹ والڈہیم کی حمایت میں ۱۱ اور مخالفت میں ایک ووٹ آیا جبکہ تین ممالک غیر حاضر تھے۔ توقع ہے کہ ۱۳۲ ممالک کے مندوبین پر مشتمل جنرل اسمبلی بہت جلد سلامتی کونسل کے فیصلے کی توثیق کر دے گی۔ اقوام متحدہ کے موجودہ سکریٹری جنرل اوتھانٹ دس سال کے بعد ۳۱ دسمبر کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جائیں گے اور یکم جنوری ۱۹۷۲ء سے کرٹ والڈہیم نئے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے اپنے عہدے کا چارج لیں گے۔

میونسپل سکنڈری اسکول امامباڑہ میں تقریری مقابلے

امام باڑہ میونسپل سیکنڈری اسکول میں مورخہ ۲۹ نومبر اور ۲؍دسمبر ۷۱ء کو اردو، ہندی، انگلش تقریری مقابلے بڑے شاندار پیمانے پر ہوئے جس میں ممبئی عظمیٰ کے میونسپل اسکولوں کے طلباء اور طالبات نے حصہ لیا۔

اردو تقریری مقابلے کی صدارت جناب زیدی صاحب نے کی اور جج روشن آرا نائیک اور صالحہ خان رہیں۔ ہندی تقریری کے مقابلے کی صدارت کے ایل جوشی صاحب نے فرمائی اور اے۔ آر سنگھو اور تیواری صاحب نے جج کے فرائض ادا کئے۔ انگلش تقریری کے مقابلے کی صدارت مشہور سماجی رکن اور ماہر تعلیم عزیز شخصیت ڈاکٹر عبد الکریم نائیک صاحب نے فرمائی۔ اور جج فیروز احمد عثمانی صاحب اور مسز سیمی صاحبہ تھے۔ اور مقابلے میں شرکت کرنے والوں کو اول، دوم، سوم انعامات تقسیم کئے گئے۔ اس مقابلے کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ڈاکٹر نائیک صاحب نے انگلش تقاریر میں اول، دوم، سوم اور چہارم آنے والے ہر طالب علم کو اپنی جیب خاص سے نقد انعامات مرحمت فرمائے اور طلبہ کی حوصلہ افزائی میں نمایاں حصہ لیا۔ موصوف کی علم دوستی اور قوم پرستی نے اسکول کے اساتذہ اور طلبہ کے سرپرستوں کا دل موہ لیا اور ڈاکٹر صاحب کی علم پرستی کے وہ نہایت ممنون ہوئے۔

مندرجہ ذیل میں درجہ بدرجہ ہر مضمون میں انعام پانے والے طلباء کی فہرست پیش کی جاتی ہے:-

جماعت دہم ـــــ (انگلش)

اول:- شاہین مولا بخش — امام باڑہ میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- آپٹے شیلا نارائن — نائیگاؤں " "
سوم:- بجے شری کرانے — ورلے بلدے میونسپل سکنڈری اسکول

جماعت نہم ـــــ (انگلش)

اول:- نفیس جہاں — ناگپاڑہ میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- کملا پورکر سستیھا — سائن " " "
سوم:- لوکھارے تا دادو — ماہم " " "

جماعت ہشتم ـــــ (انگلش)

اول:- حسینہ مبارک شیخ — ماہم میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- سارہ ڈلیبا — ٹوپی والا لین " " "
سوم:- نورجہاں شیخ محمد — امام باڑہ " " "

جماعت دہم ـــــ (اردو)

اول:- اقبال کریم — ناگپاڑہ میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- اقبال بیگم — امام باڑہ " " "
سوم:- محمد نثار — ماہم " " "

جماعت نہم ـــــ (اردو)

اول:- بخاری احمد — ورلی میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- نیلوفر یسین — امام باڑہ " "
سوم:- ساجدہ — عمر رجب روڈ " " "

جماعت ہشتم ـــــ (اردو)

اول:- سلمیٰ — امام باڑہ میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- ممتاز — عمر رجب روڈ " " "
سوم:- نیاز — ماہم " " "

جماعت دہم ـــــ (ہندی)

اول:- کماری پشپا اوستھی — تلاؤ میونسپل سکنڈری اسکول
دوم:- زاہدہ غلام نبی — امام باڑہ " " "
سوم:- بھگوتی پرساد تواری — گھاٹکوپر " " "

جماعت نہم ـــــ (ہندی)

اول:- آشا پانڈو ونگ کدم — این ایم جوشی مارگ میونسپل سکنڈری اسکول

دوئم:۔ اُرمیلا دیوی — قلابہ میونسپل سکنڈری اسکول
سوئم:۔ کرشن کمار جھا — دادر (مغربی) " " "

جماعت ہشتم — (ہندی)

اول:۔ زرینہ شیخ — ناگپاڑہ میونسپل سکنڈری اسکول
دوئم:۔ حوربانو — امام باڑہ " " "
سوئم:۔ مہترے شوبھا تا مدھو — بائیکلہ " " "

منجانب وزیر اعظم اسکول پارلیمنٹ
میونسپل سکنڈری اسکول امام باڑہ

اندرا ڈاک

۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بمبئی کی بندرگاہ میں گودی کے بہت بڑے حصے الیکزنڈرا ڈاک کا نام "اندرا ڈاک" رکھ دیا گیا۔ بمبئی پورٹ ٹرسٹ کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے پاکستان کے خلاف فتح پانے کی خوشی میں یہ فیصلہ اتفاق رائے سے کیا — اور جوانوں کے استقبال میں ہونیوالے ایک جلسۂ عام میں اس کا اعلان کیا — یہ بھی غور کیا جا رہا ہے کہ بندرگاہ کے دیگر حصوں کا نام بھی فوجی جانبازوں کے نام پر رکھا جائے۔

بھارت رتن اندرا گاندھی

۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدر جمہوریہ شری وی وی گری نے نئی دہلی میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ "بھارت رتن" عطا کیا۔

جنگ کا انجام

"ہتھیار بر زمیں" — ڈھاکہ میں پاکستانی میجر جنرل محمد جمشید کے منہ سے یہ تین گرجدار آواز نکلتے ہی گولف کورس کے میدان میں پانچسو پاکستانی افسروں نے اپنے ہتھیار کھول کر رکھ دیئے اور صف بستہ ہو گئے — یہ رسم سارے بنگلہ دیش میں منائی جا رہی تھی۔ یحییٰ کی مقبوضہ فوج کے ہزاروں افسران اور سپاہی اپنے اپنے ہتھیار کھول کر رکھ رہے تھے اور انھیں ان کے بیرکوں میں واپس بھیجا جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک ظالم فوج پر ہندوستان کی فتح اور بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ عوام کی آزادی کی رسم بھی مکمل ہو گئی۔

اس جنگ میں ہندوستان نے جو شاندار کارنامہ انجام دیا ہے اس کی مثال تمام قوموں کی جنگوں کی تاریخ میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ آج تک کسی نے اتنی کم مدت میں اتنی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ بنگلہ دیش صرف ۱۳ دنوں میں آزاد کرا لیا گیا۔ ساری جنگ چودہ دنوں میں ختم ہو گئی۔ لیکن ان ۱۳ دنوں نے فوجی تاریخ کے نئے عنوان ترتیب دے دیئے۔ فوجی تاریخ کے طالب علم ابھی برسوں تک جنگ کے اس ریکارڈ پر سوچتے ہی رہیں گے۔ فی الحال ہم اس جنگ نے پاکستان کا جو حال کیا ہے اسی پر ایک نظر ڈالیں گے۔

پاکستان تب اور اب......

	پاکستان مع مشرقی بنگال	★	پاکستان بنگلہ دیش کے بغیر
(۱) رقبہ:۔	۳۶۵۵۲۹ مربع میل	★	۳۱۰۴۰۳ مربع میل
(۲) آبادی:۔	۱۲۸۶۴۳ ملین	★	۵۸۶۴۹ ملین

(پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کے آبادی سے متعلق بابت ۷۰-۱۹۶۹ء کے اعداد پر مبنی)

(۳) دیہی آبادی:۔	۸۶۶۹ فیصد	★	۷۷۶۵ فیصد
(۴) مسلم آبادی:۔	۸۸۶۰۹ فیصد	★	۹۷۶۱۷ فیصد
(۵) مسلمانوں کی کل تعداد:۔	۱۱ کروڑ	★	تقریباً ۵ کروڑ ستر لاکھ

(بھارت میں چھ کروڑ مسلمان رہتے ہیں)

(۶) فی مربع میل افراد کی تعداد:۔	۲۵۶	★	۱۳۸
(۷) جنگلاتی علاقے:۔	۱۸۶۵ فیصد	★	۲۶۵ فیصد
(۸) خواندگی:۔	۱۵۶۹ فیصد	★	۱۳۶۶ فیصد
(۹) ریلوے لائن میلوں میں:۔	۷۰۸۶۶۴۸	★	۵۳۳۴۶۷۹
(۱۰) بندرگاہ:۔ (۶۸-۱۹۶۷ء میں ٹریفک ہزار ٹن)	۱۴۵۸۵		۸۶۶۲

(۱۱) سڑکوں کی لمبائی میلوں میں ۲۲۳۶۱۷۰۹ ★ ۲۱۷۵۸

(۱۲) درآمدات ملین روپیوں میں (۶۹ — ۱۹۶۸ء کے اعداد و شمار کی بنیاد پر)

۳۰۴۶ ۴۸۷۰

(۱۳) برآمدات ملین روپوں میں (۶۹ — ۱۹۶۸ء کے اعداد و شمار کی بنیاد پر)

۲۳۰۵ (تین ارب ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے) ★ ۱۲ ۷۶۲ (ایک ارب ۶۷ کروڑ ۲۰ لاکھ)

(۶۸ — ۱۹۶۷ء میں مشرقی بنگال سے عام جوٹ کی برآمدات سے ۷۵۸۶۹ ملین روپیے کی آمدنی ہوئی جب کہ سال مذکور کے دوران بنیادی مصنوعات کی برآمدات سے ہونے والی کل آمدنی ۱۶۵۷۶۷ ملین روپیے کے بقدر تھی)

(۱۴) اسکول و کالج ۷۷۶۶۳ ۴۲۵۴۲

(۱۵) پروفیشنل کالج ۷۷ ۴۸

(۱۶) یونیورسٹیاں ۱۲ ۷

رتناگیری ضلع کے مسلم طلبہ کو وظیفے

کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگیری کی بمبئی سب کمیٹی نے اس سال رتناگیری ضلع کے مسلم طلبہ کے لیے حسب ذیل یکمشت وظیفے منظور کیے ہیں :-

(۱) ابراہیم عبداللہ چکیے ۵۰ روپیے
(۲) شاہجہاں عمر محمد ۵۰ روپیے
(۳) عزیزہ بیگم عبداللہ چکیے ۶۰ ”
(۴) انور حسین عبدالرحمٰن [illegible] ۶۰ ”
(۵) رفیق حسین حبیب قاضی ۶۰ ”
(۶) نور محمد آدم دار [illegible] (شولاپور) ۷۵ ”
(۷) عبداللہ محمد یوسف رکھانگی ۷۵ ”
(۸) نیاز احمد داؤد دیرکار ۷۵ ”
(۹) عاشق علی شیخ محمود دابھولی ۱۰۰ ”
(۱۰) عصمت یار [illegible] ۱۰۰ ”
۱۱۔ محمد جلیل ابراہیم چوگلے ۱۰۰ روپے
۱۲۔ شریف حسن خان گرگر ۱۰۰ ”
۱۳۔ عبدالغنی ابراہیم بلبلے ۱۰۰ ”
۱۴۔ محمود عمر کارباری ۱۰۰ ”
۱۵۔ سراج عبداللطیف ملا رتناگیری ۱۰۰ ”
۱۶۔ شوکت قاسم شرد ے ۱۰۰ ”
۱۷۔ یوسف خان مجاہد [illegible] رتناگیری ۱۰۰ ”
۱۸۔ سراج الدین عبدالرحمٰن [illegible] ۱۰۰ ”
۱۹۔ [illegible] میاں [illegible] ۱۰۰ ”
۲۰۔ نذیر احمد محمود دیرکار ۱۰۰ ”
۲۱۔ محمد حنیف داؤد خان ۱۰۰ روپے
۲۲۔ نجم الحسین یوسف آبادے ۱۰۰ ”
۲۳۔ محمد اقبال ابراہیم چوگلے ۱۰۰ ”
۲۴۔ بشیر احمد محمود تناخوا (رتناگیری) ۱۰۰ ”
۲۵۔ خواجہ غلام عمر ملا (رتناگیری) ۱۰۰ ”
۲۶۔ مشتاق احمد اسحاق لانبے ۱۰۰ ”
۲۷۔ نثار علی محمد پاٹنکر ۱۰۰ ”

میزان کل :- دو ہزار چار سو پینسٹھ روپیے

چرمین پروفیسر اے۔ بی دادرکر
کے ایم۔ آئی سوسائٹی سب کمیٹی بمبئی

صدائے احتجاج

پاکستان کے حملہ کے خلاف آدرش ہائی اسکول کرچی (کھیڈ) اور اردو پرائمری اسکول کرچی کے تمام اساتذہ، طلباء و طالبات نے ایک شاندار جلوس کی شکل میں گاؤں گشت لگا کر صدائے احتجاج بلند کی۔ طلباء و طالبات نے مختلف نعرے لگا کر قومی جذبہ کا اظہار کیا وہ درحقیقت قابل تعریف تھا یہ جلوس بحسن و خوبی دو گھنٹہ کے بعد ٹھیک ۵ بجے راشٹریہ گیت اور حلف نامہ پر اختتام پذیر ہوا۔

کامیابی

کامیابی اور ناکامی انسانی زندگی کی ناگزیر حقیقتیں ہیں کامیابی اگرچہ ترقی کے دروازے کھول دیتی ہے تو ناکامی بھی کامیابی کی راہیں متعین کر دیتی ہے۔ کامیابی کی سمت میں محنت کرنے کے باوجود اگر ناکامی حصے میں آئے تو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور کامیابی کے راز کو منکشف کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اکتوبر امتحانات کا نتیجہ بیشتر ایسے ہی اولو العزم اور باہمت طالبان علم کی محنتوں کا ثمر ہے۔ ہم ان طلبار کو کامیاب ہوگئے ہیں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو S.S.C. اکتوبر ۷۱ء کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ کامیابی کا اوسط ۴۳.۳۴۶۲۹ رہا۔ مہینہ کے آخر میں جب کہ کاپی پریس جاری تھی یہ نتیجہ ظاہر ہوا ہے اس لئے ہمیں تمام کامیاب طلبار کے نام معلوم نہیں ہو سکے جن خوش نصیبوں کے نام ہمیں معلوم ہوئے وہ شریک اشاعت ہیں۔ انتہائی احتیاط کے باوجود اگر نام میں کچھ غلطی ہوگئی ہو تو اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

S.S.C. کے کامیاب طلبار جن میں بمبئی اور مضافات کے علاوہ کوکن کے اضلاع کے مختلف مراکز سے شریک ہونے والوں کے نام شامل ہیں۔

S.S.C.

محمد حسین محمود مادرے — اکرام الدین نور محمد بلبلے
عقیل احمد عبد اللہ مقدم — اقبال احمد عثمان پالیکر
زبیدہ خانم عبد القادر ڈولے — نذیر احمد عبد الرحمن تنگیکر
شکیل محمد پھرک — محمد متین محمود یوسف نورنگے
حسین خان بابا صاحب دلوی — عبد الرزاق محمد پارکر

S.S.C

عبد اللہ ایوب پرڈے — اعجاز احمد شفیق احمد ڈونلا رے
عبد الوہاب عباس دلوی — عبد الحمید عبد الرحمن مقدم
قمر بانو فقیر محمد کھانچے — عبد المجید عباس جھسکر
شہناز محمد علی کھوت — اقبال حسن دلوی
مختار احمد عباس الوارے — نذیر اسمٰعیل جھسکر
علاؤ الدین یوسف چوگلے — محمد یوسف نیورنیکر
منیر احمد شیخ علی ڈاورے — کلیم النساء سید سراج الدین
نظیر محمد بغدادی

B.A. بی اے

عبد البشیر عبد الرحمن مقدم (اکناکس)
محمد ابراہیم مقدم

B.S.C. بی ایس سی

شفیق احمد محمد یوسف دیویکر
محمد صدیق حسن نائیک
مرزا محمد یوسف نزواری
ریاض فقیر محمد سنگرار
طاہر پروین عبد الستار کھوت

M.B.B.S ایم بی بی ایس

متین احمد غلام عباس ڈودت
رضوانہ عبد الجلیل دیویکر
عبد الملک عبد الرزاق کنگانے
نرگس عبد القادر بوبیرے

B.S.C بی ایس سی

رضیہ اسمٰعیل جوڑے
داؤد حسن واگلے

INT. SC. انٹر سائنس

عبد القادر پٹھان
نثار احمد قاضی
ابراہیم بالا کاپڑی
افضل ابراہیم مونڈے

INT. ARTS انٹر آرٹس

فریدہ عبد القادر دلوی
رخسانہ محمد اسمٰعیل فصاحے
محمد آصف قاضی
خیر النساء عثمان خواجہ
عبد الرحمن اے بھارے

F.Y. ARTS فرسٹ ایر آرٹس

پروین حسن کامگے
حمیرا امتیاز کھٹکھے
حافظ بیگم ابراہیم سندیلکر
مسرت آرا تنگیکر
بشیر احمد اللہ ڈے
ایس ستار شاہ باذکر

فرسٹ ائر سائنس F.Y.SC.

رفیع احمد حسین مقدم

L.L.B ایل ایل بی

عثمان عبد اللہ قاضی

انتقالِ پُر ملال

● خان بہادر شیخ حسین صاحب (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس) متوطن ساونت واڑی کا ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر انتقال کے وقت تقریباً ۵۸ سال تھی

★ ۔ مہاپرل ضلع رتناگری کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والی سرگرم ہستی جناب حسن احمد مقدم کا ۲ دسمبر ۷۱ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم برسوں بعد افریقہ سے وطن لوٹے تھے۔

★ ۔ جناب فقیر محمد مستری کے ماموں بدرالدین زین الدین مقدم (امامی) کا جمعہ ۲۴ دسمبر ۷۱ء کو ان کے وطن گوو نلکوٹ چپلون میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دینی امور اور بچوں کو عربی تعلیم دینے میں گذارا۔

ڈاکٹر سیدین رحلت کر گئے

۱۹ دسمبر کو مرکزی وزیر تعلیم کے سابق سکریٹری ۷۶ سالہ دانشور ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین کا حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث انتقال ہوگیا۔ مرحوم بنگلہ دیش کی آزادی کے سلسلے میں سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ ممتاز ماہر تعلیم اور دانشور ڈاکٹر سیدین کو ۱۹۶۷ء میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر سیدین انڈین ایجوکیشن کمیشن کے ایک رکن اور ایشیا انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے تھے۔ آپ نے سماجی اور ثقافتی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب "آندھی میں چراغ" پر آپ کو انعام بھی دیا گیا تھا۔ موت سے کچھ پہلے تک آپ تین اہم کتابیں لکھنے میں مصروف تھے۔ جن میں سے ایک اسلام ان دی ماڈرن ایج (اسلام دورِ جدید میں) ہے۔

شہریار عابدی ایڈیٹر اردو ٹائمز کو صدمہ

روزنامہ اردو ٹائمز کے چیف ایڈیٹر جناب شہریار عابدی کے برادر اسد جعفری (ایڈیٹر "حیات" ویکلی دہلی) ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء شب میں اروِن ہسپتال دہلی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم اپنی قیام گاہ واقع دہلی کی دو منزلہ عمارت سے گر پڑے تھے اور شدید طور پر زخمی ہوئے۔ اروِن ہسپتال میں آپ کو داخل کیا گیا مگر جانبر نہ ہو سکے۔ میت دہلی سے بذریعہ طیارہ ان کے وطن حیدرآباد پہنچائی گئی اور ۷ دسمبر کو تدفین عمل میں آئی۔

مدیر "آج" حضرت خلیاش انتقال فرما گئے

بمبئی کے ایک بزرگ صحافی روزنامہ "آج" کے مدیر و مالک جناب خلیل احمد شیخ المعروف خلیاش ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو حبیب ہسپتال بمبئی میں رحلت کر گئے۔ مرحوم عارضۂ قلب کے مریض تھے اور ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ منگل کی صبح نو بجے آپ کو بڑے سونا پور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مرحوم ایک طویل عرصہ تک "انقلاب" کے ادارتی عملے سے وابستہ رہے۔

عبدالرزاق سعید صاحب کو صدمہ

جناب عبدالرزاق سعید صاحب کے بھائی عبدالمجید محمد (محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی کے پارٹنر) کا ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن٥

ادارہ تمام مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت کا طالب ہے۔

قوالی کا پروگرام

کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگری (بمبئی سب کمیٹی) کے زیر اہتمام ۱۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بمبئی میں ہونے والا قوالی پروگرام ہنگامی حالات کے پیش نظر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اگلی تاریخ کا بہت جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت یہی (خریدے ہوئے) ٹکٹ کام آئیں گے۔

60 PAISE

جمہوریت نمبر

FEBRUARY 1972

خاندان کے ہر فرد کا رسالہ

ماہنامہ نقش کوکن بمبئی

۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹

ٹیلیفون نمبر:۔ 331572

جلد ۱۱ ★ شمارہ ۲

فروری ۱۹۷۲ء

تاریخ اشاعت ۳ فروری ۱۹۷۲ء

طابع وناشر:۔ عبدالکریم نائیک

مقام طباعت:۔ اجمل پریس بمبئی ۳

ملکیت:۔ نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ

رجسٹریشن نمبر:۔ E 3006

زیر ادارت

عثمان حسین خان

سالانہ زرمبادلہ ہندوستان میں:۔ چھ روپے

بیرونی ممالک سے:۔ ۵ اشلنگ برٹش پوسٹل آرڈر

اشتہارات، ترسیل زر اور دیگر امور کے بارے میں خط وکتابت

منیجر ماہنامہ نقش کوکن

۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹ کے پتے پر کیجئے

رکن انڈین لینگویجز نیوز پیپر ایسوسی ایشن

تمام متنازعہ امور میں حق سماعت عدالتہائے بمبئی کو ہوگا۔

قیمت

۶۰ پیسے

آئینۂ تحریر

صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۹۴۷ء میں ہمیں آزادی ملی ۔ سیکولر اور جمہوری بنیادوں
پر اس کا دستور مرتب کیا گیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کے
جمہوری ملک ہونے کا اعلان کیا گیا ۔ اس طرح ہر سال ۲۶ جنوری کو
یوم جمہوریہ منایا جاتا ہے ۔

ہمارے جمہوری قوانین کی بنیاد پر ملک میں بسنے والے
تمام شہریوں کو مساوی حقوق عطا کیے گئے ہیں اور ذات پات ،
فرقہ ، مذہب ، زبان یا علاقے کی بنیاد پر کسی بھی ہندوستانی کو
شہری حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔

گذشتہ ۲۲ سال میں جمہوریۂ ہند نے ترقی کی کئی منازل
طے کی ہیں مسلسل ہزارہا سال غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے
کے بعد ہندوستانی قوم نے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی زندگی کا
آغاز کیا ہے ۔ اس بائیس سال کے عرصے میں ہمارا ملک دنیا کے
ترقی پذیر ممالک کی صف اول میں ہے ۔ غذائی اعتبار سے کم و بیش
خود مکتفی ہو چکا ہے ۔ صنعتی و اقتصادی ترقی کی منزلیں بھی طے کی جا رہی ہیں ۔

گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے بعد اب وزیر اعظم اندرا گاندھی
کی قیادت میں ہندوستان عالمی امن اور ہمہ جہتی ترقی کی منزل کی طرف
گامزن ہے ۔ فرقہ پرست ، رجعت پرست ، سرمایہ دار اس ترقی میں رکاوٹ
پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مفادات کی خاطر نعرے لگا رہے ہیں ۔
مگر وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک کی ترقی پسند طاقتوں سے تعاون
و اشتراک کر کے ملک میں پر امن سماجی انقلاب برپا کرنے کی کوشش
کی ہے ۔ سال نو کی مبارکباد کے ساتھ ہم دعا کرتے ہیں کہ یوم جمہوریہ ہمارے
ملک ، ہماری قوم اور ہمارے عوام کے لئے بابرکت ثابت ہو اور اس دن
نئی ترقیوں اور کامیابیوں کا آغاز ہو ۔

عید الضحیٰ مبارک

جشن جمہوریہ مبارک

محمد عثمان

جمہوریت اور ہندوستان

آج ہم اس دن کی یاد تازہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس روز کشور کشائی کا تاجِ زریں عوام کے سر پر رکھا گیا تھا، اور عوام نے صدیوں کی درباری غلامانہ زندگی سے چھٹکارا پایا تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کی صبح ہمارے لئے ایسا سورج لے کر آئی تھی جب اونچ نیچ، چھوٹائی، بڑائی اور امیری غریبی کی گہری کھائیاں پاٹنے کا عزم کیا گیا تھا، اور جمہور کی آواز کو قانون قرار دیا گیا تھا۔ اس روز ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم کی گئی تھی جس کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں تھی، اور وہی اپنے ملک کے مالک اور حاکم بنائے گئے۔

آج ہماری جمہوریت نے ۲۲ ویں سال میں قدم رکھا ہے۔ ان طویل صبر آزما ۲۲ سالوں میں وقت نے ہمیں طرح طرح کے شکنجوں میں جکڑنے کی کوشش کی لیکن ہم اپنی حق گوئی اور اتحاد کی ڈھال سے اپنا تحفظ کرتے رہے۔ آج ہی کے روز ہم نے پرانے اور فرسودہ دستورِ حکومت کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور ظلم و نا انصافی، غلامی اور حقارت کو جرم قرار دیا۔ ہم نے سامراجیت اور سرمایہ داری کی گھناؤنی بازیگری کو بھی نیست و نابود کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ہم آج بھی اس کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

جمہوری حکومت قانونِ فطرت کے عین مطابق ہوتی ہے اسی لئے اس میں پائیداری اور استحکام ہوتا ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے جمہوریت کا عملی سبق ہمیں سکھایا اور دنیا پر یہ ثابت کیا کہ یہی نظامِ حکومت امن و آشتی کا ضامن ہے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام سمجھ دار ہوں۔ انھیں اپنی اہمیت کا احساس ہو، اور ان میں ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کی صلاحیت ہو جو مخلص، ایماندار اور [illegible] ہوں۔ لیکن یہ بڑا مشکل کام ہے۔ جمہوریت کے راستے کی دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے عوام کا زیادہ تر حصہ جہالت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ پیٹ کی آگ انھیں اپنے سینے میں علم کی شمع روشن کرنے سے روکتی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ انسانیت کے دشمن اپنی دولت کے سہارے ان بھولے بھالے لوگوں کو بہکا کر ووٹ حاصل کرتے ہیں، جمہوریت کی بنیادیں کھوکھلی کر کے اپنے محلوں کی دیواریں مضبوط کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کے اس دلدل زار میں وہ [illegible] اور مہک نظر نہیں آتی جو کہ ہونی چاہیئے۔

یومِ جمہوریہ ہر سال منایا جاتا ہے۔ ایک رسم کی طرح۔ ایک ایسی رسم جس میں روح کا کہیں پتہ نہیں۔ وقت کے چکر نے ان لاکھوں بہادروں کو [illegible] جو ہماری آزادی اور جمہوریت کی سنگِ بنیاد رکھتے۔ کاش ہماری آنکھیں کھل جائیں اور ہم سب مل کر ایک ایسی سوسائٹی کی بنیاد ڈالیں جس پر [illegible] رشک کرے اور ہم فخر سے کہہ سکیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں [illegible]
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں [illegible]

شرف کمالی

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مستقل عنوان "ذرا نم ہو تو یہ مٹی....." کا سلسلہ میں نے اِس اُمید پر شروع کیا ہے کہ ہر ماہ مستقل طور پر مختلف سماجی سیاسی، مذہبی، علمی و ادبی موضوعات پر مسلسل لکھتا رہوں۔ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا ہے کہ خیالات میرے اپنے ہوں گے۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ نقش کو کن کا ہر قاری میرے خیالات سے سو فیصدی متفق ہو۔ گذشتہ شمارے میں محترم ڈاکٹر فقیر محمد کٹلے صاحب کے اعتراضات نظر سے گذرے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اتنے سارے اعتراضات کے بعد میرے بارے میں ان کا عطا کردہ سرٹیفکٹ اطمینان بخش ہے۔ فرماتے ہیں "مجھے یقین ہے کہ شرف کمالی صاحب کی نیت اہانت اسلام اور تعلیمات اسلام کی تضحیک ہرگز نہیں۔"

میں محترم المقام ڈاکٹر کٹلے صاحب سے مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ آپ کے اور راقم الحروف کے مابین جو اختلاف ہے وہ نظریاتی اختلاف ضرور ہے لیکن میری نیت کی ایمانداری پر آپ کو بھی یقین ہے۔ جواب الجواب کا سلسلہ میں بھی غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن بہتر ہوتا میرے سیدھے مضمون پر شعلہ بیا ہو کر یہ زورِ قلم آزمانے کے بجائے اسلام، شریعت اور قرآن کی کھلے الفاظ میں توہین کرنے والے مسلمان مصنفوں کے اسلام دشمن مضامین کے دنداں شکن جواب دینے میں وہ اپنی انرجی صرف فرماتے۔ اس مشن میں میری خدمات بھی ان کے ساتھ ہوتیں۔ بہر کیف میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے توجہ کے ساتھ میرے مضمون کا مطالعہ فرمایا۔ میں ان کا مزید شکر گذار ہوں گا اگر اس سلسلہ کے متعلق اعتراضات کی بجائے وہ مجھے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازیں۔ مجھ سے بالمشافہ بحث کر کے اپنا موقف مجھے سمجھا دیں۔ ممکن ہے اُن کے صحیح عقائد مجھے قابلِ قبول ہوں اور میں اپنی من مانی منطق چھوڑ کر ان سے سیکھی ہوئی منطق اپنا لوں۔

دعا طلب شرف کمالی

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ہمارا عزیز ملک ہمیشہ سے اپنے اعلیٰ اقدار اور عظیم مقاصد کے لئے مشہور ہے۔ پاکستان کے جارحانہ حملے کا دنداں شکن جواب اور ہماری فتح عظیم درحقیقت ہمارے اعلیٰ اقدار اور عظیم مقاصد کی فتح ہے۔ یہ جنگ اصول کی جنگ تھی۔ وحشت کے خلاف انسانیت کی جنگ تھی۔ اس جنگ میں ہمارے دو جوان مادرِ وطن کی حفاظت کے کام آئے۔ وطن کو ناز ہے ان سپوتوں پر جنھوں نے سر بکف ہو کر دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچا دیا۔ جنھوں نے ناموسِ وطن کے وقار پر اپنی جانیں جان آ

کے سپرد کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ ۹ دسمبر کو ہمارے
بحری بیڑے کے اینٹی سب مرین جہاز آئے۔ این۔ ایس کھکری پر
دشمن نے تین تارپیڈو سے حملہ کیا۔ اس جہاز کے ساتھ اٹھارہ
افسران اور ۱۷۵ ملاح غرقاب ہو گئے۔ جہاز کے کپتان
مہیندرناتھ ملا نے جہاز چھوڑنے سے انکار کیا۔ جتنے ملاحوں کو
بچا سکتے تھے بچایا اور بچنے والے ملاحوں نے دیکھا کہ ان کا دلیر
ناخدا بصد اطمینان جہاز کے بالائی عرشہ پر جلوہ افروز تھا اور
جہاز غرق ہوا۔ یقیناً بحیرۂ عرب کی موجیں اس بہادر ناخدا کی
عظمت پر شاہد رہیں گی۔ جس نے دریائی بہادروں کی روایت کو
برقرار رکھا اور بہادروں کی آن پر حرف نہ آنے دیا۔

جنگ اصول کے تحت لڑی جاتی ہے۔ اصول ٹکرا
جائیں تو بھائی بھائی لڑتے ہیں۔ بابر سے ابراہیم لودی کی جنگ
مسلمان مسلمان کے مابین تھی۔ مذہب اسلام وطن کی محبت
سکھاتا ہے۔ اس لئے مسلمان بھی تحفظ وطن کی خاطر شہید
ہونے سے نہیں ڈرتا۔ خوشحال خان خٹک پشتو زبان کا
مشہور وطن دوست شاعر تھا جس نے افغانستان کو مغلوں
سے آزاد کرانے کے لئے سرحد کے افغانی قبائل کی ایک جمعیت
قائم کی تھی۔ قبائل میں آفریدیوں نے آخر دم تک اُس کا ساتھ دیا۔
علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم "خوشحال خان کی وصیت" ایک
سچے مردِ مسلماں کا کردار پیش کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں
قہستاں کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند

پاکستانی ریڈیو کا یہ پروپیگنڈہ محض پروپیگنڈہ ہی تھا
کہ یہ جنگ اسلام کے تحفظ کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ اسلام
کے تحفظ سے ان کو کیا واسطہ جو مظلوموں پر بے دریغ ظلم
ڈھائے جا رہے تھے۔ وہ عیش پرست جو مشرقی پاکستان
کے عوام کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور اپنے بھائیوں کو
صفحۂ ہستی سے نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہیں اِنَّمَا
الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَۃٌ کا سبق بھی یاد نہ رہا وہ کیا خاک
اسلام کا تحفظ کرتے؟ ان کے نزدیک محض بنگلہ دیش کی
جنتا اس لئے قابل گردن زدنی تھی کہ وہ ان کی فوجی ڈکٹیٹرشپ
کو ماننے سے انکار کرتی تھی۔ یہی ان کا قصور تھا۔ پچیس سال قبل
جب پاکستان جسے مولانا آزاد نے مسلمانوں کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے
تعبیر کیا تھا وجود میں آیا تو ایک دوسرے سے بارہ سو میل دُور دو
ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان باشندے
رشتۂ اسلام کی وجہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انھیں پورے حقوق
حاصل ہوں گے۔ لیکن ۲۵ سال کے بعد بھی ہم ان دونوں ٹکڑوں
کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا تھا کہ بنگلہ دیش کی جنتا کے
ساتھ بھائی چارے کا سلوک ہی نہیں کیا گیا۔ زیادہ تر ترقیاتی
منصوبے مغربی پاکستان ہی میں عمل میں لائے جا رہے تھے
اور ان سوتیلے بھائیوں کی کس مپرسی کا عجیب عالم تھا۔ اسی
الیکشن میں مجیب الرحمٰن کی کامیابی کے بعد مغربی پاکستان کی
ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ اور جب صدائے
احتجاج بلند کرنے پر ان پر ظلم و تشدد کیا گیا اور وہاں کی جنتا
پناہ گزین بن کر اپنا سب کچھ لٹا کر ہندوستان کی سرحد پار
کر کے یہاں پناہ مانگنے آئی تو ہندوستان نے انھیں سہارا دیا۔
پاکستان کی بلاوجہ حمایت کرنے والے دانشوروں کا یہ خیال کتنا

مضحکہ خیز ہے کہ یہ تو پاکستان کا داخلی معاملہ ہے۔ اس میں
ہندوستان کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ انسانیت
کچلی جا رہی ہو، اور داخلی معاملہ کہہ کر کوئی شریف پڑوسی
کیسے خاموش رہے! ایسے بہت سے عناصر آج بھی ہیں جن
کو پاکستان سے بے سوچے سمجھے بلاوجہ ہمدردی ہے اور
ہندوستان کی جمہوریت نواز حکومت سے خواہ مخواہ بیر ہے
جو کہتے ہیں کہ "یہ تو پاکستان کا داخلی معاملہ ہے۔ اس میں ہندوستان
کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" ایسے عناصر کی یقیناً
بیخ کنی کرنی چاہیئے۔ جو اس ملک میں رہ کر ملک کے مفاد
کے خلاف باتیں کر رہے ہوں۔ ہندوستان ایک ایسا جمہوری
ملک ہے جو ایک مسلمان کو صدر جمہوریہ کا عہدہ عطا کر کے
بھارت رتن کے خطاب سے نوازتا ہے۔ جس کی پارلیمنٹ میں
ہمیشہ مسلمان وزراء مقتدر رہتے ہیں۔ جہاں مسلمان اعلیٰ عہدوں
پر فائز ہیں۔ پھر ہماری جمہوری حکومت اس قدر اچھی ہے کہ
اسے یقیناً معلوم ہے کہ ملک دشمن عناصر کون ہیں پھر بھی ان کے
ساتھ رحم و کرم سے پیش آتی ہے۔ ایسے عناصر جو پاکستان کو
معصوم سمجھتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تک ہندوستان
میں کیوں رہتے ہیں؟ انھیں تو پاکستان پہنچ جانا چاہیئے
وہاں پہنچنے پر اصلی مقام معلوم ہوگا۔ لیکن ایک بات ثابت
ہو چکی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکومتِ ہند کے
سچے وفادار ہیں۔ وہ بھی پاکستان کے خلاف جنگ کو اس لئے
جائز سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ جبر و تشدد کے خلاف جنگ
ہے۔ اور کہیں ایک آدھ گوشے میں پاکستانی ہمدرد باقی ہو
تو ایسے غدار وطن کو منظر عام پر لا کر کیفر کردار تک پہنچانا ہی
دانشمندی ہے بلکہ خدمتِ وطن ہے۔

"بنگلہ دیش" تو وجود میں آ ہی گیا اور اب اسے
دنیا کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن پاکستان کی پالیسی اگر ایسی ہی رہی

تو "خوشحال خاں کی وصیت" یاد رکھنے والے وہاں آج بھی موجود
ہیں اور انھیں اب عملی طور پر بنگلہ دیش والوں نے یہ ثابت
کر دکھایا ہے کہ جب بہادروں کے دلوں میں سرفروشی کی تمنا
پیدا ہوتی ہے تو وہ بازوئے قاتل کا زور آزمانے پر تیار ہو جاتے
ہیں اور آخر کار سرفروشوں کی فتح ہوتی ہے!

دنیا میں کسی ملک نے چٹکی بجاتے ہی ترقی کی تمام
منازل طے نہیں کر لیں۔ ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اور
گزشتہ ۲۵ سال کے عرصہ میں ہم نے وہ ترقی حاصل کر لی ہے
کہ ہمارے ترقیاتی منصوبوں اور ہماری دلیر وزیراعظم کی خلوص کاری کی
وجہ سے ہم ہر شعبۂ حیات میں خود کفیل ہوتے جا رہے ہیں۔
اس جنگ میں یہ ثابت ہو چکا کہ اب ہم کو اپنے آپ پر اعتماد ہے۔
پاکستان کے نمائشی ہمدردوں کو اپنی طاقت پر بڑا ناز ہے
جو خلیج بنگال میں اپنے ساتویں بحری بیڑے کو لا کر ہمیں ڈنڈ پیل کر
ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن انھیں معلوم ہو گیا کہ
ہندوستان کے نڈر اور جانباز سپوت اس قسم کی گیدڑ بھپکیوں
سے اب نہیں ڈرتے اور ہماری بہادر فوج کے سامنے
پاکستانی فوج نے جب ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیئے تو وہ
اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ انھیں شاید اب ہمارے متعلق یہ
احساس ہو گیا ہے

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

ایک بزرگ نے صبح جلد اٹھنے کے فائدے اپنے بچے کے سامنے
بیان کئے اور دلیل دی: جو پرندہ صبح ہی صبح اپنے گھونسلے سے نکلتا
ہے پیٹ بھرنے کیلئے کیڑے مکوڑے اسی کو زیادہ ملتے ہیں۔"
یہ سن کر بچہ ہنسا اور کہنے لگا:
"دادا جان! آپ نے یہ بھی سوچا کہ صبح ہی صبح اپنے بلوں سے
نکلنے کا انعام کیڑے مکوڑوں کو کیا ملا؟"

اُمیدیں...
جو ایل-آئی-سی سے وابستہ ہیں!
EDUCATIONAL ANNUITY POLICY
NPS/LICU-3
بیمہ زندگی سلامتی کے لئے بے مثال ہے!
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

انتولے

بابو راؤ بیلوے

رضوان حارث

عمر قاضی

★ تفصیل صفحہ نمبر ۲۵ پر ملاحظہ فرمائیے ★

اقبال بلگرامی
ایم۔اے

اُردو غزل اور چند دکنی شعراء

غزل کا خمیر غنائیت، شدتِ جذبات، نزاکتِ ادا اور سوز و گداز انہی چار عناصر سے اٹھا ہے۔ شعر و نغمہ اس کی روح ہیں، اور جب غزل کے ساز سے یہ نغمے بلند ہوتے ہیں تو سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کے تار کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اور حدیثِ دیگراں اپنی حدیثِ غم دوراں اپنا غم اور ہر لفظ کی اٹھتی ہوئی آواز اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

غزل کو نقادوں کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے کئی پہلو اور رہیت ہمارے سامنے نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً

"غزل ہمارے مخصوص ماحول کی پیداوار ہے اور ہمارا مخصوص ماحول غزل کی پیداوار۔" [1]

"غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔" [2]

غزل کا سب سے بڑا یہ اعجاز ہے کہ اس میں طویل سے طویل کہانی کو مختصر سے مختصر الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

عشق و محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو یونیورسل حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں عشق و محبت کا ذکر ہوگا ظاہر وہاں صنفِ نازک سے مخاطبت ہوگی۔

شاعروں نے مختلف انداز سے اپنے معشوق بے پروا کا ذکر کیا ہے، جس سے ان کے معشوق کے حسن و جمال، عادات و خصلت، رنگ و روغن، چال و ادا، گفتار و افتادِ طبیعت، ناز و انداز، بے اعتنائیاں اور جفا شعاریاں کا اندازہ ہوتا ہے۔

غزل کا بنیادی موضوع خواہ وہ کسی دور سے کیوں نہ ہو عشق ہی رہا ہے۔ قلی قطب شاہ سے دورِ حاضر تک یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ بعض ادوار میں یہ جذبہ بہت ہی شدت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جذبہ وہی ہے لیکن انداز بدلا ہے۔

قلی قطب شاہ کے کلام کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو

---

[1] غزل اور مطالعۂ غزل از ڈاکٹر عبادت بریلوی
[2] جدید غزل از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ان کے پاس جذبۂ عشق کی جلوہ طرازیاں ہیں
نہ صرف یہ بلکہ ان کے کلام سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معشوق تو
گوشت پوست کا ایک انسان ہے اور دکنی ہے۔ غزلوں میں عشق
کی روئیداد کو نہایت کھلے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ان کا کلام دکنی
اور خاص طور پر ہندی سے متاثر ہے۔ تشبیہ اور استعارے بھی
خالص عام فہم اور بول چال کی زبان کے استعمال کئے گئے ہیں۔
نمونتاً چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

میرے سجن کو بولو جتنے سارے بتیاں
سبھی اما لاں کہو اس کا جواب

وفا منگتے ہیں بے عقلی ٹھہر حُسن میں اب
وفا کا پاس نہیں اس شہر میں کیسا ہے یہ بد مست

خال ہندو کا کر مجھ کیا ہے بت پرست
سب خیالاں اپنے سٹک کرتا ہے میرا خیال بہت

نہیں عشق میں وہ بڑا کوڑ ہے
کہ ہر جس اس سے مل بیسا جائے نا

قطب شاہ نہ دے مجھ دوانے کو پند
دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

اسی طرح دوسرے دکنی شعراء کا کلام دیکھنے سے یہ
پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہندی الفاظ کو بہت خوب برتا اور ان کا
بھی موضوع عشق ہی ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے فرزند اور
جانشین سلطان عبداللہ قطب شاہ جو عبداللہ تخلص کرتا تھا،
ان کے کلام میں مندرجہ بالا خصوصیتیں مل سکتی ہیں۔ چند اشعار
ملاحظہ فرمائیے۔

تو پیاری عشق بھی تیرا ہے پیارا
لگیا ہے بہوت تج سوں دل ہمارا
سکھی آمل کہ تل تل ذوق کریں
دنیا میں کوئی نہیں آیا دوبارا

اسی دور کے مشہور شاعر غواصی کے کلام میں بھی
یہی خوبیاں کم و بیش مل جاتی ہیں۔ اس میں سطحیت ہے۔ یہ بھی اپنی غزلوں
میں عشق ارضی ہی کی بات کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہوتا — عشق بازی میں چاک چاک ہوتا
دل کے انکھیاں میں لانے میں سر — اس کی پلکاں منج تلاک ہوتا
ہے غواصی یو عاشقانہ غزل — یو غزل میں درد ناک ہوتا

اسی دور کے بعد غزل ایک نئے مزاج سے ہم آہنگ
ہوتی ہے اور اسے ایک نیا موڑ ملتا ہے۔ اس نئے موڑ کے بانی ولی
اورنگ آبادی ہیں۔ ولی دہلی ہو آئے تھے اور انھیں وہاں ہاتھوں
ہاتھ لیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے کلام کی پیروی کی گئی۔ ولی کے
زمانہ میں تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ چونکہ ولی بھی
اس سے متاثر تھے اور صوفیانہ مسلک اختیار بھی کر لیا تھا اس لئے
ان کے کلام میں متصوفانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ نیز سلاست اور
متانت بھی پائی جاتی ہے۔ لطف زبان، سادگی، صفائی ان کے
کلام کے خاص جوہر ہیں۔ تصوف کے باوجود ان کے کلام میں غزل کا
جو بنیادی عنصر "عشق" موجود ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے:

اس کی تعظیم ہوئی اہل چمن پر لازم
بلبل باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا

خیال کی مت کرو دل فرازی — خاطرِ زلف مشک فام رکھو
ناز سے سرکشی کوں دیکھو لگا — آج میرا تیاز نام رکھو

تجھ عشق میں ولی کے انجھوں اُمنڈ چلے ہیں
اے بحرِ حسن آ دیکھ اس پور کا تماشا

ولی اورنگ آبادی کے بعد غزل میں وسعتِ بیان
اور زود معنویت اور اس کے نئے مزاج سے روشناس کروانے میں
سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی نمایاں شخصیت ہمارے
سامنے آتی ہے۔ سراج چونکہ صوفی منش تھے اس لئے ان کے کلام
میں تصوف ملتا ہے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ عشق بھی بدرجہ اتم موجود

ہے۔ ان کی غزلیں اکثر ذو معنوی ہوتی ہیں۔ یعنی اگر یہ غزلیں ایک طرف مجلس سماع میں صوفیا کو روحانی غذا پہنچاتی ہیں تو دوسری طرف اہلِ ذوق کے لئے لطف و مسرت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

مضامین کی شگفتگی، خیالات کی بلندی اور کلام کی صفائی اور سادگی یہ تمام خوبیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ دکنی شاعروں میں سراجؔ اپنی آپ مثال ہیں۔ سراجؔ اپنے منفرد انداز کی وجہ سے دوسرے تمام ہم عصروں اور تمام دکنی شعراء سے ممتاز ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو توں رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بےخبری رہی

شہِ بےخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یوں ہی دھری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بےنوائے سراجؔ کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بےخطری رہی

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاہ سراجؔ کے کلام میں تصوف کی چاشنی کے ساتھ ساتھ غزل کے لئے جو بنیادی شئے عشق موجود ہے، ان کے کلام میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں کی جھلک ہوتی ہے۔ قاری خواہ وہ کسی مشرب کا ہو اپنے مطلب کی بات ان کے کلام سے اخذ کر لیتا ہے۔ سراجؔ نے غزل کو ایک ایسا حسین امتزاج بخشا کہ اس کا پلہ بالکل برابر رہا۔ تو وہ عشقِ مجازی کی آواز بن کر رہ گئے اور نہ وہ بالکلیہ عشقِ حقیقی کی ہی بازگشت۔ اسی وجہ سے ہماری اردو غزل ایک نئے مزاج اور آہنگ سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان شعراء کے کلام میں موضوع عشق رہا ہے۔ ان شعراء کی شاعری کو ہم کسی حد تک عوامی شاعری کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کے کلام میں سیدھا سادا انداز، الفاظ اور محاورہ بالکل اسی زمانے کے روزمرہ کے استعمال کئے گئے ہیں۔

سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی یہ لوگ اپنے آپ کو شمال کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے خاص طور سے ان شعراء نے فارسی ترکیبوں اور بحروں کے، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اور زیادہ تر ہندی بحروں سے کام لیا ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر دکنی شعراء شمالی ہند کے شعراء سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ دکنی شعراء کے کلام میں بعض جگہ محبت کا اظہار معشوق کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

☆

ملّا جامی

پھول

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ام الفضلؓ جو حضور اکرم
 اللہ علیہ وسلم کی چچی تھیں، آپؐ کے پاس آئیں اور عرض کیا: "حضور!
 نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کہ آپؐ کے جسم مبارک کا ایک ٹکڑا
ٹ کر میری گود میں ڈال دیا گیا ہے۔"
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور فرمایا: "چچی!
و بڑا اچھا خواب ہے۔"
اُم الفضلؓ کے اس خواب کے کچھ دن بعد ہی سیدنا حضرت
ینؓ ۵ شعبان ۴ھ (۸ جون ۶۲۶ء) کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔
ضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے
ر فرمایا: "میرے جگر پارہ کو میری گود میں دو۔"
آپؐ نے بچے کو گود میں لے کر کان میں اذان کہی۔ پھر آپؐ
نے حضرت حسینؓ کو ام الفضلؓ کے گود میں دے دیا۔ اس طرح
ن کا خواب پورا ہو گیا۔ حضرت حسینؓ کے عقیقہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
ے دو جانور ذبح کئے اور ان کے سر کے بال منڈوا کر اتنے ہی وزن کی
ندی خیرات کی۔ حضرت حسینؓ اور حضرت حسنؓ سے رسول اللہ صلی اللہ
 وسلم کو بے انتہا محبت تھی۔ جب کبھی آپ بیٹی کے گھر تشریف لے جاتے
ان کو گود میں اٹھا لیتے، پیار کرتے اور ان کو اس طرح سونگھتے جس طرح
پھولوں کو سونگھا جاتا ہے اور فرماتے: "یہ دنیا میں میرے پھول ہیں۔"
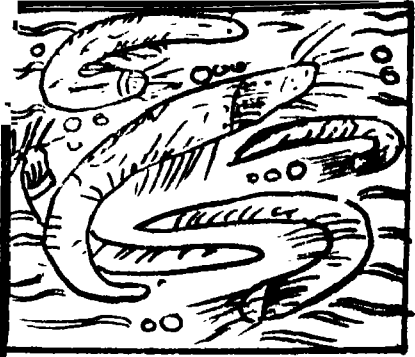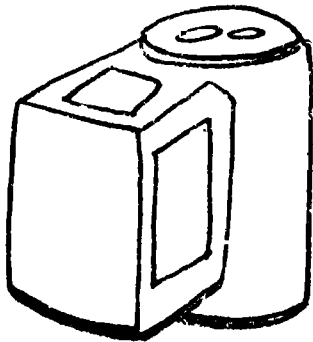
ترمذی کی ایک اور روایت ہے کہ "یہ دونوں میرے بچے اور میری بیٹی کے لڑکے ہیں۔ اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت رکھنے والوں سے محبت فرما۔" (ترمذی)

ایک مرتبہ آپؐ سیدۃ النساء بی بی فاطمہؓ کے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ حضرت حسینؓ کے رونے کی آواز آئی۔ بیقرار ہو کر رک گئے اور آواز دے کر کہا: "فاطمہ! کیا تم نہیں جانتیں، اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے؟"

ایک مرتبہ ایک صحابی بارگاہِ رسالت میں آئے تو دیکھا حضرت حسنؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے پر سوار ہیں۔ کہنے لگے: "کیا اچھی سواری ہے۔" اور حضور نے فرمایا: "اور سوار بھی تو اچھا ہے۔"

ایک بار حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہیتے نواسے کے ہاتھوں کو تھامے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی محبت سے فرما رہے تھے: "اے ننھے قدموں والے! چڑھ آ، اوپر چڑھ آ۔" بچہ جسمِ اطہر پر چڑھنے لگا۔ آپ نے اس کے قدموں کو سینے سے لگا دیا۔ پھر فرمایا: "اے اللہ! اسے محبوب رکھ کہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں۔"

ایک دن دونوں بھائی حسنؓ اور حسینؓ بچپن میں کھیلتے کھیلتے

لڑ پڑے۔ پھر ماں کے پاس ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہوئے آئے۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ حسینؓ نے مارا یا حسنؓ نے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم دونوں پر اللہ میاں خفا ہوں گے۔ کیونکہ وہ لڑائی جھگڑے کو پسند نہیں کرتے۔" یہ سن کر دونوں بھائیوں نے سر جھکا لیا اور کہا: "امی! اب معاف کر دیجئے۔ آئندہ ہم کبھی نہ لڑیں گے۔" بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "معافی اپنے خدا سے مانگو۔ چلو وضو کرو اور مصلّے پر کھڑے ہو جاؤ۔" دونوں بچے اللہ کے حضور کھڑے ہو گئے اور عبیلے پن کے ساتھ اللہ سے معافی مانگنے لگے۔

خاندانِ نبوت میں بچوں کی تربیت کا یہی انداز تھا۔ ہر بات پر ان کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی تربیت دلائی جاتی تھی۔ بچپن میں جو بات بچوں کے ذہن میں بٹھائی جاتی ہے بڑے ہو کر وہی ان کی شخصیت اور کردار پر اثر ڈالتی ہے۔ بچوں کو ان کے قصور پر اللہ سے ڈرانے اور ان کے مطالبات پر اللہ تعالیٰ سے طلب کرنے کی اس طرح تلقین کی جاتی رہے تو بچپن ہی سے ان کے ذہن میں خدا کا خوف اور خدا کی محبت رچ بس جاتی ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں نواسوں کو اکثر ساتھ رکھتے تھے۔ نماز پڑھتے وقت انھیں اپنے پاس بلا لیتے۔ کہیں دعوت ہوتی تو ان کو بھی ساتھ لے جاتے۔ بچپن ہی سے دونوں بچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رہن سہن طور طریقے، رکھ رکھاؤ سے واقف ہوتے رہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
حسنؓ و حسینؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے کشتی لڑا کرتے تھے تو حضورؐ
دونوں کو جدا کر کے سونگھتے جیسے
پھولوں کو سونگھا جاتا ہے۔"

بدیع الزّماں خاور

○

کیا وفا ڈھونڈتے حسینوں میں
دل ہی جب ہوں نہ، اِن کے سینوں میں

کیا پتہ، بھیگتے مہینوں میں
کیوں سُلگتی ہے آگ سینوں میں

کیجئے دوستی، رقیبوں سے
پالیئے سانپ آستینوں میں

غم کی پرچھائیاں ہیں چہروں پر
خوف کی تیرگی ہے سینوں میں

پار کرنا ہے خون کا دریا
آکے بیٹھے تو ہیں، سفینوں میں

پھول جس کو قبول کر نہ سکے
رچ گئی وہ مہک پسینوں میں

رنگِ مئے کتنا پھیکا پھیکا ہے
گھول دو خون، آبگینوں میں

اُن مکانوں کو کیا کہیں، جن کا
کوئی مالک نہ ہو مکینوں میں!

فصلِ خاورؔ کوئی اُگے نہ اُگے
بیج تو ڈال دو، زمینوں میں

جے رادھا کرشنن

طوفانوں پر قابو

قدرتی طوفانوں اور طغیانیوں کو ہندوستان اور جنوب
مغربی بحرالکاہل کے علاقے میں "سائیکلون" بحیرہ جنوبی چین کی سرحدوں
پر واقع ملکوں میں "ٹائیفون" مغربی اٹلانٹک خطے کیریبین سمندر اور خلیج
میکسیکو میں "ہریکین" کہا جاتا ہے۔ ان طوفانوں کا نام خواہ کچھ ہو جب
یہ واقع ہوتے ہیں تو بہت بھیانک ہوتے ہیں۔ یہ تباہیوں کا متواتر
پیش خیمہ ہیں۔ اور اپنے پیچھے جان و مال کا بے پناہ نقصان چھوڑ جاتے ہیں۔

ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں سائیکلونی طوفانوں
کا بہت پہلے سے صحت کے ساتھ پتہ لگانے کا معیار بہت اونچا ہو گیا
ہے۔ لیکن ان کے اثرات کی پیش گوئی کرنا ابھی تک امریکہ اور جاپان
جیسے ملکوں میں بھی مشکل ہے جہاں ہر سال واقع ہونے والی طوفانی
تباہیوں نے تاریخی صورت اختیار کر لی ہے۔

ماہرین کی رائے ہے کہ ان طوفانوں میں حقیقی جان لیوا
ان کے زور سے آنے والے سیلاب ہیں۔ ان کے اثرات کا اندازہ لگانا
زیادہ مشکل ہے۔ خاص کر پچھلے نومبر میں مشرقی بنگال جیسے طوفانی
سیلابوں سے آنے والی تباہی و بربادی کا۔ ایک اندازہ کے مطابق
۱۹۴۷ء کے بعد سے سائیکلونی تباہیوں میں تقریباً ۱۰ لاکھ اموات
ریکارڈ کی گئی ہیں۔ یعنی ڈوب مرنے والے ہر پانچ افراد میں سے تقریباً
چار طوفانوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔ اس سے عالمی موسمیاتی تنظیم کے
ذمہ جو بڑا کام آتا ہے وہ ہے تباہی سے قبل کی منصوبہ بندی۔

گرم علاقوں کے طوفانوں سے متعلق عالمی موسمیاتی ادارہ
کی طرف سے موسمیاتی ماہرین کی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جو موسمی پیش گوئی
مسئلوں پر نگاہ رکھنے کا پلان بنائے گی تاکہ تباہیوں سے زندگیاں بچائی
جاسکیں اور نقصان میں کمی ہو۔

"ہندوستان کے لئے قدرتی طوفان نسبتاً کہیں پرانا مسئلہ
ہے۔ درحقیقت ہندوستان کے محکمۂ موسمیات کے قیام کا سلسلہ
ایک طوفان سے جوڑا جا سکتا ہے جس نے ۱۹۶۴ء میں بنگال میں
تباہی مچائی تھی۔"

یہ بیان ہندوستان کے محکمۂ موسمیات کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر
پی کوٹیشورم کا ہے۔ ہندوستان کے موسمی پیشگوئیوں کے پروگرام کے
ساتھ برسوں کی ان کی دیرینہ وابستگی نے انھیں گرم علاقوں کے طوفانوں
کے متعلق ایک مستند ماہر بنا دیا ہے۔

۱۹۶۴ء کے طوفان کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ کلکتہ، مدراس
اور بمبئی میں طوفانوں سے متعلق خبردار کرنے والے نظام کا قیام عمل میں
آیا۔ یہ تینوں مرکز ان طوفانوں کا سراغ لگاتے ہیں جو خلیج بنگال اور

بحیرۂ عرب میں تشکیل پاتے ہیں۔ ڈاکٹر کوٹیشورم نے بتایا کہ یہ نظام کار کسی بھی طرح تسلی بخش نہیں تھے۔ لیکن اپنی سوجھ بوجھ اور امریکہ اور دوسرے ملکوں میں اس ضمن میں ٹیکنالوجی کو جو فروغ ملا ہے اسے اختیار کرنے سے ہم ایسے مناسب اقدامات کی رہنمائی کے قابل ہوئے جس سے حتی الامکان کم سے کم نقصان ہو۔

انھوں نے بتایا کہ موثر پیشین گوئیوں میں آگے کی جانب عظیم چھلانگ سنہ ۱۹۶۰ء میں عمل میں آئی۔ امریکہ کے "ٹائرس" (TIROS) اور "ایسا" (ESSA) موسمیاتی مصنوعی سیارے مدار میں گردش کر رہے ہیں ہندوستان ان کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پہلے پہل یہ کام روزمرہ کی بنیاد پر معلومات کے تبادلہ کے ذریعہ انجام دیا جاتا رہا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۶۴ء میں امریکہ نے ہندوستان کو بحر ہند کی مہم کے متعلق بین الاقوامی پروگرام کے حصے کے طور پر تصویریں بھیجنے کی خودکار آلات سے لیس مشنری مہیا کی۔ چنانچہ ابھی تک یہ بمبئی میں کام کر رہی ہے اور یہ گرم ملکوں کے طوفانوں کے بارے میں پیشین گوئیوں کے سلسلے میں بڑی مدد دے رہی ہے۔

"امریکی موسمیاتی مصنوعی سیارے طوفانوں کی تباہی کو کم کرنے کے متعلق عالمگیر مساعی میں ایک عظیم برکت ثابت ہوئے ہیں۔ جب کہ وہ مدار میں رات دن گردش کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف تصویروں کی تشریح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ان میں تصویر بھیجنے کا خودکار سسٹم بھی موجود ہے۔"

اس اثنا میں ہندوستان کے محکمہ موسمیات کی طرف سے ملکی طور پر زیادہ خودکار تصویریں بھیجنے کا سامان تیار کرنے کے سلسلے میں کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ پچھلے برس ہم نے ملک میں ہی یہ مشینری بنانے میں کامیابی حاصل کی اور ان میں سے چار مشینیں اب کلکتہ، دلی، مدراس اور پونہ میں لگائی گئی ہیں۔ ان کی صلاحیت بڑھانے کے لیے وشاکھاپٹنم میں ایک خصوصی موسمی راڈر نصب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۲ء تک دو مزید راڈر مدراس اور کلکتہ میں نصب کرانے کا پلان بنایا گیا ہے۔ ان کے فوراً بعد پانچ مزید مرکزوں — یعنی بھوبنیشور، مسولی پٹنم، کرائیکل، بمبئی اور گوا میں راڈر نصب کئے جائیں گے۔ ساحلوں پر نصب کئے جانے والے یہ راڈر ۴۰۰ کلومیٹر کی دوری تک کام کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر کوٹیشورم نے بتایا کہ ان کی مجموعی سہولتوں سے ہم ہندوستان کے نزدیک کہیں بھی آنے والے طوفانوں کا مکمل اور کامیاب سراغ لگانے کی امید رکھتے ہیں۔ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ عرصہ پہلے ہی ساحلی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو مطلع کرنا ممکن ہے۔ راڈروں کے حوالے سے زیادہ صحت سے یہ بتانا بھی ممکن ہو جائے گا کہ طوفان ٹھیک کہاں تباہی مچانے والے ہیں۔

ڈاکٹر کوٹیشورم ماہر موسمیات ہیں جنھوں نے امریکہ کی نیشنل ہری کین ریسرچ لیبارٹری میامی (فلوریڈا) میں تین برس ۱۹۶۴ء ۶۷ گزارے تھے اور اس عرصے میں قبل از وقوع تباہی منصوبہ بندی میں خصوصی تحقیق کی تھی۔ ان برسوں میں وہ ایک بہترین متعلقہ ٹیکنالوجی کے ارتقاء سے وابستہ رہے جن سے طوفانوں سے ہونے والی تباہیوں کو گھٹانے کے موثر اقدامات کئے جا سکیں

نظر و خبر

تضمین بر نظم علامہ سیماب اکبر آبادی

عارف سیمابی بانکوٹی

انسانوں پر اک قہر خدا دیکھ رہا ہوں		جرأت نہیں کہنے کی میں کیا دیکھ رہا ہوں
ہر شخص کو مائل بہ جفا دیکھ رہا ہوں		"مشرق کے کناروں پہ گھٹا دیکھ رہا ہوں
ٹھہرا ہوا طوفانِ بلا دیکھ رہا ہوں"

افسوس رہے دن وہ حمایت نہ خوشی کے		یہ حال ہو جینے کا تو کیا فائدہ جی کے
آزادیوں نے طور بگاڑے ہیں سبھی کے		"پھیلے ہیں وبا بن کے جراثیم خودی کے
تاراجیٔ مخلوقِ خدا دیکھ رہا ہوں"

کس منہ سے کہوں اپنے وطن کی میں کہانی		ہر ذرہ یہاں آج فسادوں کا ہے بانی
دم توڑ چکی حوصلۂ دل کی جوانی		"انفاس پہ طاری ہے جمود اور گرانی
میں قبضِ فضا نبضِ ہوا دیکھ رہا ہوں"

کیا ہو گیا شیخ اور برہمن کو نہ جانے		گڑھتے ہیں یہ خود بیٹھ کے مذہب کے فسانے
آتے ہیں انھیں جب لڑانے کے بہانے		"مندر ہیں ہوا غراض پرستوں کے ٹھکانے
مسجد میں قیامِ جہلا دیکھ رہا ہوں"

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے انساں کی تباہی		پھیلی ہوئی ہر سمت ہے ظلموں کی سیاہی
میں بھی ہوں اسی جادۂ پرہول کا راہی		"ہوں منتظرِ جلوۂ منشاءِ الٰہی
تقدیر کو منظور ہے کیا دیکھ رہا ہوں"

ہونے کو نمودار ہے ایک اور سویرا		اٹھنے ہی کو ہے چہرۂ سفاک سے پردا
اب اور زیادہ نہ رہے گا یہ اندھیرا		"پھٹنے ہی کو ہے مادرِ مشرق کا کلیجا
ہر ذرے کو مجبورِ گلہ دیکھ رہا ہوں"

صمد جاوید (علامہ گنبد)

شادی کا مشاعرہ

تقریب ہے شادی کی کرم کیجئے مجھ پر
مہمان بڑی شان کے آتے ہیں مرے گھر
لیڈر بھی ہیں افسر بھی شہریان منسٹر
سب ٹھاٹ وہ ہوں گے کہ کوئی دیکھے گھڑی بھر

امید ہے فنکشن یہ بڑی ٹھاٹ کا ہوگا
فرمائیں قدم رنجہ کرم آپ کا ہوگا

آجائیں گے حضرت تو مری بات رہے گی
پُر لطف یہ تقریب ملاقات رہے گی
محفل جمی احباب کی دن رات رہے گی
ڈوبی ہوئی نغمات میں بارات رہے گی

اشعار سے حضرت ہمیں دل شاد کریں گے
برسوں سبھی احباب انھیں یاد کریں گے

مدت سے اقارب کو تھا اس بات کا ارماں
شادی میں نئی ڈھب کے ہوں تفریح کے ساماں
بستی میں تخلص کا ہوا آپ کے اعلاں
آئے نہ اگر آپ تو آجائے گا طوفاں

دعوت کریں منظور مری حضرت والا
واللہ نہ کیجے گا کوئی حیلہ حوالا

شرف کمالی

غزل

تمام قصۂ غم میکشو تمام کرو
شراب و ساغر و مینا کا اہتمام کرو

جو چاہتے ہو تو رائج نیا نظام کرو
پرانے بادہ کشوں کا بھی احترام کرو

مرے مزاج سے واقف نہیں ہیں وہ شاید
جو کہہ رہے ہیں کہ جھک کر ہمیں سلام کرو

خلوصِ دل سے ملو ہم سے تم جہاں بھی ملو
سیاستوں کو بھی اپنی سپردِ جام کرو

بساطِ دیر و حرم میں اگر اماں نہ ملے
ہمارے دل میں جگہ ہے یہاں قیام کرو

جلو میں اپنے بنارس کی صبح لے آؤ
ہماری شام کو آکر اودھ کی شام کرو

فرازِ طور کی عظمت پہ حرف آتا ہے
تم اپنے حسن کے جلوؤں کو یوں نہ عام کرو

غمِ حیات کا ہم احترام کرتے ہیں
ہماری شوخ پسندی پہ مت کلام کرو

شرف ملے گا تمھیں حجِ اکبری کا ثواب
کسی غریب کی خوشیاں نہ تم حرام کرو

"اے قادرِ عادل کچھ تو بتا......

یونس قنوجی

ہنگامۂ غم سے اکتا کر میں یونس کل کچھ رات گئے
بستی سے پرے اک وادی میں بیٹھا تھا غزل کہنے کیلئے
ناگاہ کہیں نزدیک سے ہی اک دردبھری آواز آئی
دیکھا کہ کوئی مزدور صفت انسان مصیبت کا مارا
اے قادر و عادل کچھ تو بتا دنیا میں تری اندھیر ہے کیوں
و نے تو محبت کی خاطر تخلیق کیا تھا انساں کو
سرمایہ پرستی نے لیکن قانونِ مشیئت بدلا ہے
دولت کے پجاری اپنے کو قانون سے بالا کہتے ہیں
داب محبت، مہر و وفا آزار ہیں ان کی نظروں میں
ظہارِ فضیلت سکوں کی جھنکار ہے ان کے مذہب میں
دار کو احمق کہتے ہیں فاقہ کو حماقت کہتے ہیں
زدور کے رُخ کی زردی سے زرکار ہیں ان کے کاشانے
ب بھوک کا طوفاں اٹھتا ہے جب موت کی آندھی آتی ہے
طوں کے اندھیرے سے ان کے محلوں میں اُجالا ہوتا ہے
ب کوئی غرض آپڑتی ہے تب دھرم کی سیوا کرتے ہیں
مظلوموں کو قسمت کی افیون پلائی جاتی ہے
جینے کا حق مانگیں تو زنجیر کا پیچ و تاب ملے
کر و دغا کی طغیانی یہ جبر و تشدد کے طوفاں
ر کبتک معصوموں کی تقدیریں آہیں بھرنا ہے

تخیل کے شہپر ٹوٹ گئے، دل کانپ اٹھا، جاں تھرا
رو رو کے خدا سے کہتا ہے باحال پریشاں بیچار
اخلاق کی حالت پست ہے کیوں؟ ایمان کی طاقت زیر ہے کیو
تو نے تو مساواتِ انساں کا درس دیا تھا انساں کو
دستورِ مروّت بدلا ہے عنوانِ محبت بدلا ہے
کونین کے مالک بنتے ہیں سنسار کا آقا کہتے ہیں
ایثار و خلوص و لطف و عطا بیکار ہیں ان کی نظروں میں
معیارِ شرافت بیہودہ تکرار ہے ان کے مذہب میں
مزدور کو حیواں کہتے ہیں محنت کو جہالت کہتے ہیں
دہقاں کے پیارے اشکوں سے گلنار ہیں ان کے پیمانے
اس وقت خزانوں میں ان کے کچھ اور تری آجاتی ہے
ہر بات انوکھی ہے ان کی ہر کام نرالا ہوتا ہے
مذہب کا لبادہ اوڑھ کے تب ایمان کا سودا کرتے ہیں
بیدار امنگوں پر پیہم اک ضرب لگائی جاتی ہے
روٹی کے عوض فولاد ملے پانی کے عوض زہراب ملے
اے قادر و عادل کچھ تو بتا برداشت کرے کبتک انسا
آخر کبتک خونخواروں کی قسمت میں خدائی کرنا ہے

ایسا نہ ہو یہ بیکس بندے تکرار کی باتیں کرنے لگیں
تقدیر کے گن گانے والے تلوار کی باتیں کرنے لگیں

اچاریہ ونوبا جی بھاوے

بھارت میں بیسویں صدی کے دوران جو چند عظیم مصلح پیدا ہوئے ہیں، ونوبا جی اُن میں سے ایک ہیں۔ مہاتما گاندھی کے سچے پیروکار اور جانشین کہے جا سکتے ہیں۔ گاندھی جی کی موت کے بعد ان کی تعلیمات اور ان کے بلند نظریات کو صحیح طور پر سمجھتے ہوئے انھیں عملی جامہ پہنانے کا کام ونوبا جی نے انجام دیا ہے۔

آپ کا جنم ستمبر ۱۸۹۵ء میں مہاراشٹر میں ضلع قلابہ کے گاگوڈے نامی گاؤں میں ہوا۔ آپ کے والد بڑودہ کے مہاراجہ کے یہاں اعلیٰ عہدے پر مامور تھے، اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم وہیں پر ہوئی — انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ کے والد نے آپ کو سنسکرت اور ویدکی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بنارس یونیورسٹی میں داخل کیا۔ اسی دوران بنارس ہندو یونیورسٹی میں مہاتما گاندھی کسی تقریب کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے۔ ونوبا جی بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔

گاندھی جی کی تقریر سننے کا یہ پہلا موقع تھا، اور اس پہلی تقریر ہی نے آپ کے خیالات میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ نے اپنی تعلیم کو منقطع کر کے مہاتما گاندھی کے ساتھ مل کر قومی، سماجی اور ملکی خدمت انجام دینے کا فیصلہ کیا — گاندھی جی سے خط و کتابت کے ذریعہ آپ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، جسے گاندھی جی نے قبول کر لیا — اور آپ کے اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے آپ کو اپنے پاس بُلا لیا۔ گاندھی جی کی جانب سے رضامندی کا اظہار ہوتے ہی آپ نے اپنے دوستوں کو بُلا کر ان کے سامنے وہ تمام اسنادیں جلا دیں جو مختلف امتحانات کامیاب کرنے پر انھیں حاصل ہوئی تھیں۔ دراصل آپ ان کاغذی اسناد کا کوئی لالچ اپنے دل و دماغ میں باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے — اور ایسی اسناد حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ آپ گاندھی جی کے ساتھ رہ کر عملی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ لہٰذا آپ اپنی تعلیم ختم کر کے سابرمتی آشرم چلے گئے، جہاں آپ کو گاندھی جی کے ساتھ تقریباً پانچ سال تک رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران آپ نے گاندھی جی کے بلند نظریات اور ان کی تعلیمات کو پوری طرح اپنایا تھا۔ مگر یہاں آپ کی ایک تشنگی دور نہ ہو سکی، وہ تھی ویدوں اور پُرانوں کی تعلیم۔ اس تشنگی کو بجھانے کے لئے آپ لکشمن وشنو شاستری جی کے پاس "وائی" آئے۔ اُن سے ویدوں اور پُرانوں کی تعلیم حاصل کر کے دوبارہ سابرمتی آشرم چلے گئے، اور گاندھی جی کے کام میں شریک ہوئے — آپ گاندھی کے منظورِ نظر تھے۔ گاندھی جی آپ کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے مختلف موقعوں پر اپنے عقیدت مندوں اور دوستوں کے سامنے یہ کہہ کر کیا کہ

" یوں تو بھارت میں ہزاروں بیٹے ہیں مگر میرا روحانی
بیٹا صرف ایک ہے ، اور وہ ہے ونوبا بھاوے "

گاندھی جی نے ونوبا بھاوے کو تحریک ستیہ گرہ کا لیڈر بنایا اور اس وقت سے ونوبا جی نے عالمگیر شہرت پائی۔ اس سے قبل وہ گاندھی جی کے ساتھ گمنام رہ کر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

تحریک آزادی کے سلسلہ میں آپ کئی بار جیل گئے۔ یہاں آپ نے "گیتائی" کے نام سے بھگوت گیتا کی شرح لکھی۔ بچپن میں آپ اپنی ماں کی زبانی بھگوان کرشن اور گیتا سے متعلق بحث بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے۔ آپ کی ماں کی خواہش تھی کہ بڑا ہونے پر ونوبا جی مراٹھی میں گیتا کی شرح لکھتے۔ اپنی ماں کی اس خواہش کو آپ نے جیل میں پورا کیا۔ کیونکہ "گیتائی" مراٹھی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ آپ سے کمزوری کے باعث لکھنے کا کام نہیں ہو پاتا تھا چنانچہ آنجہانی سانے گروجی سے اس سلسلہ میں مدد لی۔ "گیتائی" ہندوستان میں بہت مقبول ہے، اور اس کا ترجمہ ہندوستان اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ گاندھی اگر اہنسا کی تعلیم کے سلسلہ میں ونوبا جی کے استاد تھے تو بھگوت گیتا کی تعلیم کے سلسلہ میں ونوبا جی ان کے استاد تھے۔ اسی بات کا اظہار انھوں نے خود ونوبا جی اور دوسروں سے کیا ہے ۔ ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے سابرمتی آشرم میں ایک کانفرنس بلائی جس کی صدارت آنجہانی بابو راجندر پرشاد نے کی تھی۔ مقررین نے گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کے نظریات، نیز ان کی عملی زندگی کو موضوع سخن بنایا۔ صدر جلسہ کی پیش کش پر جب ونوبا جی تقریر کرنے کیلئے آئے تو آپ نے کہا کہ گاندھی جی کے نظریات اور ان کی تعلیمات ان کی اپنی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے دیش کی پرانی سنسکرتی اور تہذیب ہے۔ گاندھی جی نے اسے اپنایا اور از سر نو عوام تک پہنچایا۔

ملک کے غریب طبقہ کی زبوں حالی اور خستہ حالی کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ نے "بھودان" کی تحریک شروع کی اور اس کے ذریعے کل ۴۲ لاکھ ایکڑ زمین حاصل کر کے غریبوں میں تقسیم کی۔ اس تحریک کو آپ نے بھارت کے کونے کونے میں پھیلا دیا، اور ہزاروں بیروزگار کسانوں کی زندگی کو خوشحال بنایا۔ اس تحریک سے صرف دیہاتی باشندوں کو فائدہ پہنچا۔ چنانچہ شہر کی مفلس عوام کی فیض یابی کے لیے آپ نے "سمپتی دان" کی تحریک شروع کی۔ آپ کی تیسری تحریک "گرام دان" کی تحریک کہلاتی ہے۔ جس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ گاؤں کی تمام زمین وہاں کے باشندوں میں مساوی طور پر تقسیم کی جائے۔ اس کے بعد آپ نے ایک نئی تحریک "گرام راجیہ" کے نام سے شروع کی، جس کے پیچھے یہ تصور موجود ہے کہ گاؤں کی حیثیت ایک چھوٹی سی سلطنت کی طرح ہو، اور اس کے تمام معاہدات اور ضروریات گاؤں ہی میں پوری ہوں گویا گاؤں کو وہ ایک مکمل اکائی" (UNIT) بنانا چاہتے ہیں۔ ریاست بہار کے کئی گاؤں میں آپ اس قسم کے "گرام راجیہ" قائم کر چکے ہیں۔ بیرونی ملکوں کی حکومت کی جانب سے کئی نمائندے ان تجربات کو دیکھنے کے لئے آچکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ونوبا جی کی تحریکوں [illegible] مدد سے عوام کے دلوں میں محبت و اخلاص، صلح و آشتی اور امن و سکون کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں، اور اگر انھیں پوری طرح اپنا [illegible] جائے تو یہ ملک ایک "دارالامن" میں تبدیل ہو جائے گا۔

گرام راجیہ کی تحریک پر ہر سال ۵۵ لاکھ خرچ کیا جا[illegible] ہے۔ گزشتہ سال ان کے "ہیرک مہوتسو" کے موقع پر آپ کو ۷۶ لا[illegible] روپئے کی تھیلی پیش کی گئی۔ یہ تمام رقم آپ اسی تحریک میں صرف کر [illegible] ہیں۔ آپ کو اردو، انگریزی، ہندی، مراٹھی، فارسی، عربی اور فرا[illegible] زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ آپ نے صرف قرآن پاک کو سمجھنے اور ا[illegible] رموز سے واقف ہونے کے لئے عربی زبان سیکھی۔ آپ کا خیال [illegible] تمام مذاہب عالم میں سود کی صحیح تعریف یا اس کا صحیح مفہوم اگر کسی مذہب نے واضح کر دیا ہے تو وہ مذہب اسلام ہے۔

قرآن کے گہرے مطالعہ کے بعد آپ نے "روح القرآ[illegible]" نامی کتاب لکھی۔ آپ جنرل ایوب خان کے دور حکومت میں ایکبار پاکستا[illegible]

بھی دورہ کر چکے ہیں۔ وہاں بھی آپ کو ہزاروں ایکڑ زمین بھودان میں ملی، جو آپ نے غریب بھائیوں میں تقسیم کر دی، آپ ہندو مسلم اتحاد اور انڈو پاک اتحاد کے زبردست حامی ہیں۔

آپ موجودہ دور کے ایک بڑے صوفی اور روحانیت کے زبردست حامی ہیں۔ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جی اکثر کہا کرتے تھے کہ "ونوبا جی ایک انسان نہیں ایک چلتی پھرتی یونیورسٹی ہے۔" آپ ایک دور اندیش سیاست دان، مدبر اور مصلح قوم ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے اکثر لیڈر آپ سے اہم مسائل پر مشورہ لیتے ہیں۔

آپ نام و نمود اور شہرت سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ آپ بہت کم سخن ہیں۔ لیکن جو بھی کہتے ہیں۔ بہت ٹھوس کہتے ہیں۔ آپ کے بیانات کو سیاسی حلقوں میں مستقبل کی پیشین گوئی تصور کیا جاتا ہے۔ عملی طور پر اپنی تحریکوں کو چلانے کے ساتھ ساتھ ادب سے متعلق اور کتابوں کی تصنیف کی طرف بھی کافی توجہ دیتے ہیں کیونکہ آپ کا خیال ہے کہ ادب ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے عوام تک

انجمؔ عباسی

اُس کو ذرا چھو کے تو دیکھیں کہ وہ کیسا ہے
پتھر ہے کہ اک موم کے سانچے میں ڈھلا ہے

اُس نے مجھے اپنا کبھی سمجھا نہیں لیکن
جس سمت گیا ہوں وہ مرے ساتھ رہا ہے

جنگل ہے درندوں کا کوئی ساتھ نہیں ہے
کس جرم کی پاداش میں بن باس ملا ہے

تجھ پر بھی زمانوں کی نگاہوں کا ہے پہرہ
مجھ پر بھی ہر اک سمت سے پتھراؤ ہوا ہے

مجھ کو تری آواز کا سایہ ہے غنیمت
یہ بحث ہے بیکار کہ تو مجھ سے جدا ہے

چہرے جو ہیں کشکول ہیں اجسام کھنڈر ہیں
ہر شخص یہاں وقت کا آئینہ بنا ہے

ہر ہاتھ میں ہے گیان کا پستک مگر انجمؔ
اس دور کا انسان بھی چنگیز رہا ہے

★

شمس الرحمن محسنی
پرنسپل جامعہ اسکول آف سوشل ورک

مسلم سوشل ورکرز کیلئے لمحۂ فکریہ

ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی مسائل

آج کل دنیا کا ہر ملک اپنے یہاں ویلفیر سوسائٹی قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سماج کے ہر بچے، نوجوان، بوڑھے اور ہر مرد عورت کے لئے اس بات کے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ اپنی جسمانی، ذہنی، اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو ابھار سکے اور اسے تہذیب و کلچر کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔ یہ سب اس وقت ہو سکتا ہے کہ سماج کے ہر فرد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ ہر شخص کو کام ملتا رہے، اتنا کام کہ وہ اپنے خاندان کے افراد کے لئے کھانا کپڑا اور مناسب گھر کا انتظام کر سکے۔ ان کے لئے تعلیم و تربیت کی سہولتیں مہیا کر سکے۔ ایسے سماج میں ان افراد کے لئے جو اپنی دیکھ بھال خود نہ کر سکیں ایسے سماجی ادارے اور انجمنیں مضبوط بنیادوں پر قائم ہوں جو ان کی کفالت کا بار اٹھا سکیں۔

ویلفیر سوسائٹی کے اس تصور کی بنیاد انسانی بھائی چارے اور سماجی عدل پر مبنی ہے۔ اسلام نے ان دونوں باتوں پر بہت زور دیا ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے پیش نظر ایسے سماج کی تشکیل تھی جس میں لوٹ کھسوٹ اور ظلم نہ ہو اور جو ہر فرد کو اس کی ہر طرح کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے مواقع فراہم کر سکے۔ قرآن نے دولت کی محبت اور ہوس کو برا کہا ہے۔ ایسے سماجی نظام کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے جو لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہو۔ اور جہاں دولت کے ذرائع پر چند لوگوں کا قبضہ ہو۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں عمل صالح کے معیار اور اصول بتائے گئے ہیں وہاں بار بار یہ بات دہرائی ہے کہ صرف ایمان کی پختگی اور عبادات کی ادائیگی کافی نہیں ہے بلکہ اپنی کمائی کا ایک مناسب حصہ خدا کی راہ میں صاحب حاجت غریبوں، ناداروں، قرضداروں اور مسافروں پر خرچ کرنا بھی عمل صالح کا ایک لازمی جزو ہے۔

پیغمبر اسلام نے پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک ایسا شخص جو خود کھائے جبکہ اسے معلوم ہو کہ اس کا پڑوسی فاقہ کر رہا ہے مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام نے ایک طرف دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی مذمت کی ہے اور دوسری طرف یہ ہدایت دی ہے کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ حاجت مند کی مدد کرے۔ قرآن شریف میں خیرات و صدقات دینے والے کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد اس طرح کرے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور جن کو یہ مدد دی جائے انھیں اس کوئی تکلیف نہ ہو۔ ان ہی تعلیمات کا اثر تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اوقاف کا رواج ہوا۔ خدا کی راہ میں صاحب حیثیت لوگوں نے لاکھوں روپیوں کی جائیدادیں وقف کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تعلیم

اشاعت بھی ہوتی رہے اور ضرورت مندوں کی مدد بھی ——
مسلمانوں میں اس قسم کے کاموں کے لئے رضاکارانہ انجمنیں بنانے کا رواج بھی بہت پہلے سے چلا آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ادارے موجودہ زمانے کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ اس صورتِ حال کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ مسلمانوں نے رفاہِ عام کے تصور کو بھلا دیا ہے۔ وہ ویلفیئر کے پرانے اداروں کو رفاہِ عام کے اصلی مقاصد کو سامنے رکھ کر اس طرح نئے انداز میں ڈھالنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ ادارے عصر جدید کے تقاضے پورا کر سکیں۔
پچھلے چند برسوں میں سماجی کاموں نے جو ترقی کی ہے اس کی وجہ سے ویلفیئر کے تصور میں بڑی وسعت آگئی ہے۔ ویلفیئر سروسز کے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ شہروں کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے جو سماجی مسائل پیدا ہو گئے ہیں انھیں حل کرنے کے لئے آج کے دانشوروں نے نئے نئے راستے تلاش کئے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے کہا تھا کہ "عقل و دانش مسلمانوں کا کھویا ہوا خزانہ ہے اور ان کا فرض ہے کہ جہاں ملے اسے حاصل کریں۔"
افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنے اور سماج میں انسانی اخوت اور سماجی انصاف کی بنیاد پر پچھڑے ہوئے لوگوں کو آگے بڑھانے کے لئے جو نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے ہیں ان پر عمل پیرا نہ ہونا سراسر نادانی ہے اور اسلام کی روح کے منافی ہے۔
آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کارِ خیر، سماجی خدمت ویلفیئر سروسز کا تصور صرف یہ تھا کہ مفلسوں، ناداروں اور دوسرے ایسے لوگوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے جو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ آج یہ تصور زیادہ وسیع ہو گیا ہے اور سماجی خدمت ویلفیئر سروسز میں وہ کام بھی شامل کئے جاتے ہیں جنھیں ہم آبادکاری کے کام بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کی خدمات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ضرورت مندوں کی کچھ اس طرح مدد کی جائے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور کچھ دنوں بعد اپنی اور اپنے متعلقین کی مادی ضرورت کی خود کفالت کر سکیں۔ اس کے علاوہ سماجی خدمت میں کچھ ایسے کام بھی شامل کر لئے گئے ہیں جن کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ سماجی مسائل کے پیدا ہونے کی روک تھام کی جا سکے۔ سوشل ویلفیئر کے مذکورہ بالا کاموں کی وضاحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔

۱۔ ضرورت مندوں کی مادی ضرورتیں پوری کرنا۔
(اس قسم کے کاموں میں یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے لئے گھر کا انتظام، ناداروں اور مفلسوں کی مالی مدد وغیرہ شامل ہیں۔)

۲۔ آبادکاری کے کام۔
(آوارہ یا ایسے بچوں کے لئے جو کسی ذہنی یا اخلاقی بیماری میں مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے ان کے والدین کو ان کی تربیت میں دشواری پیش آتی ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی اور ان کے والدین کی اس طرح مدد کی جائے کہ وہ اس مشکل پر قابو پا سکیں۔ خاوند بیوی کے تعلقات کسی وجہ سے استوار نہ ہوں تو اس کا اثر ان کے بچوں کی نشوونما پر بھی پڑتا ہے، انھیں مدد دینے کی ضرورت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھیں اور اپنے خاندان کو تباہی سے بچائیں۔ آج کل بڑے شہروں میں اس کام کے لئے جگہ جگہ چائلڈ گائیڈنس کلینک اور فیملی ویلفیئر سنٹرز قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ بیکار ہیں ان کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں کسی مفید کام سے لگایا جائے اور مناسب ذریعہ معاش تلاش کرنے میں ان کی مدد کی جائے۔ عوام کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں سہل طریقے پر عام تعلیم پھیلائی جائے۔ اس سلسلہ میں ذہنی طور پر پس ماندہ اور جسمانی طور پر معذور بچوں اور بڑوں کو اس طرح تربیت دینے کے ادارے بھی قائم ہیں کہ وہ اپنی دیکھ بھال خود کرنے کے قابل ہو سکیں۔)

۳۔ سماجی مسائل کی روک تھام۔
بچوں، نوجوانوں اور بڑوں میں بہت سے ایسے

ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جنھیں حل کرنے کے لئے ان تمام خدمات کا انتظام کرنا پڑتا ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ مسائل اکثر اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں کی سماجی ضرورتیں گھر، اسکول اور پڑوس کے تعاون کے ذریعہ پوری نہیں ہوتیں۔ اور وہ ان کو پورا کرنے کے لئے ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں جو ان کے اور سماج دونوں کے لئے مضر ہیں۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خاص انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کو کھانا، کپڑا اور گھر کے علاوہ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرصت کے مشاغل کی حاجت ہے اور بلند مقام کی خاطر آپس میں ملنے جلنے کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ غریبوں کی بستیوں میں بچوں کی تعلیم کا انتظام اگر نہیں ہے تو اس کا انتظام ہونا چاہئے۔ وہ اپنے بچوں کو اگر تعلیم نہیں دلاتے تو اس کے اسباب معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش درکار ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بالغوں کی تعلیم کے لئے آج کی دنیا میں جو جدید طریقے رائج ہیں ان کو استعمال کیا جائے تاکہ لوگوں میں اپنے مسائل کو سمجھ کر حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

آج کے ہندوستان میں مسلمانوں کے ویلفیئر کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ مسلمانوں میں ویلفیئر کے کیا کیا روایتی پروگرام چل رہے ہیں۔ عصر جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مسلمانوں نے اپنے ویلفیئر کے کون کون سے کام شروع کئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان ان ویلفیئر کی سروسز سے کہاں تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے مختلف محکمہ جات مہیا کرتے ہیں اسی سلسلے میں یہ بھی معلوم کرلینا چاہئے کہ مسلمان ان ویلفیئر سروسز سے کہاں تک مستفید ہو رہے ہیں۔ جو سیکولر ادارے اور ایجنسیاں بلا تفریق مذہب و ملت

—— ہر ہندوستانی باشندے کے لئے مہیا کرتی ہیں۔ مسلم ویلفیئر کے ان تمام پہلوؤں پر یقینی طور پر کوئی بات کہنا اس لئے مشکل ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

مسلم ویلفیئر کے موضوع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے موقع پر جامعہ اسکول آف سوشل ورک نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ایک سمینار کیا تھا، جس میں ملک کے بہت سے مسلم و غیر مسلم مفکروں اور سماجی کارکنوں نے شرکت کی تھی۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ویلفیئر کے تمام پہلوؤں پر اس سمینار میں جو باتیں زیر بحث آئیں ان کا ایک خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

مسلمانوں کے ویلفیئر کے روایتی پروگرام مسلم اوقاف کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ اندازہ ہے کہ ملک میں ان اوقاف کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کا اثاثہ تین سو اور پانچ سو کروڑ کے درمیان ہے۔

اوقاف کے زیر اہتمام جو کام کئے جاتے ہیں وہ بہت محدود ہیں۔ مسجدوں، درگاہوں، قبرستانوں کے علاوہ دینی مدرسے اور مکتب چلتے ہیں۔ یتیم خانوں، سراؤں اور مسافر خانوں کا انتظام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں عام تعلیم اور ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے بھی چلاتے ہیں۔ ان کی نگرانی میں اسمبلی ہال، ہسپتال، ڈسپنسری، لڑکوں کے لئے ہوسٹل کا انتظام بھی کیا جاتا ہے مفلسوں اور ناداروں میں کھانا اور کپڑا بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ بیواؤں کو مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔ ان کی سرگرمیوں کا جو سرسری جائزہ لیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اوقاف نے ابھی تک ان ویلفیئر سروسز کی طرف توجہ نہیں کی ہے جو عصر جدید کے تقاضوں کے پیش نظر ملک میں رائج ہو گئے ہیں اور جن پر توجہ دینے کی بڑی شدید ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سینٹرل پاس ہونے کے بعد اوقاف کے نظم و نسق میں بڑی حد تک تبدیلی آئی ہے جس کی بنا پر وقف کے روپئے کے غلط استعمال کی بڑی حد تک روک تھام ہو گئی ہے۔ اوقاف کے پاس کئی کروڑ روپئے کا اثاثہ ہوتے ہوئے باوجود مسلمانوں کے حالات سے مشہور اور پرانے تعلیمی ادارے

نتائج عام طور پر بڑی نازک حالت میں چل رہے ہیں۔ انھیں حکومت کی طرف سے ۹۰ یا ۹۵ فیصد امداد کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے۔ لیکن بجٹ کا پانچ یا دس فیصد حصہ جو انھیں خود فراہم کرنا پڑتا ہے مشکل سے جمع کر پاتے ہیں۔ اکثر ان کے اسٹاف کو کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی۔

ایک اور روایتی ادارہ مسلمانوں میں ویلفیر کا خاصا بہت کام کرتا ہے، وہ ہے "بیت المال"۔ حیدرآباد میں اور یوپی کے بعض علاقوں میں بیت المال قائم ہیں۔ جو ہر گھر سے ہر ماہ کچھ رقم جمع کرتے ہیں۔ اس رقم سے بہت سے ویلفیر کے کام کئے جاتے ہیں۔ غریب والدین کی مدد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی شادی کریں۔ قرض داروں کو جو ساہوکاروں سے بھاری سود پر قرض لئے ہوئے ہوتے ہیں یا اسیر قرضہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس قرض کو ادا کر دیں۔ کچھ تعلیمی اداروں کو گرانٹ بھی دی جاتی ہے۔ اس قسم کی تحریکیں ابھی تک پرانے انداز میں چل رہی ہیں لیکن ضرورت ہے کہ ان کو مقبول بنایا جائے اس لئے کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں میں تحریکات ... پیدا کی جا سکتی ہیں اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کے ... سے مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں جو رضاکارانہ انجمنیں عصر جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہیں ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے۔ سینٹرل سوشل ویلفیر کے ریکارڈ کے مطابق اندازہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں کل ملا کر دس ہزار رضاکارانہ انجمنیں کام کر رہی تھیں۔ بورڈ نے ان میں سے چھ ہزار انجمنوں کو مالی امداد دی تھی۔ ان چھ ہزار میں سے جنھیں سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ نے ۱۹۶۱ء میں گرانٹ دی تھی۔ صرف ۲ فیصدی ادارے ایسے تھے جنھیں کسی مذہبی گروپ نے قائم کئے تھے۔ ان میں سے تین فیصدی دوسرے مذہبی جماعتوں کے تھے۔ مسلمانوں کی رضاکارانہ انجمنیں جنھیں سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ سے مدد ملی وہ ایک فیصدی سے بھی کم تھیں۔

یہ اعداد و شمار ہم نے ڈاکٹر ڈی پال چودھری کے ایک مقالہ سے لئے ہیں جو انھوں نے مسلم ویلفیر کے سیمینار میں پڑھا تھا۔ موصوف کئی سال تک سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ میں ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں ایسی رضاکارانہ انجمنوں کی تعداد کم ہے جو اپنے پروگراموں کو ترقی دینے اور اسے بڑے پیمانے پر چلانے کے لئے بورڈ سے مدد لیتی ہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی بہت کم رضاکارانہ انجمنوں نے ویلفیر کا کام شروع کیا ہے۔ اگر اس قسم کی انجمنیں موجود بھی ہیں تو اتنی بات تو یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ سے اپنے کام کے لئے مدد نہیں لے سکیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مسلم علاقوں میں یا تو ایسی رضاکارانہ انجمنیں موجود نہیں ہیں جو سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کے معیار پر پوری اتریں یا پھر وہ بورڈ اور گورنمنٹ کے کسی ادارے سے مدد لینا مناسب نہیں سمجھتیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے انھیں مدد ملنے میں دشواری پیش آتی ہے، اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ نے ویلفیر کے کاموں کی ایسی بہت سی اسکیمیں چلائی ہیں جن کی مسلمانوں کو بھی اشد ضرورت ہے۔ مثلاً بالغ عورتوں کے لئے جو اپنے بچپن میں نہ پڑھ سکی ہوں تعلیم کا انتظام، غریب بچوں کیلئے ہالی ڈے ہوم، شہروں میں ویلفیر و پروجیکٹس اور رین بسیرے۔ اس بات کا پتہ چلانے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے شہری علاقوں میں یہ اسکیمیں کیوں نہیں چلیں۔ کیا شاید وہ ان سے واقف نہیں ہیں یا پھر انھیں ملک کے ویلفیر کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

مسلم ویلفیر کے اس پہلو پر بھی کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایک تو اس موضوع پر کوئی کام نہیں ہوا ہے اور دوسرے کسی قسم کے اعداد و شمار بھی موجود نہیں ہیں۔ اتنی بات البتہ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں تک دیہاتی علاقوں کا تعلق ہے مسلمانوں میں بھی کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام سے تقریباً اتنا ہی فائدہ اٹھایا ہے جتنا دوسرے برادران وطن نے۔ جو مسلمان مزدور صنعتی اداروں میں کام کرتے ہیں وہ بھی شاید ان ویلفیر کی خدمات سے فائدہ لیتے ہوں گے جو دوسروں کو ملتی ہیں۔ لیکن جو غریب مسلمان شہری علاقوں میں رہتے ہیں اور جو کسی منظم تحریک سے وابستہ نہیں ہیں ان کے لئے حکومت کی کسی اسکیم سے فائدہ اٹھانا اس لئے مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں ویلفیر ایجنسیوں اور سوشل ورکروں کی بہت کمی ہے۔

ہندوستان میں ایسی ویلفیر ایجنسیوں کی تعداد بہت

نے اپنے علاقے میں جو انھوں نے سیمنار میں تقسیم کیا تھا بتایا کہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض سیکولر ویلفیر اداروں کی خدمات سے مسلمان عورتوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان عورتوں نے کبھی ان اداروں کو جن سے انھیں مدد ملی اپنا نہیں سمجھا۔ اس صورتحال کی بنا پر شاید وہ ان ایجنسیوں سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکی ہوں جتنا دوسرے اٹھاتے ہیں۔ بہر حال یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان کس حد تک سیکولر اداروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان سے مدد نہیں لیتے تو کیوں؟ اور ان کو اپنا نہیں سمجھتے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بیروزگاری اور ملک کے دوسرے معاشی اور سماجی حالات کی وجہ سے ہندوستان کے دوسرے باشندوں کو ویلفیر کے میدان میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہی مسائل ہندوستانی مسلمانوں کو بھی درپیش ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کے سماجی اور معاشی حالات میں بہت بڑا انقلاب آیا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔ جاگیرداریاں اور زمینداریاں ختم ہو گئیں۔ دیسی ریاستوں میں بہت زبردست سیاسی انقلاب آیا جس کا اثر مسلمانوں پر بہت گہرا پڑا۔ ہندوستان میں پہلے ہی نچلے طبقے کے مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اب یہ تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور ان کو اپنے تعلیم یافتہ برسر روزگار برادران ملت اور مسلمان جاگیرداروں، زمینداروں اور والیان ریاست سے جو سہارا ملتا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ مسلم علاقوں میں پرانی لیڈرشپ ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ ابھی تک کوئی ایسی لیڈرشپ پیدا نہیں ہوئی جو ان کے ویلفیر کے مسائل پر توجہ دے سکے۔ مسلمانوں میں جو لوگ اس قسم کا کام کرنا بھی چاہتے ہیں ان کی ہمتیں آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات خراب رہنے کی وجہ سے مسلمان اور اکثریتی فرقہ میں اکثر تناؤ کی کیفیت رہتی ہے۔ اکثریتی فرقہ میں بعض جماعتیں اپنے سیاسی مفادات کے پیش نظر ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت کی آگ کو بھڑکاتی رہتی ہیں۔ اس کا اثر مسلمانوں پر یہ

پڑتا ہے کہ وہ ملک کے تعمیری کاموں سے الگ تھلگ رہتے لگتے ہیں۔ اکا دکا چند سرپھرے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو انھیں تعمیری کاموں کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔

ان تمام حالات کی وجہ سے مسلمانوں میں معاشی اور سماجی بدحالی کی روک تھام نہیں کی جاسکتی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں خواندگی کا اوسط قومی اوسط سے بہت کم ہے۔ مسلمان تعلیم کی ان سہولتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں جن میں آزادی کے بعد بہت اضافہ ہوا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کی پستی کی وجہ سے انھیں بہت سے سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بڑے بڑے شہروں میں ایسی گنجان آبادی میں رہتے ہیں جہاں بچوں اور نوجوانوں کے لئے ہر قسم کی برائیوں کا قبول کرنا بہت آسان ہے۔

مسلمانوں میں ایسے ادارے بھی بہت کم ہیں جو غریب والدین کے ذہین طلبا کو وظائف دے کر تعلیم دلا سکیں۔ ان کے لئے ٹیکنیکل تعلیم اور کام دھندے کی ٹریننگ کے مواقع بھی بہت کم ہیں۔

مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پچھلے طبقہ کی عورتوں کے لئے تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کی مدد کی جائے کہ وہ اپنے خاندان کی آمدنی بڑھانے کے لئے چھوٹے موٹے دھندے شروع کر سکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے لئے ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ سماجی اور تہذیبی معاملات میں بے جھجک شریک ہو سکیں۔ ان کے چھوٹے بچوں کے لئے نرسری کی تعلیم کے انتظام کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے جہاں وہ نہ صرف اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں کو اُجاگر کر سکیں بلکہ جہاں ان کی غذائی کمی کو بھی دور کرنے کا انتظام ہو۔

ویلفیئر کے ان سب پروگراموں کی مسلمانوں کو عام طور سے ضرورت ہے۔ ویلفیئر کے میدان میں مسلمان کیا کر رہے ہیں اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ویلفیئر کی سرگرمیوں کو منظم کرنے کا شعور ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ اپنے مسائل سے تو اچھی طرح واقف ہیں مگر ان کا دھیان صرف سیاسی مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ وہ سمجھیا غلط ابھی تک یہ سمجھتے رہے ہیں کہ یہ مسائل اگر حل ہو گئے تو ان کے دوسرے سماجی، معاشی اور ثقافتی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہندوستان کی سیاست تنگ نظری اور تعصب کی لعنت سے پاک ہو جائے اور ملک میں سماجی اور معاشی انقلاب کے لئے راہیں کھل جائیں تو اس سے مسلم و غیر مسلم باشندوں کا بھلا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ سیاسی حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کرتے رہیں یا اپنی تعلیمی پسماندگی، معاشی بدحالی اور تہذیبی و اخلاقی پستی کو دور کرنے کے لئے خود بھی کوئی پروگرام بنائیں اور اس پر عمل شروع کر دیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بہت تیزی کے ساتھ یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ انہیں حوصلہ اور اپنی ہمت پر بھروسہ کر کے تعلیم و ترقی اور اصلاح و تعمیر کے کاموں میں لگ جانا چاہیے۔ تعلیمی اور معاشی حالت سدھر جانے کی تو شاید ان کے سیاسی مسائل کا بھی حل نکل آئے۔

ہر ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس تجویز اور خیال پر توجہ کے ساتھ غور کرے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ ان مسائل کے پیچھے جو اسباب کارفرما ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے۔ سماجی خدمت کی راہیں تلاش کی جائیں۔ مفید تعلیمی منصوبوں، معاشی اسکیموں، اصلاحی پروگراموں، فلاح و بہبود کے کاموں اور تعمیری سرگرمیوں کا کھوج لگایا جائے۔ ان سب کے لئے اصول اور طریقے متعین کئے جائیں تاکہ یہ سب کام اس طرح منظم ہوں کہ سیاست کی اس میں آمیزش نہ آئے۔

آل انڈیا فورم کا قیام:

جامعہ اسکول آف سوشل ورک کی طرف سے اکتوبر میں جو سیمینار کیا گیا تھا اس کی ایک اہم سفارش یہ تھی کہ ایک آل انڈیا فورم کی تشکیل کی جائے جس کا خاص کام یہ ہو کہ وہ مسلمانوں میں تعلیمی

کریں اور تعمیری و سماجی کاموں کو مقبول بنانے کے لئے جدو جہد کریں۔

سیمنار نے اس کام کے لئے ایک اڈہاک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اپنے جلسے منعقدہ یکم مئی ۱۹۷۱ء میں آل انڈیا فورم کی تجویز مرتب کر لی ہے اس فورم کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے ویلفیر کاموں کو ترقی دینے کے لئے دوسری ایجنسیوں سے رابطہ قائم کرنا۔

۲۔ مسلمانوں میں ویلفیر کے جدید تصور اور اس کی سرگرمیوں کو مقبول بنانا۔

۳۔ ان تمام رضاکارانہ اداروں کو جو مسلم ویلفیر کا کام کر رہے ہیں، ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، ان کے کام میں مدد کرنا اور ان کی سرگرمیوں میں باہم تال میل پیدا کرنا۔

۴۔ مسلمانوں میں ویلفیر کے کاموں کو ترقی دینے کے لئے لٹریچر، رسالے اور کتابیں شائع کرنا۔

۵۔ مسلم ویلفیر کے بارے میں سیمنار اور کانفرنس منعقد کرنا۔

۶۔ مسلم ویلفیر کے مسائل پر تحقیقی کام کرنا۔

۷۔ کوشش کرنا کہ سیکولر ویلفیر اداروں کی خدمات سے مسلمان فائدہ اٹھا سکیں۔

۸۔ کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں کام کرنے والے ادارے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی مالی امداد کی اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۹۔ مقامی طور پر ویلفیر کے کام کو منظم کرنے کے لئے لیڈر تیار کرنا اور موجودہ اداروں کے اسٹاف کی ٹریننگ کا انتظام کرنا۔

آل انڈیا فورم کی تشکیل کے سلسلے میں پہلا کام یہ طے کیا کہ دسمبر کے آخری ہفتہ میں مسلمانوں میں کام کرنے والی ویلفیر ایجنسیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس حیدرآباد میں بلائی جائے، جس میں آل انڈیا فورم کے قیام کی تجویز اور اس سلسلے میں دوسرے پہلوؤں پر غور کیا جائے۔

اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ مسلمانوں میں کام کرنے والے تمام اداروں کے پتے حاصل کئے جائیں اور ان سے معلومات حاصل کر کے ایک ڈائرکٹری تیار کی جائے تاکہ ویلفیر کی فیلڈ میں کام کرنے والوں کو اس کانفرنس میں مدعو کیا جا سکے۔۔۔ ان تمام لوگوں سے درخواست ہے جو اس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے میں کام کرنے والی ویلفیر ایجنسیوں کے پتے حاصل کر کے مندرجہ ذیل پتہ پر بھیج دیں اور اس ابتدائی کام میں ہماری مدد فرمائیں۔

شمس الرحمٰن محسنی
پرنسپل جامعہ اسکول آف سوشل ورک۔ جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

مرسلہ
فیروزہ قاضی

اقوالِ زریں

- دوسروں کی زندگی کے آئینہ میں اپنے لئے راہ عمل تلاش کرو۔ (مشرقی مفکر)
- کامیاب انسانوں کی کامیابی کا یہی راز ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے دل کو پرامید خیالات سے لبریز رکھتے ہیں (ڈاکٹر مارڈن)
- جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے مگر انسان اپنے خدا کو نہیں پہچان سکتا! (حضرت عثمانؓ)
- انسان کتنا بیوقوف ہے۔ وہ ایک کیڑا نہیں بنا سکتا لیکن درجنوں دیوتاؤں کی تخلیق کئے جاتا ہے۔ (مونٹون)
- آداب زندگی سے اپنی علمیت کو زینت دو، اس سے زندگی کی راہوں میں روانی آتی ہے۔ (چیسٹر فیلڈ)
- ہوائیں اور موجیں ہمیشہ قابل ترین ملاحوں کا ساتھ دیتی ہیں۔ (گبن)

امام حسین علیہ السلام

حضرت امام حسینؑ کی ولادت باسعادت ۴ شعبان المعظم ۴ھ بروز سہ شنبہ مدینہ منورہ میں ہوئی۔ حضورؐ نے آپ کا نام "حسینؑ" رکھا۔ قرآنی فضا میں آپ کی پرورش ہوئی۔ شہنشاہ کونین نے نواسے کی شادی فارس "یزدجرد" کی بیٹی سے ہوئی تھی جو نوشیرواں عادل کی پوتی تھیں۔ قدرت نے یہ عجیب پیوند لگایا تھا اور یہ اپنی اپنی جگہ پر بھی امتیازی شان رکھتا تھا۔ لیکن امتزاج نے کچھ اور ہی شان پیدا کر دی تھی۔ اس خوش نصیب شہزادی کا نام شہربانو رکھا گیا تھا۔ ایک تو یہ خود اعلیٰ خاندان کی تھیں، اور اس کی وجہ سے زیورِ اوصاف سے آراستہ۔ دوسرے خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ سے جوڑ لگا جو سونے پر سہاگہ کا کام کر گیا۔

شہربانو کو اپنے شوہر سے جو سچی محبت تھی وہ خواتین اسلام کے لئے سبق آموز ہے۔ چنانچہ کربلا کے میدان میں بھی یہ ساتھ رہیں اور آخری وقت تک حق رفاقت سے منہ نہ موڑا۔ آپ کو چھ شہزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ تمام عمر میں آپنے ۲۵ حج کئے۔ آپ فرض نمازوں کے علاوہ ہر روز ایک ہزار نفل نمازیں ادا فرماتے تھے۔ یادِ الٰہی اور تلاوت قرآن پاک میں راتیں گذر جاتی تھیں۔ محبتِ الٰہی میں اس قدر درد انگیز اشعار پڑھتے تھے کہ شام سے رونا شروع کرتے تو صبح ہو جاتی تھی۔ یہی حال توبہ استغفار کا بھی تھا جو آپ کے درجات کی بلندی کا سبب بنتے تھے۔

حضرت سیف امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں جو کچھ کیا وہ عملی رنگ میں قرآن تھا۔ باری باری سے آپ کے تمام رفقاء آپ کی ذات مقدس پر فدا ہو گئے۔ اب حضرت امام حسینؑ کے سوا کوئی نہیں رہا جو میدانِ جنگ میں جاتا ہے۔ اس لئے قطبِ جہاں اور مرکزِ حق نے خود جنبش فرمائی۔ آپ پہلے بیمار بیٹے حضرت زین العابدین کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "بیٹا! اب میں رخصت ہوں۔ ہمارے بعد جو مصیبت پیش آئے مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنا اور اہل بیت کی حفاظت کرنا۔" صاحبزادے نے رو کر کہا: "بابا جان! کیا میں ایسا بدبخت ہوں کہ آپ میرے سامنے سر کٹائیں اور میں اپنی جان آپ پر نثار نہ کروں۔ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ پہلے مجھے اجازت ہو۔" آپنے فرمایا: "تم میرے بعد سادات کی یادگار رہو گے۔ میرے نانا کے جانشین ہو گے۔ دنیا تم سے فیض پائے گی۔ مشیت ایزدی یہی ہے۔"

اہل بیت رونے لگے، عورتوں نے رکاب پکڑ لی۔ مگر آپنے سب کو خدا کے سپرد کیا اور "بسم اللہ" کر کے میدانِ کارزار میں آئے اور سرِ میدان مردانہ وار نیزہ زمین پر گاڑ کر فرمایا "اے لوگو! میری بات سنو۔ جلدی نہ کرو مجھے اپنی آمد کا سبب بیان کرنے

دو۔ اگر میرا بیان سچا ہو اور تم میرے ساتھ انصاف کر سکو تو یہ تمہارے لئے سعادت کا باعث ہوگا اور تم میری مخالفت سے باز آجاؤ گے۔ لیکن اگر سننے کے بعد تم انصاف کرنے سے انکار کر دو تو پھر مجھے کسی بات پر اصرار نہیں۔ میرا مالک ہر حال میں اللہ ہے جس نے قرآن نازل اور جو نیکوکاروں کا حامی ہے۔

اے لوگو! میرا حسب نسب یاد کرو۔ سوچو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو خوب غور کر لو۔ کیا تمہارے لئے میرا قتل اور میری حرمت کا رشتہ توڑنا روا ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کی بیٹی کا بیٹا نہیں ہوں؟ اس کے عم زاد اور اس کے جانشین اور امیر المومنین کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب میرے باپ کے چچا نہیں۔ کیا ذوالجناحین جعفر طیارؓ میرے چچا نہیں۔"

حضرت امام حسینؓ کے بار بار سوال کرنے پر بھی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور لاجواب بات کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اور اگر کوئی جواب تھا تو یہ کہ ابن سعد نے اس کے ساتھ ہی آپ کی طرف تیر پھینکا اور اپنی فوج کے لوگوں سے کہا: تم لوگ اس بات پر گواہ رہنا کہ پہلا تیر میں نے پھینکا ہے۔ اور پھر شمر بن زیاد نے اپنے لوگوں سے پکار کر کہا: تمہارا برا۔ کیا دیکھ رہے ہو۔ کیوں حسین پر ایک ہی بار ٹوٹ نہیں پڑتے۔ یہ سن کر حضرت امام حسین نے کہا کہ بزدلو! کیا میرے قتل پر ایکدوسرے کو ابھارتے ہو؟ میرے بعد کسی آدمی کے قتل پر بھی خدا اتنا ناخوش نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ خدا تمہیں ذلیل کرے گا اور مجھے عزت بخشے گا۔ تم سے میرا بدلہ لیا جائے گا۔ میرے قتل سے تمہارے اندر پھوٹ پڑ جائے گی۔ تمہارا خون پانی کی طرح بہے گا۔ یہ بھی کافی نہ ہوگا بلکہ خدا تمہیں دہرے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ مگر وقت آچکا تھا۔ زرعہ بن شریک تمیمی نے بایاں ہاتھ تلوار سے زخمی کیا۔ آپ کمزوری سے لڑکھڑا گئے۔ لوگ خوف و دہشت سے پیچھے ہٹے مگر سنان بن انس نخعی نے بڑھ کر نیزے کا ایک ایسا وار کیا کہ آپ زمین پر گر پڑے۔ پھر اس نے آپ کا سر مبارک تن سے جدا کیا اور ابن یزید کے حوالے کر دیا۔ آپ کے جسم مبارک پر ۳۳ گھاؤ تیر کے اور ۳۴ تلوار کے تھے۔ اور آپ اس جہانِ فانی سے جام شہادت نوش فرما کر کوچ کر گئے۔

غزل

داؤد اظہر سلطانی

نگر نگر میں سجے آج کل ہیں میخانے
چھلک رہے ہیں ہر اک سمت جام و پیمانے

خرد سے ہوش سے ہر چند ہیں جو بیگانے
مری طرح سے ملیں گے نہ تم کو دیوانے

غم حیات سے چاہو نجات تو آؤ
کہا یہ رندوں سے ساقی نے اور صہبا نے

خلوص و مہر و وفا نام کو کسی میں نہ تھا
ملے تو لوگ بہت مجھ کو جانے پہچانے

اٹھا رہے ہیں وہ فتنے نئے نئے لیکن
ہے دل میں اور بھی کچھ ان کے کیا خدا جانے

وفورِ جوشِ جنوں اور بڑھ گیا اظہر
جو یار لوگ مجھے رات آئے سمجھانے

بہت بڑا گناہ

یہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم خود نہیں کرتے

(حکم خداوندی)

ننھی منی کہانیاں

مرسلہ
راشدہ محمد ایوب

"بخشش کا وسیلہ"

سلطان محمود غزنوی کی حکایت ہے کہ انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا: باری تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ سلطان محمود نے کہا: خدا نے مجھے بخش دیا۔ بخشش کا سبب یہ ہوا کہ ایک رات میں ایسے مکان میں ٹھہرا تھا جہاں طاق میں کلام پاک رکھا ہوا تھا۔ نیند نے غلبہ کیا تو سوچا یہاں کلام پاک رکھا ہے، یہاں سونا نہ چاہیئے۔ پھر جی میں آیا قرآن پاک ہی کو دوسری جگہ رکھ دوں۔ مگر اپنے آرام کے لئے قرآن کو دوسری جگہ منتقل کرنا بھی خلاف ادب معلوم ہوا۔ اس لئے صبح تک جاگتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے میرا یہ ادب پسند فرمایا اور بخش دیا۔

غیبت سن کر دعوت سے اٹھ گئے

کسی نے حضرت ابراہیم ادھمؒ کی دعوت کی۔ دعوت کرنے والے کے مکان پر پہونچے تو وہ کسی کی برائی کر رہا تھا۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ نے فرمایا: کیسے تعجب کی بات ہے کہ لوگ پہلے روٹی توڑتے ہیں اور گوشت سے کھاتے ہیں مگر یہاں گوشت کھایا جا رہا ہے۔ روٹی دیکھئے کب کھائی جائے۔؟ اور اُٹھ کر چلے آئے۔

"شرم آتی ہے"

حضرت فاروق اعظمؓ کے پوتے سالمؒ ایک مرتبہ حج بیت اللہ میں تھے۔ ہشام بن عبد الملک نے انھیں دیکھا تو بڑے اخلاق کا برتاؤ کیا اور کہا: "سالمؒ اگر تمھیں ضرورت ہو تو مجھ سے کچھ مانگ لو"۔ سالمؒ نے فرمایا اے ہشام یہ بیت اللہ ہے۔ اس گھر میں مجھے غیر اللہ سے مانگتے شرم آتی ہے۔ یہ سُن کر ہشام خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

"دکھاوا"

ایک صاحب ہمیشہ امیرانہ وضع میں رہتے اور دوستوں میں شیخی بگھارتے کہ آج گوشت بہت مزے دار تھا۔ پلاؤ بھی خوب تھا۔ چاول باریک اور پُرانے تھے۔

ترکیب یہ کرتے کہ مونچھوں پر چراغ کا تیل لگا لیتے اور پھر شیخی بگھارتے۔ ایک دن تیل مونچھوں پر چپڑنے لگے تو اتفاق سے بتی کا ٹکڑا بھی مونچھوں سے لپٹ گیا۔ باہر آکر حسب عادت ڈینگیں مارنے لگے کہ "اللہ آج کا پلاؤ بہت مزیدار تھا"۔ ایک صاحب نے مونچھوں کی طرف دیکھ کر کہا "جناب جو کچھ فرماتے ہیں بجا ہے۔ پلاؤ کا ایک چاول بھی مونچھوں میں لپٹا آیا ہے"۔ ہاتھ پھیر کر دیکھا تو بہت شرمائے۔

انعامؔ :- آپ کا بیٹا تو S.S.C. میں ہے خدا کرے کامیاب ہوا تو آپ کا کیا ارادہ ہے؟
اکرامؔ :- میں اسے کالج بھیج دوں گا۔
انعامؔ :- خدا نخواستہ فیل ہو گیا تو؟
اکرامؔ :- تب بھی کالج بھیج دوں گا۔ ٹیلرنگ کالج

امتحان کا مقابلہ ہمت و استقلال سے کیجئے

امتحانات کے دنوں میں کتابی کیڑا نہ بنئے بلکہ کافی نیند و آرام لیجئے۔ گاہے گاہے دماغ کو تازگی بخشنے کے لئے سیر و تفریح کے لئے بھی تھوڑا وقت دینا چاہئے۔ اچھی غذا کھائیے۔ اگر آپ نفسیاتی طور پر پریشان ہیں یا جسمانی طور پر بیمار ہیں تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے کیونکہ جسمانی تکلیف یا ذہنی کوفت کے ہوتے ہوئے پڑھنا لکھنا اور یاد رکھنا انتہائی دشوار امر ہے۔

جو بھی آپ یاد کرتے ہیں اس کی تحریری مشق کیجئے۔ جب جب آپ کسی سوال کا جواب یاد کریں اس کو لکھ لیں کیونکہ لکھے ہوئے الفاظ حافظہ میں زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کے لہجے اور جملوں کی ساخت اچھی ہو جائے گی۔

مندرجہ ذیل اقدامات امتحانات میں بہت سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

خود اعتمادی:۔ اتفاق پر کبھی انحصار نہ کیجئے۔ جب تیاری کے ساتھ امتحان دیا جاتا ہے تو کامیابی یقیناً قدم چومتی ہے۔ یاد رکھئے کہ آپ کے ممتحن آپ کو پاس کرنے کے لئے بیتاب ہیں، اگر آپ پاس ہونے کے مستحق ہیں۔ ایک طالب علم جو خود اعتمادی سے کام لیتا ہے کبھی بدقسمتی اور ناکامی کا منہ نہیں دیکھتا۔

ھوشیاری: ۔جوابات لکھنے سے پہلے پرچے میں دی ہدایات کو بغور پڑھ لیجئے۔ اس کے بعد:

(ا) کاپی کے سرورق پر اپنے رول نمبر، کلاس سیکشن اور سبجیکٹ وغیرہ کے اندراجات میں بڑی احتیاط سے کام لیجئے۔ بہت سے اچھے طلبہ اس معمولی کام میں جلد بازی سے نقصان اٹھاتے ہیں۔

(ب) امتحانی پرچے کو دھیان سے پڑھئے، پھر ان سوالات پر نشانات لگائیے جن کو آپ حل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر سوال کو دو بار پڑھئے اور پھر لکھنے سے پہلے مختصر طور پر جواب کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کیجئے۔ اس کے بعد اپنا جواب پیش کیجئے۔ اول نمبر پر اپنے بہترین یاد کئے ہوئے سوال کو حل کرنے سے آپ کے ممتحن پر اچھا اثر پڑے گا۔

(ج) پوائنٹ قائم کرکے بالترتیب لکھئے۔ اگر تفصیلی طور پر بیان کرنا ہے تو ضروری نہیں کی بیکار کی بھرمار کی جائے۔ ممتحن بھی بہر نوع انسان ہیں۔ جواب کی وسعت اور جامعیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ ممتحن کے لئے کوئی چیز اتنی پریشانی کا باعث نہیں بنتی جتنی کہ غیر متعلق باتوں سے صفحات کا سیاہ کرنا۔ اگر آپ سے کسی حکومت کے ایڈمنسٹریشن کے بارے میں پوچھا گیا تو وہی لکھئے۔ تین صفحات اس کی اصطلاحات پر مت لکھئے۔

خوشخطی: ۔ جلد بازی میں خوشخطی کو قربان نہ کیجئے۔ اس بات کا دھیان رکھئے کہ ممتحن کو ہزاروں کاپیاں دیکھنا پڑتی ہیں ۔۔۔ ایسی حالت میں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ کس طرح صاف اور خوشخط پیپر کا استقبال کرتے ہوں گے۔ اگر آپ کی کاپی روشنائی کے دھبوں، کاٹ چھانٹ، بدخطی لئے ہوگی تو پھر آپ پریشان ممتحن کو کچھ جوابات نظر انداز کرنے اور کم نمبر دینے پر مجبور کریں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ کی تحریر صاف اور خوشخط ہے۔ صفحات دھبوں وغیرہ سے مبرا ہیں اور پوائنٹس کو پیراگراف کی صورت میں لکھا گیا ہے تو آپ ممتحن کو اپنی موافقت میں اچھا موڈ بنانے کے قابل بنا سکیں گے۔ اور اس طرح آپ زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کر سکیں گے۔

نقل سے گریز: ۔ دھوکا دینے کی کوشش ہرگز نہ کیجئے۔ جو کچھ آپ جانتے ہیں اس کو بخوبی لکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ امتحان میں نقل کرنا قطعی غلط اور نازیبا حرکت ہے [illegible] سے نہیں بلکہ عقل سے کام لیجئے۔ نقل کرنا ایک ایسا جرم ہے جو ناقابل معافی ہے۔ ہر سال سینکڑوں طلبہ اس جرم کا ارتکاب کر کے کئی سال کے لئے امتحان سے روک دئے جاتے ہیں اور اپنی عمر عزیز کے کئی سال گنوا بیٹھتے ہیں۔

پورے سوال: ۔ پرچے کی ہدایات کے مطابق جتنے سوال کرائے جائیں ان میں سے کوئی سوال نہ چھوڑئیے۔ فرض کیجئے آپ کو بیس نمبروں کے پانچ سوال حل کرنے ہیں۔ اگر آپ صرف چار سوالات کے جوابات دیتے ہیں تو آپ اپنے لئے نمبروں کی تعداد گھٹا کر اسّی کر دیتے ہیں۔ اس لئے اب آپ کو چار سوالوں میں سے زیادہ سے زیادہ سیکنڈ ڈویژن کے نمبر مل پائیں گے۔ جب کہ ایک سوال چھوڑنے سے آپکے پورے بیس نمبر قطعی ختم ہو چکے ہیں۔ اس لئے ابتدا میں اپنے وقت کو سوالات کے جوابات کے لئے تقسیم کر لیجئے، اور وقت کی اس تقسیم پر سختی سے کاربند رہئے۔ پہلے دو تین جوابات لکھنے میں زیادہ وقت دیجئے۔ پھر بتدریج کم کرتے چلے جائیں۔ مگر اس بات کا دھیان رہے کہ آپ کو پورے سوالات کرنے کے لئے پورا وقت مل سکے۔

نظر ثانی: ۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ہر سوال کو ختم کرنے کے بعد دہرانا چاہئے۔ میری رائے میں پہلے دو سوالوں کو دہرا لیا جائے اور پھر باقی جوابات کو پرچے کے اختتام پر۔ اس طرح وقت کی کمی کے باعث سوالات چھوٹ جانے کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔ دہرانے کا عمل جلدی مگر ہوشیاری سے کیجئے۔ کہیں کہیں ضرب المثل، شعر یا جملے کا اضافہ کر دیجئے۔ اگر آپ کے پاس اتنا وقت ہو تو یہ اضافہ کیجئے۔ بصورت دیگر اس کی ضرورت نہیں۔ ہجے کی اغلاط اور الفاظ کے نقطوں پر پوری توجہ دیجئے۔

ذہنی سکون: ۔ کمرۂ امتحان میں پہونچنے کے لئے کافی وقت پہلے ہی گھر سے چلنا چاہئے۔ اس طرح گھبراہٹ اور پریشانی سے بچ سکتے ہیں، اور ذہنی سکون قائم رہتا ہے۔ آپ کی دماغی کیفیت پریشانی یا یکسوئی آپ کے پرچے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر آپ کو گھبراہٹ یا پریشانی کا احساس ہو تو چند گہرے سانس لیجئے اور ایک چھوٹی سی دعا کے ساتھ اپنے آپ سے کہئے:

"وہ چیلنج جس کا میں مدت سے منتظر تھا آچکا ہے، اب مجھے اپنی لیاقت اور قابلیت دکھانے کا وقت آگیا ہے۔"

ذاتی توجہ: ۔ اس بات کا اطمینان کر لیجئے گھر چھوڑنے سے پیشتر آپ کے پاس اس دن کے سفر کے لئے اور امتحان سے متعلق ضروری سامان آپکے ساتھ ہے۔ اس کام کے لئے اپنے نوکر، بھائی، بہن وغیرہ پر بھروسہ نہ کیجئے۔ گھر چھوڑنے سے پہلے اس پر اپنی ذاتی توجہ دینا بہتر ہے۔

مندرجہ بالا اشارات پر اگر آپ عمل پیرا ہوں گے تو آپ امتحانات کا چیلنج قبول کرنے کے ساتھ فتحمند و کامران ہوں گے اور موسم گرما کی چھٹیوں سے پوری طرح

ابراہیم عُمر قاضی

"جو بڑھکر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے"

زندگی ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں ہمت، جُرأت اور طاقت ہے، وہ اس کے سینے پر تیر کر پار چلے جاتے ہیں۔ جو کمزور اور کم حوصلہ ہیں دم توڑ کر ڈوب جاتے ہیں اور آبی جانور انھیں ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اسی طرح جو مجمع میں گر جاتا ہے کچل دیا جاتا ہے جس میں ہمت ہوتی ہے وہ صفوں کو چیرتا ہوا نکل جاتا ہے۔

تاریخ سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ ایک قوم کی تباہی دوسری قوم کی ترقی ہے۔ ایک قوم کا زوال دوسری قوم کا عروج ہے۔ ایک ملک کی کمزوری دوسرے ملک کی طاقت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غلام آقا بن جاتا ہے اور کبھی آقا کو غلامی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ کچھ محکوم حاکم بن جاتا ہے اور کبھی حاکم محکوم ہو جاتا ہے۔ یہی چکر ہے جو ابتدا سے چلا آتا ہے۔

اس دنیا میں مانگنے سے اور ہاتھ پھیلانے سے کچھ نہیں ملتا۔ خدائے بزرگ و برتر نے مانگنا بُرا قرار دیا ہے۔ اس نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ حقدار بنو، خود بخود مل جائے گا۔ زمانہ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ تمھارا حق کسی کو دبانے کی ہمت نہ ہوگی اور نہ ہی دبا سکے گا۔ ڈرتے کو ڈرایا جاتا ہے اور دبتے کو دبایا جاتا ہے۔ جتنا ڈرو گے اتنا ہی ڈرائے جاؤ گے، جتنا دبو گے اتنا ہی دبائے جاؤ گے۔

دنیا کشمکش کا وسیع میدان ہے۔ ہمت، عمل اور قربانی کی ضرورت ہے۔ بس میدان تمھارا ہے۔ جو آدمی دم بخود ہو کر بیٹھ گیا اس نے دنیا ڈبو دی۔ کمزوری دکھائی اور ختم ہو گیا۔ جس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طاقت اور صلاحیت نہیں وہ کہاں تک چل پھر سکتا ہے۔ بس یہی ایک نکتہ ہے جس میں قوموں کی حیات و ممات مضمر ہے۔ جو قوم اس کو سمجھ لیتی ہے اور اسی کو اپنا مشعلِ راہ بنا لیتی ہے اس کی راہ میں نہ پہاڑ کھڑے ہوتے ہیں اور نہ سمندر ہی رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ کشاں کشاں دنیا کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی بامِ ترقی پر جا پہنچتی ہے۔ زمین اس کی، آسمان اس کا۔ غلام اُس کے۔ جدھر نظر دوڑائیے اس کا سکہ بیٹھا ہے۔ اور جو اس نکتہ کو سمجھنے سے قاصر ہے یا اس راہ سے بھٹک جاتی ہے یا غفلت کرتی ہے وہ اگر عرش پر ہی کیوں نہ ہو زمین پر گر کر خاک میں مل جاتی ہے اور زمانہ اسے پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اس میں قوت ہے وہ دوسرے جانوروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے، یہی آئینِ فطرت ہے۔

کمزوری موت ہے۔ موت سے ڈرنا موت ہے۔ نااہلیت کا نام کمزوری ہے۔ کمزور میں اس جد و جہد کی زندگی میں رہنے کی اہلیت نہیں ہوتی اس لئے دنیا کہتی ہے کہ کمزور کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ کمزور کے لئے بہتر جگہ قبرستان ہے، جو دنیا کے شور و شغب سے دور خاموشی اور سکوت کی جگہ ہے، جہاں وہ خاموش بلا مداخلت بڑے اطمینان سے بیٹھ سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو ایک روز بڑی مچھلی چھوٹی کو نگل ہی جائے گی۔

بہر حال زندہ رہنے کے لئے طاقت اور قوت کی ضرورت ہے۔ اگر طاقت ہے تو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ پاس ہے۔ نہ کسی بلا کا خوف ہماری راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بلا ہی ہم پر خوف طاری کر سکتی ہے۔ ترقی کا میدان ہمارے سامنے کھلا ہے، صرف ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت ہے۔

- ★ اتحاد میں طاقت ہے۔
- ★ حسد، انسان کو جلا دیتا ہے۔
- ★ نیکی کر کے احسان نہ جتاؤ۔
- ★ حرکت میں برکت ہے۔

از ہارون خوشتر

حرف وحیات

(خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں)

مکاتیب مہدی

ننھّی صدیقہ!

آج ۲۴ جنوری ہے۔ اس دنیا میں آئے ہوئے تمھیں ایک سال ۴ ماہ اور اکیس دن ہو گئے ہیں۔ دو دن بعد ۲۶ جنوری ہے۔ اس دن ہم لوگ اپنے مادرِ وطن ہندوستان میں جشن جمہوریت مناتے ہیں۔ اس سال سن ۷۲ میں بھی جشن جمہوریت دھوم دھام سے منانے والے تھے۔ چوں کہ شہیدانِ وطن کی یاد مقدّم ہے اس لئے حسب روایت سیدھے سادے طریقہ سے ہی جشن منایا جائے گا۔

تم سوچتی ہو گی کہ میری عمر اتنی چھوٹی سی ہے۔ چاکلیٹ، بسکٹ یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں لکھنے کے بجائے راقم الحروف جسے تم بغیر سوچے سمجھے اپنی ننھی منی زبان سے ابا کہہ کر لپٹ جاتی ہو تمھیں اس طرح کا خط کیوں لکھ رہا ہے۔ تو تمھارا سوچنا تعجب خیز نہیں۔ اس لئے کہ آج کل بچوں کے نام لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ بڑے لوگ توجہ نہیں دیتے۔

چاکلیٹ یا بسکٹ کے بارے میں لکھنے کو جی چاہتا تھا راقم الحروف تمھارے لئے کسی قدر چاکلیٹ یا بسکٹ بازار سے خرید کر لا سکتا تھا مگر جب بھی بازار گیا تو لوٹ آنے میں ہی خیریت نظر آئی۔ اس لئے کہ بازار گرم تھا۔ بھاؤ کافی حد تک بڑھ گئے تھے ــــــ جانتی ہو یہ بازار والے کون ہیں۔ وطن دشمن ہیں۔ ایک طرف تو ہمارے برادرانِ وطن اپنی اپنی جانوں پر کھیل کر ہمارے پیارے وطن ہندوستان کی حفاظت میں گھر بار چھوڑ کر رزم گرم فضا میں دشمن سے نبرد آزما ہیں۔ ان کے گھروں میں تمھاری ہی طرح ان کے بھی بچے ہیں، مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بھائی بند ہیں۔ مگر دوسری طرف یہ چور بازاری کرنے والے سوچتے تک نہیں۔ بس روپیہ بٹورنے اور موقع سے فائدہ اٹھانے میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں تم ہی سوچو چاکلیٹ یا بسکٹ خریدنے اور اسے تمھارے سامنے رکھنے کی جرأت کیسے کی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف کی تو یہ خواہش ہے کہ اگر تمھاری امّاں، خالہ، ماموں، نانی اور نانا سے چاکلیٹ یا بسکٹ کے چھوٹے بڑے پیکٹ قصداً یا تمھیں بہلانے پھسلانے کے لئے ملیں تو تم اسے لو مگر کھاؤ نہیں۔ اپنی امّی، ماموں یا نانا سے کہو کہ وہ تمھاری عمر کے ان بچوں کے لئے بھیج دیں جن کے جوان باپ مادرِ ہندوستان پر قربان ہو چکے ہیں اس لئے کہ تم بھی ہندوستان کی جنگ آزادی میں نہایت ہی معمولی ساحصہ لینے والے ایک ہندوستانی کی بیٹی ہو۔ ایسا کرنے سے تم یہ نہ سمجھو کہ تمھیں چاکلیٹ کھانے کو نہیں ملے گا۔ ملے گا اور ضرور ملے گا۔ مگر اس وقت جب ہمارے ہندوستان کی سرحدوں سے دشمن اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹ جائیں گے یا موت کا مزہ چکھ لیں گے۔

ہماری حکومت چور بازاری کرنے والوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ مہلت ملتے ہی ان کی اور زیادہ سرکوبی ہو گی تو دام کم ہو جائیں گے تب راقم الحروف بازار سے تمھارے لئے چاکلیٹ یا بسکٹ خرید سکے گا۔

دیکھو ۲۶ جنوری کی سادہ سی تقریب میں شرکت کرنا نہ بھولنا اور اس دن اپنی ان ہم عمر سہیلیوں کے لئے چاکلیٹ یا بسکٹ کے پارسل بھجوانا، جنھیں فی الوقت ضرورت ہے ــــــ تم اچھی بچّی ہو ــــ امید ہے کہ مایوس نہ کرو گی۔

دوران جنگ

خون کم بہے اس کے لئے زمانۂ امن میں پسینہ زیادہ بہانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے جوانوں نے غیر معمولی شجاعت دکھا کر اپنے لہو سے ایک نئی تاریخ مرتب کی ہے۔ زمانۂ امن میں یہ ہمارا فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کریں تاکہ ہمارا ملک زیادہ مضبوط، خوشحال اور ترقی یافتہ ہو سکے۔

جنگ رُکی ہے، ختم نہیں ہوئی۔

اس یوم جمہوریہ پر ہمارا عہد

★ جوانوں کے لئے خون عطا کریں گے اور معذور جوانوں کے خاندان کی مدد کریں گے۔
★ دفاعی فنڈ میں عطیات دیں گے۔
★ مہاراشٹر میں چھوٹی بچت کے لئے مقررہ نشانے کے علاوہ ۲۵ کروڑ روپے جمع کرنے کے نشانے کو جلد سے جلد پورا کریں گے۔
★ کھیتوں اور کارخانوں میں پیداوار بڑھاتے رہیں گے۔
★ قیمتیں بڑھنے نہیں دیں گے۔
★ ذات پات، مذہب اور زبان کا خیال نہ لاتے ہوئے قومی یکجہتی پیدا کریں گے۔
★ ہر میدان میں خود کفیل ہونے کے لئے پوری جد وجہد کریں گے۔ کسی دوسرے کی امداد کے بھروسے نہیں رہیں گے۔
★ دفاعی محاذ پر پوری جد وجہد جاری رکھیں گے۔
★ غریبی ختم کر کے ملک کو خوشحال اور طاقتور بنانے کے لئے پوری کوشش کریں گے۔
★ ہم اپنا کام دل لگا کر اور تیزی سے کریں گے۔

ڈائرکیٹوریٹ آف پبلسٹی، حکومت مہاراشٹر، بمبئی

مسلمانانِ مہسلہ کا تعمیری پروگرام

موجودہ زمانے میں تعلیم انسانی ترقی کے لیے لازمی ہے
اور بلاشبہ وہ ہر طرف جس تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے اس کا اب
تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت ماہرینِ تعلیم اور دانشورانِ ادب کے
خیال آرائی کے مطابق ملک علمی دھماکہ EDUCATIONAL EXPLOSION
کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اس وسعتِ علمی کے مقابلے میں عمارات، معقول
تربیت یافتہ اساتذہ، ساز و سامان، کھیل کے میدان وغیرہ ساری ضرورتوں
کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ حکومت نیز نجی ادارے جو اس میدان میں کارفرما
ہیں، اس کارِ عظیم کی تکمیل کی مشکلات سے بخوبی واقف ہیں اور مختلف
ذرائع سے انھیں حل کرنے کی سعیٔ بلیغ کر رہے ہیں۔

ضلع قلابہ کے موضع مہسلہ کے مسلم عوام کچھ اس قسم کی
مشکلات سے دوچار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کے مقامی حضرات
نے ان مشکلات کا جو حل ڈھونڈ نکالا ہے وہ نہ صرف قابلِ صد آفریں
اور لائقِ تحسین ہے بلکہ اوروں کے لیے قابلِ تقلید بھی ہے۔ یہاں کے
ہر گھر کے کمانے والے یا وظیفہ یافتہ ہر فرد نے ایک ماہ کی آمدنی عطا
فرمائی اور سال بھر کے قلیل عرصے میں تقریباً پونے دو لاکھ روپئے کی
کثیر رقم جمع کر لی۔ مہسلہ میں فی الوقت دو پرائمری اسکول جاری ہیں
گرلز اسکول کرایہ کی جگہ پہ ہے تو لڑکوں کا مدرسہ بھی ایک بوسیدہ عمارت
میں ہے۔ علاوہ ازیں ایک ہائی اسکول اور بورڈنگ ہاؤس بھی قائم ہے۔
اور یہ دونوں ادارے کرایہ کے مکانات میں چلتے ہیں۔ ان حالات
گاؤں والوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ تعلیمی فضا کو سدھار۔
اور طلبہ کو سہولتیں فراہم کرنے کے لئے ایک منصوبۂ عظیم بنایا جا
جس میں اردو پرائمری اسکول، بورڈنگ ہاؤس، ہائی اسکول کی عمارت
ٹیچرس کوارٹر کی عمارت، ویلفیئر سنٹر کی عمارت (جس میں دعا کے لئے
ایک بڑا ہال) کی تعمیر زیرِ عمل رہے۔ مذکورہ پانچوں عمارات ایک ہی جگہ
میں تعمیر ہوں تاکہ الگ سے ایک تعلیمی مرکز کا قیام ہو سکے۔ اس سلسلے
کوشش کی گئی اور مذکورہ تعلیمی مرکز کے لئے مہسلہ مسلم جماعت نے
جگہ عطا فرمائی۔ بلڈنگ کمیٹی کے اراکین حضرات (جن میں مضافاتی دیہات
کے لوگ بھی شامل ہیں) نے تخمیناً بجٹ بنایا جو مبلغ ۵ لاکھ روپئے
ہے۔ منصوبے کی تکمیل کے بعد یہ پانچوں عمارت مسلم جماعت مہسلہ
کے زیرِ اہتمام ہوں گی۔ جو ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے اور جسے بمبئی پبلک
ٹرسٹ ایکٹ ۱۹۵۰ء کی نمبر قلابہ بی ۴۲ کے تحت منظوری حاصل۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اتنے بڑے منصوبے کی تکمیل
مقامی لوگوں نے نہ ہی اور لوگوں سے اپیل کی اور نہ دستِ سوال دراز
بلکہ جیبِ خاص سے جمع کردہ رقم سے ایک عمارت کی تعمیر کی۔ اپنے
جوشِ عمل کا ایک نمونہ پیش کیا۔ اور جب اس نئی عمارت کا جشنِ افتتاح
فرمایا تب جا کر لوگوں کو بتایا کہ ہماری امکان بھر کوششوں کا نتیجہ آئینہ

سامنے ہے اور منصوبے کی باقی ماندہ عمارتیں علم دوست اور صاحب خیر حضرات کی محتاج کرم ہیں۔ کرم فرماؤں کی علم دوستی کو زندہ جاوید بنانے کی غرض سے یہاں بھی ایک ایسا طریقہ سوچا گیا ہے جو یقیناً ان کی بلند مذاقی اور عالی ظرفی کا نمونہ ہے۔

مخیر حضرات جو اس سلسلے میں ادارہ مذکور کی مالی اعانت فرمائیں گے ان کے نام کی تختیاں دیواروں میں پیوست کی جائیں گی تاکہ یادگار رہے — (۱) پچیس ہزار روپئے دینے والے کا نام ویلفیر سنٹر کے دعا ہال میں (۲) پندرہ ہزار روپئے دینے والے کا نام ہائی اسکول کے بڑے ہال میں۔ (۳) دس ہزار روپئے دینے والے کا نام بڑے کمرے میں۔ (۴) پانچ ہزار روپئے دینے والے کا نام چھوٹے کمرے میں۔

پہلی عمارت کے جشن افتتاح کے موقع پر کی ہوئی یہ اپیل صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ جوش عمل کی قدر کرنے والے لوگوں نے فوراً ہی اپنی طرف سے عطیات کا اعلان کیا۔ تاہم مذکورہ عمارت کا تعمیری پلان محتاج کرم ہے اور اس سلسلے میں علم دوست حضرات کو اور توجہ دینے کی ضرورت ہے — ادارہ نقش کوکن باشندگان بھسلہ کو پرخلوص کوششوں پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے منصوبہ کی فوری تکمیل کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہے — آمین

محسن سنبھلی

کربلا

کربلا کیا ہے نیاز و ناز کا میدان ہے
کربلا کیا ہے حق و باطل کی اک پہچان ہے
کربلا حسنِ عمل کا ایک پاکیزہ مقام
کربلا حدِ کمالِ عظمت انسان ہے
باوفا ایسے نہ شاید خلق پیدا کر سکے
کربلا اہلِ وفا کا آخری میدان ہے

تبصرہ

تبصرہ کیلئے کتاب کی
دو کاپیاں آنا ضروری ہے

"ہمارا دین"

حکومت مصر کی وزارت تعلیم و تربیت نے ایک کتاب "التربیۃ الدینیۃ" کے نام سے اپنے ملک کے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے شائع کی تھی۔ جسے ہمارے یہاں کے باخبر لوگوں نے بہت پسند کیا اور جناب حسین وجیہہ الدین مقدم ایم۔ اے بی ایڈ نے اس کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور انجمن اسلام بمبئی کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین دسنوی نے مناسب و موزوں ترتیب اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ بڑے اہتمام سے فائدہ عام کی غرض سے خرچ سے کم قیمت دو روپیہ رکھ کر شائع فرمایا۔
جزاھم اللہ۔

کتاب کے دو حصہ ہیں۔ پہلے حصہ میں دیباچہ اور والدین اور معلمین سے گذارش کے عنوانوں کے علاوہ ، ۳۴ عنوان ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلکش مثلاً تلاوت قرآن۔ الحمد للہ۔ لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ کی قدرت کے نمونے۔ آؤ کلمہ پڑھیں۔ پانچ نشانیاں۔ آؤ وضو کریں۔ پانچ وقت کی نمازیں۔ شب قدر۔ عید۔ دو دوست۔ صفائی ستھرائی۔ حضرت آدم اور چند اور نبیوں کے سبق آموز مختصر حالات۔ اصحاب فیل کی کہانی۔ غرض کھیل کود اور باتوں باتوں میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کتاب کی خصوصیت ہے (مندرجہ بالا عنوان بعض کتاب کے ہیں اور بعض عنوانوں کو مختصراً میں نے اپنے لفظوں میں درج کیا ہے)۔ دوسرے حصہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی، حالات اور آپ کے پیغام کو دس عنوانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ آخر عنوان ہے "دین میں سب برابر ہیں"۔ دونوں حصہ ایک ہی جلد میں شامل ہے۔ سائز بڑا ہے۔ لکھائی جلی ہے صفحوں کی تعداد ایک سو تیس ہے اور اسلام سے تعلق رکھنے والی کچھ تصویریں ہیں کتاب اردو جاننے والے ہر گھر میں رکھے جانے کے قابل ہے، تاکہ بچے بھی پڑھیں اور بوڑھے بھی۔ پہلی اشاعت میں خاصی مشکلات کا سامنا رہا۔ مگر دوسری اشاعت میں یہ نکتہ خصوصیت سے پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ حرفوں کے نقطے ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر ہوں اور حروف علت کی معروف و مجہول علامات کے اظہار میں از اول تا آخر یکسانیت کی پابندی کی جائے تاکہ بچے اور مبتدی صحت کے ساتھ آسانی پڑھ سکیں۔

ملنے کا پتہ :- ادبی پبلشرز۔ شعبۂ اشاعت انجمن اسلام
دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی علے

م۔م بیش

حل المشکلات

"حل المشکلات" چوبیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر مگر جامع مجموعہ اردو علاقۂ کوکن کے ایک کہنہ سال سوشل ورکر جناب عباس ابن حسام الدین دلوی (داپھیلی) کی کاوشوں کا ثمرۂ شیریں منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اس مختصر اہم مجموعہ میں جناب عباس دلوی نے "ربنا" سے شروع ہونے والی قرآنی آیات کو یکجا کر کے مشکلات کا حل پیش کیا ہے۔ حضرت امجد حیدرآبادی کی ایک مشہور رباعی ہے :

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

رب سے مانگنے کے لئے بھی سلیقہ سیکھنا ضروری ہے۔ ہر نماز میں ہم ادب وسلیقہ سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اے اللہ تعالیٰ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) کہہ کر اپنے رب سے کچھ مانگتے ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتابچہ کو مرتب کرنے میں دلوی صاحب کی محنت اور لگن کو بڑا دخل ہے۔ بیک وقت اتنی دعائیں پڑھنے والا یقیناً مرتب کے لئے دعائیں کرے گا۔ ابتدا میں مرتب نے حضرت سید صوفی وارثی "میر عثمان" کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ "تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدائے بزرگ وبرتر کا اسم مظہر ذاتی ویسے اللہ ہے (جل جلالہٗ) مگر جس قدر وہ (اللہ) اسم گرامی "ربّ" سے خوش ہوتا ہے اتنا کسی نام سے رضامند نہیں ہوتا۔" اور شاید یہی قول محرک بنا کہ مرتّب نے رَبَّنَا سے شروع ہونے والی اوراد یکجا کیں۔ از حضرت آدم تا ایں دم دعاؤں سے واقعی بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کیا گیا۔ دعاؤں کا سہارا لے کر اللہ کے مقبول بندے کٹھن مراحل سے خندان و شادان گزرے ہیں جنگ بدر میں حضور سرور کائنات فخر موجودات نے بھی اپنے لشکر کی کامیابی کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا فرمائی جو مقبول ہوئی۔ "حل المشکلات" میں دعاؤں کے ساتھ دعاؤں کا ترجمہ بھی ہے، جس سے دعا مانگنے والا یہ بھی جان سکتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور میں کیا عرض کر رہا ہے۔ محترم عباس دلوی صاحب کی اس بہترین کاوش کو یقیناً ہر جگہ بنظر استحسان دیکھا جائے گا۔ جسے انھوں نے اپنے پیر ومرشد حضرت الحاج سید قربان علی شاہ قادری ابوالعلائی چشتی جہانگیری سکندری کے نام سے منسوب کیا ہے۔ مزید براں نظر ثانی کرنے میں حضرت پیر ومرشد الحاج سید حسام الدین ابن سید حسن صاحب قادری عرتوی، مولانا سید ابراہیم ابن الحاج سید سیف الدین صاحب قادری اور عالمی جناب پروفیسر احمد بہاؤ الدین دادرکر صاحب صدر شعبۂ عربی وفارسی واسلامیات جامعہ ممبئی کے اسمائے گرامی اس کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ کتابت وطباعت مناسب ہے۔ قیمت درج نہیں لیکن ہدیۃً جو کچھ بھی پیش کیا جائے مرتب قبول کرتے ہیں۔ آپ ان دعاؤں سے ضرور فیض اٹھائیے۔

ملنے کا پتہ :۔ (۱) جناب پروفیسر اے۔ بی۔ دادرکر
۲/۱۷۷ ڈونگری اسٹریٹ ممبئی ۹ء
(۲) حسن اسمٰعیل ابن یعقوب دلوی
۲/۱۲۷ جحریہ اسٹریٹ ممبئی ۸ء

ن ۔ ک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

از ریاض آفندی
سیرت اکیڈیمی
بمعرفت اقبال بکڈپو
۱۴ محمد علی روڈ، محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

کسی عاشق رسول نے کیا خوب کہا ہے :

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

سرور کائنات، فخر موجودات، آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر کوئی کتاب سپرد قلم کرنا جس قدر اہم ومقدس کام ہے اسی قدر ایک مشکل ذمہ داری بھی ہے۔ کیونکہ نہایت سنبھل سنبھل کر اس میدان میں قدم اٹھانا پڑتا ہے کہ مبادا کوئی نادانستہ لغزش بھی بارگاہ رسول انام میں باعث بے ادبی نہ ہو۔ کسی عقیدت مند نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

زیر تبصرہ کتاب "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" ایک ایسی نیک کوشش ہے جس پر حضرت ریاض آفندی کو مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر سیرت کی کتب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ فرمایا۔ ریاض آفندی صاحب اردو داں طبقہ کے لئے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ کچھ عرصہ ادارہ نقش کوکن میں ایک مخصوص "ثاقب" مرتب کرتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی "چاچا" نامی کتاب نقش کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف امدادی درسی کتب بھی وہ شائع کر چکے ہیں۔

کتاب کے ٹائیٹل ہی پر ایک شعر درج ہے ؎

تو ئی سلطان عالم یا محمدؐ
زراہِ لطف سوئے من نظر کن

اس سے بارگاہِ خیر الانام سے مصنف کی گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

اس مقدس کتاب کا انتساب یقیناً جرأت آفریں ہے:

"ہر اس فرزند توحید کی خدمت میں جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے"

آج اس دور میں جب مسلمانوں کے مابین اختلافات خواہ مخواہ بڑھتے جا رہے ہیں، فرقوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک فرقہ دوسرے کی تکذیب کرتا ہے اس قسم کا انتساب کرنے والے مصنف کو یہی کہنا زیادہ مناسب ہے کہ "آپ کا دم بھی غنیمت ہے مسلمانوں میں"۔

بُت پرستی تو شرک خفی ہے لیکن فرقہ پرستی شرک جلی ہے۔ اس کی وضاحت میں بتا دیا گیا کہ مشرک ہونے کا مطلب یہی وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہونا جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے" — فرقے بن جانے کے بعد ہر فرقہ یہی سوچتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں "پہلی بات" کے تحت مصنف نے اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِنَ النُّوْرِ کی اچھی تشریح کی ہے — ہر نیا عنوان شروع ہونے سے پہلے حضرت حفیظ جالندھری کے مشہور شاہنامے کے اشعار سونے پر سہاگہ معلوم ہوتے ہیں۔ مصنف نے "آنحضرتؐ سے پہلے عرب کی حالت" "آنحضرتؐ کی پیدائش"، "ان کا بچپن"، "عہد شباب"، "نبوت"، "نبوت کے بعد کے واقعات"، "معراج النبیؐ"، "معراج شریف کے واقعات"۔ ان عنوانات کو لے کر سیرت طیبہ بیان فرمائی ہے۔

کتاب کا گیٹ اپ بہت عمدہ ہے لیکن کتابت پر مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ صفحہ ۸ پر "شجر زحجر" کے بجائے "شجر و ہجر" لکھا گیا ہے — ہدیہ تبریک ایک روپیہ ۲۵ پیسے بہت مناسب ہے۔ عاشقانِ رسولؐ سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کو ضرور خرید کر پڑھیں۔

(ش۔ک)

مسز ذکیہ ضمیر الدین خطیب ایم اے
(آنریری پرنسپل پی پی ٹی کالج بمبئی)

پری پرائمری ٹیچرز ٹریننگ

درس و تدریس کا سنگِ بنیاد

یہ حقیقت ہے کہ آج اکثر بچے انگریزی اسکولوں میں ابتدائی عمر سے ہی بھیجے جاتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بہتر انگریزی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان انگریزی اسکولوں میں نرسری نیز کے جی K.G. کی ماہر اساتذہ نفسیاتی و دلچسپی کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان بچوں کو تربیت دیتی ہیں اور بچہ ان اسکولوں میں بہلا رہتا ہے۔

انجمن اسلام بمبئی نے ان ہی باتوں کو سمجھ کر گذشتہ سال یہ قدم اٹھایا ہے کہ ایس ایس سی لڑکیوں کو بھی اس قسم کی تربیت دی جائے اور وہ کے جی (K.G) کی سند حاصل کر سکیں تو ہم بھی اپنے تمام اسکولوں میں نرسری و کے جی کے ابتدائی درجے شروع کر سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کی بہ نسبت اپنے مسائل بہتر طور پر سمجھ سکیں گے، اور انھیں سمجھنے کے بعد بہتر طور پر سمجھا سکیں گے۔

انجمن اسلام کی یہ نئی کالج پری پرائمری ٹیچرز ٹریننگ کالج بھائیکلہ ۱ باپو کھلی روڈ بمبئی ۲۷ میں جولائی ۱۹۷۱ء سے شروع ہو چکی ہے۔ اس میں فی الحال ۳۵ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ یہاں نہ صرف بمبئی کی طالبات ہیں بلکہ دیہی علاقوں سے آئی ہوئی طالبات بھی ہیں۔ چونکہ یہ کورس ہمارے لئے بالکل نیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ والدین کو سمجھایا جائے کہ اس کورس میں کون سے مضامین سکھائے جاتے ہیں۔

یہاں اس بات پر دھیان دیا جاتا ہے کہ لڑکیاں بچے کی نشو و نما کو بخوبی سمجھ سکیں۔ پیدائش سے قبل ایامِ حمل میں ہونے والی ماں کے لئے غذا اور دوسری باتوں کی کیا احتیاط برتنی ہے کہ بچہ تندرست و توانا ہو سکے۔ اس کا ذہنی معیار کیسا ہے۔ پیدائش کے بعد بچے کی ایک سال سے چھ سال کی عمر تک اس کی نشو و نما میں کیا احتیاطی تدابیر اختیار کئے جائیں۔ وغیرہ۔ اس مضمون کا نام CHILD DEVELOPMENT ہے۔

اس کا دوسرا اہم مضمون ہے :- NURSERY SCHOOL ADUCATION —

نرسری کلاس یا نرسری اسکول کے مسائل دوسری بڑی یا چھوٹی اسکولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ نرسری کلاس کا کمرہ کس ساخت کا ہو۔ اس میں ہوا کا رخ کیسا ہو۔ اس کا رقبہ کتنا ہو ان مسائل کو سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت کیسی ہو۔ پڑھانے کے اوقات کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ تربیتی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے بچے کے لئے کس قسم کے کھلونوں کا انتخاب ہو۔ سستی اور بہتر چیز کہاں سے اور کیسے دستیاب ہو سکے۔ کونسی چیزیں بچے کے لئے اچھی ہوتی ہیں اور کن چیزوں سے پرہیز کیا جائے

اچھی اور میٹھی زبان میں اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی کی چھوٹی چھوٹی نظمیں سکھائی جاتی ہیں تاکہ طالبات آگے چل کر اپنی اپنی نرسری میں ان خوش کن انداز میں بچوں کی تربیت کر سکیں۔

اس کا تیسرا مضمون ہے CREATIVE ACTIVITY اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ بچوں کی تربیت لکڑی کی نوک اور استاد کی چیخ و پکار سے نہیں بلکہ کھلونوں کی مدد سے ہو۔ اسی لئے لازم آتا ہے کہ استاد کھلونوں کو بھی بنا تا جائے اس لئے دستکاری سکھائی جاتی ہے۔ انھیں نرم کپڑے کے کھلونے بنانا سکھایا جاتا ہے۔ اچھے اچھے چارٹس اور ڈرائنگ بتائے جاتے ہیں۔ بچے کاغذ کا بٹنا، کاغذ پھاڑنا CLAY سے کھیلنا، تصویروں کو کاٹ کر چسپاں کرنا وغیرہ تاکہ بہت اچھی طرح لانبے وقفے کے لئے بچوں کو بہلایا جا سکے۔

اس کا چوتھا مضمون ہے انتظامیہ یا ایڈمنسٹریشن۔ اس میں طالبات سیکھتی ہیں کہ فیس کیسے لی جائے، رسید کس طرح سے بنائی جائے۔ فائلیں کیسی ہوں۔ ان کی ترتیب کیا ہو۔ آفس کس طرح قائم کیا جا سکے خطوط کس طرح لکھے جا سکیں۔ نرسری کے آمد و خرچ کے حسابات کو کس طرح قائم رکھا جائے۔ وغیرہ۔ کیونکہ کبھی تو نرسری بڑی اسکول کا ایک حصہ ہوتی ہے اور الگ کلرک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ہمیں تو طالبات کو یہ بھی سکھانا ہے کہ بڑی اسکول کی نرسری میں جگہ نہ ملنے کی صورت میں وہ خود اپنی نرسری اپنے اپنے محلے میں قائم کر سکیں۔ کیونکہ اپنی نرسری قائم کرنا اور اسے چلانا کئی درجہ بہتر ہے اس سے کہ وہ آگے چل کر اپنا گھر اپنے بچے چھوڑ کر خدمت کے لئے ادھر ادھر جائیں۔

نرسری تعلیم سے آج کی نوجوان لڑکیوں کو آراستہ کرنے کا یہ بھی ایک اہم مقصد ہے کہ عورت اپنے صحیح مقام میں رہ کر ہی آمدنی کے کچھ ذرائع بنا سکے۔

اوپر دیئے ہوئے مضمون اس کورس کی THEORY کے مضامین ہیں۔ اس کے عملی یا PRACTCLE مضامین بھی الگ ہیں۔ طالبات معلومات حاصل کرنے کے لئے ہفتے میں تین دن صبح کے وقت شہر کی اچھی اچھی نرسری میں OBSERVATION یا معائنہ کے لئے (PARTICIPATION) جاتی ہیں۔ کراٹیسٹ چرچ اسکول کونوینٹ آف جی سیز اینڈ میری اسکول، بمبئی۔ انٹرنیشنل اسکول، ڈائمنڈ جوبلی اسکول، داؤد فاضل اسکول، نیو ایکٹیویٹی اسکول اور دوسری اسکولوں کی نرسری میں جا رہی ہیں۔ اس طرح انھیں نہ صرف اصولی بلکہ عملی تجربات سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔

یہ کورس صرف ایک سال کا ہے اور اس میں تربیت پانے کے بعد طالبات کے لئے روشن اور صحیح مستقبل ہے۔ اس تربیت کے بعد یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ انگریزی اسکول ہی میں پڑھا سکیں گی۔ خوشی کی بات ہے کہ آج ہماری اکثر اسکولیں نرسری شروع کرنے پر غور کر رہی ہیں لہٰذا ان بچیوں کے لئے مواقع بڑھ رہے ہیں۔ مختلف اسکولز کے ٹرسٹیز و پرنسپل سے میں یہاں درخواستاً یہ عرض کروں گی کہ اپنی اسکولوں کے کے جی و نرسری کے لئے اساتذہ کا تقرر کرتے وقت ہماری کالج سے ضرور رابطہ قائم کریں کیونکہ ہماری طالبات جون ۷۲ء سے اسکولوں میں ملازمت لے سکیں گی۔

اس کورس کے داخلے محدود ہیں۔ مارچ ۷۲ء میں ایس ایس سی کے امتحان میں شامل ہونے والی طالبات اپریل ۷۲ء میں فارم بھریں۔ چھٹیوں میں ان طالبات کے لئے انجمن اسلام گرلز ہائی اسکول بیلاسس روڈ پر خصوصی انگریزی کے کلاسیز کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ تاکہ انگریزی بہتر ہو سکے۔ ان کلاسیز میں بھی داخلے کے لئے طالبات اپنا نام لکھوا سکتی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ان کوششوں سے نہ صرف یہ کہ قوم کے بچوں کا مستقبل روشن و تابناک ہوگا بلکہ ہماری اسکولوں کا معیار تعلیم بھی بلند ہو سکے گا۔

بہتر نرسری بہتر اسکول کی ضامن ہے ——

محمد سعید کھوکھر
بی اے (آنرز)

مشرقی پاکستان

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے حکومتِ پاکستان نے نظامِ حکومت میں اور ملکی ترقی و اصلاح کے منصوبوں میں مشرقی پاکستان کے بیشتر جائز حقوق کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ کل کی بات ہے کہ پاکستان مشتمل تھا مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان یعنی مشرقی بنگال پر۔ مشرقی پاکستان آبادی اور ذرائع آمدنی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے بڑا ہونے کے باوجود قریب کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ مغربی پاکستان کے اصلاحی منصوبوں پر خرچ ہوتا رہا اور اس کی تعلیمی، تجارتی اور صنعتی ترقی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی اور یہ سب ہوتا رہا باوجود اس کے کہ سہروردی، فضل الحق اور محمد علی بوگرا جیسے مشرقی بنگال کے رہنما پاکستان کے وزرائے اعظم رہ چکے تھے۔ پاکستان ایک مسلم ریاست ہونے کے نظریے کے زیر اثر ایک عرصۂ دراز تک مشرق و مغرب کے اس بیّن فرق کو اور اس سے پیدا ہونے والی اپنی پس ماندگی کو مشرقی پاکستان کے عوام نے محسوس نہیں کیا۔ مگر یہ فرق بتدریج اس قدر نمایاں ہوتا گیا کہ مغربی پاکستان کی خود غرضی اور عدم مساوات کے مایوس کن اثرات نے بالآخر مشرقی پاکستان کے عوام کو بیدار کر ہی دیا، اور یہ قدرت کی کرشمہ سازی سمجھنا چاہئے کہ ایسی بیدار شدہ عوام کی رہبری کے لئے مجیب الرحمٰن جیسا قابل اور درد مند رہنما رونما ہوا اور مشرقی پاکستان کے عوام الناس یہ نعرہ لگاتے ہوئے کہ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

مجیب صاحب کے جھنڈے تلے جوق در جوق جمع ہو گئے ـــــ

شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ابتدائی کارنامے

مجیب الرحمٰن ضلع فرید پور کے ٹانگی پارہ گاؤں کے ایک متوسط خاندان میں ۱۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے اور وطن اور وطن والوں کی تڑپ دل میں ساتھ لے آئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وطن کی خدمت اور سیاسی تحریک کی طرف رجحان ان کی فطرت میں موجزن تھا۔ سترہ (۱۷) سال کی عمر میں ایک سیاسی اجتماع میں شرکت کرنے کے جرم میں ایک ہفتہ کے لئے جیل سے ہو کر آئے۔ اسلامیہ کالج کلکتہ کے جو اب مولانا آزاد کالج کے نام سے موسوم ہے بحیثیت طالب علم ہونے کے کالج کے مسلم اسٹوڈنس فیڈریشن میں عملی حصہ لیا۔ ۱۹۴۱ء میں نیتا جی بوس نے بلیک ہول المیہ کی دوامی یادگار کو ہٹانے کی کلکتہ میں جو تحریک شروع کی تھی اس میں مجیب الرحمٰن نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ مجیب کے ان وطنی اور قومی خدمات کے جذبات کو اور ان کی آزاد خیالی کو دیکھ کر سہروردی صاحب

نے ان کو مسلم لیگ پارٹی میں شامل کیا۔ ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم بنگال کی اسمبلی کے لئے مسلم لیگی امیدواروں کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں سلہٹ علاقہ کو پاکستان میں ضم کرنے کے لئے جو ریفرینڈم کیا گیا اس میں ان کی بیا بہانہ کوششیں شامل تھیں۔ لیکن جب مسلم لیگ حاکم پارٹی نے اردو زبان کو نافذ کرنا چاہا تو انھوں نے بنگالی زبان کو جائز مقام ملنے کا مطالبہ کیا اور جب جناح صاحب نے اردو زبان کے ملکی زبان ہونے کا اعلان کیا تو مجیب نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔ اس جرم کی سزا کے لئے مغربی پاکستان کی حکومت نے پہلی بار ان کو جیل میں بھیجا۔

جیل سے رہا ہونے پر مجیب نے مسلم لیگ سے قطع تعلق کیا، اور نئی پارٹی بنام عوامی لیگ بنائی جس کو سہروردی صاحب کی حمایت حاصل تھی۔

۱۹۵۴ء کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست ہوگئی اور فضل الحق صاحب نے وزارت بنائی جس میں مجیب صاحب کامرس منسٹر بنائے گئے۔ لیکن جلد ہی وہ مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء کے انتخاب میں وہ نیشنل اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور وزیر بھی بنائے گئے۔ انڈو پاک دوستی کی توثیق کے لئے ۱۹۵۵ء میں ہندوستان کو بھیجے ہوئے ڈیلی گیشن کی انھوں نے رہنمائی کی۔ ۵۵ء اور ۵۷ء میں بھی پیکنگ بھیجے گئے پارلیمانی ڈیلی گیشن کے وہ لیڈر تھے۔ ۵۶ء میں پاکستان کا مرتب کردہ دستور العمل مشتہر کیا گیا مگر مجیب اور ان کی پارٹی نے اس کو اس لئے مسترد کر دیا کہ صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو پورا کرنے میں وہ ناکام رہا۔ ۵۸ء میں جنرل ایوب خاں بحیثیت صدر پاکستان برسر اقتدار آ گئے۔ انھوں نے مجیب کو جیل میں بھیجا اور ان کی عوامی لیگ پارٹی کو غیر قانونی قرار دیا۔

جنرل ایوب خان

چونکہ اندنوں پاکستان کا عام نظام حکومت اندرون اور بیرون دفتر بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی عام باتیں تھیں اور عوام حکومت سے مایوس اور غیر مطمئن تھے جنرل ایوب خان نے بغیر خون بہائے آسانی سے صدر مرزا کا تختہ الٹ دیا اور خود صدر مملکت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ چونکہ ان کی شخصی حکومت کا قیام مارشل لا کا رہین منت تھا انھوں نے کئی ضابطے نافذ کر کے نظام حکومت کو درست کیا۔ رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی کا کسی حد تک سدّ باب کیا۔ انکم ٹیکس کے کروڑہا روپے کا بقایا وصول کیا اور زیر مکان اور زیر آب اناج اور سونے کے ذخیرے برآمد کئے جس سے اقتصادی حالت کچھ درست ہو کر جنرل ایوب کو عوام میں بڑی حد تک ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ مگر یہ دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ انتخابات اور دستور العمل کے پیچیدہ اور متنازعہ مسئلے در پیش تھے۔ انتظام حکومت کی سہولت اور کفایت شعاری کے لئے انھوں نے مغربی پاکستان کے شمالی صوبوں کو ایک یونٹ میں بدل دیا، اور انتخابات کے لئے علاقائی نمائندگی کے انتخابی مرکز کے بنیادی طریقۂ کار کو رائج کیا۔ جس سے عام حق رائے دہندگی محدود ہو جانے سے اکثر لوگ خوش نہیں تھے۔

۱۹۵۹ء میں جنرل ایوب خان نے مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے ساتھ آئینی بے انصافی ہونے پر انھوں نے آئین کے خلاف صدائے احتجاج پھر بلند کی جس کے صلے میں ۶۲ء میں وہ پھر جیل میں بھیجے گئے۔ رہائی کے بعد ۶۵ء میں عوامی لیگ کو پھر زندہ کیا اور ۶۵ء کے انتخابات میں ایوب خاں کی رقیب مس فاطمہ جناح کی بھرپور مدد کی۔ فتح مند ایوب خان نے مارشل لا کے ضابطہ کے تحت عوامی لیگ کو ممنوع قرار دیا اور مجیب پر فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔ ۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بھی ہوئی۔ یہ جنگ ۲۲ روز لڑنے کے بعد تاشقند معاہدہ پر اس کا خاتمہ ہوا۔ اس چند روزہ جنگ

نتائج کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ ہر فریق نے اپنی فتح مندی کا دعویٰ کیا۔ خواہ کچھ ہی ہو مگر اس چند روزہ جنگ نے پاکستان کی اقتصادی حالت پر ضرب لگادی اور عام لوگ بھی خوش نہ رہے۔ ہندوستان کو بھی کچھ کم نقصان اٹھانا نہ پڑا۔

۱۹۶۶ء میں عوامی لیگ پر سے قانونی پابندیاں اٹھائی گئیں اور مجیب الرحمٰن نے پاکستان کے آئین کے اندر رہ کر مشرقی پاکستان کی خود مختاری کے لئے اپنے چھ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا جس کو مشرقی پاکستان کی عوام نے منظور کیا تھا۔ یہ پروگرام جیسا پہلوؤں کے پیش نظر انتہائی درجہ کی خود مختاری کا ایک نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے حسب ذیل تین نکات قابل ذکر ہیں:

۱۔ مرکزی حکومت کو صرف خارجہ معاملات اور دفاع پر اختیار ہوگا۔

۲۔ ٹیکس لگانے اور مالیہ اکٹھا کرنے کے اختیارات صرف صوبوں کو ہوں گے۔ مرکزی حکومت کے اخراجات کے لئے صوبے اپنی آمدنی کے تناسب سے روپے کی ادائیگی کریں گے۔

۳۔ مشرقی پاکستان کو اپنا ایک الگ فوجی ملیشیا بنانے کی اجازت ہوگی۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا نکات کے ماتحت پاکستان ہی نہیں دنیا کی کوئی مطلق العنان حکومت امن اور قانون کی بحالی اور انتظامی اور فرمانروائی کے امور کے نفاذ کے اخراجات کے لئے اپنے ماتحت صوبوں کی محتاج رہ کر اپنی مرکزیت کی بالاتری کو اور دنیا کے ممالک میں ہمسری کے درجہ کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ البتہ خود مختاری دینے اور دنیا کے ممالک میں اپنی ہمسری کے درجہ کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ البتہ خود مختاری دینے اور خود مختاری لینے والوں کے مقصد میں اخلاص بھی ہو تو بتقاضائے اصول جمہوریت اور آزادی ان نکات میں عملی نکتۂ نگاہ سے ترمیمات کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ مگر اب یہ بعد از وقت ہے ___

ان چھ نکاتی پروگرام کے جرم میں مجیب الرحمٰن پھر جیل گئے اور دوسرے کئی جرائم کے لئے ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا، مگر یہ مقدمہ ناکام رہا اور وہ ۱۹۶۸ء کی ابتدا میں رہا کردئے گئے۔ اس کے فوراً بعد وہ پھر گرفتار کئے گئے اور مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کے لئے ہندوستانی افسروں سے سازش کرنے کے الزام میں فوجی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ رائے عامہ اس مقدمے کی سخت مخالف تھی اور اس کے خلاف عام تحریک شروع ہوئی اور اس قدر زور پکڑ گئی کہ ایوب خان نے مجبوراً مقدمہ اٹھالیا اور جنوری ۱۹۶۹ء میں مجیب الرحمٰن کو رہا کردیا گیا۔ اس وقت ملک میں انتشار اور بدامنی کا دَور دورہ تھا۔ اور خاص کر طلبہ کی حصول حقوق اور تعلیمی نظام کی تحریک نے توڑ پھوڑ اور جلانے کا کام شروع کرکے ملک میں بدانتظامی پیدا کی۔ مجیب نے اس عوامی بے چینی سے فائدہ اٹھاکر اس تحریک کی ہر قسم سے مدد کی اور ایوب خان سے عوام کی مخالفت اس قدر بڑھ گئی آخر عوام کے سامنے ان کو سر جھکانا پڑا اور بالآخر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو انھوں نے عنانِ حکومت یحییٰ خان کے سپرد کردی۔

جنرل یحییٰ خان

اگرچہ جنرل یحییٰ خان کی شخصیت اور ان کی آواز میں فوجی انداز نمایاں تھا مگر ابتدا ہی سے وہ عوامی حکومت کے قائل تھے ___ رائے عامہ کی آواز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے مغربی پاکستان کے ایک یونٹ کو نکال کر صوبائی حکومتیں قائم کیں۔ ایوب خان کے طریقۂ انتخاب کو موقوف کرکے عام رائے بالغان کی بنیاد پر طریقۂ انتخابات کو پھر رائج کیا اور پاکستان کے دونوں حصوں میں دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات ہونے کا اعلان کیا۔ دونوں حصوں میں انتخابات کی زبردست تیاریاں ہونے لگیں۔ مغرب میں بھٹو صاحب پاکستان پیپلس پارٹی کے جو وہاں کی سب سے بڑی پارٹی تھی، لیڈر تھے۔ ادھر مشرق میں عوامی لیگ کے لیڈر مجیب الرحمٰن نے اپنا ۶ نکاتی پروگرام ہاتھ میں لے کر دھواں دھار تقریریں کیں اور عوام کی زبردست حمایت حاصل کی۔ مقررہ وقت پر

دونوں طرف پرامن طریق سے انتخابات ہوئے۔ مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب کو اوران کی پارٹی کو بڑی اکثریت حاصل ہوئی اور مشرقی پاکستان میں تو قریب قریب تمام رائے دہندگان نے مجیب کے حق میں ووٹ دئے۔ اوران کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔ اس عظیم کامیابی کے بل پر مجیب نے اپنے ۶ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر پاکستان کا آئین مرتب کرنے کا مطالبہ کیا۔

جنرل یحییٰ خان نے ابتداء میں ۶ نکاتی پروگرام کی طرف اپنی رغبت کا اشارۃً اظہار کیا۔ مجیب صاحب کو آئندہ کے وزیراعظم کہا۔ اور ڈھاکہ میں نیشنل کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی منعقد کرنے کے لئے ان کی تجویز کو قبول کیا۔ لیکن بعد میں ۶ نکاتی پروگرام کے نظام حکومت پر ہونیوالے اثرات کو محسوس کر کے نیز بھٹو صاحب کے مشورہ کے زیراثر ڈھاکہ میں نیشنل اسمبلی کا انعقاد ملتوی کردیا، اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ۶ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر مرتب کردہ آئین وہ منظور نہیں کریں گے۔ ۶ نکاتی پروگرام کی حمایت میں عوام کے فیصلہ سے یحییٰ خان کے اس انکار کو مجیب نے ان کی بدنیتی پر محمول کیا اوراس انکار کا مقابلہ کرنے کیلئے انھوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور مشرقی پاکستان کے عوام نے ان کی حمایت کی۔ اس تحریک کے تحت سرکاری افسروں اور دفتروں اور دیگر نجی شعبوں کو مجیب نے اپنے نام سے احکام جاری کئے جس سے اس تحریک میں شدت پیدا ہو کر ملک میں بدامنی شروع ہوئی اور تشدد کے واقعات ہونے لگے۔

مجیب الرحمٰن کی سول نافرمانی کی تحریک کے نتائج دیکھ کر یحییٰ خان نے ڈھاکہ کو پرواز کی۔ ظاہرا اس مقصد کے لئے کہ مجیب صاحب سے روبرو گفت و شنید کر کے نیشنل اسمبلی منعقد کرنے سے پہلے ۶ نکاتی پروگرام کے متعلق ان کے خیالات کو ہموار کر کے بطریق مصالحت کسی متفقہ فیصلہ پر آجائیں۔ باہمی گفتگو شروع ہوئی اور کئی دنوں تک جاری رہی۔ اس دوران سول نافرمانی بھی جاری رہی اوراس کی روز افزوں شدت دیکھ کر یحییٰ خان نے مغربی پاکستان سے فوج منگائی۔ دوران گفتگو میں اختتام نشست پر مجیب الرحمٰن نے باہر آکر جو دو باتیں بازنامہ نگاروں کو بیانات دئے ان سے کسی مصالحت کی امید بندھ گئی تھی۔ مگر یہ غلط ثابت ہوئی۔ فریقین جن میں بھٹو صاحب اور دیگر پارٹی لیڈران بھی دعوت سے شریک تھے، اپنے اپنے مطالبے اور دلائل پر مُصر رہے۔ اور بغیر کسی نتیجہ کے مجلس کی گفتگو میں یہی منظر پیش رہا ؎

ملک الموت اڑے ہیں کہ میں جاں لیکے رہوں
سربسجدہ ہے مسیحا کہ میری بات رہے

بھٹو صاحب اور دیگر پارٹی لیڈران نامراد واپس چلے گئے اور حالات تیزی سے بدلتے گئے۔ مصالحتی گفتگو کے ناکام نتائج سے برانگیختہ ہوکر ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمٰن نے لاکھوں عوام کے سامنے دھواں دھار تقریر کر کے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اور آزاد بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے جرم کے خلاف یحییٰ خان نے اپنے مارشل لاء احکام صادر کئے اور مجیب الرحمٰن ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو ایک بجے گرفتار کئے گئے اور فوراً ان کو قیدی بنا کر مغربی پاکستان کو بھیجا گیا۔ اور خود یحییٰ خان اپنی فوج کے ہاتھ میں شعلہ ہائے آتشیں دیکر اوران کو آزاد چھوڑ کر فوراً مغربی پاکستان روانہ ہو گئے۔

آتشزدگی اور غارتگری

پھر کیا تھا! ہر جگہ اور ہر سمت تاخت و تاراج کا بازار گرم ہوا اور ہر طرف ایک آگ سی لگ گئی۔ سیکڑوں عوامی لیگی گرفتار کئے گئے یا گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ مکانات جلائے گئے، منہدم کئے گئے اور بلا امتیاز مرد و عورت، بوڑھا اور جوان قتل عام شروع ہوا۔ بچوں تک کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ فوج پر کسی کا قابو نہ تھا اور یہ آزادانہ درندگی اور دہشت انگیزی کا طوفان بے پناہ کئی دنوں تک جاری رہا، اور لاکھوں بے گناہ جانیں تلف ہوئیں اور ہزاروں مکانات برباد کئے گئے۔

اس عام خونریزی، درندگی اور دہشت انگیزی سے بچنے کیلئے شہروں اور دیہاتوں سے ہزاروں نہیں لاکھوں ہندو اور مسلمان مہاجرین نے

سرحد پار کر کے مغربی بنگال اور دیگر قریبی علاقوں میں پناہ لی۔ مگر اس کے
ساتھ ساتھ مجیب کے جانثار ہیروؤں نے یحییٰ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے
لئے گوریلا قسم کی جنگ شروع کی اور گوریلا فوجی چالوں اور گھاتوں سے
فوج کو پریشان کیا اور پھر مکتی فوج کو منظم کر کے باقاعدہ لڑائی شروع کی۔

لاکھوں پناہگزینوں کا بارِ گراں
اور ہندوستان کی ناگزیر مداخلت

مشرقی پاکستان میں یحییٰ خانی فوج نے جو عام قتل اور
غارت گری برپا کی اس سے جان بچانے کے لئے روزانہ ہزاروں اور
لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزین مغربی بنگال میں داخل ہونے لگے، اور
ازروئے انسانی ہمدردی ان لاکھوں ہندو مسلم پناہ گزینوں کے کھانے
پینے اور بود و باش کے کثیر اخراجات کا ہندوستان کو لامحالہ متحمل ہونا پڑا۔
یوں تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کے سیاسی مسائل کے
تنازعہ سے اور اس سے پیدا ہونے والی اس جنگ و جدل سے ہندوستان
کو کوئی واسطہ نہ تھا اور ابتدا میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اس کو
پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دیا۔ مگر جب روزانہ ہزاروں کی تعداد میں
پناہ گزینوں کے ہندوستان میں ورود سے ان کی تعداد پچاس لاکھ سے
متجاوز ہو گئی تو ان کے لئے روزانہ کروڑہا روپے کے اخراجات ہندوستان
کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئے۔ اس لئے پناہ گزینوں کے مسئلے
کو اب بین الاقوامی مسئلہ قرار دے کر اندرا گاندھی نے بنگلہ دیش
کی تحریک آزادی سے ہندوستان کی ہمدردی ظاہر کر کے مکتی فوج کی
حمایت شروع کی، اور پہلے اپنے وزیروں کو بھیج کر اور پھر خود بیرونی
ملکی حکومتوں مثلاً امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ کے پاس
جا کر درخواست کی کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے پاکستان کو بنگلہ دیش
سے سیاسی مصالحت کرنے پر آمادہ کریں تاکہ امن بحال ہونے پر
پناہ گزین اپنے وطن کو واپس لوٹ سکیں اور ان کے لئے ہونے والے
کروڑہا روپے کے اخراجات سے ہندوستان کو نجات ملے، اور ساتھ

ان اخراجات کے ناقابلِ برداشت بار سے بچنے کے لئے ہندوستان
خود اپنے طور سے اقدام کرے گا۔ اس سے پہلے مسز اندرا گاندھی
بڑی سیاسی دانشمندی سے روس کے ساتھ ایک قرارنامہ کیا۔
جس کی رو سے روس نے علاوہ دیگر امور کے پناہگزینوں کے مسئلے پر
ہمدردی ظاہر کی اور پاکستان کی طرف سے جارحانہ اقدام ہونے پر
اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ مگر ان دوسری طاقتوں نے جن کے پاس
خود اندرا گاندھی درخواست لے کر گئی تھیں بجز اظہارِ ہمدردی کے
پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان کوئی سیاسی مصالحت کرانے
کے لئے اپنے کسی اقدام کی پیشکش نہیں کی۔

۱۴ روزہ جنگ اور اس کا انجام

پناہگزینوں کی تعداد روزانہ لاکھوں سے بڑھتی گئی اور
ان کی روک تھام یا واپسی کے اقدام کے لئے بڑی طاقتوں سے ناامید
ہو کر مسز اندرا گاندھی نے فوج اور آلاتِ جنگ کی صورت میں مکتی
باہنی فوج کی حمایت علانیہ تیز کر دی۔ پاکستانی فوج کی ہزیمت اب
شروع ہو گئی اور ہندوستانی اور مکتی باہنی فوج نے مل کر یکے بعد دیگرے
کئی معتبر شہروں پر قبضہ کر کے جیسور اور سلہٹ کی طرف رخ کیا۔ اس
مسلسل پسپائی سے پریشان اور خشمگیں ہو کر یحییٰ خان کی فوج نے اب
مغربی سرحد کی طرف یعنی پنجاب اور کشمیر کے علاقہ میں ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو
یکایک ہندوستان کے چھ اڈوں پر یکبارگی زبردست بمباری کر کے
کچھ پیش قدمی بھی کی، اور باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ ہندوستان نے
پوری قوت کے ساتھ اس پیش قدمی کو روک دیا اور جواباً کراچی اور سندھ
کے علاقہ پر بمباری کی۔ اس طرف مشرقی محاذ پر ہندوستانی فوج نے
مکتی باہنی فوج کو ہر طرف سے بھرپور مدد پہنچائی۔ جنگی صورت حال تیزی
سے بدلتی گئی۔ دونوں فوجوں نے ۷ دسمبر کو جیسور اور سلہٹ کے فوجی
مقامات کو آزاد کرا لیا اور پایہ تخت ڈھاکہ کی طرف دونوں فوجوں نے ہر طرف
سے مارچ کر کے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ کی پاکستانی

اور مکتی باہنی فوج کے کمانڈر اروڑا کے دستخط سے سپرد کی اور جنگ بندی کا تاریخی عہدنامہ ہوکر دونوں فتح مند فوجیں پایہ تخت ڈھاکہ میں داخل ہوگئیں۔
اب چونکہ مشرقی محاذ کی جنگ کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی اور مغربی محاذ کی جنگ جاری رکھنے میں کوئی مقصد باقی نہ رہا۔ مسز اندرا گاندھی کی یہ دوسری سیاسی دانشمندی تھی کہ انھوں نے مغربی محاذ کی جنگ بندی کا فوراً از خود یکطرفہ اعلان کیا۔ برخلاف اس کے اُسی رات کے براڈکاسٹ میں جنرل یحییٰ خاں نے اعلان کیا کہ جنگ جاری رہے گی۔ مگر دوسرے ہی روز شاید روس کے تنبیہ آمیز مشورہ سے ۱۷ دسمبر کی رات کو جنرل یحییٰ خان نے بھی جنگ بندی کے احکام صادر کئے اور دونوں محاذ پر جنگی ہولناکیاں ختم ہوگئیں۔ جنگ کے ناکام اختتام پر مغربی پاکستان کے عوام کے دل لازماً شکستہ ہوگئے اور اس سے پیدا ہونے والے مخالفانہ تاثرات کو دیکھ کر یحییٰ خان نے یہ اچھا کیا کہ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کرسی صدارت خالی کردی اور عنانِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو سپرد کردی۔

بنگلہ دیش حکومت کا احیاء

۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو جنگ وجدل کی لگی ہوئی آگ سے مشرقی پاکستان کم وبیش ۹ مہینوں تک جلتا رہا اور جنگ کے اختتام اور ۲۰ دسمبر کو یحییٰ خان کے اخراج کے ساتھ اس کی خاک سے بنگلہ دیش پیدا ہوا اور مشرقی پاکستان کے نام کا وہاں کوئی نشان باقی نہ رہا۔ مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ میں جنگ کی فتح اور بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کیا۔ جس کا جوش وخروش کے ساتھ ”جے بنگلہ دیش“ کے خوشی کے نعروں میں استقبال کیا گیا۔ پارلیمانی ممبروں نے یحییٰ خاں کے جانشین بھٹو صاحب سے مطالبہ کیا کہ وہ بنگلہ دیش کے منتخب صدر مجیب الرحمٰن کو قید سے فوراً رہا کردیں اور مغربی اور ایشیائی حکومتوں سے درخواست کی کہ وہ بنگلہ دیش حکومت کو تسلیم کریں۔ پایہ تخت ڈھاکہ کی فتح کے بعد فوراً بنگلہ دیش کے نائب صدر نذر الاسلام صاحب اور اس کے وزیر اعظم تاج الدین احمد صاحب اور عوامی لیگ کے دیگر پیش کار ڈھاکہ کو واپس لوٹ آئے۔ بنگلہ دیش حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے نظام حکومت کو ترتیب دیا۔ صدر حکومت مجیب الرحمٰن کو قید سے رہا کرنے کے لئے بھٹو صاحب سے اپیل کی اور بیرونی حکومتوں سے بنگلہ دیش حکومت کو تسلیم کرنے کی درخواست کی۔ بنگلہ دیش اور اس کی حکومت کے قیام کے اعلان کے ساتھ حکومت ہند نے پناہ گزینوں کی واپسی کا اہتمام کیا اور اب وہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے عزیز وطن کو واپس لوٹ رہے ہیں۔

پاکستان کے موجودہ صدر بھٹو صاحب اور پاکستان کی یکجہتی سالمیت کیلئے ان کی کوشش

بھٹو صاحب نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کی صدارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے فوراً بعد عام اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ایک سے زیادہ وقت اس بات کا اعلان کیا کہ وہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں ان کی پیپلز پارٹی کو مکمل اکثریت حاصل ہوجانے سے وہ عوام کے نمائندہ صدر ہیں۔ اسی حیثیت سے وہ ملک اور عوام کی فلاح وبہبود کے لئے اپنی مخلصانہ خدمات پیش کرتے رہیں گے اور اسی حیثیت سے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے عوام کو ذمہ دار رہیں گے ملک کی خوشحالی اور ترقی کے لئے اپنے مختلف منصوبوں کو ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اس اولین مقصد کا اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باوجود وہ پاکستان کی سالمیت کو خواہ وہ کسی ہلکے نوعیت کی ہو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔
اس اولین مقصد کی برآوری کے پیش نظر بھٹو صاحب نے مجیب الرحمٰن سے جیل میں دو تین بار ملاقاتیں کرکے گفتگو کی۔ ظاہر ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی سیاسی رشتہ داری کا سوال ضرور زیر بحث آیا ہوگا اور اس کے ساتھ کسی ہلکی نوعیت کی سالمیت کا بھی۔ مگر گفتگو کے نتائج کا اور مجیب الرحمٰن کے جوابی تاثرات کا بھٹو صاحب نے مصلحتاً عوام کے سامنے انکشاف نہیں کیا۔
موافق فضا پیدا کرنے کے لئے نیز بیرونی چند حکومتوں کی درخواستوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھٹو صاحب نے ۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو

کراچی کے ایک عظیم اجتماع کے سامنے مجیب الرحمٰن کو رہا کرنے کے اپنے ارادہ کا اعلان کر کے حاضرین کی پُرجوش رضامندی حاصل کی۔ بھٹو صاحب نے ۸ جنوری کی صبح کو مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا اور فوراً بذریعہ طیارہ ان کو لندن روانہ کیا۔ ۱۰ کی صبح کو مجیب الرحمٰن لندن سے دہلی آئے اور اسی دوپہر کو ڈھاکہ کو پرواز کر گئے۔ ظاہر ہے ڈھاکہ میں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ ایک جم غفیر کے سامنے اپنی پہلی تقریر میں بھٹو صاحب سے اپنی گفتگو کا حوالہ دیے بغیر مجیب صاحب نے چند ہی الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان سے آئندہ کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ چونکہ بھٹو صاحب اس بارے میں حسن ظنی کے ساتھ عزم صمیم بھی رکھتے ہیں انھوں نے ایک بار سے زیادہ مرتبہ مجیب سے اپیل کی اور ابھی ابھی یہ بھی کہنے کی جسارت کی کہ پاکستان کی سالمیت کی خاطر وہ اپنی صدارت سے دست بردار ہو کر سالم پاکستان کی حکومت مجیب الرحمٰن کے سپرد کر دیں گے مگر مجیب الرحمٰن نے اس قیمتی سودے سے بے نیاز ہو کر دو ہی لفظوں میں جواب دیا کہ وہ پاکستان نہیں چاہتے۔

بھٹو صاحب کا پاکستانی سالمیت کو خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو پھر حاصل کرنے کا ارادہ معنوی اعتبار سے اپنی جگہ ایک پسندیدہ بات ہے۔ مگر اس کی پیشکش کے لئے اور اس کی قبولیت کے لئے موجودہ فضا سازگار نہیں ہے۔ سالمیت کی زندگی میں قریب ربع صدی کے تلخ تجربے کے بعد اب جب لاکھوں کا خون بہا کر بنگلہ دیش کے نام سے آزادی حاصل کی تو کسی بھی قیمت پر اس کا سودا کوئی کیونکر کرے۔ بستیوں کی آتش زدگی اور خونریزی سے مجیب کے دل کے زخم ابھی ہرے ہیں۔ اور لاکھوں مقتولین کے پس ماندگان کی آہ و فغاں ان کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور جب ویرانوں اور کھنڈروں کے بھیانک اور دلخراش منظر دیکھ کر وہ دریافت کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت اور عالیشان عمارتیں کیا ہوئیں تو

بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ وہاں گل تھا

اور وہ خود کھڑے رو رہے تھے۔ ایسے ویرانے [illegible]

کی یہ بے وقت کی صدائے سالمیت کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے۔

البتہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی تلخی کی وجہ سے جو بعد المشرقین کی خلیج پیدا ہو گئی ہے اس کو پاٹنے کے لئے کسی ایسی نوعیت کی فیڈریشن کا رشتہ قریب الامکان ہو سکتا ہے جس طرح کہ مصر، شام اور لیبیا میں ہے۔ یہ تینوں حکومتیں اپنی اپنی جگہ آزاد اور مطلق العنان رہ کر اور ان کے اندرونی نظام حکومت میں بغیر کسی مداخلت کے سیاسی، دفاعی، تجارتی، اصلاحی وغیرہ مشترکہ مفاد کے امور میں فیڈریشن کے میثاق کے ماتحت وہ باہم قریب سے قریب تر ہو گئے ہیں۔ ایسا فیڈریشن آج نہیں تو کل ہونا لابدی ہے تاکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کا سیاسی اور اقتصادی وقار دنیا کی ملکوں میں قائم ہو جائے۔ مگر اس کے لئے بھی پہلے سازگار حالات پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس حقیقت سے ایک کسی کو خواہ وہ دوست ہو یا دشمن انکار نہیں ہو سکتا کہ بنگلہ دیش وجود میں آ گیا ہے۔ اس کا نظام حکومت مرتب ہو رہا ہے اور اس کی تنظیم اور استحکام کی غرض سے مجیب الرحمٰن نے اپنا تمام تر وقت وقف کرنے کے لئے اپنا عہدۂ صدارت جناب ابو سعید چودھری کے سپرد کر کے خود وزیر اعظم کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آئے دن مغربی اور ایشیائی حکومتیں بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کر رہی ہیں اور وہ اسلامی حکومتیں بھی جو پاکستان کی خاطر اب تک سرد مہری سے کام لے رہی ہیں اس زمرہ میں عنقریب شامل ہونے کا امکان ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان بھی حقیقت بینی سے کام لے کر بنگلہ دیش حکومت کو تسلیم کرے تو یہ اقدام مجیب الرحمٰن سے رشتۂ دوستی اور یگانگت جوڑنے کی ابتدائی کوشش میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوگا۔ اور پھر بتدریج سیاسی مفاہمت کے لئے دوستانہ اور مصالحانہ گفتگو کے لئے سازگار فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ بنگلہ دیش حکومت اپنے وجود میں آنے کے لئے مسز اندرا گاندھی کی اور اس اعتبار سے تمام [illegible]

اطلاعات و معلومات

انجمن خیر الاسلام کی جانب سے

بمبئی میں پہلا اردو میڈیم کالج آف ایجوکیشن

ہمدردانِ انجمن اور بمبئی شہر کے تعلیمی حلقوں میں یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ انجمن کی جانب سے بمبئی میں اردو میڈیم سے چلنے والا جونیر کالج آف ایجوکیشن کا اجرا آئندہ سال ۱۹۷۲ء سے ہو رہا ہے۔

بمبئی میں پرائمری پڑھانے والے ٹیچروں کو اردو میڈیم سے ٹریننگ حاصل کرنے کی کہیں بھی سہولت نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کا کالج میسر تھا۔ انجمن نے اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے محکمۂ تعلیم گورنمنٹ آف مہاراشٹر کو اس جانب توجہ دلائی۔ خدا کا شکر ہے کہ محکمۂ تعلیم نے انجمن کو انجمن کی نئی تعمیر شدہ اردو ہائی اسکول کرلا میں اس کالج کو جاری کرنے کی اجازت دی۔ ان شاء اللہ یہ کالج جون ۱۹۷۲ء میں تعلیمی سال سے انجمن خیر الاسلام اردو ہائی اسکول میں شروع کر دیا جائے گا۔

مہاراشٹر کے ثانوی اسکولوں میں جون سے نیا نصاب

۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وزیر تعلیم شری ایم ڈی چودھری نے سچیوالیہ میں ضلع افسران تعلیم کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کی ضرورت جتائی کہ ریاست مہاراشٹر میں تقریباً ۵۵۰۰ ثانوی اسکولوں میں آئندہ تعلیمی سال سے نیا نصاب کامیابی سے زیر عمل لایا جائے گا۔ یہ جلسہ نئے نصاب کی عمل آوری کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے طلب کیا گیا تھا جس کا مقصد طلبہ کی ہمہ جہتی ترقی ہے۔ وزیر تعلیم نے یہ بھی فرمایا کہ نئے نصاب کی عمل آوری کے سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا: نئے اسکولوں کی منظوری دینے سے قبل انھیں اس بارے میں فیصلے سے مطلع کیا جائے۔

مغل لائن کا نیا جہاز "اکبر"

مغل لائن کا نیا مسافر و مال بردار جہاز "اکبر" کیپٹن جے۔ ایل دوبے کی کمان کے تحت ابتدائی سفر کرتے ہوئے ڈنمارک سے ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی پہنچا۔ یہ نیا جہاز ڈنمارک میں بنایا گیا ہے۔ اس جہاز میں اسی (۸۰) مسافروں کے لئے ۴۰ ایرکنڈیشنڈ ڈبل کیبن ہیں اور عرشے (ڈیک) پر پندرہ سو (۱۵۰۰) مسافروں کی گنجائش ہے۔ اس جہاز کی تیاری کے بعد مغل لائن جو حاجیوں کے لئے جہاز چلاتی ہے اس کے پاس اب ۶ جہاز ہو گئے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جمعہ کے مبارک روز سے اس نئے جہاز نے ۱۶۰۰ عازمین حج کے ساتھ اپنے پہلے سفر کا آغاز کیا۔ روانگی کے وقت حج کمیٹی کے افسران کے علاوہ شری علی یاور جنگ گورنر آف مہاراشٹر و عالی جناب ڈاکٹر سیدنا برہان الدین بھی موجود تھے۔ آپ نے جہاز کا معائنہ بھی فرمایا۔

مسلم امبولنس کا صحت افزا اقدام

مسلم امبولنس سوسائٹی عوام کی جو خدمت کر رہی ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ حال ہی میں سوسائٹی عوام کی جو خدمت کر رہی ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ حال ہی میں سوسائٹی نے بھارتی آروگیہ نیدھی کے اشتراک و تعاون سے چھاتی کے ایکسرے کا مفت انتظام شروع کیا ہے۔ آٹھ آنے کے معمولی صرفہ سے نام رجسٹر کرنے والوں کا بہت ہی قلیل مدت میں ایکسرے لیا جاتا ہے۔ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۷۲ء سے امبولنس کے دفتر واقع ۱۵۲ کامبیکر اسٹریٹ بمبئی ۳ میں اس سلسلہ کا آغاز ہوا۔

مسلم امبولنس سوسائٹی نے پچھلے سال سے چیچک، بی سی جی، پولیو اور ٹرپل ویکسین ٹیکہ لگانے کا بھی انتظام کیا ہے جو ہر جمعرات اور سنیچر کے روز شام کے چار بجے سے پانچ بجے کے دوران جاری رہتا ہے۔

حالیہ ایکسرے کا انتظام مسلم امبولنس سوسائٹی کی بہت ہی نیک اور مفید خدمت ہے اور حلقہ کے غریب عوام کو اس سے یقیناً سہولت ہوگی۔

مچھلی مار سوسائٹی پڑوین کی علم دوستی

پڑوین مچھلی مار سوسائٹی نے پڑوین اردو مدرسہ کے نرسری کلاس کے بچوں کے لئے ۲۲۰ روپیوں کا عطیہ کھلونے اور دیگر تعلیمی وسائل کی خریداری کے لئے دیا تھا۔ اس رقم سے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ضروری تعلیمی سامان مدرسہ کے لئے خریدا گیا ہے۔ تعلیمی تبلیغ کے لئے سوسائٹی نے جو نیک اقدام کیا ہے اس کے لئے ٹیچر اسٹاف و اسکول کمیٹیاں شکر گذار ہیں اور آئندہ بھی سوسائٹی سے کارِ خیر کی امید رکھتے ہیں۔

نامہ نگار سکریٹری ینگ مسلم لائبریری

علم دوستی

کونڈیولی تعلقہ کھیڑ کے اردو اسکول کے لئے گاؤں کے علم دوست حضرات نے ایک گھڑی، بڑا سا آئینہ، قومی لیڈروں کی تصویریں اور تعلیمی چارٹ کل ۵۲۵ روپیہ کا قیمتی سامان دے کر تعلیمی وسائل پورے کئے ہیں۔ اسکول کے صدر مدرس غزالی اس بارے میں ان کے مشکور ہیں۔

جیل کی سلاخیں
تعلیم کیلئے رکاوٹ نہیں بن سکتیں

سال ۱۹۶۸ء کے دوران مختلف امتحانات میں ۳۲۶۳ قیدیوں نے شرکت کی تھی جن میں ۲۰۶۸ قیدی کامیاب ہوئے۔ ۱۲ ایس ایس سی امتحان میں بیٹھے تھے جن میں سے تین کامیاب ہوئے۔ غیر تعلیم یافتہ قیدی جو کہ مہاراشٹر کی جیلوں میں لمبی مدت کی سزا کے طور پر ہیں ان کو ایلیمنٹری تعلیم دی جاتی ہے اور جیل کے عہدیدار دیکھتے ہیں کہ جب وہ قیدی آزاد ہوں تو کچھ نہ کچھ تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ جیلوں میں تعلیمی پروگرام میں توسیع کے لئے تنخواہ شدہ مدرسین تعلیم یافتہ قیدیوں کے ذریعہ خواندگی درجے قائم کئے جاتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کے لئے قیدیوں کو تعلیمی ترقی دیکھ کر ان کی سزاؤں میں کمی بھی کی جاتی ہے۔ جو قیدی ایس ایس امتحان یا کالج کے امتحانوں میں شریک ہونے کے خواہشمند ہوتے ہیں ان کو ضروری سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں اور ان امتحانوں میں شرکت کے لئے پیرول پر بھی رہا کیا جاتا ہے۔

آدم شر گاڈنکر بری

بمبئی ہائیکورٹ نے آدم شری گاڈنکر اور عبدالعزیز کو اپنے آپ کو کسٹم افسران ظاہر کرنے اور ایک کار سے دو ہزار روپئے کی چوری کے الزام سے بری کر دیا ہے اور ایڈیشنل چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے مذکورہ دونوں افراد کو جو سزائے قید با مشقت دی تھی اسے مسترد کر دیا ہے۔

۱۶ میونسپل ٹیچرز کو ایوارڈ
اُردو کے تین ٹیچرز بھی شامل

۲۱ جنوری کو بمبئی کے میئر ڈاکٹر ہیم چندر گپتے نے ۱۶ میونسپل ٹیچروں کو اعزاز دیا جس میں ۵۰۰ روپئے کا انعام بھی شامل ہے۔ ایجوکیشن کمیٹی کی چیرمین شریمتی اندومتی پاٹل نے تقریب کی صدارت کی۔ میونسپل حکام نے ٹیچروں کی فلاح و بہبود اور تعلیمی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے سرگرم کوشش کی ہے — ۱۶ ٹیچروں میں مراٹھی کے سات، گجراتی کے ۲، اردو کے تین، ہندی کے دو، ملایالم کا ایک اور انگریزی کا ایک ٹیچرز ہیں۔ اردو ٹیچروں کے نام یہ ہیں: (۱) قاضی محمد جعفر صدر مدرس محمد عمر رجب روڈ اردو اسکول۔ (۲) اسمٰعیل عمر دھنشے صدر مدرس آر سی ماہم اردو ویکیشنل اسکول۔ (۳) شریمتی عارفہ صدر ہیڈ مسٹریس ایم باڑہ سیکنڈری اسکول۔

پمپوٹکر دہلی کے نئے گورنر

۱۹ جنوری کو وزارت داخلہ کے خصوصی سکریٹری شری ایم جی پمپوٹکر نے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا — ۵۳ سالہ شری پمپوٹکر مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں اور بمبئی میونسپل کارپوریشن کے کمشنر رہ چکے ہیں۔ انھیں دہلی کے لیفٹننٹ گورنر اے این جھا کی موت کی وجہ سے گورنر مقرر کیا گیا ہے۔

کامیابی

★ امسال مستری ہائی اسکول رتناگیری سے انٹرمیجیٹ ڈرائنگ کے امتحان میں دس طلبہ شریک ہوئے اور تمام کامیاب ہوئے۔ ایلیمنٹری (ڈرائنگ) امتحان میں ۱۳ شریک ہوئے تھے جن میں سے ۱۲ نے کامیابی حاصل کی (نتیجہ ۹۲ فیصد رہا) — جناب اے اے فنصویکر ڈرائنگ ٹیچر نے بچوں کی رہنمائی کی تھی۔

★ جناب ایم ڈی پرکار (متوطن ہانکوٹ) کے فرزند برہان نے B.S.C. امتحان (بمبئی یونیورسٹی) میں کامیابی حاصل کی۔

بقیہ: مشرقی پاکستان

وہ بھی نوزائیدہ حکومت کے استحکام، امن، ترقی اور منصوبے اور
نظامی امور کی ترتیب کے لئے بنگلہ دیش حکومت ہندوستان کے
ہر قسم کے تعاون اور اعانت کی کچھ عرصہ تک منت پذیر رہے گی۔ جناب
بھٹو صاحب نے اس امر کا بارہا دعویٰ کیا ہے کہ وہ پاکستان کی از سر نو
تعمیر کریں گے اور اس کو ایک مستحکم، طاقتور اور آزاد جمہوری حکومت میں
تبدیل کریں گے۔ الحمد للہ۔ اگر یہ درست ہے تو اس کی تکمیل کے لئے
ضروری ہے کہ وقت کے تقاضے کو حقیقت بینی سے جان کر اول فرصت
میں ہندوستان سے دوستی کا رابطہ پیدا کیا جائے۔ کشمیر کا مسئلہ جو ایک
چوتھائی صدی سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مخاصمت کی
بنیاد بنا ہے اور جو خود حل ہونے کی اب اپنے اندر صلاحیت نہیں رکھتا اس کو
بالائے طاق رکھا جائے تاکہ باہمی سود مند مفاہمت کے لئے خوشگوار
فضا پیدا ہو اور دوستی اور آشتی کے ماحول میں مصالحانہ گفتگو سے
مسئلوں کے اور خاص کر حالیہ جنگ سے پیدا ہونے والے تنازعات اطمینان
بخش طریقے سے طے ہو کر ہندوستان اور پاکستان دوست ہمسایہ بن کر
رہیں اور دونوں مملکتوں کو اپنی فلاح اور ترقی کے منصوبوں کی تکمیل کیلئے
امن فرصت نصیب ہو۔ اس وقت زمانے کی پکار یہی ہے اور اس پر
کان دھرنا بہت ضروری ہے۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

ایس کے میڈیکل سینٹر کا افتتاح

مورخہ ۹ جنوری ۱۹۷۲ء کو مدنپورہ علاقہ میں دواؤں کی
ایک نئی دوکان کا افتتاح کوکن کے پرانے سیاسی و سماجی کارکن
جناب حسین خان دلوائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ خرابیٔ صحت کے دور از دن
ترقی میں علاج معالجہ اور دواؤں کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔
ایسی حالت میں مدنپورہ جیسے مزدور طبقہ کے علاقہ میں اچھی اور
کفایت دام پر ملنے والی دواؤں کی نئی دوکان تجارت میں انسانی
خدمت بھی ہے۔ مزید خوشی اس بات کی ہے کہ یہ دوکان شب و روز
(چوبیس گھنٹے) کھلی رہے گی۔

الوداعی جلسہ

اردو اسکول لاٹون (تعلقہ منڈنگڑھ) کے صدر مدرس
جناب ابراہیم زین الدین موڈک ۵۸ سال عمر میں مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء
کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے جس کی وجہ سے لاٹون پنج گروشی
کے اساتذہ حال و ماضی کے تمام طلبہ اور عوام کی جانب سے ایک
الوداعی جلسہ محترم سبھاپتی پنچایت سمیتی منڈنگڑھ کی زیر صدارت
مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو موضع لاٹون میں منعقد کیا گیا۔ جناب آر
بی دیسلے کے بعد جناب قاسم ساونت۔ بی۔ این چافیکر۔ ایچ۔ ایم
مالگنڈکر۔ اے۔ کے دیسلے۔ ترشی پاٹل گروجی۔ جناب اظہار الحسن۔
یو۔ ایم چوگلے اور حلقہ کے ہر دلعزیز سماجی رکن جناب دائم خان شیخ
کی تقریریں ہوئیں۔ جناب اسمٰعیل اوپادے نے الوداعی سلام پیش کی۔
خطبۂ صدارت کے بعد موڈک صاحب کو عقیدت مندانہ پھولوں کا
ہار اور ۷۰ روپے کی انعامی تھیلی پیش کی گئی۔

موڈک صاحب نے اپنی تقریر میں بانیان جلسہ کا شکریہ
ادا کرتے ہوئے اردو اسکول لاٹون کے لئے الیکٹرک میٹر کی تنصیب
پر آنے والا خرچ ۹۰ روپے اپنی طرف سے ادا کئے اور اس طرح ایک
روشن یادگار چھوڑی ہے۔

فیض احمد فیض روس میں پاکستان کے سفیر ہوں گے

پاکستان کے لینن انعام یافتہ شاعر فیض احمد فیض کو روس
کا سفیر مقرر کیا جارہا ہے۔ اس بات کا انکشاف قاہرہ میں افریشیائی
کانفرنس میں پاکستانی وفد کے ایک رکن نے کیا۔

★

جنوبی رتناگیری اور گوآ کی انجمنوں کا فیڈریشن

جنوبی رتناگیری اور گوآ کے باشندوں کی مختلف انجمنوں کا "دی فیڈریشن آف دی ساؤتھ رتناگیری اینڈ گوآ ایسوسی ایشنس" کے نام سے ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو اتحاد عمل میں آیا۔ اور اس طرح اہالیان جنوبی رتناگیری اور گوآ کی دیرینہ خواہش اور ایک نہایت اہم ضرورت پوری ہوئی ـــ جناب پروفیسر اے اے قاضی ایم اے۔ ایل ایل بی۔ جے پی اور جناب سلطان پٹیل صاحبان کی مسلسل جد و جہد اور عزم صمیم کی بدولت مذکورہ بالا علاقوں کی مختلف جماعتیں اور انجمنیں ایک روشن مستقبل اور نئی نسل کی فلاح و بہبودی کے لئے فیڈریشن کے تحت متحد ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔

ہر انجمن کے چار چار نمائندوں پر مشتمل جنرل باڈی کی مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کے اجلاس میں اس فیڈریشن کے لئے ۲۳ ممبروں کی کونسل کا انتخاب عمل میں آیا، اور ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مندرجہ ذیل عہدیداران کا انتخاب کرتے ہوئے فیڈریشن نے اپنے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔

عہدیداران

پریسیڈنٹ: جناب نور محمد یوسف خان مالک سوویلٹ پرنٹنگ پریس
چیرمین: پروفیسر اے اے قاضی ایم اے۔ ایل ایل بی۔ جے پی۔
وائس چیرمین: شبیر خان۔
آنریری جنرل سکریٹری: سلطان شاہ پٹیل۔
جوائنٹ سکریٹریز (۱): شیخ عبدالغنی حمزہ۔
(۲): شیخ عبدالرحمٰن عبدالغفور۔
خازن: حسن شاہ یوسف شاہ پٹیل۔
جنرل آڈیٹر: عبدالرحیم کے آغا
نیز دیگر ۱۵ ممبران

اس فیڈریشن کے اغراض و مقاصد کی کاپیاں مختلف انجمنوں تک پہنچا دی گئی ہیں۔ ان میں مذکورہ علاقوں کے عوام کی تعلیمی، سماجی اور فلاح و بہبود کی ضروریات کی تکمیل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا فیڈریشن سے متعلق تمام انجمنوں کے اراکین سے درخواست ہے کہ وہ فیڈریشن کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر اس سے بھرپور تعاون کریں۔ فیڈریشن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مالی امداد کی ضرورت اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو ایک شاندار قوالی کا پروگرام منعقد کیا جائے۔ اس کی ابتدائی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ ہر کس و ناکس اس پروگرام کی کامیابی کے لئے اپنی خدمات پیش کرے گا۔ نیز اپنے دوست احباب کے تعاون سے بھی نوازے گا۔

فیڈریشن مذکورہ کی جانب سے ۲۷ جنوری ۱۹۷۲ء کو عید ملن کی تقریب پٹیل مسافر خانہ پیرخان اسٹریٹ بمبئی ۸ میں منعقد کی گئی جس میں تمام انجمنوں اور جماعتوں نے شرکت کی عام درخواست کی تھی ـــ نامہ نگار: شیخ عبدالغنی حمزہ
(جوائنٹ سکریٹری)

تصحیح:-

پچھلے شمارہ میں کامیاب طلبہ کی فہرست میں B.S.c. کے کامیاب امیدواروں میں ایک نام سہواً ریاض فقیر محمد سنگرار چھپا ہے۔ اصل میں وہ ایاز فقیر محمد سنگرار ہونا چاہئے۔ ریاض صاحب تو ایل ایل بی کر رہے ہیں اور ریزرو بنک آف انڈیا میں برسر روزگار ہیں۔ ایاز فقیر محمد سنگرار نے اس سال بی ایس سی (B.S.c.) میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اسی طرح شرف کمالی صاحب کے مضمون "ڈرامہ ہو ـــ" شمارہ جنوری ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۵ پر ترتیب متن کی بجائے تمن ترتیب لکھا گیا ہے ـــ قارئین نوٹ فرمالیں۔

پٹرولیم

ہمارے ملک میں پٹرولیم کی کھپت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ آئندہ دس برسوں میں پٹرولیم کی کھپت اس وقت کے مقابلے میں دوگنی ہو جائے گی۔ اس وقت ملک میں ہر سال تقریباً ۲ کروڑ ٹن پٹرولیم صرف ہوتا ہے۔ البتہ اندرونِ ملک جو تیل ملتا ہے وہ ملک میں پٹرولیم کی ضروریات کا صرف ایک تہائی حصہ پورا کرتا ہے بقیہ دو تہائی حصہ تیل غیر ملکوں سے آتا ہے، یعنی خلیج فارس اور خلیج عرب کے ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔

بھارت میں
بجلی کے بھاری ساز و سامان کی تیاری

گذشتہ دس برسوں میں بھارت میں بجلی کی تیاری کے لئے درکار بھاری ساز و سامان کی صنعت نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ یہ صنعت اگرچہ ملک میں مقابلتہً نوزائیدہ ہے اور اس وجہ سے اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پھر بھی ملک میں بجلی کی تیاری سے متعلق مختلف النوع سامان کے ڈیزائن اور اسے تیار کرنے کے لئے درکار ٹیکنالوجی وغیرہ کے ضمن میں بھارت نے خود اکتفائی حاصل کی ہے۔

دابھول ایجوکیشن سوسائٹی کا قیام

طالبانِ علم و ادب کے لئے یہ بات باعثِ مسرت ہوگی کہ ۲۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو باشندگانِ دابھول (مقیمانِ بمبئی) کا ایک جلسۂ عام ہوا جس میں عالیجناب عثمان عبداللہ پنچی بی اے ایل ایل بی کی صدارت میں دابھول ایجوکیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جلسہ میں دابھول اور اس کے قرب و جوار کے ثانوی تعلیم کے خواہشمند طلبہ کے لئے ایک ہائی اسکول کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ سوسائٹی انجمن خدام الاسلام کی سرپرستی میں اگلے تعلیمی سال سے ہائی اسکول

جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

کوکن اور انتخابات

مارچ ۷۲ء میں اسمبلی کے ہونے والے انتخابات کیلئے ہر سطح پر زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ کوکن میں ضلع قلابہ سات انتخابی حلقوں میں تقسیم ہے اور یہاں رائے دہندگان کی تعداد ۶۳۱۲۷۲ ہے جس میں ۲۹۸۵۵۸ مرد اور ۳۳۲۷۱۴ عورتیں ہیں۔ پورے ضلع میں ۹۳۲ انتخابی مراکز ہوں گے۔

رتناگیری ضلع ۱۳ انتخابی حلقوں میں بٹا ہوا ہے اور وہاں ۱۰۰۵۸۴۶ رائے دہندگان ہیں جن میں ۶۱۷۰۰۴ عورتیں اور ۳۸۸۸۴۲ مرد ہیں۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے دوگنی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مرد تلاشِ معاش میں ضلع سے باہر رہتے ہیں۔

مسجد نور باغ کی تعمیر

مسجد نور باغ ڈاکٹر مہیشوری روڈ بمبئی ۹ ایک زمانے سے خراب و خستہ حالت میں چلی آرہی تھی۔ مگر وہاں کے ذمہ دار حضرات، متولی، مصلی اور اہلِ خیر اس کی طرف سے غافل نہیں تھے بلکہ برابر کام کر رہے تھے۔ اور ۸ جنوری کو اس سلسلہ میں ایک عام جلسۂ عام مسجد کے اندر کیا گیا جس میں فوری طور سے حاضرین نے گیارہ ہزار روپیہ چندہ دیا۔ اس طرح مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں کل ۳۵ ہزار کی رقم جمع ہے۔ ایک عام اندازہ کے مطابق کم از کم ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ مسلمانوں سے گذارش ہے کہ وہ اس مسجد کی تعمیر کی طرف خصوصی توجہ کریں اور اپنے پاک مال اور حلال طیب روزی سے اس کی تعمیر میں حصہ لیں۔ انشاءاللہ یکم فروری سے کام شروع ہوگا، اس وقت قدم قدم پر روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کے خدام اور متوسلین آپ کے یہاں پہنچیں گے اور آپ ان کے ذریعہ اس کی امداد کریں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

مہاراشٹر اسمبلی کے حالیہ امیدوار

جناب رضوان حارث بی اے (آنرز)

بعض شخصیتیں مقناطیسی کشش رکھتی ہیں اور پہلی ملنے والے کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ رضوان صاحب کی ذات گرامی بھی انہیں میں سے ہے۔

رضوان صاحب تھانہ ضلع کے تاریخی مقام سوپارہ کے رہنے والے ہیں ـــ اور بے لوث عوامی خدمات کی وجہ سے پورے ضلع میں معروف و مقبول ہیں۔ ضلع پریشد تھانہ کے نائب صدر، تھانہ ایس ٹی بورڈ کے ممبر اور امن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے آپنے گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں۔ گاندھی جی کے آدرشوں پر چل کر آپنے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا غریبوں اور پس ماندہ اقوام کے لئے آپکے دل میں گہرا درد ہے اور بلا تفریق مذہب و ملت سب کے دکھ درد میں کام آنا آپ کا شیوہ ہے اونچ نیچ کی تمیز یا وقت بے وقت کی سبب پر آپنے کبھی کسی سے ملنے سے گریز نہیں کیا۔ اور اسی لئے آپ کو ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ مہاراشٹرا اسمبلی کے آنیوالے انتخابات میں کانگریس نے آپ کو اپنا نمائندہ چن کر رہبر ملک و قوم کو خدمت کا بہتر موقع دیا ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر عبدالحمید ملاّ

بابو راؤ بیلوسے

دابولی منڈنگڑھ حلقہ کے سرگرم اور بے لوث خدمتگار شری راجندر دتّاراؤ بیلوسے بابوراؤ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں پالگڑھ ضلع رتناگیری میں آپ کا جنم ہوا۔ ابتدائی تعلیم سانے گروجی کے بھائی دادا سانے کے زیر تربیت ہوئی اور ثانوی مدارج دابولی اور بمبئی میں طے کر کے پونہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اُسی کے زمانۂ طالب علمی میں آنجہانی سانے گروجی کی تعلیمات کا آپ پر

[illegible]

اپنے آبائی پیشہ میں اپنے والد کا بھی ہاتھ بٹایا۔ مگر صرف دولت سمیٹنے میں دل نہیں لگا لہٰذا سماجی و سیاسی کاموں کی طرف دوبارہ مائل ہوئے ۱۹۵۲ء میں ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ کا جب انتخاب ہوا تو آپ بھاری ووٹوں سے چن کر آئے اور ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۵ء تک تعلقہ لوکل بورڈ کے چیرمین کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ انہی عملی خدمات کا ثمر ہے کہ آپ کا قانون ساز اسمبلی میں داخلہ ہوا۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء ان دو ٹرم میں آپنے کوکن کے اس پس ماندہ علاقہ کے لئے بہت ہی انقلابی کام انجام دیا ہے۔ جہاں جانوروں کا گذر مشکل تھا ایسے جنگل میں منگل ہو گیا ہے۔ سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔ دواخانے کھل گئے ہیں۔ مدرسے قائم ہوئے۔ S.T. کی مسافر بردار گاڑیاں دوڑنے لگیں۔ ماہی گیری کو فروغ ملا، اور قطرہ قطرہ کو ترسنے والوں کے لئے پانی کی اسکیم عمل میں آئی ـــ ہنوز یہ علاقہ آپ جیسے فعال، نیک نفس اور دھن کے پکے رہنما کا محتاج کرم ہے ـــ آنے والے الکشن میں کانگریس نے آپ کو نمائندگی کا حق دے کر نہ صرف ایک بے لوث خدمت گار کو موقع دیا ہے بلکہ ان دو حلقوں کے باشندگان پر احسان کیا ہے۔

یہ شیر دل اور شیر جسم لیڈر نہ صرف مہاراشٹرا اسمبلی میں شیر کی طرح دھاڑتا ہے بلکہ پورے علاقہ میں "شیر انقلاب" کے لقب سے معروف ہے۔

مرسلہ: فی بن صاد

عمر عزیز قاضی

ناگپاڑہ حلقہ انتخاب سے کانگریس کے نمائندہ جناب عمر قاضی پیشہ کے اعتبار سے وکیل اور سیاسی و سماجی میدان کے جواں عزم و جواں سال کارکن ہیں۔ جذبۂ خدمت بے لوث ہے مگر خاموشی کے ساتھ کام کرنا ان کی عادت رہی اس لئے اپنے حلقے میں شہرت عام حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ "مشک آنست کہ خود ببوید

[illegible]

اس حلقہ کی فلاح وبہبود اور تحفظ وسالمیت کے لئے وہ بہتر کام کر دکھائیں گے۔ ایسی امید ہے۔

عمر قاضی صاحب ضلع رتناگیری کے رہنے والے ہیں۔ سینٹ زیویئرس کالج بمبئی سے بی اے (آنرز) اور گورنمنٹ لا کالج سے ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد آپ نے بمبئی ہائیکورٹ سے وکالت شروع کی۔ مگر عوامی خدمات سے ناطہ نہیں توڑا۔ بلکہ اور مضبوط کیا۔ یوں تو زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ سرگرم عمل رہے ہیں۔ زیویئرس کالج کی اردو لٹریری سوسائٹی اور کالج کے جنرل سکریٹری اور سوشیو اکنامک اکیڈمی کے ایکزیکیٹو کمیٹی کے ممبر رہے۔ لا کالج میں آپ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے سکریٹری اور کالج کونسل کے خازن تھے۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد راجہ پور تعلقہ ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری، انسٹیوٹ بیلیس (جہاں آپ قیام پذیر ہیں) کو آپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی کے چیرمین، سٹیزنز ڈیفنس کمیٹی ناگپاڑہ حلقۂ انتخاب کے جنرل سکریٹری، ای وارڈ بھارت یوک سماج کے چیرمین اور فورم فار ڈاٹنامک سیکولرزم کے سکریٹری کی حیثیت سے جداگانہ تنظیموں میں مختلف النوع مگر عوامی بہبودی کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کی رکنیت، ای وارڈ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کی ایکزیکیٹو باڈی کی رکنیت، ناگپاڑہ بلاک کانگریس کمیٹی کی سکریٹری شپ آپ کی عملی خدمات ہیں۔ کانگریس میں حالیہ انقلابی روح پھر جانے کے بعد جو نئی تنظیم عمل میں آئی ہے عمر قاضی اس میں بہت فعال نظر آتے ہیں اور اسی لئے بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کی نئی ایکزیکیٹو کمیٹی میں آپ کو رکنیت کا حق ملا۔

ایک خاموش مگر تیز کام، بے لوث اور قدردانی کا مقام خدمتگار کی قدر کر کے کانگریس نے سر بام لا یا ہے۔ عوام کا فرض ہے کہ وہ ان کے نیک کام کے لئے مدد کریں۔

★

بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے

کوکن کے جواں عزم وجواں سال رہنما بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے سنہ ۱۹۲۹ء میں انبیت ضلع قلابہ میں پیدا ہوئے۔ کالج کے زمانۂ طالب علمی ہی میں آپ نے گاؤں کے سماجی اور تعمیری کاموں میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ کالج میں بھی آپ مقبول و معروف تھے۔ بیرسٹری کی تعلیم کے لئے جب آپ انگلینڈ میں تھے آپ نے وہاں سے ہی متعلقہ حکام (جن میں شری جگ جیون رام جو اس وقت وزیر مواصلات تھے) سے خط وکتابت کر کے اپنے گاؤں میں تار آفس قائم کرنے پر زور دیا اور نتیجہ میں انگلینڈ سے واپسی سے پہلے ہی تار آفس قائم ہو گیا تھا۔ واپسی کے بعد آپ نے پریکٹس شروع کی اور بہت ہی جلد اپنا مقام حاصل کیا۔ مگر سیاست سے گہری دلچسپی نے آپ کو اس میدان میں لا کھڑا کیا۔ سنہ ۱۹۵۷ء سے آپ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن ہیں۔ ہندو مسلم دونوں سماج میں یکساں مقبولیت بلکہ ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ انگریزی، اردو، مراٹھی تینوں زبانوں پر ملکہ حاصل ہے۔ پرجوش مقرر اور خوش فکر صاحب قلم ہیں۔ مہاجن کمیشن پر آپ کی لکھی ہوئی کتاب نے ملک کے کونے کونے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ کوکن کی بندرگاہوں کی تعمیر وتوسیع کیلئے جو کمیشن مقرر ہوا اس کے سربراہ تھے۔ آج کل مہاراشٹر کے وزیر مملکت (برائے تعلیم، مقننہ، ماہی گیری وذیلی بندرگاہ) ہیں اور حالیہ انتخابات میں شری وردھن حلقہ سے امیدوار ہیں۔

سعید دادر صاحب کا دورہ

دی مغل لائن لمیٹیڈ کے ڈپٹی منیجر جناب محمد سعید دادر کر جب سے اس کمپنی میں آئے ہیں حاجیوں کی خدمت اور انتظامی امور میں بہتری کیلئے بہت زیادہ سرگرم عمل ہیں۔ مورخہ ۳۰ جنوری سنہ ۷۲ء کو آپ بذریعہ طیارہ کویت روانہ ہوئے جہاں سے جدہ جانے کا پروگرام ہے۔ ممکن ہے آپ بیروت اور سنگاپور تک چلے جائیں۔ دادر صاحب کا یہ دورہ ان علاقوں میں کمپنی کی کارگذاری کو فروغ دینے کی مخلصانہ کوشش کے سلسلے میں ہوگا۔

ھدیۂ تہنیت

- حکومت مہاراشٹر کے انڈر سکریٹری اور اردو کے صاحبِ دیوان شاعر جناب آئی ایس قادری (مہر جہسلانی) کی دو صاحبزادیوں نیسلم اور نصرت کی شادی خانہ آبادی فضل عبدالحمید ماسٹر اور ضیغم صدیقی کے ساتھ علی الترتیب ۲۴ دسمبر ۶۱ء کی شام صابو صدیق گراؤنڈ پر انجام پذیر ہوئی۔
- جناب عبدالعزیز سیکاسن (متوطن سیطوڑہ) کا عقد ڈاکٹر ایچ اے اوبارے کی دختر رضیہ کے ساتھ ۹ جنوری ۶۲ء کو صابو صدیق گراؤنڈ بمبئی ۸ میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آیا۔
- کوکن کے مشہور وکیل جناب روشن خان کے فرزند ڈاکٹر ابراہیم خان M.B.B.S. کی شادی ۹ جنوری ۶۲ء کو انجام پائی۔ داپولی میں ان کے مکان خان منزل کے سامنے بنائے گئے عالیشان شامیانے میں رسمِ نکاح ادا کی گئی۔ حضرت سید حسام الدین قادری نے نکاح پڑھایا۔ اس تقریبِ سعید کیلئے شہر بمبئی اور اضلاع کوکن کے دور دراز مقامات سے آکر لوگوں نے شرکت کی۔
- کیپٹن حسین کاپڑی کی بہن ڈاکٹر نور جہاں کاپڑی اور جناب حسین عبدالغفور پابیکر کے فرزند ڈاکٹر نورالدین پابیکر ۲۶ جنوری کو رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے اور اس طرح دونوں ایک جان ہوگئے۔ حال ہی میں ڈاکٹر پابیکر نے کھیڈ میں اپنا دواخانہ قائم کیا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نہ صرف ان کی رفیقۂ حیات بن گئی ہیں بلکہ رفیقۂ کار بھی ثابت ہونگی۔ کوکن کے مسلمانوں میں یہ پہلا اتفاق ہے۔
- کوکن کے سیاسی و سماجی لیڈر جناب حسین خان دلوائی ایم ایل اے کی صاحبزادی ریحانہ کی شادی احمد ابن المرحوم شایا خان دلوائی کے ساتھ ۷ جنوری ۶۲ء کو ان کے وطن اکمارڈ (چپلون) ضلع رتناگری میں انجام پائی۔
- نقش کوکن کے دیرینہ ہمدرد اور بمبئی کے سیلس ٹیکس افسر جناب دریا خان دلوائی کے فرزند قاسم خان کی شادی ریحانہ بنت المرحوم الحاج ابراہیم خان دلوائی کے ساتھ ۲۶ دسمبر ۶۱ء کو ان کے وطن مرزول تعلقہ چپلون میں انجام پائی۔
- جناب سید اشفاق حسین صاحب (ایکسپریس بلاک کمپنی بمبئی) کے صاحبزادے حاجی سید آصف حسین کی شادی خانہ آبادی محترم عالیجناب سید مبشر حسین صاحب کی صاحبزادی سے جمعرات ۲۱ ذی قعدہ مطابق ۳۰ دسمبر کو مقام کھنڈوہ میں نہایت خیر و خوبی کے ساتھ ہوئی۔
- جناب داؤد اسمٰعیل بورکر کے فرزند اقبال بی کام کی شادی جناب ابراہیم اسمٰعیل رکھانگی کی دختر عزیزہ بی کے ساتھ ۲ جنوری ۶۲ء کو المالطیفی ہال بمبئی میں انجام پائی۔

ادارۂ نقش کوکن ان دولہا دولہن اور ان کے اہل خاندان کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں تمام تر خوشیاں انھیں نصیب ہوں —

انتقال پُر ملال

▲ ممبکہ تعلقہ کھیڈ ضلع رتنا گیری میں ایک ہی نام کی دو معزز ہستیاں (۱) داؤد شمس الدین بیگ اور داؤد احمد ٹانکے ۳۰ دسمبر ۷۱ء کو ایک ہی روز راہیٔ عدم ہوئیں۔ مرحوم داؤ بیگ ٹاٹا اسپتال میں زیر علاج تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا جب کہ داؤد ٹانکے صاحب کا حرکتِ قلب بند ہونے سے گھر ہی پر انتقال ہوا۔ دونوں میت بمبئی سے وطن لے جاکر سپرد خاک کی گئی۔

▲ کارساز فلمز کے مالک مراٹھی فلموں کے مشہور پروڈیوسر ڈسٹری بیوٹر (فلم ایکٹی اور دھاکٹی بہن کے انوام یافتہ) جناب غلام حسین چوگلے کی والدہ فاطمہ بی بی کا بروز پیر ۱۷ جنوری کو نیشنل ہسپتال (ماہم) میں انتقال ہوگیا۔

▲ اردو کے مشہور ادیب ناول نگار عادل رشید ۳ جنوری کی صبح حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ موصوف کچھ دنوں سے علیل تھے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

سو باتوں کی ایک بات

دنیا میں ایک فرقہ کی آواز اسی وقت موثر ہوسکتی ہے جب کہ اس میں یہ چیزیں پائی جائیں:

۱۔ اعلیٰ تعلیم، ۲۔ صنعت و حرفت اور اس کے ذریعہ مرفہ حالی، ۳۔ اعلیٰ اور روشن سیاسی فکر، ۴۔ اعلیٰ اخلاق اور سماجی کردار

اور مسلمان بدقسمتی سے ان چاروں چیزوں میں پس ماندہ ہیں۔ اس بناء پر مسلمانوں کی شکایات اس وقت تک ہرگز دور نہ ہوں گی جب تک ان کی پس ماندگی کا تدارک نہ ہوگا۔

(مولانا) سعید احمد اکبر آبادی
برہان اکتوبر ۷۱ء

عبد الرزاق سعید

رثاء الاخ العزیز عبد الحمید

ابن محمد حاجی آدم

عبد الحمید ہم سے یکایک جدا ہوئے
کیا مختصر سی زندگی مستعار تھی

پورے ہوئے نہ عمر کے چالیس سال بھی
باقی ہنوز باغ میں اس کے بہار تھی

خوددار بذلہ سنج مرنجاں مرنج تھا
احساں کسی کا اُس کو اٹھانے سے عار تھی

دن رات اسے فروغِ تجارت سے کام تھا
محنت مشقت اسکی پئے کاروبار تھی

خدمت بھی والدہ کی تھی مدِ نظر اُسے
دلجوئی اہلِ خانہ کی لیل و نہار تھی

تیرہ سو بیانوے ہجرت کا سن ہوا
شوال کی چھبیسویں گھر بھر پہ بار تھی

تھا علم بھی بقدر ضرورت اسے سعید
اک پرسکون زندگی وضعدار تھی

... PRESS, Bombay-3, and Published from 44, Jail Road (East), Bombay-9. by Dr. A. M. NAIK ... Publication Trust, Bombay-9. Title Cover Printed at AMIN ART PRINTING PRESS, Bombay-...

نقش کوکن
موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا

عارف صدیقی
تفصیل صفحہ نمبر ۱۹۰ پر ملاحظہ فرمائیے

خاندان کے ہر فرد کا رسالہ

ماہنامہ نقش کوکن بمبئی

۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹

ٹیلیفون نمبر:- 331572

جلد ۱۱ ★ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۷۲ء

تاریخ اشاعت ۳ مارچ ۷۲ء

طابع و ناشر:- عبدالکریم نائیک

مقام طباعت:- اجمل پریس بمبئی ۳

ملکیت:- نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ

رجسٹریشن نمبر:- E 3006

زیر ادارت

عثمان حسین خان

سالانہ زر مبادلہ ہندوستان میں:- چھ روپے

بیرونی ممالک سے:- ۱۵ شلنگ برٹش پوسٹل آرڈر

اشتہارات، ترسیل زر اور دیگر امور کے بارے میں خط و کتابت

منیجر ماہنامہ نقش کوکن

۴۴ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹ کے پتے پر کیجئے

رکن انڈین لنگویجز نیوز پیپر ایسوسی ایشن

تمام تنازعہ امور بحق سماعت عدالت ہائے بمبئی کو ہوگا۔

قیمت:- ۶۰ پیسے

آئینہ تحریر

اور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی باتیں

دیندارون کا یوم حساب تو ایک ہی مرتبہ ہوگا اور وہ بھی حشر کے میدان میں۔ مگر ہمارے ملک کے نیتاؤں کا یوم حساب ہر پانچ سال کے بعد آہی جاتا ہے ۔ لفظ "ہی" کا استعمال اسی لئے کیا ہے کہ امسال ہند و پاک حالیہ جنگ کی وجہ سے یہ خدشہ تھا کہ شاید پنچسالہ چناؤ ملتوی ہو جائیں، اور ہمارے لیڈروں کا یوم حساب بھی تاخیر سے آئے، مگر بھلا ہو ہماری وزیر اعظم کا کہ وقت کی کسوٹی کو خوب پرکھتی ہیں۔ انھوں نے یوم حساب کو آخر سر پر لا کھڑا کر ہی دیا۔ اب لیڈروں کی نیندیں حرام ہیں کہ ووٹر ان کے گذشتہ اعمال کا مواخذہ نہ کریں اور کہیں ان کی بھی جارج فرنانڈس جیسی گت نہ بنے۔ کیونکہ اب عوام کا سیاسی شعور جاگ چکا ہے۔ وہ دن گئے جب ہمارے لیڈر فاختائیں اڑایا کرتے تھے (محاورے کے خلیل خان سے معذرت کے ساتھ) اور عوام کو بلند بانگ دعوؤں اور سہانے خوابوں کی خاطر کشتی سے بیوقوف بنایا کرتے تھے۔ اور اپنا الّو سیدھا کرنے کے بعد عوام کو پانچ سال تک اپنی شکل بھی دکھانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج جو لیڈر بھی عوام سے زیادہ قریب رہا ہوگا، جو بھی رہنما ان کے دکھ سکھ میں عملی طور پر شرکت کر چکا ہوگا وہی نیتا کامیاب ہوگا۔ ورنہ دوسری صورت میں اس الکشن میں منہ کی کھائے گا۔ کیونکہ یہ یوم حساب ہے ۔ اور آج ہر لیڈر کو ہفتہ عشرہ میں اپنے اپنے گھروں، بنگلوں فلیٹوں سے نکلنا ہوگا اور ہر مزدور، ہر غریب اور ہر شریف، ہر بدمعاش کے در دولت پر جبہ سائی کرنی ہوگی۔ یہاں تک کہ سزا یافتہ مجرموں تک سے ووٹ کے لئے ہاتھ پھیلانے ہوں گے ——— اور اس کے بعد بھی اس کے اعمال یا اس کا مقصد کہ وہ کامیاب ہوتا ہے کہ نہیں۔ عوام اپنی رائے دہندگی سے اسے نوازتے ہیں کہ نہیں ——— ایک سوال ہوگا۔

اور اس کا جواب
اسے یوم حساب کے سورج ڈھلتے ہی ملنا شروع ہو جائے گا۔

(ماخوذ)

ایک اہم اعلان

نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ ایک اہم اقدام کا اعلان کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہے :

ماہنامہ نقش کوکن ــــ سال کے عرصے میں اہالیانِ کوکن کو ایکدوسرے سے قریب لانے کا ذریعہ بن گیا۔ کوکن اور بمبئی میں بسنے والے اہالیان کوکن نقش کوکن کی بدولت ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرسکے اور ان کے آپسی تعلقات کے نئے دور کا ہر سطح پر آغاز ہوا۔ پھر جب ذاتی تعارف قربت کا ذریعہ بنا تو علمی، صنعتی اور سماجی سطح پر بھی کے انجانے" نقش کوکن کی بدولت ہر سطح پر ایک دوسرے سے اشتراک کرنے لگے۔ اور اہالیان کوکن نے اس بات کا اعتراف کیا کہ نقش کوکن کی بدولت ہمیں ایکدوسرے کو جاننے پہچاننے اور ایکدوسرے کے معاملات اور مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ دوری قربت میں بدل گئی اور جو قریب تھے وہ اور زیادہ قریب ہوگئے۔ ہم کو اپنے پڑوسی گاؤں اور علاقے کے حالات اور ماحول سے ناواقفیت سی رہتی تھی لیکن نقش کوکن کی بدولت آج کوکن کے ہر خطے اور علاقے کے بارے میں معلومات ملتی رہتی ہیں۔

اس مرحلے پر

اس بات کی ضرورت کی طرف ہمیں قارئین نے توجہ دلائی کہ اہالیان کوکن کے مشہور تعلیمی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی صنعتی اداروں اور کوکن میں کام کرنے والی مختلف انجمنوں اور ان کے سربراہوں کی ایک ڈائرکٹری شائع کرنے کا اقدام نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ انجام دے ــــ کام بہت عظیم اور اہم ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ سب کا تعاون درکار ہے کہ آپ اپنی انجمن، اپنے ادارے یا اپنی شخصی معلومات ہمیں روانہ کریں۔

یہ معلومات

جتنی مکمل اور جلد ہمیں دستیاب ہوسکی اتنی جلد ہی یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچے گا۔ آپکے فوری تعاون کا مطلب ہمارے مقصد کی فوری تکمیل!

منیجر

شرف کمالی

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

(ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!)

کونسا ندی بھری ہے بھرپور
اکیلی میں کیسی جاؤں
میرے بھیّا نے دئے مجھے دور..... اکیلی میں کیسی جاؤں
میری بھابی کو بھیجو میرے ساتھ..... اکیلی میں کیسی جاؤں

یہ بند آزاد شاعری کے نمونے کے طور پر پیش نہیں کر رہا ہوں۔ کوکن کا ایک گیت ہے جو میں نے بڑی حسین فضا میں سُنا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ میں، میرے ایک محترم دوست جناب اسحٰق ابراہیم پرکار صدر مدرّس پرائمری مدارس ضلع پربھنی رتناگیری کے ساتھ دابھول کھاڑی میں حاجی داؤد ابن ہائی اسکول بالستہ کے امدادی پروگرام "کبھی جو سن" کے ٹکٹ فروخت کرنے کے لئے جا رہا تھا۔ یہ پروگرام جناب ایم۔ اے پرکار (کوکن کلا کیندر) کی طرف سے مذکورہ ادارہ کی امداد کے لئے ہو رہا تھا۔ اکثر خطوں میں دولہا بارات لے کر دلہن کے گھر آتا ہے لیکن ہماری طرف اسکے برعکس دولہا ہے۔ دولہن کی بارات دولھے کے گھر آیا کرتی ہے۔ اسی طرح مضافات سے ایک بارات دابھول کھاڑی کے ایک دیہات میں جا رہی تھی۔ ہمیں بھی شرکت کی دعوت تھی۔ لہٰذا منتظمین سے ہم نے گذارش کی کہ وہ کالستہ میں ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے لیں۔ صبح چار بجے

ایک بڑی کشتی جسے پاموٹ کہتے ہیں بارات لے کر آئی اور ہم سوار ہوئے۔ کچھ دیر تو "خالو" کا باجا ہوتا رہا۔ خالو کو خالہ کا مذکر نہ سمجھئے۔ یہاں جس خالو کا ذکر ہو رہا ہے اُس کا خالہ سے ذرا بھی تعلق نہیں۔ ایک بڑا ڈھول، ایک بہت چھوٹا سا ڈھولک (ڈمکی) اور دو شہنائیاں، چار سازندوں پر مشتمل یہ آرکسٹرا ہے۔ بس اسی کو "خالو کا جوڑ" کہتے ہیں۔ جس تقریب میں یہ "خالو کا جوڑ" ہو پھر اس تقریب کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ دھنیں بھی یہاں کے گیتوں کی یا راتب کے وزنوں کی الاپتے ہیں اور سماں باندھ دیتے ہیں۔ ان سے کچھ وہی حضرات لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو کوکن کے گیتوں سے واقف ہوں۔ مثلاً دلہن کی رخصتی کا ایک گیت اس خطہ میں ہر طرف برسہا برس سے رائج ہے:

بابا دیا جی رضا مجھے جانا ضرور
ساجن کا بنگلہ ہے دُور..... مجھے جانا ضرور
ساجن نے قاصد بھیجا مجھے جانا ضرور.....

ہمارے خطہ میں یہ گیت بڑی ہی پُرسوز لے میں گاتے ہوئے میں نے سُنا ہے اور ہر بار رخصت ہونے والی دلہن کی مجبوری کی داستان سُن کر آنکھیں اشک ریز ہوتی ہیں۔ ایک بار تو میں نے یہ تہیہ کیا تھا

کہ جب بیٹی کو رخصت کرنے کا وقت آئے گا تو میں روؤں گا نہیں۔ لیکن جب "خالو کے جوڑ" نے شہنائی کی لَے میں مذکورہ گیت کی دُھن چھیڑی تو بے ساختہ دل بھر آیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور میں چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ سماں مجھے آج بھی یاد ہے۔ ہاں! تو جس پامبوٹ میں ہم سفر کر رہے تھے اُس میں کچھ دیر اس کوکنی آرکسٹرا سے محظوظ ہوتے رہے، اور یہ دَور ختم ہوا۔ پانچ بج رہے ہوں گے۔ صبح کی خنکی طبیعت کو فرحت بخش رہی تھی۔ داشِشٹی ندی میں جہاں اب کوینا کا دھارا بھی شامل ہو گیا ہے اور پانی میٹھا ہے "میرے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" پامبوٹ اپنی منزل کی طرف رواں تھی،...... دو ملّاح اپنے چپوؤں کی مدد سے کھے رہے تھے۔ فضا پر سکوت تھی۔ پامبوٹ میں کچھ براتی سو رہے تھے، کچھ جاگ رہے تھے۔ جاگنے والے ہولے ہولے باتیں بھی کر رہے تھے کہ دلھن کی سکھیوں نے گیت چھیڑا "کوینا ندی ہے بھرپور"۔

باتیں کرنے والے خاموش ہو گئے تھے۔ رسیلی آواز سے سارا ماحول مترنم ہو گیا تھا۔ اور میں اس لَے میں گویا کھو گیا تھا..... میرے ساتھی پرکار صاحب جو میری افتادِ طبع سے واقف تھے۔ آہستہ سے فرما رہے تھے "شرف صاحب آپ کو کوکن کے گیتوں پر مضمون لکھنے کے لئے مواد مل رہا ہو گا۔" میں ان کی شاعر شناسی پر چونکا۔ واقعی مجھے مواد اُس وقت ملا۔ لیکن اس مواد کو پورے چار سال بعد میں آج بروئے کار لا رہا ہوں۔ پرکار صاحب کو بھی انتظار کرنا پڑا!

کوکن کے گیت واقعی بڑے معنی خیز ہوا کرتے ہیں۔ قصور ہمارا ہے کہ ہم اس کلچرل ورثہ کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے بلکہ بسا اوقات بے معنی فائدہ سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور کسی کو ہو نہ ہو، مجھے ان گیتوں سے دلچسپی ضرور ہے۔ میں نے ایک عرصہ پہلے ماہنامہ "صبحِ امید" میں ایک مضمون "کوکن کے گیت" لکھا بھی تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ صبحِ امید کے مدیر جناب عبدالحمید بوبیرے صاحب نے فرمائش بھی کی تھی کہ میں یہ سلسلہ مکمل کروں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میری اپنی چند مجبوریوں کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اس بسیط عنوان پر اپنے خیالات قلمبند کروں اور ادارہ صبحِ امید کو بھیج دوں کہ اپنا زلفِ یار سے زیادہ دراز زعدہ وفا ہو۔ مجھے کچھ یاد ہے کہ میں نے صبحِ امید کے مضمون میں ایک گیت کا حوالہ دیا تھا اور اس کی تشریح بھی کی تھی۔ اس گیت کا ترجمہ ہے:

"نہ جانے کس پڑوسن کا یہ مرغا ہے بھئی۔ جس نے اس وقت (جب شبِ وصال ہے) بانگ دی ہے۔"

"حسن صاحب (دولہا) جو نمازی ہیں اُن کی نیند میں اس کی بانگ سے خلل پیدا ہو گیا ہے۔ مرغے نے بانگ دی ہے۔"

اب آپ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

دی مؤذن نے اذاں وصل کی شب پچھلے پہر
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

آپ دونوں مضامین میں مماثلت ضرور پائیں گے۔ بلکہ کوکن کے گیت کچھ اور بھی نکات وضاحت طلب ہیں۔ مُرغا ہمارے گھر کا نہیں ہے جس نے یہ گستاخ حرکت کی ہے۔ یہ تو کم بخت کسی پڑوسن نے پال رکھا ہے ـــــ حسن صاحب جو نمازی ہیں پرہیزگار ہیں اور ظاہر ہے بڑی دیر میں صبح ہوتے ہوتے ان کی آنکھ لگی ہے اور اس گستاخ مرغے کی بانگ ان کی میٹھی نیند میں خلل پیدا کر رہی ہے۔

ایک گیت جو مخصوص لَے میں گایا جاتا ہے یوں ہے:

گُل بانگ یو جلوہ گاؤں علیؓ کا یو جلوہ گاؤں علی کا
گُل بانگ یو جلوہ گاؤں علی کا

حضرت کی دختر فاطمہ زہرہؓ ان کی شادی مبارک
یو جلوہ گاؤں علیؓ کا یو جلوہ گاؤں علی کا

جلوہ گانے کا ایک خاص انداز ہے۔ اس کی دُھن بھی واقعی دلپذیر ہے۔ اس میں آگے اور بھی بند ہیں۔ جن میں مختلف خیالات نظم کئے گئے ہیں

اور اس کا لطف جو سننے میں ہے وہ یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس گیت کے ہر بند سے حضرت علی کرم اللہ وجہ' اور حضرت بی بی فاطمہؓ سے عقیدت جھلکتی ہے۔ ممکن ہے گانے والی خواتین کا یہ عقیدہ ہو کہ ان مقدس ناموں کی برکت سے نئے جوڑے کی زندگی بھی سدا بہار بنی رہے۔

علاقۂ کوکن میں یہ گیت کئی برسوں سے رائج ہیں۔ لیکن ان کی طرف کسی نے خیال ہی نہیں کیا۔ البتہ اس ضمن میں محترمہ ڈاکٹر میمونہ دلوی صاحبہ قابلِ مبارکباد ضرور ہیں کہ ان کی طرف توجہ فرمائی۔ کچھ گیتوں کا حوالہ اپنے مقالہ میں دیا ہے اور مزید ان کی کوششیں جاری ہیں۔ مجھے یہ علم ہے وہ ان گیتوں کو جمع کرنے میں بہت محنت سے کام لے رہی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ ہمارے علاقہ کا دورہ بھی کر چکی ہیں جہاں وہ گیتوں سے ذوق رکھنے والی خواتین سے ملی ہیں اور گیت حاصل کئے ہیں۔

ان گیتوں میں بہت ساری خامیاں یقیناً ہیں۔ اکثر تو مطلب سمجھے بغیر ہی گائے جاتے ہیں۔ ان کی ادائیگی ٹھیک نہیں ہے۔ دھنیں دلپذیر نہیں ہیں۔ یہ شکایات اپنی جگہ بجا ہیں لیکن یہ خامیاں دُور کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم اپنے اس کلچرل ورثہ کو زندہ رکھ سکتے ہیں اور انھیں مزید مرغوب بنا سکتے ہیں۔ میرا مقصد اس وقت گیتوں پر تحقیقی مقالہ لکھنا نہیں ہے۔ محض ایک جھلک ان گیتوں کی دکھانی ہے کہ ہمارے پاس قابلِ توجہ مواد ہے جس پر غور کیا جا سکتا ہے۔

کوکن کی خواتین اب زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہیں ہر جگہ علم و ادب کے چرچے ہیں۔ اس کام میں تعلیم یافتہ خواتین کو زیادہ دلچسپی لینی چاہیے، کہ ہم ان گیتوں سے ثابت کر سکیں کہ ہمارے خطے میں گائے جانے والے گیت ہماری تہذیب دیرینہ کا زندہ و پائندہ یادگار ہیں۔ کوکن کی تہذیب میں ایسی کئی چیزیں ہیں ہنوز پوشیدہ ہیں جو منظرِ عام پر نہیں آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ نئی نسل اس طرف توجہ دے گی اور اس خطہ کے متعلق ثابت کر دے گی کہ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

شمسی طہرانی ایم۔اے

تغیر

روئے گلفام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے
موسمِ جام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

اے صفا تجھ کو بھی گلشن میں بفرمانِ سحر
روشِ عام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

کبھی صہبا، کبھی نغمہ، کبھی نکہت، کبھی نور
حُسن کو نام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

کفر اپنا کبھی بدلا ہے نہ بدلے واعظ
تیرا اسلام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

مے نہ بدلی تری آنکھوں کی قسم اے ساقی
ہاں مگر جام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

عشق کے جادۂ پر پیچ سے گذرے ہیں مگر
دل بہر گام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

جب سرِ شام ملی ہے کوئی خورشید جمال
منظرِ شام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

ان کی بیگانہ نگاہی کا اثر کیا کہئے
رنگِ ایام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

کوئے اصنام سے جس دم ہوا شمسی کا گزر
حالِ اصنام بدلتے ہوئے دیکھا ہم نے

شرف کمالی

داستان کربلا

(اظہارِ خلوص و عقیدت)

موجزن دل میں ہے حُبِّ آلِ نبی، آج روحِ عقیدت بھی بیدار ہے
جشنِ شاہِ شہیداں میرے ہم نفس اک خلوص و محبت کا اظہار ہے

ظالموں کے لئے کربلا ہے سبق ظلم سے دب سکے گی نہ آوازِ حق
سر کٹایا مگر سر جھکایا نہیں ایک مظلوم کس قدر خود دار ہے

شاہ بولے رضا حق کی مطلوب ہے، عاشقوں کیلئے صبر ہی خوب ہے
ورنہ چاہوں تو نقشہ بدل دوں ابھی ہاتھ میں میرے حیدرؓ کی تلوار ہے

سخت مشکل میں ہے غم کا طوفان ہے گھر لٹا خود کوئی دم کا مہمان ہے
اُس نواسے کی یہ بے کسی الاماں جس کا نانا دو عالم کا سرکار ہے

صفحۂ دہر پر میں نے مانا ہوئیں اور خونریزیاں اے مؤرخ مگر
دیکھ تاریخِ عالم کے صفحات میں اور کس کا بڑا اتنا ایثار ہے

ظلم جب بھی کہیں حد سے بڑھ جائے ہے دبے پاؤں اک انقلاب آئے ہے
داستاں کربلا کی ہے رنگیں شرف وہ سمجھ جائے ہے جو سمجھ دار ہے

مولوی سمیع اللہ

حادثۂ کربلا

اس کے اسباب اور ردِّ عمل

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعۂ شہادت ان ہولناک واقعات میں سے ہے جن کا مسلمانوں کے ذہن و فکر پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ اگرچہ اس واقعہ پر ایک غیر جانبدار مورخ کے طور پر لکھنا بہت مشکل ہے۔ یزید اور حضرت امام حسینؓ کی حکمت عملی کیا تھی جس کے نتیجے میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ اس پر بہت احتیاط اور غیر جانبداری سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ بنو امیہ کے طرفدار مورخوں نے حضرت امام حسینؓ کے کردار کو داغدار بنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی۔ اسی طرح حضرت امام حسینؓ کے حامیوں نے بھی یزید کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی۔ اگر حضرت امام حسینؓ کو باغی، مجرم خروج کا مرتکب اور خلافت کا خواہش مند ثابت کیا گیا ہوگا تو یزید کو ظالم، عیاش اور غاصب بتایا گیا ہوگا۔

لہٰذا اگر ہم "کرم کتابی" بننے کی بجائے اس واقعہ پر دوسرے ذرائع سے غور کریں تو زیادہ موزوں ہوگا۔ اور وہ ہیں خارجی شہادتیں اور داخلی اثرات ۔۔۔ داخلی اثرات میں تو مسلمانوں کا وہ حزن و غم ہے جو تواتر اور توارث کے طور پر ان کی زبان اور دل میں ہے، اور جو اس بات پر دلیل ہے کہ میدانِ کربلا میں کوئی انتہائی درد انگیز واقعہ رونما ہوا ہوگا۔ اور خارجی طور پر وہ دوسرے واقعات ہیں جو حادثۂ کربلا جیسے حوادث کے ظہور پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں زیاد کا، حضرت معاویہ کو ہندہ جگر خور کا بیٹا کہنا۔ یہ معلوم ہے کہ جنگ اُحد میں حضرت معاویہ کی والدہ "ہندہ" نے ایک غلام کے ذریعہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کو شہید کرایا تھا۔ اور پھر ان کا سینہ چیر کر ان کا کلیجہ چبایا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت وحشیانہ فعل تھا جو حضرت معاویہ کی والدہ ہندہ سے ظہور میں آیا۔ زیاد اس کو ہندہ جگر خور کا بیٹا کہہ کر اسی بات کا طعنہ دیتا تھا۔ اگرچہ عام مورخوں نے ایسے اقوال کے درج کرنے سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے۔ مگر زیاد کے طعنے سے ظاہر ہے کہ عام مسلمانوں نے ہندہ کے اس سنگدلانہ فعل کو نہایت نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا۔

اسی طرح حضرت معاویہ کا زیاد کو مرجانہ کا بیٹا کہنا جس سے زیاد کے حسب و نسب پر حرف آتا ہے۔ یہ طعنے بازیاں تاریخوں میں مذکور ہیں ۔۔۔

پھر یہ کہ جس طرح یزید نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بیدردی سے شہید کرایا۔ اسی طرح ان کے والد بزرگوار حضرت معاویہ بھی ایک جلیل القدر صحابی حضرت حجر بن عدی اور ان کے رفقاء کو بیدردی سے شہید کرا چکے تھے۔ واقعۂ کربلا کو تو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اسلئے کہ اس واقعہ کے بعد بنو امیہ کی سیاست میں تلخیاں بڑھتی گئیں، مگر حضرت حجر بن عدی جیسے متقی اور پرہیزگار صحابی اور ان کے رفقا کی شہادت کو

سود شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ مگر اہلِ نظر کے نزدیک حضرت معاویہ
کا جرم یزید کے جرم سے کچھ کم نہ تھا بلکہ اس اعتبار سے کہ واقعہ کربلا میں
یزید کی طرف سے ایک معذرت کی گنجائش ہے کہ یہ واقعہ یزید کی مرضی
کے بغیر ہوا۔ مگر شہادت حجر بن عدی میں حضرت معاویہ کی طرف سے
عذر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ جرم جرم کربلا سے زیادہ سنگین
نوعیت کا ہے۔ اسی لئے حضرت معاویہ بستر مرگ پر اس واقعہ کو یاد کرکے
بہت پریشان تھے اور اسی موقع پر کہا کرتے تھے کہ مجھ کو حجر جانا کے
بیٹے نے اس ظالمانہ فعل پر آمادہ کیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ اسی دور کے اکابر سیاست
مصلحت یا حکمت عملی کے نام پر ایسے ظالمانہ افعال کے ارتکاب سے
گریز نہیں کرتے تھے۔ جب باہمی منافرت بڑی ہو اور سیاست بھی
متقاضی ہو جائے تو ایسے قتل سے کون گریز کر سکتا تھا۔

ان خارجی شہادتوں پر بھی قیاس کرکے ہم سمجھ سکتے ہیں
کہ دشت کربلا میں شہادت حسین کا واقعہ رونما ہوا ہوگا۔ اور ان کو
حجر بن عدی کی طرح بالکل ناحق قتل کیا گیا ہوگا۔ یزید کے اس فعل
قبیح کی توجیہ کرنا اور اس کو محض ابن زیاد کی زیادتی قرار دینا غلط ہوگا۔

واقعہ کربلا دراصل اس زمانے کے پیچیدہ سیاست کی ایک
کڑی تھی۔ کوفہ اور بصرہ کے باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر چکے
تھے۔ اس کے بعد اسی کوفے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔
اہل کوفہ کے دامن پر ظلم، بے وفائی اور بزدلی کے بدنما
دھبے تھے۔ ان سبھوں نے اس دھبے کو دھونے کے لئے
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ آنے کی دعوت دی، اور سوچا کہ اگر
ان کے باپ کا ساتھ نہ دے سکے تو چلو انھیں کا ساتھ دے کر
اپنی غلطی و گناہ کا ازالہ کر دیں۔ یہی سوچ کر ان سبھوں نے یزید کے
خلاف حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ آپ
بھی بنو امیہ کے اقتدار میں کلی یا جزئی طور پر تبدیلی کے خواہاں تھے، اسی لئے
کو نے کا ارادہ کیا۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اقتدار کی منتقلی
بنو امیہ کی طرف ہوئی، آپ اس سے متفق نہیں تھے۔ یہ انتقالِ اقتدار
حضرت علی کی پالیسی کے بھی خلاف تھا۔

جنگ صفین میں جب صلح و صفائی کے لئے دو ثالثوں کا
قیام عمل میں آیا، اور ان میں سے حضرت علی کے ثالث ابو موسیٰ اشعری نے
اس امید پر کہ حضرت معاویہ کے ثالث عمرو بن العاص بھی معاویہ کو
امارت سے معزول کر دیں گے۔ حضرت علی کو غلطی سے معزول کر دیا تو حضرت
علی نے ثالث کا یہ فیصلہ قبول نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ امیر معاویہ کے
ثالث نے ان کو امارت سے معزول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت
امام حسین اپنے والد بزرگوار کے اس فیصلے سے متفق تھے، اور چاہتے
تھے کہ اقتدار بنو امیہ کی طرف منتقل نہ ہو۔ یہ دراصل اصول، اقتدار اور
آدرش کی جنگ تھی اور اسلامی معاشرہ کا ایک اعلیٰ نصب العین تھا۔

ہم کو ان اسباب کا پورا پورا علم نہیں، جن کے باعث حضرت
امام حسین بنو امیہ کی طرف اقتدار کی منتقلی کو ناپسند کرتے تھے۔
البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ جب خلافت شیخین سے حضرت عثمان رض کی
طرف منتقل ہوئی تو اس کا رنگ بدل گیا، اور خود اہل مدینہ ان کی پالیسی
سے بیزار ہو گئے تھے۔ حضرت امام حسین چاہتے تھے کہ یہ رنگ
پختہ نہ ہو جائے۔ اسی لئے جب ان کے بڑے بھائی حضرت امام
حسن رضی اللہ عنہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوئے
تو انھوں نے ان کے اس فعل کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ میرا
خیال ہے کہ اس قسم کے اور بہت سے دواعی اور محرکات ہوں گے
جن کے پیش نظر آپ نے بنو امیہ کی طرف اقتدار کا انتقال امت کے
عام مصالح کے خلاف سمجھا، اور اس کے خلاف عملی قدم اٹھایا۔ کوفیوں
نے آپ کو جس نیت سے بلایا تھا، کچھ ضروری نہیں کہ آپ ان سے
متفق ہوں۔ البتہ خود آپ کا ایک سیاسی مسلک تھا، اسے ہی
قائم کرنے کے لئے آپ کوفہ جانے پر رضامند ہوئے۔

اس جگہ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت امام حسین کی سیرت

ان کے والد بزرگوار کی سیرت سے بہت مطابقت رکھتی تھی۔ وہ اپنے والدین کی طرح دینی احکام، مالی معاملات اور حدود و تعزیرات کے نفاذ میں سخت گیر واقع ہوئے تھے، اسی لئے وہ اپنے ہم عصروں میں اپنے والد ماجد ہی کی طرح غیر مقبول تھے صحابۂ کرام اور مکہ و مدینہ کے ارباب حل و عقد ان کی سیرت کے اس پہلو سے واقف تھے انھیں اندیشہ تھا کہ آپ عوام کی حمایت حاصل کرنے میں شاید کامیاب نہ ہو اسی لئے ان حضرات نے آپ کے اس سفر کی مخالفت کی۔ آپ کے سوتیلے بھائی محمد بن الحنفیہ نے بھی آپ سے اختلاف کیا اور آپ کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

اس جگہ یہ بھی معلوم کر لینا چاہیئے کہ حضرت حسنین کی سیرتوں میں کیا فرق تھا۔ اس سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ناکامی کے اسباب سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نہایت خوش مزاج، زندہ دل اور باذوق آدمی تھے۔ خطابت کا بھی اعلیٰ ملکہ تھا۔ اس کے مقابل حضرت امام حسین ایک عابد، زاہد اور مرتاض آدمی تھے۔ خطابت کا ملکہ بھی نہیں تھا۔ مکہ و مدینہ کے اصحاب الرائے کو یہ اندیشہ تھا کہ جب حضرت امام حسن اپنی تمام خوبیوں کے باوجود معاویہ کے مقابل نہ ٹھہر سکے تو آپ ان امویوں کے مقابل کیسے ٹھہر سکیں گے۔ اسی لئے وہ آپ کو اس سفر سے منع کرتے تھے۔

لیکن حضرت امام حسین رض نے خدائی تحریک کے ماتحت کوفہ جانے کا فیصلہ کر لیا، اور اپنے قاصد کے طور پر پہلے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ کی طرف بھیجا۔ جب یہ کوفہ پہنچے تو اس وقت کوفہ کا گورنر نعمان بن بشیر تھا۔ جو ایک نرم دل آدمی تھا۔ غالباً اہل کوفہ کے دل میں ان کا کوئی خوف و رعب نہیں تھا۔ حضرت مسلم مختار ثقفی کے گھر فروکش ہوئے جو حضرت عبداللہ بن عمر کا داماد تھا۔ کوفیوں کو جب آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو وہ لوگ جوق در جوق بیعت کے لئے آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کر لی مسلم بن عقیل نے ان حوصلہ افزا حالات کی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھیج دی۔ آپ یہ اطلاع ملتے ہی کوفہ کی طرف چل پڑے۔ آپ کے ہمراہ اہل بیت کے ۱۷ مرد اور ۳ عورتیں تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ حضرت امام حسین
۲۔ " عباس
۳۔ " عثمان " جعفر
۵۔ " عبداللہ
۶۔ " محمد ابوبکر
(یہ پانچوں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بھائی ہیں۔)

۷۔ " علی بن حسین
۸۔ " عبداللہ بن حسین
(یہ دونوں امام حسین رض کے لڑکے تھے۔)

۹۔ " عبداللہ بن حسن
۱۰۔ " ابوبکر بن حسن
۱۱۔ " قاسم بن حسن
(یہ تینوں امام حسن رض کے لڑکے تھے۔)

۱۲۔ حضرت محمد بن عبداللہ بن جعفر طیار
۱۳۔ " عون بن " "
(یہ دونوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھتیجے تھے۔)

۱۴ - ۱۵ - ۱۶ - ۱۷ - مسلم بن عقیل کے چار لڑکے

عورتوں کے نام یہ ہیں:

۱۸۔ حضرت زینب بنت فاطمۃ الزہرا رض
۱۹۔ " سکینہ
۲۰۔ " فاطمہ

حضرت علی اصغر جن کی ولادت میں اسی دم یزیدیوں نے ان کو شہید کر ڈالا

قافلے میں کیا جائے تو قافلہ اہلِ بیت کی کل تعداد ۲۱ ہو جاتی ہے۔ ۱۸ مرد اور تین عورتیں۔ اعوان و انصار کی تعداد ۵۶ تھی — مجموعی تعداد ۷۷ ہوتی ہے۔

یہی ابرار و اخیارِ امت کا وہ قافلہ تھا جو دشتِ کربلا میں حق و صداقت کا جھنڈا بلند کرنے چلا تھا۔

ادھر کوفے کے حالات میں جو تغیر رونما ہوا اس کی امام حسینؓ کو کچھ خبر نہ تھی۔ یزید کو جب معلوم ہوا کہ نعمان بن بشیر اس تحریک کو دبانے میں پس و پیش کر رہا ہے تو اس نے اس کو معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد کو کوفے کا گورنر نامزد کر کے بھیجا۔ اس ظالم نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی ظلم و سخت گیری شروع کر دی۔ اس گھر کا پتہ لگایا جہاں حضرت مسلم مقیم تھے۔ آپ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے وہ گھر چھوڑ کے ایک عورت کے گھر میں پناہ لی۔ مگر اس کے لڑکے نے مخبری کر دی اور آپ اسی گھر سے گرفتار کر لئے گئے۔ عبید اللہ بن زیاد نے آپ کو باغی قرار دے کر آپ کے حق میں سزائے موت کا فیصلہ سنایا۔ اور دار الامارہ کی چھت پر قتل کرا کے آپ کا جسم زمین پر پھنکوا دیا۔

حضرت امام حسین ان حالات سے بے خبر تھے اور راہ پر پڑاؤ ڈالتے ہوئے کوفہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ مقام "ثعلبہ" میں آپ کو حضرت مسلم کی شہادت کی خبر ملی۔ اور سوال درپیش ہوا کہ اب کوفہ کی طرف کوچ کیا جائے یا مکہ کی طرف راجعت کی جائے۔ آپ مکہ کی طرف لوٹ جانا چاہتے تھے مگر حضرت مسلم کے لڑکوں نے خونِ مسلم کے قصاص کا نعرہ بلند کیا۔ آپ مجبور ہو گئے اور کچھ امید و بیم کی حالت میں کوفہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں کئی بہی خواہوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ جیسے فرزدق۔ عبد اللہ بن جعفر، عبد اللہ ابن مطیع۔ ان سبھوں نے آپ کو کوفہ کی صورتِ حال سے آگاہ کیا — مگر بھی نبوی ... یا شوقِ اعلائے کلمۂ حق آپ کو کشاں کشاں کو ... نے کا ارادہ ...

کوفہ کی طرف لے جا رہا تھا۔

آپ جب کربلا کے قریب پہنچے تو عبید اللہ بن زیاد نے عمر بن سعد کو چار ہزار فوج دے کر کہا کہ آپ کو محاصرہ میں لے لیا جائے۔

یہ کتنی حیرت انگیز بات تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بزرگ صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص فاتحِ ایران کا لڑکا آپ کے نواسے کو قتل کرنے آیا تھا۔

کہتے ہیں کہ عمر بن سعد کو "رے" کی گورنری دی گئی تھی۔ مگر جب قافلہ اہلِ بیت کربلا کے قریب آیا تو عبید اللہ بن زیاد نے اس کو ہی اس مقدس قافلے کو تباہ و برباد کرنے پر مقرر کیا۔ عمر بن سعد نے جب انکار کیا تو اس سے کہا گیا کہ پھر رے کی گورنری کی سند واپس کر دے۔ وہ کبھی اس سند کی طرف دیکھتا اور کبھی اہلِ بیت کی طرف۔ آخر اس پر حرصِ دنیا غالب آئی اور قافلۂ اہلِ بیت کا محاصرہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

اس نے جب قافلۂ اہلِ بیت کا محاصرہ کر لیا تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس صورتِ حال سے باعزت طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے تین تجاویز پیش کیں۔

(۱) ہم کو یزید کے پاس جانے دو۔ ہم اس سے دو بدو بات چیت کر کے اپنا معاملہ طے کر لیں گے۔

(۲) یا ہمیں سرحدِ اسلام کی طرف جانے دو۔ وہاں کفار کے خلاف جہاد میں حصہ لیں گے۔

(۳) یا ہمیں مکہ واپس جانے دو۔

یہ تینوں قابلِ قبول تجاویز تھیں۔ اور شاید ابن زیاد یہ تجاویز قبول کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بعض بدبخت درباریوں نے مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ حضرت امام حسین سے غیر مشروط بیعت کے سوا اور کسی بات پر مباحثت نہ کی جائے۔ لیکن امام عالی مقام کسی قیمت پر اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ اصول اور اقدارِ حیات کی جنگ نہ ہوتی تو شاید آپ اس پر

تیار ہو جاتے۔ اس لئے کہ خود اپنے کو۔ اپنی اولاد کو، اپنے قریب ترین رشتے داروں اور سرفروش دوستوں کو غربت و بےکسی کے عالم میں قتل کرانا کون گوارا کرتا ہے۔ ہاں جب عقیدے، اصول اور اقدار زندگی کا سوال آتا ہے تو پھر ایسی قربانیاں آسان ہو جاتی ہیں۔

حضرت امام حسین نے جب عمر بن سعد کی ہٹ دھرمی دیکھی تو آپ کی ایمانی غیرت اور حیدری شجاعت جوش میں آئی اور اعلان جنگ قبول فرمایا۔

اس کے بعد جنگ ہوئی۔ یزیدی فوج نے اس بہادر قافلہ کے سرفروشوں پر حملہ کیا۔ عموماً نقشۂ جنگ کھینچنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ انیس و دبیر جیسے مرثیہ گو شعراء نے تو آسمان و زمین کے قلابے ملا دئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ ہوئی۔ اہل بیت کے شہسواروں نے خوب خوب داد شجاعت دی۔ یزید کی فوج کے چند حق پرست فوجی بھی قافلۂ اہل بیت کے جنگ آزماؤں میں شامل ہو گئے۔ خود ابن زیاد کا بھائی عبداللہ بن زیاد بھی حضرت امام حسین کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ جرأت، سرفروشی اور محبت اہل بیت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ ہوا۔ جوانان اہل بیت اور ان کے اعوان و انصار ایک ایک کر کے اپنے اصول اور اقدار زندگی کے لئے میدان کربلا میں کٹ مرے۔ کسی نے پیٹھ نہیں دکھائی۔

دوسری طرف افواج یزید نے بھی ظلم و ستم، سنگدلی و بیرحمی اور سفاکی اور بیدردی کے مظاہرے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ حتی کہ حضرت امام حسین کے لڑکے حضرت علی اصغر جو اسی دن میدان جنگ میں پیدا ہوئے تھے، ان یزیدیوں نے انھیں بھی شہید کر ڈالا۔ شمر ذی الجوشن ان میں پیش پیش تھا۔

اب قافلۂ اہل بیت میں صرف عورتیں تھیں یا ایک بیمار بچہ جو علالت و نقاہت کے باعث خیمہ میں پڑا تھا۔ وہ تھے امام الاتقیاء حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ۔ جن کی بدولت سادات فاطمی کی نسل باقی رہی۔ اگر خدانخواستہ آپ بھی میدان کربلا میں شہید ہو جاتے تو دنیا سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل کا خاتمہ ہو جاتا۔

اس دشتِ کربلا میں جو دردانگیز واقعہ رونما ہوا اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوگا کہ شہدائے کربلا میں خود حضرت امام حسین کے علاوہ حضرت فاطمہ کے پانچ پوتے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بھتیجے اور حضرت امام حسین کے پانچ سوتیلے بھائی شامل تھے۔ مسلم بن عقیل اور حضرت علی اصغر کی شہادت اس کے سوا ہے۔ اگر ان دونوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے چھ پوتوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین بھتیجوں نے جام شہادت نوش کیا۔

یہ جنگ تین چار گھنٹوں کے اندر ہی ختم ہو گئی۔ زہیر نے یزید کے سامنے جنگ کی جو رپورٹ پیش کی تو یہی کہا کہ لوگ قیلولہ کرتے ہیں یا اونٹ کی کھال ادھیڑی جاتی، جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یزید کے فوجیوں نے تینوں محترم خواتین اور حضرت زین العابدین کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیا، اور ابن زیاد نے ان سبھوں کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

یزید نے ان مظلوم اور ستم رسیدہ اشخاص کو دیکھ کر اظہار افسوس کیا۔ یہ واقعی اظہار افسوس تھا یا مگرمچھ کے آنسو۔ کچھ بھی ہو۔ مگر یہ درست ہے کہ یزید نے ابن زیاد یا قاتلان حسین کو کوئی سزا نہیں دی۔ بلکہ ان کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی بھی نہیں کی۔ تاآنکہ خدا نے خود لوگوں کو قصاص حسین کے لئے ابن زیاد اور قاتلان حسین کے خلاف مشتعل کر دیا۔

قصہ یہ ہوا کہ جب یہ قافلۂ اہل بیت جو اب صرف

تین ستم رسیدہ خواتین اور ایک بیمار بچے پر مشتمل تھا جب یزید کے دربار سے نکل کر مکہ پہنچا تو سارا مکہ سوگوار ہو گیا۔ گھر گھر ماتم ہونے لگا۔ امام حسینؓ کے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہ نے "یا لثارات الحسین" کا نعرہ لگایا یعنی حسینؓ کے خون کا بدلہ لینے کون کھڑا ہوتا ہے۔

ادھر کوفیوں کو بھی ندامت کا احساس ہوا، اور وہ اپنی بدعہدی پر پچھتانے لگے۔ اس لئے وہاں بھی آناً فاناً تواب‌ین کی تحریک چل پڑی۔ مختار ثقفی جس کے گھر حضرت مسلمؓ مقیم ہوئے تھے، اس تحریک کا قائد بنا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ وہی ابن زیاد جو کل قوت و اقتدار کے نشے میں چور تھا، اور وہی عمر بن سعد جس نے محض رے کی گورنری کے لئے امت کے سرتاج حضرت امام حسینؓ کا خون کیا تھا۔ دونوں اب ان لوگوں کی حراست میں تھے۔ ان دونوں کو اسی دم نہایت ذلت و خواری کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح شمر ذی الجوشن اور ہر وہ شخص جس پر قتل حسین میں کسی طرح ملوث ہونے کا شبہ ہوا، بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور ان کی لاشیں یا تو کتوں کو کھلا دی گئیں یا جلا دی گئیں۔

یہ جماعت جو قصاص حسین کے لئے کھڑی ہوئی تھی اس کو "توابین" کی جماعت کہتے ہیں۔ کوفہ میں اس کا سربراہ مختار ثقفی تھا، اور مکہ میں حضرت محمد بن الحنفیہ۔ اس جماعت نے قاتلین حسین کو خس و خاشاک کی طرح پھونک ڈالا۔ اس میں سے کسی کو کفن یا دعائے جنازہ بھی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن وہ جگہ جہاں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا جسد اطہر سپرد خاک کیا گیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے مرجع خلائق بن گئی۔ جماعت توابین کی عورتوں نے غم حسینؓ میں ایسا نوحہ کیا کہ یہ منظر دیکھ کر آسمان بھی تھرا اٹھا۔ اور مردوں نے قبر حسین پر عقیدت کے اتنے پھول چڑھائے کہ کرۂ ارض کے فرشتے بھی اس پر رشک کرنے لگے۔

آئندہ کے واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مظلومؓ کا خون حکمران طبقے کے لئے ایک قہر الٰہی بن گیا۔ یزید جو معلوم نہیں کتنی تمناؤں کے ساتھ امام کو شہید کروایا تھا بہت جلد اس کو ملک الموت نے اپنا خونی پنجہ دکھایا اور وہ عین جوانی میں بدنامی کی موت مر گیا۔ اس کا بیٹا جو تخت و تاج کا وارث تھا وہ تخت و تاج سے ہی دستبردار ہو گیا۔ پھر اس کے چند ہی سال کے بعد ابو مسلم خراسانی کا ظہور ہوا۔ اور اس کے تدبر اور سیاسی کارروائیوں کی بدولت حکومت بنو امیہ سے بنو عباس کی طرف منتقل ہو گئی۔ پھر اس دن کیا ہوا۔ آہ! کچھ نہ پوچھئے چن چن کر بنو امیہ کو قتل کر دیا گیا۔ اور کوشش کی گئی کہ دنیا سے اس نسل کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ حتیٰ کہ سیاہ لباس جو بنو امیہ کا لباس تھا وہ لباس پہننا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو گیا تھا۔ وہ دن بنو امیہ کے لئے آخر اور ان کی بس کا دن تھا۔ سچ پوچھئے تو بنو امیہ پر خون حسین قہر الٰہی بن کر نازل ہو گیا۔ اگرچہ ان دنوں اس قسم کے قتلوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی مگر حسینؓ کا قتل تو ایک امت کا قتل تھا، اس لئے سارا زمانہ قاتلین حسین کے خلاف کھڑا ہو گیا ــــ اس قسم کے واقعات کے متعلق اس عہد کے مسلمانوں کا تصور تھا وہ یہ تھا کہ قیام امن کے لئے اس قسم کے قتل ہوتے ہیں وہ بالکل غیر اہم ہوتے ہیں۔ وہ نہ دیکھتے تھے کہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کس کے ذریعے ہو رہی ہے جس کے ذریعے اسلامی سرحدوں یا ممالک اسلامیہ کی سالمیت کی حفاظت ہوتی وہ اس کی حمایت ضروری سمجھتے تھے حضرت معاویہ یا یزید کی اسی بنا پر حمایت کی گئی کہ ان دنوں انہیں کی فوج اسلامی سرحدوں کی محافظ تھی۔ اندرون ملک بدامنی یا انتشار کو دور کرنے کے لئے حاکم وقت جو کچھ کرتا لوگ اس کو اس کی صوابدید پر چھوڑ دیتے تھے اسی لئے اکابر امت کی تعزیت یا قتل پر کسی نے کوئی خاص اعتراض نہیں کیا۔ نہ وہ ایسے قتل کو کسی گناہ کی پاداش سمجھتے تھے۔

ان کا دوسرا تصور یہ تھا کہ وہ مسلمان جس کو سزائے موت دی جاتی اگر اس کی تجہیز و تکفین عمل میں آتی اور ان پر دعائے جنازہ پڑھی جاتی تو سمجھتے کہ ان کا انجام بخیر ہوا حضرت حجر بن عدی اور ان کے رفقاء کی تجہیز و تکفین ہوئی اور ان پر دعائے جنازہ بھی پڑھی گئی اس لئے سبھوں کا عقیدہ تھا کہ ان کا انجام بخیر ہوا کسی نے ان قتلوں کو کوئی اہمیت نہ دی ـ مگر حادثۂ کربلا کوئی انفرادی نوعیت کا حادثہ نہ تھا بلکہ اس عہد کی پیچیدہ سیاست کی ایک کڑی تھا اس لئے قتل حسین کے بعد بھی بنو امیہ کے خلاف تحریک چلتی رہی اور اس میں بڑے بڑے مدبر و سیاستدان شریک ہوتے گئے۔ غالباً ان سب کا عام مطالبہ تھا کہ اقتدار بنو امیہ کے ہاتھ سے چھین لیا جائے۔ اس شورش کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور خلافت میں ہوا لیکن یہ تحریک پروان چڑھی ابو مسلم خراسانی کے ہاتھوں۔ حضرت امام حسینؓ تو صرف درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

یوسف ناظم

عبداللہ دیوانے

ایسا نہیں ہے کہ دعوتوں میں جانا اور دعوتیں کھانا ہمیں
پسند نہیں ہے بلکہ ایک زمانہ تھا جب ہمارا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ ہم نہ صرف
دعوتیں قبول کرتے تھے بلکہ باقاعدہ دعوتیں وصول کرتے تھے لیکن ادھر
پچھلے چند دنوں میں ہمیں بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں اور اب کسی دعوت
میں جانا ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کوئے یار سے نکل کر
سوئے دار جا رہے ہوں۔ اب تو ہمیں کوئی دعوت دیتا ہے تو یہ سمجھ کر بلاتا
ہے جیسے نہ صرف ہم پر بلکہ ہمارے آبا و اجداد اور ہماری آل اولاد پر
احسان کر رہا ہے۔ دعوت دیں گے اور ارشاد فرمائیں گے دیکھئے ذرا
ایک دو گھنٹے پہلے آجائیے تو ٹھیک رہے گا، اور ہاں اپنا ڈنر سیٹ
بھی بھجوا دیجیے گا۔ بلکہ یوں نہ کریں کہ آتے وقت اپنے آپ ساتھ ہی لیتے آئیں۔
کوئی اٹھائے گا تو حفاظت سے نہیں لائے گا ــــ اب یہ کوئی دعوت
ہوئی۔ جاؤ تو ڈنر سیٹ ساتھ لاد کے لے جاؤ۔ نہ جاؤ تو دعوت دینے والا
یہ سمجھے کہ ڈنر سیٹ دینے والا یہ سمجھے کہ ڈنر سیٹ مانگا تو قبلہ آئے ہی نہیں۔
بغیر ڈنر سیٹ کے جاؤ تو میزبان سیدھے منہ بات بھی نہ کرے۔ اس قسم
کی کئی دعوتیں ہمیں مل چکی ہیں اور وہ تجربے ہوئے ہیں کہ جی جانتا ہے۔

اب آپ اس دعوت کا ذکر سنئے جس کی یاد آتی ہے تو
دل تڑپ جاتا ہے۔ ہمارے محلے میں ایک خان صاحب رہتے ہیں۔ اب ہم محلہ
ہیں تو ظاہر ہے سلام دعا کا سلسلہ تو ہوگا ہی۔ ہم سے بھی جان پہچان ہے۔
بس آتے جاتے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھ لیا یا زیادہ سے زیادہ
خیریت پوچھ لی بہت ہوگئی۔ اس سے آگے بات کبھی نہیں بڑھی۔ یہی خانصاحب
ایک دن ہمارے ہاں تشریف لائے، اور سچ پوچھئے تو اسی دن ہم نے
انھیں اتنے قریب سے دیکھا۔ ہمیں بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنے خوفناک ہونگے۔
خان صاحب نے ہم سے فرمایا میر صاحب، آپ کو ہماری بھانجی کی شادی
میں شریک ہونا ہے۔ صرف شریک ہی ہونا نہیں بلکہ آپ کو وکیل بھی بننا ہے۔
ہم نے عرض کیا خان صاحب کسی بزرگ آدمی کو وکیل بنائیے یا کم سے کم
ایسے شخص کو وکیل بنائیے جو اس سے پہلے اسی دشوار گذار راستوں سے
گذر چکا ہو۔ خاں صاحب بولے نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ اس
نیک کام سے انکار کردیں۔ آپ سے تو ہمارے برسوں کے تعلقات ہیں۔
دیکھئے، اتوار کے دن آپ کو کار سے ہمارے گاؤں چلنا ہوگا۔ بس یہی
کوئی دس میل دور ہوگا۔ ہم نے سوچا اب ان سے کیا انکار کریں۔ خانصاحب
پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں اور اس محبت سے دعوت دے رہے ہیں۔
دوستی نہ سہی پرانی جان پہچان تو ہے۔ ہم نے حامی بھرلی۔ اتوار کے
دن ابھی ٹھیک سے سویرا بھی نہیں ہوا تھا کہ خانصاحب گھر پر آگئے۔
ہمیں سوتے سے اٹھایا گیا اور خان صاحب کے حضور میں پیش کردیا
گیا۔ خان صاحب دیکھتے ہی بولے کمال ہے، صاحب، ہمیں گاؤں
میں سب سے پہلے پہنچنا ہے اور آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ ہم نے کہا:

خان صاحب: میں ابھی تیار ہو جاتا ہوں۔ جب تک آپ کار تو لے آئیے۔
خان صاحب بولے، "کار؟ اجی میر صاحب، ہم سب آپ کی کار میں جانے والے ہیں۔" ہم نے کہا "خان صاحب یہ تو آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ مجھے اپنی کار میں جانا ہوگا۔" خان صاحب نے کہا "یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پاس کار ہے اور میرے پاس نہیں۔" اس دلیل کے بعد حجّت کا کیا موقع تھا۔ خان صاحب نے فرمایا "اب دیر مت کیجئے، بچّے انتظار کر رہے ہیں۔" ہم نے کہا "بچّے؟" خان صاحب بولے: ہاں ہاں، ہمارا زنانہ اور بچّے بھی تو ساتھ جا رہے ہیں۔ — ہم نے یہ سُن کر زہر کا گھونٹ پی لیا (چائے پینے کا وقت بھی کب تھا) منہ ہاتھ دھوئے، کپڑے بدلے۔ گاڑی نکالی اور خان صاحب کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ آدھی بارات ہماری گاڑی کے انتظار میں کھڑی ہے۔ کچھ نہیں تو کوئی بارہ پندرہ سواریاں ہونگی۔ ہم نے کہا "خان صاحب یہ سب لوگ تو ایک گاڑی میں نہیں جا سکتے۔" خان صاحب نے کہا کیوں نہیں جا سکتے۔ اور اگر یہ سب ایک مرتبہ میں نہیں گئے تو آپ ہی کو دوبارہ آنا پڑے گا۔
اس کے بعد خان صاحب نے بچوں کو حکم دیا: چلو سب کے سب اندر بیٹھ جاؤ — بچوں نے جونہی کمانڈر کا حکم سُنا ع

بے خطر کود پڑے کار میں سب بچّے

بچوں کی کامیابی پر خوش ہو کر خان صاحب نے ایک ایک کر کے عورتوں کو موٹر میں داخل کیا۔ ان کا سامان ڈاگی میں رکھا گیا۔ خود بیٹھے اور نہایت اطمینان سے فرمایا دیکھئے میں کہتا تھا کہ سب آسانی سے بیٹھ جائیں گے۔ چلیئے اب ذرا تیز چلیئے۔ سات بج گئے ہیں اور دس بجے عقد ہونا ہے — اپنی گاڑی کو پانی کا جہاز بنتے دیکھ کر ہمیں تقریباً رونا آگیا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ خان صاحب کی بھانجی کی شادی کی تقریب کے دن رونا مناسب نہ ہوگا۔ ہم ضبط کر گئے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہوتے ہی چھوٹے بچوں نے رونا اور بڑے بچوں نے تالیاں بجا کر انھیں منانے کا پروگرام شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر کے

گاڑی میں دولھن کے گھر پہنچے تو پہلی اطلاع یہ ملی کہ شہر سے فرش اور دولھے میاں کی مسند اب تک گاؤں نہیں پہنچی ہے۔ خان صاحب نے فوراً انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور کہا گھبراتے کیوں ہو۔ ہم ابھی شہر جا کر سب چیزیں لے آتے ہیں۔ — پھر ہم میں اور خان صاحب میں کچھ مکالمہ ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آج ہم نے خان صاحب کا ساتھ نہیں دیا تو خان صاحب کی مونچھیں نیچی ہو جائیں گی۔ خان صاحب نے اس کے علاوہ بھی کچھ محاورے استعمال کئے جو ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ لیکن ہم فوراً خان صاحب کو لے کر شہر واپس ہوئے شہر سے فرش اور فرش اور دولھے میاں کی مسند، تکیے اور قالین وغیرہ ہماری گاڑی پر لادے گئے اور ہم پھر دولھن کے گھر پہنچے — خان صاحب اپنے کارنامے پر بہت مسرور تھے لیکن اس وقت دولھے والوں کا یہ پیام دولھن والوں کے گھر پہنچ چکا تھا کہ دولھے والوں نے دولھے میاں کی سواری کے لئے جس گھوڑے کا بندوبست کیا تھا وہ گھوڑا علیل ہو گیا ہے اور مزاج کی ناسازی کی وجہ سے باہر نہیں آ سکتا۔ اس لئے دولھے کی سواری کا انتظام کیا جائے ورنہ بارات نہیں آئے گی۔ خان صاحب میں اور ہم میں پھر مکالمہ ہوا جو پہلے والے مکالمے سے ذرا طویل تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر اس وقت ہم نے خان صاحب کی مدد نہ کی تو ان کی بھانجی عمر بھر کنواری رہ جائے گی۔ خان صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس وقت تو سواری کا انتظام کرنا ہے جو ممکن ہے۔ لیکن آئندہ کسی دولھے کا انتظام ناممکن ہوگا۔ — اس کے بعد ہماری موٹر کو نہلایا گیا۔ پھولوں سے سجایا گیا۔ اس کے چاروں طرف رنگ برنگی غبارے لگائے گئے اور خان صاحب نے ہم سے کہا: اب جاؤ اور نوشاہ میاں کو احتیاط سے لے آؤ۔ پہلے ہم اپنی گاڑی کے مالک تھے۔ اب ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ گاڑی خان صاحب کی اور ہم ان کے ہاں شوفر کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ خان صاحب کی نوکری بھی غنیمت تھی۔ لیکن ہمیں تو نوشاہ میاں کی پیشی میں حاضر ہونا تھا۔ نوشاہ میاں کے گھر پہنچے تو

معلوم ہوا کہ نوشاہ میاں کا پاجامہ ابھی درزی کے ہاں سے نہیں آیا ہے۔ نوشاہ کے چچا نے ہمیں حکم دیا کہ ہم پہلے ان کے ساتھ درزی کے ہاں جائیں۔ ہم نے یہ بھی کیا۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ دنیا کا کوئی نوشاہ آج تک پاجامے کے بغیر شادی کے پنڈال میں داخل نہیں ہوا ہے۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب نوشاہ میاں کی سواری بادبہاری اپنے کاشانے سے برآمد ہوئی۔ مع اپنے چار دوستوں اور ایک والد کے ہماری گاڑی میں سوار ہوئے۔ کار کو بہت آہستہ آہستہ چلانے کا حکم دیا گیا۔ راستہ میں جگہ جگہ ٹھہر کر بینڈ بجایا گیا۔ پٹاخے چھوڑے گئے۔ ساڑھے بارہ بجے گاؤں کی گشت ختم ہوئی۔ نوشاہ کے والد کو جب اطمینان ہو گیا کہ اب گاؤں کی کوئی گلی اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا ہے تو بارات دولھن کے گھر پہونچی۔ اس وقت تک ہمیں چائے کی ایک پیالی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

نوشاہ میاں ہماری گاڑی سے اتر کر شامیانے میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہم نے اپنی گاڑی کے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا اور بس گھر آکر ہی دم لیا۔

اب خان صاحب سے ہماری صاحب سلامت بھی نہیں ہے اور اب ہم میں کسی دعوت میں جانے کی ہمت بھی نہیں ہے۔

★

دو شعر

اختر راہی

حدیثِ فکر جہاں سے جو وقت مل جاتا
تو ہم بتوں سے بھی کچھ دیر گفتگو کرتے

صبا بھی آئے گی پیغامِ نوبہار لئے
چلو تو تذکرۂ زلفِ مشکبو کرتے

آدم نصرت

درباریے

○

سر سے پا تک چیختے غدارئے
یہ بڑی آنکھیں کئے سرکارئے
ہم انھیں شیخ و برہمن کہہ گئے
وہ ولی اللہ کے درباریے
خود کو سمجھے عقلمند، روشن ضمیر
اور کو سمجھے نہیں اتوارئے
ان کے حق میں نفرتیں کافی نہیں
نوک پر لیکر قلم کی مارئیے

○

مارنا جب ہے کسی دن سانپ کو
اپنی ہی پرچھائیوں کو مارئیے
خود کو الجھا کر خیالِ خام میں
کس لئے جی جان کو بیزارئیے
رہبری گم کردۂ منزل ہوئی
نقشِ پا خود بن گئے دیوارئیے
دیکھئے منزل وہی ہے یا نہیں
روح کو جھنجھوڑئیے، بیدارئیے
معرکے دیکھے جنون و عقل کے
برتری کو عقل کی انکارئیے
ہارنا تھا جن سے وہ تو جا چکے
کون ہیں نصرت وہ جن سے ہارئیے

○

یہ سب تو زنبیلوں میں جا کر چھپ گئے اتوارئے
آپ جا کر کس جگہ بیٹھے تھے منگل وارئے
سانپ لوگوں کو مطیع کرنے کا منتر مل چکا
جس قدر پھنکارنا ہے آپ کو پھنکارئیے
زندگی میں کورٹ کچہری کے یہ چکر کیا ہوئے
دیکھتے میں اپنے بھی تو آ گئے، دو چارئے
حضرتِ انساں کی نظروں میں صاحب آ گئے
شوق سے ڈنڈے کے آگے جا کے کنڈلی مارئیے

جسمِ انسانی کے چلتے پھرتے یہ ناسور ہیں
ان کو نصرت ہر طرح پھٹکارئیے، دھتکارئیے

(نوٹ: ـ آدم نصرت نقش کوکن کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کئی سال بمبئی سے باہر تھے، آپ آگئے ہیں تو امید ہے کہ نقش کوکن میں مسلسل لکھتے رہیں گے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں آدم نصرت کی تازہ فکر جھلکتی ہے۔ ان شعروں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے ــــ (ادارہ)

تصویریں کیا کہتی ہیں

ڈاکٹر رفیق زکریا

ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا

سیکولرزم اور سوشلزم، حب الوطنی اور قوم پرستی، مساوات اور انسان دوستی کے علمبردار ڈاکٹر رفیق زکریا سنہ ۱۹۲۰ء میں سوپارہ ضلع تھانہ میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی رفاہ عام کے کاموں اور سیاست میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے دوران برٹنیہ میں اسٹوڈنٹ کانگریس کی نمائندگی کے فرائض انجام دئے۔ لندن میں انڈیا لیگ کے سرگرم اور باعمل رکن رہے۔ سنہ ۴۲ء سے ۴۹ء تک لندن مجلس کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ برطانیہ اور یورپ میں قائم شدہ انڈین اسٹوڈنٹس سوسائٹی کی صدارت سنبھالی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں پراگ میں منعقدہ بین الاقوامی یونین کی افتتاحی تقریب میں ہندوستانی وفد کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ حصول تعلیم کے دوران ہندوستان کے باہر ڈاکٹر زکریا کی یہ سرگرمیاں ان کے شاندار سیاسی مستقبل کی محکم اور پائیدار بنیاد ثابت ہوئیں۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں مہاراشٹر لیجسلیٹو کونسل کے لئے منتخب ہوکر کانگریس پارٹی کے چیف وہپ مقرر ہوئے۔ اور اہل اورنگ آباد کی بے لوث محبت سے سنہ ۶۲ء اور سنہ ۶۷ء کے عام انتخابات میں مہاراشٹرا اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے۔ پہلی ٹرم میں نائب وزیر تھے اور اس وقت وزیر اوقاف ہیں۔ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا یہ زبردست اثر تھا کہ اکتوبر سنہ ۶۵ء میں ہند پاک تصادم کے بعد آپ کو ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں بھیجا گیا تھا۔

سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ تعلیمی اور سماجی حلقوں میں بھی آپ کو ہردلعزیزی حاصل ہے۔ انڈو عرب سوسائٹی کے بانی کی حیثیت سے آپ ہندوستان اور عرب ممالک کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کا باعث بنے۔ اورنگ آباد میں مولانا آزاد کالج اور بمبئی میں مہاراشٹر کالج آپ کی علمی خدمات کا زندہ ثبوت ہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ آپ کی مشہور تالیف "اسٹڈی آف نہرو" بہترین، بے نظیر انتخاب اور غور و فکر کی گہرائی کی غماز ہے۔ اقبالیات کے انگریزی تراجم شعر و ادب سے گہرے شغف اور زبان و بیان پر قدرت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ادبی تصنیف "رضیہ سلطانہ" نے بھی بے حد مقبولیت حاصل کی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا اور السٹریٹیڈ ویکلی میں منفرد تحریریں صحافت کے بلند ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ اور اسی لئے سیاسی، سماجی، صحافتی اور ثقافتی مسائل پر منعقد ہونے والی مجلسوں میں بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود شریک کئے جاتے ہیں۔ حالیہ انتخابات میں آپ اورنگ آباد حلقہ سے کانگریس کے امیدوار ہیں۔

جناب اسمٰعیل عمر دھنشے

امسال بمبئی میونسپل کارپوریشن نے جن ۱۶ مدرسین کو میئر ایوارڈ (۵۰۰ روپے نقد + ایک طلائی تمغہ) سے نوازا ان میں اردو سائڈ سے آرسی ماہم کے صدر مدرس جناب اسمٰعیل عمر دھنشے بھی شامل ہیں۔

جہاں تک درس و تدریس کا تعلق ہے دھنشے صاحب کی زندگی دوسروں کے لئے مشعل راہ ہے۔ وہ جہاں بھی گئے اور جہاں بھی رہے ماحول اور اپنے اسٹاف میں خلوص و محبت سے غایت درجہ کی یگانگت پیدا کرتے رہے۔ طلبہ کی صحیح تعلیم و تربیت پر انھوں نے کافی دھیان دیا ہے۔ اور اس ضمن میں ہمہ گیر کوششوں

کے اشتراک سے صحت مند اور خوشگوار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی میں دیانتداری، تندہی اور خلوص کیشی کا ثبوت دینے پر ہی یہ منصب و منزلت انھیں نصیب ہوا ہے۔

وہ ۵ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں موربہ ضلع قلابہ میں پیدا ہوئے۔ پی آر ٹریننگ کالج احمد آباد سے اول نمبر سے ٹریننگ کا امتحان کامیاب کیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک قلابہ ضلع لوکل بورڈ میں مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے اور پھر ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے بمبئی میونسپل کارپوریشن میں درس و تدریس میں سرگرم ہیں۔ انھوں نے تیرہ سال تک سخت ریاضت و جانفشانی سے کام کیا ہے، اور اکثر و بیشتر پرائمری اسکولوں میں اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔ ایک کامیاب صدر مدرس کے علاوہ وہ مندرجہ ذیل سوسائیٹوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی ورکنگ کمیٹی کے رکن۔
(۲) میونسپل ہیڈ ٹیچرس ایسوسی ایشن کے بھی برسوں رکن رہے۔
(۳) گریٹر بمبئی میونسپل پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری رہ چکے ہیں۔
(۴) سوشل سروس سوسائٹی موربہ کی اسٹینڈنگ کونسل کے ۱۵ سال سے رکن ہیں۔

اور فی الوقت نیواز دو پرائمری ٹیچرز فنڈ بمبئی کے صدر ہیں۔

مسز عارفہ صدیقی

بمبئی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے میئر اوارڈ پانے والی سیکنڈری اسکول کی ہیڈ مسٹریس محترمہ عارفہ صدیقی صاحبہ اورنگ آباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے متعلق ہیں (والد جناب محمد مستحسن صدیقی مانے ہوئے وکیل و ایڈوکیٹ رہے ہیں اور اب ان کی مسند پر ان کے صاحبزادے سراج المستحسن متمکن ہیں)۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد گرلز ہائی اسکول میں ہوئی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ آندھرا پردیش) سے کیا اور ایم۔ اے کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔

عملی زندگی: بی۔ ایڈ کی تکمیل کے بعد بحیثیت صدر مدرسہ اورنگ آباد گرلز ہائی اسکول شروع کی۔ تین سال تک وہاں نصابی تعلیم کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ مثلاً لڑکیوں کے لئے سوئی۔ سلائی۔ بنائی کی کلاسیں چلائیں۔

بمبئی کی زندگی: آرسی ٹیچرز ٹریننگ کالج امام باڑہ میں بحیثیت انسٹرکٹر شروع کی۔ جہاں پرائمری اسکول کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے علاوہ کیمپ، کلچرل پروگرام اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ۷ سال تک حصہ لیا۔

۱۹۶۵ء میں کارپوریشن کے سیکنڈری کے اجراء کے وقت بحیثیت صدر معلمہ ڈونگری سیکنڈری اسکول کے تقرر ہوا۔ جہاں مراٹھی اور اردو زبانیں ذریعہ تعلیم تھیں۔ دو سال کے اندر ہی اس اسکول کو اتنی ترقی دی کہ کارپوریشن کو دونوں زبانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اسکول بنانے پڑے اور اس طرح امام باڑہ سیکنڈری اسکول وجود میں آیا۔ بحیثیت صدر معلمہ امام باڑہ سیکنڈری اسکول میٹرک کے پہلے ہی گروپ کا نتیجہ ۹۸ فیصد لانے میں کامیابی ہوئی۔ لڑکیوں کی تعلیمی دیکھ بھال کے علاوہ طالبات کا فنڈ قائم کیا گیا اور نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے طالبات میں ایک یونٹ PINK HOUSE کے نام سے تیار کیا گیا۔ اس کے علاوہ بچیوں کی خانہ داری، کشیدہ کاری اور دیگر خواہشات اور ضروریات کے اعتبار سے مقابلے اور پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ اسی لئے اسکول میں لڑکیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ساڑھے سات سو تک پہنچ گئی ہے۔

ان ہی خدمات کے پیشِ نظر میونسپل حکام نے امسال "میئر ایوارڈ" صرف پندرہ سال کے تعلیمی تجربات کے مختصر تجربہ پر بطور ہمت افزائی عطا کیا۔

جناب ایچ ایم دلوائی

جناب حسین خان صفدری خان دلوائی کا جنم مرزولی چپلون میں

ہوا۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم وہیں ہوئی۔ پھر اعلیٰ تعلیم بی اے ایل ایل بی بمبئی یونیورسٹی سے کرنے کے بعد بمبئی ہی میں وکالت شروع کی اور مختصر عرصہ میں کافی شہرت پائی۔ پہلے ہائی کورٹ، پھر سپریم کورٹ کی سند حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی میں تحریری و تقریری مقابلوں میں متعدد انعامات جیتے۔ ثانوی تعلیم کے دوران چپلون میں "سیوا دل" کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ کالج کی مراٹھی بزم ادب کے سکریٹری رہے۔ "بمبئی ودیارتھی سنگھ" کانفرنس میں انھوں نے اپنے کالج کی نمائندگی کی تھی۔ بچپن ہی سے قومی خدمت کا ذوق و شوق رہا ہے۔

۱۹۵۷ء میں کھیڈ حلقۂ اسمبلی سے الکشن کے لئے کانگریسی امیدوار تھے۔ مگر چونکہ متحدہ مہاراشٹر کی تحریک زوروں پر تھی اور خود دلوائی صاحب اس حلقہ میں نووارد اور غیر معروف تھے اس لئے ناکام ہوئے۔ پھر بھی ضلع کے دیگر کانگریسی امیدواروں سے موازنتاً آپ کو زیادہ ووٹ ملے تھے۔ پھر ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء پانچ سالوں تک کھیڈ حلقہ سے آپ کا قریبی تعلق رہا۔ عوام کی کچھ مشکلات حل کیں۔ ممکنہ مدد اور رہنمائی فرمائی اس لئے ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں آپ اتنے بھاری ووٹوں سے چن کر آئے کہ مخالفین کے ڈپازٹ ضبط ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں دوبارہ آپ کی کامیابی آپ کی مقبولیت پر جیسے سہاگہ ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کو آزادئ ہند کی ۲۲ ویں سالگرہ کے موقع پر حکومت مہاراشٹر نے آپ کو جسٹس آف پیس۔ J.P. کے خطاب سے نوازا۔

مہاراشٹر اسمبلی کے حالیہ الکشن میں بھی آپ کانگریسی امیدوار ہیں۔ کھیڈ تعلقہ کے وکاس کو آپ نے نظم و ضبط سے شروع کیا ہے۔ پگڈنڈیوں کی جگہ اب کشادہ سڑکیں ہیں جن پر S.T. کی بسیں رواں دواں ہیں۔ بجلی، آبپاشی، ابتدائی تعلیم و سکنڈری تعلیم کو اس خطہ میں فروغ حاصل ہے۔ کسانوں کے بچے زیور علم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ جلد ہی ایک کالج جاری کرنے کا پلان ہے۔ ان خدمات کو یاد کرکے یقیناً اس حلقہ کے رائے دہندگان دلوائی صاحب کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرائیں گے۔

ڈاکٹر عمر فاروق قاضی

پروفیسر اے اے قاضی (جے پی) کے بھائی جناب عمر فاروق قاضی جنھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے (اکنامکس) میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا اور پھر مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے لندن چلے گئے تھے۔ مقام مسرت ہے کہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

پہلے آپ نے لندن یونیورسٹی سے اکنامکس کی ایم ایس سی M.Sc. ڈگری حاصل کی تھی اور اب حال ہی میں برمنگھم یونیورسٹی سے اکنامکس میں پی ایچ ڈی۔ Ph.D. کیا اور کامیاب و کامران ہو کر وطن واپس لوٹے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ اس وقت لندن میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ مگر اب وطن واپس لوٹنے کے بعد مادر وطن ہندوستان ہی میں خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے

قلابہ ضلع میں شری وردھن حلقہ سے اسمبلی کے الکشن کے لئے جناب بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ اقلیت اور اکثریت دونوں فرقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں، اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

گذشتہ بارہ تیرہ سالوں میں انھوں نے قلابہ ضلع کی جو خدمت کی ہے وہ بھلائی نہیں جا سکتی۔ وہ قوم کے ایک خاموش اور جوان سال خدمت گذار ہیں۔ قلابہ ضلع کو ترقی کے راستوں پر لانے کے لئے انھوں نے مناسب تجاویز کو بروئے کار لانے میں پوری کوشش کی ہے، اور اگلے منصوبوں کیلئے ضلع قلابہ کو ان کی اشد ضرورت ہے۔

ضمیر اشرف
ایم۔ایس۔سی

جواہرات

عقائد اور توہمات

جہالت توہمات کا ہمیشہ پیش خیمہ رہی ہے۔ زمانۂ قدیم میں جہاں جواہرات زیبائش اور خوشنمائی کے لئے استعمال ہوتے تھے وہاں اکثر و بیشتر وہ طرح طرح کے توہمات سے بھی منسلک تھے۔ یہ توہمات مختلف ممالک میں مختلف تھے۔ پرانے قصے کہانیوں میں جواہرات مافوق الفطرت اثرات بیان کئے گئے ہیں۔ بعض کے استعمال سے کسی بیماری کا علاج ہوتا تھا تو کسی سے روحانی طاقت آتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کا استعمال انسان کی قسمت پر بھی کافی اثر انداز تصور کیا جاتا تھا۔ مگر جوں جوں انسان ترقی کرتا اور قدرت کے نادرہ کار ہاتھوں کی صنعت طرازیوں کو سمجھتا گیا یہ توہمات کم ہوتے گئے۔ گو کہ بالکل ختم نہیں ہوئے۔ اور اس زمانہ میں بھی اکثر لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف جواہرات ان کی روزمرہ زندگی میں اور آئندہ کے حالات میں موافق یا غیر موافق ہوتے ہیں۔ اور کافی لوگ جواہرات کا استعمال صرف اسی عقیدہ کی بنا پر کرتے ہیں۔ اس عقیدہ سے پڑھے لکھے لوگ مبرّا نہیں ہیں۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑی تعداد اس قسم کے توہمات پر یقین رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر نیلم کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ یہ جواہر بہت برا اثر ہوتا ہے اور نیلم ہر ایک کو موافق نہیں آتا۔ چنانچہ حال ہی میں ایک صاحب نے جو حقیقت میں سائنسدان ہیں اور علم الجواہرات سے بخوبی واقف ہیں، اور شاید ان توہمات پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ بازار سے ایک نیلم خریدا اور ڈرتے ڈرتے اس کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنے بازو پر باندھا۔ مگر تین دن کے بعد ہی اس نیلم کو جوہری کو واپس کر دیا کہ وہ ان کے موافق نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے باندھنے کے تین دن کے اندر ہی ان کا ملازم نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔

اس قسم کے توہمات کیسے اور کیوں شروع ہوئے یہ بتانا مشکل ہے مگر زیادہ خیال یہی ہوتا ہے کہ کبھی کسی کو کوئی جواہر استعمال کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد کوئی سانحہ پیش آیا ہوگا اور اس سانحہ کا تعلق اس جواہر سے جوڑ دیا گیا ہوگا۔ یا بعض عقائد کسی اچھے مقصد کے تحت پرانے زمانہ کے بڑے بوڑھوں نے رائج کر دیئے۔ مثلاً ہندوستان میں یہ عقیدہ ہے کہ ہیرے کا پانا اور کھونا دونوں برا ہے۔ چونکہ ایک قیمتی پتھر ہے اس لئے کسی سمجھدار اور ذہین شخصیت نے یہ عقیدہ لوگوں کے ذہن میں پیوست کر دیا تاکہ لوگ ہیرے کو سنبھال کر رکھیں اور اسے کھونے نہ دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا پانا

اس لئے برا کہتے ہیں تاکہ اگر کسی کا ہیرا گم ہو جائے تو دوسرا اس کو نہ اٹھائے۔ بہر حال بعض توہمات یا عقائد جو مختلف جواہرات کے ساتھ وابستہ کئے گئے ہیں ان کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

(۱) الماس (ہیرا)

بعض مشہور تاریخی ہیرے منحوس تصور کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہیرے جس شخص کے پاس بھی رہتے ہیں اس کے لئے تباہی کا سامان بنتے ہیں۔ ان میں سے بعض بیش قیمت بھی ہیں۔ تاہم تاریخ ان کا منحوس ہونا ثابت کرتی ہے۔ ان میں مشہور ہیرا ہوپ (HOPE) بھی ہے۔ یہ نیلگوں رنگ کا ہیرا فرانسیسی سوداگر ٹیورنیر (TAVERNIER) نے ۱۶۴۲ء میں ہندوستان کے ایک مندر سے چرایا تھا اور لوئی چہار دہم کے ہاتھ فروخت کیا۔ بعد میں اس کو فلیپ ہوپ نے ۱۸ ہزار پونڈ میں خریدا۔ یہ ہیرا مشہور فلم ایکٹریس مس یوہی کے پاس رہا۔ اور مس یوہی نے اپنی شہرت کم ہونے کی وجہ اس ہیرے ہی کو بتایا۔ اس ہیرے کو ۱۹۱۲ء میں واشنگٹن کی مسز میک لین نے ۶۰ ہزار پونڈ میں خرید لیا۔

ہیرے میں بعض نقائص بھی اس کے برے اثرات کی وجہ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں عقیدہ ہے کہ اگر ہیرے میں سرخ رنگ کا دھبہ ہو (اس نقص کو رند ہو کہتے ہیں) تو ایسا ہیرا جان اور مال کے لئے نقصان دہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہیرے کے اندر اگر پرند کے مانند دھاری ہو (اس نقص کو چھیدا کہتے ہیں) تو ایسا ہیرا دوستوں سے جدائی کا موجب تصور کیا جاتا ہے۔ جس ہیرے میں دھاری نمایاں ہو (دیکھا) تو عقیدہ ہے کہ اس قسم کے ہیرے کو پہننے سے سانپ کے کاٹنے کا امکان ہوتا ہے۔ دھندلا ہیرا جس میں کوے کے پنجے جیسا نشان ہو (جس کو کابا ڈا کہتے ہیں) اس سے موت اور بربادی کا امکان ہوتا ہے۔ ان نقائص کے علاوہ اور دوسرے نقائص مثلاً کالنکا، تراسا وغیرہ بھی برے تصور کئے جاتے ہیں۔

(۲) لعل

پرانے زمانہ میں عقیدہ تھا کہ لعل زہر کا توڑ ہے اور طاعون سے بچاتا ہے۔ غم دور کرتا ہے اور آسودہ حال کی برائیوں سے بچاتا ہے، اور برے خیالات نہیں آنے دیتا۔ خیال تھا کہ پہننے والے پر برا وقت آنے پر اس کی رنگت پھیکی پڑ جاتی ہے، اور برا وقت گذر جانے پر اس کی رنگت دوبارہ واپس آجاتی ہے۔

ہندوستان میں لعل کے بارے میں عقیدہ ہے کہ دوسرے جواہرات کی طرح اگر بعض خامیاں ہوں تو اس کے اثرات برے ہوتے ہیں، اور اگر لعل بے نقص اور نفیس ہو تو اس کے استعمال سے دولت، ثروت اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہر حال یہ خامیاں اور ان کے اثرات کا جو عقیدہ ہے وہ درج ذیل ہیں:-

۱- دورنگا لعل (دو چھیہ) یعنی جس میں دوہرا رنگ جھلکے (دوستوں کی موت اور نقصان)
۲- ویروپا- یعنی چڑیا کے پنجہ کی طرح کا نشان ہو- (بے عزتی لاتا ہے)
۳- سمویدا- یعنی شگاف کا نشان ہو (پہننے والے پر کسی ہتھیار کا وار ہو)
۴- اسودن- یعنی ایسا لگے جیسے دودھ میں ڈوبا ہوا (بہت سے حادثات پیش آتے ہیں)۔
۵- کوکیلا- یعنی اس میں شہد کی بوند کا ایسا نشان ہو (جان، مال اور عزت کو خطرہ)
۶- مرا- یعنی بے رنگت۔ (مال کا نقصان)
۷- دھوڑا- یعنی دھندلا دکھائی دے۔ (بجلی گرنے کا امکان)

(۳) نیلم

نیلم کے بارے میں عقیدہ ہے کہ یہ بہت سی قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پوپ سوئم نے تمام پادریوں کو نیلم کی انگوٹھی پہننے کا حکم دیا تھا۔ پادری سینٹ جیروم نے لکھا ہے کہ نیلم پہننے سے حکومت نہیں ہوتی، اور یہ دشمنوں سے بھی سلامتی لاتا ہے۔

(۴) زمرّد

زمانۂ قدیم میں زمرد دیوی دیوتاؤں کو نذر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ عقیدہ تھا کہ زمرد نذر کرنے سے ایمان پختہ ہوتا ہے، اور اس کو اس اظہارِ عشق کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اور عقیدہ تھا کہ اس کا رنگ بدلنے سے معشوق کی ہرجائیت کا پتہ چلتا ہے۔ زمرد کو آنکھوں کیلئے فرحت بخش خیال کیا جاتا تھا۔

(۵) پکھراج (یاقوت زرد)

عقیدہ ہے کہ پکھراج پہننے سے دولت اور ثروت آتی ہے اور اس کا پہننے والا غریب نہیں ہوتا۔ مشہور شعر ہے ؎

ہر کہ انگشتری یاقوت زرد
در دست کند فقیر نشود

۶- فیروزہ

پہلے زمانہ میں اکثر لوگوں کا عقیدہ تھا کہ فیروزہ پیش کیا جانا چاہیئے، خریدنا چاہیئے۔ محبت کے ہاتھ سے دیا ہوا فیروزہ خوش بختی لاتا ہے۔ اس کو پہننے والا جب خطرہ میں ہوتا ہے تو فیروزہ کا رنگ ہلکا پڑ جاتا ہے۔

۷- سنگ قرون (OPAL)

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض سنگ قرون منحوس ہوتے ہیں۔ اصلیت جو بھی ہو لیکن اسپین کے بادشاہ الفانسو دوازدہم (۱۸۶۳ء) کے پاس یقیناً ایک منحوس سنگ قرون تھا۔ اپنی شادی کے موقع پر اس نے ملکہ کو ایک سنگ قرون کی انگوٹھی پیش کی۔ ملکہ جلد ہی فوت ہو گئی۔ پھر یہ انگوٹھی اس نے اپنی بہن کو دی۔ وہ بھی تین ماہ کے اندر ہی فوت ہو گئی۔ پھر اس نے یہ انگوٹھی خود پہنا مگر جلد ہی خود بھی مرگیا۔ ہو سکتا ہے یہ سب محض اتفاقات ہوں۔

۸- جمونیا (نیلم ارغوانی)

یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جمونیا کے پیالوں میں شراب پینے سے نشہ نہیں ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جمونیا جادو ٹونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ (واللہ اعلم)

۹- مونگا

مونگا بہت سی قوتوں کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ رومی مونگے کے ہار بچوں کے گلے میں باندھتے تھے تاکہ دانت صحیح نکلیں اور وہ بیماریوں سے بچے رہیں۔ یہ بھی عقیدہ تھا کہ مونگا ایجاد اور دوسرے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ سر ہوگ پلاٹ نے ۱۴۵۹ء میں لکھا ہے کہ مونگا پہننے والا اگر بیمار پڑ جاتا ہے تو مونگے کا رنگ ہلکا پڑ جاتا ہے اور جوں ہی وہ ٹھیک ہوجاتا ہے تو مونگا اصلی رنگ کا ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی مونگا ایسی اسی قسم کے عقیدوں کی وجہ سے بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۰- حجر الشیف (سنگ یشب)

چینیوں کا عقیدہ تھا کہ یشب کا سفوف بنا کر اگر پانی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اندرونی بیماریوں کا علاج ہے، تھکان دور کرتا ہے، عمر بڑھاتا ہے اور مرنے کے بعد سڑنے سے بچا دیتا ہے۔

۱۱- عنبر

عنبر بھی بہت سی قوتوں کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں عنبر کے ٹکڑے ہار کی شکل میں گوندھ کر بچوں کے گلے میں باندھتے ہیں تاکہ دانت آسانی سے نکلیں۔ ترکوں کا عقیدہ تھا کہ عنبر کے منہ نال کا استعمال تمباکو نوشی کے برے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس سے وضع حمل کی صعوبتیں اور پیچیدگیاں کم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھوت پریت اور گندی روحوں کے اثرات سے حفاظت بھی ہوتی ہے۔

نجوم کے اعتبار سے جواہرات کی جو نسبتیں ہیں وہ

درج ذیل ہیں :-

الماس	شمس	مروارید	قمر در زحل
حجرالبلور	زحل	مرجان	مشتری
زمرد	عطارد و زہرہ	یاقوت کبود	شمس
عقیق	زہرہ	یاقوت احمر	شمس
لعل بدخشاں	شمس	یشب	قمر

صدف — زہرہ

ہندوستان میں نو جواہر ایسے سمجھے گئے ہیں جن کا استعمال مختلف سیاروں کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے (واللہ اعلم) یہ نو جواہر نورتن کہلاتے ہیں۔ ان کے اثرات درج ذیل ہیں :-

۱۔ مانک (لعل) سورج کا اثر زائل کرتا ہے۔
۲۔ موتی چاند کا اثر زائل کرتا ہے۔
۳۔ مونگا منگل کا اثر زائل کرتا ہے۔
۴۔ زمرد بدھ کا اثر زائل کرتا ہے۔
۵۔ پکھراج برہسپت (جمعرات) کا اثر زائل کرتا ہے۔
۶۔ ہیرا شکر کا اثر زائل کرتا ہے۔
۷۔ نیلم سنیچر کا اثر زائل کرتا ہے۔
۸۔ گئومیدک راہو کا اثر زائل کرتا ہے۔
۹۔ لہسنیہ کیتو کا اثر زائل کرتا ہے۔

دنیا میں اکثر لوگ پیدائش کے مہینہ کے اعتبار سے جواہرات کو موافق تصور کرتے ہیں۔ جو نیچے درج ہیں :-

جنوری	گارنٹ (گومیت)	جولائی	جزا یا فیروزہ
فروری	جمونیا (نیلم ارغوانی)	اگست	عقیق سرخ یا خزلے یمانی
مارچ	یشم یا نیونیہ	ستمبر	کرائیسولائٹ
اپریل	ہیرا یا نیلم	اکتوبر	سنگ قروان یا زبرجد
مئی	سنگ سلیمانی یا زمرد	نومبر	ٹوپاز
جون	زمرد یا سنگ سلیمانی	دسمبر	لعل یا فیروزہ

پان جو ایک دوا بھی ہے

پان کی بیل ہندوستان کے شمال مشرقی حصے اور جنوبی خطوں کے مرطوب سبزہ زاروں اور جنگلوں کی قدرتی پیداوار ہے۔ جس کی کاشت ہندوستان کے بہت سے خطوں میں کی جاتی ہے نیز بنگلہ دیش میں بکثرت اس کی کاشت ہوتی ہے۔

خواص واستعمال

اس کی بیل کے تازہ یا ہرے پتے (پان) اور جڑیں دواؤں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ پتے (پان) کاسر ریاح، دافع تعفن، مفرح، مخرج بلغم اور مخرج لعاب ہوتے ہیں۔ پان کا رس شہد کے ساتھ بچوں کو سوء ہضم، درد شکم، اسہال اور خراش حنجرہ میں اور بخار اتارنے کے لئے روزانہ دو بار ایک ڈرام کی مقدار میں دیا جاتا ہے۔ دودھ کے ساتھ پان کا رس مقوی باہ کے لئے دیا جاتا ہے۔ کھانسی کے لئے یہ رس ادرک کے ساتھ پلایا جاتا ہے۔ پان کا [illegible] (۱۰ سے ۳۰ قطرہ) خراش حلق، [illegible] ضیق النفس، سوء ہضم وغیرہ بچوں کی عام شکایتوں میں مفید [illegible] ہے۔ پان کی گلوری سے منہ کی بدبو دور ہوتی ہے۔ پان چباتے رہنے سے [illegible] بلغم کے پیک کے ساتھ مواد خارج ہوتے ہیں اور سانس کی نالی [illegible] نہیں پانے پاتے۔ بیرونی طور پر پان کا رس آنکھوں میں ٹپکانے سے درد آشوب چشم میں افاقہ ہوتا ہے اور اس کا رس کان میں ڈالنے سے کان کا درد بھی کم ہو جاتا ہے۔ پان پر تیل لگا کر اور گرم کرکے انھیں امراض سینہ کھانسی خراش [illegible] اور ضیق النفس وغیرہ میں مقام ماؤف پر باندھا جاتا ہے۔ بالخصوص [illegible] جیسے درد جگر کیلئے جگر پر، درد شکم اور نفخ وغیرہ کیلئے پیٹ پر، غدود کی ورم دور کرنے کیلئے غدودوں پر، دودھ کا افراز بند کرنے کیلئے پستانی پھوڑوں پر، درد سر کیلئے پیشانی اور [illegible] اور ورم خصیہ اور ورم ملیح پر باندھا جاتا ہے۔ ڈریسنگ کے طور پر

سلمان ماهی

تھانہ ضلع

جس طرح مہاراشٹر پر خوشنما سمندری کنارے
[حر]ت بخش ہریالی اور گوناگوں خوبیوں کے لئے خطہ کوکن
[مش]ہور ہے اُسی طرح کوکن اضلاع قلابہ اور رتنا گیری میں
[تھ]انہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی اہمیت اس
[لح]اظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ نہ صرف شہر بمبئی کے نزدیک
[وا]قع ہے بلکہ یہ ریلوے کا جنکشن ہونے کی وجہ سے صنعت
[و ح]رفت کے پھیلاؤ کے لئے بھی مفید ہے۔ اس کے علاوہ خشکی
[سڑ]کوں، ٹرانسپورٹ کی سہولیات اور آمد و رفت کے جملہ وسائل
فراہمی کے باعث نہ صرف اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے بلکہ
[صن]عتی علاقہ قرار دیئے جانے کے بعد مہاراشٹر کی اقتصادی حالت
[کے] فروغ کا باعث بھی ہوا ہے۔ ضلع تھانہ میں مندرجہ ذیل تیرہ
[تع]لقے ہیں: تھانہ، کلیان، بھیونڈی، الہاس نگر،
[ش]ہپن، تلاسری، ڈہانو، جوار، واڈا، کوماڈ وغیرہ۔

تمام ضلع کی ۶۵ فیصد آبادی کاشتکاری پر زندگی
[ب]سر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ۳۰ فیصد آبادی جو
[آد]یباسیوں اور پس ماندہ طبقوں پر مشتمل ہے اس کی گزر اوقات
[بھ]ی کاشتکاری پر ہے۔ اس کے باوجود ضلع تھانہ چند سال
[پہ]لے ایک ایسا صوبہ تھا جو کم پیداوار، بنجر زمین اور ناقابل
[کا]شت علاقوں کے لئے پورے مہاراشٹر میں مشہور تھا۔ مگر
انتظامیہ کی شبانہ روز محنت اور کاشتکاروں کا تعاون اور رہنمائی
کے بعد نہ صرف آج خود کفیل ہوگیا ہے بلکہ ہمسایہ علاقوں میں
اناج، پھل اور دیگر ضروری چیزوں کی برآمد بھی کرنے لگا ہے۔
——— گذشتہ چند سالوں میں تھانہ نے جو ترقی کی ہے
زیر نظر مضمون میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کاشتکاری میں اصلاح :-

پہلے پنچسالہ منصوبہ کے ابتداء میں تعلقہ کوماڈ میں
"کوماڈ کسان سنگھ" نامی ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ اس
ادارے نے اپنے علاقہ میں جاپانی طریقۂ کاشت کا تجربہ کیا۔
نتیجتاً جب پیداوار میں حیرت ناک اضافہ ہوا تو دیگر مقامات
کے کسانوں نے بھی اسی طریقے سے زراعت شروع کی۔ اس کے
علاوہ حکومت نے مختلف تعلقوں میں کھاد اور بیج کی فراہمی نیز
زراعتی سامان کی خریدی کے لئے آسان قسطوں پر قرض دینے
کے لئے امداد باہمی کے اداروں کی بنیاد رکھی تو کسانوں نے
جاپانی زراعتی اسکیم کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی پیداوار میں اضافہ
کا کام شروع کیا۔ ان منصوبوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۱۹۷۱ء میں کاشتکاری
کا رقبہ جو ۳۱٫۹۵۰ ہیکٹر تھا، اب ۸۰٫۵۳۹ ہیکٹر تک پہنچ گیا ہے۔
اس طرح ضلع کی کل قابل کاشت زمین ۱٫۵۰٫۰۰۰ ہیکٹر بن گئی ہے۔
جس کا ۵۵ فیصد حصہ ترقی یافتہ بنیاد پر کاشت کیا جاتا ہے چونکہ

ضلع تھانہ کی سرزمین بڑے بڑے منصوبوں کی تکمیل کے لئے موزوں نہیں ہے اسلئے کاشتکاری اور باغبانی کو فروغ دینے کے لئے چھوٹی چھوٹی اسکیموں کو جاری کیا گیا ہے۔ گذشتہ دس سالوں میں مندرجۂ ذیل اسکیمیں مکمل کی گئیں :-

(۱) ۹۸۱ نئے کنویں کھودے گئے۔ جس کی وجہ سے کنوؤں کی تعداد ۷۴۸۲ ہوگئی ہے۔

(۲) ۳۹ نئے بند باندھے گئے۔

(۳) ۴ تالاب بنائے گئے۔

ان اسکیموں کی تکمیل کے نتیجے میں بسین، پالگھر اور ڈہانو کے کاشتکار کیلے چکو اور امرود کی برآمد کرنے لگے ہیں۔ جبکہ کلیان، بھیونڈی اور الہاس نگر کے کسان بھرپور سبزی ترکاری اُگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بمبئی کی رنگین فضا میں تازگی گھولنے کے لئے رنگ برنگے پھول بھی روانہ کر رہے ہیں۔

ماہی گیری :-

تھانہ ضلع سے لگ کر ۱۱۰ کیلو میٹر سمندری کنارا ہے جس میں کامیابی کے ساتھ ماہی گیری کی جاتی ہے۔ اس کے فروغ کے لئے امداد اور جدید سامان کی فراہمی کے بعد ماہی گیری میں ۱۲۲۵۰ میٹرک کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مچھلیوں کی حفاظت کے لئے برف گھر (COLD STORAGE) بھی بنائے گئے ہیں جو امدادِ باہمی کے اصول پر چلائے جاتے ہیں۔ اس پیشے میں جدید طریقے اختیار کرنے کے لئے دو ٹریننگ سنٹر بھی کھولے گئے ہیں جہاں ماہی گیروں کے بچوں کو اس فن میں مہارت حاصل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

آمد و رفت کے ذرائع :-

صنعتی مرکزوں کے قیام اور بڑھتے ہوئے دھندوں کے پیش نظر نئے راستوں کی لمبائی میں گذشتہ بیس سالوں کے دوران ۵۷۵ کیلو میٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ۴۰۰ کیلو میٹر نئے راستے بنائے گئے ہیں۔ ممبئی احمد آباد روڈ بسین کی کھاڑی پر اور ممبئی پونہ روڈ پر تھانہ کی کھاڑی پر پل بھی تعمیر کئے جارہے ہیں۔ جن کی وجہ سے بالترتیب ۱۹ اور ۲۰ کیلو میٹر کا فاصلہ کم ہو جائے گا۔

پورے تھانہ ضلع میں ۴ ایس۔ ٹی بسیں دوڑتی ہیں۔ جس کی وجہ سے آمد و رفت میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ نئے راستوں کی اسکیم شروع کرنے سے قبل بسوں کی کل تعداد ۹۸ تھی اور راستے ۳۹ تھے۔ مگر اب ان میں بالترتیب ۲۶۶ اور ۳۲۱ کے حساب سے اضافہ ہوا ہے۔

تعلیمی ترقی :-

۲۰۰ آبادی والے ہر گاؤں میں اسکولیں کھولی جا رہی ہیں جن کی وجہ سے اسکولوں کی تعداد حسب ذیل ہوگئی ہے پرائمری اسکول ۲۰۵۶ اور سیکنڈری اسکول ۱۷۳۔ دس سال قبل تھانہ ضلع میں ایک بھی کالج نہ تھا۔ مگر اب ۵ کالج تعمیر ہوئے ہیں جو پونا یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔

صنعتی ترقی :-

دس سال قبل یہاں صرف ۳۹۳ بڑے کارخانے تھے۔ مگر اب ان کی تعداد ۷۸۸ ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے کارخانے جہاں ۵۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں ۲۴۵ کے لگ بھگ ہیں۔ چھوٹی صنعتوں اور گھریلو دھندوں کے مرکز بھی ۴ ہزار سے زائد ہوگئے ہیں۔ بھیونڈی میں ہینڈ لوم کی صنعت نے کافی ترقی کی ہے۔ ایسے یہاں لومس کی تعداد ۴ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ان صنعتوں کے علاوہ ضلع تھانہ کے محل وقوع کو مدنظر رکھ کر مرکزی حکومت نے ۶۶ کروڑ کی لاگت سے تارا پور میں ایٹمی توانائی کام کز قائم کرنے کا منصوبہ شروع کیا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے بعد نہ صرف تھانہ کی صنعتی ترقی

میں بیش بہا اضافہ ہوگا بلکہ مہاراشٹر کی ایک بڑی آبادی کو روزگار بھی فراہم ہوگا۔

ضلع کی ترقی کا جائزہ

(۱) — دس سال قبل صرف ۳۹ گاؤں ہی میں بجلی فراہم کی جاتی تھی۔ اب ۹۲۸ گاؤں میں فراہم کی جاتی ہے۔

(۲) — ۱۰ سال قبل امداد باہمی کے اداروں کی تعداد ۱۰۷۸ تھی۔ اب ۶۵۸ ہوگئی ہے۔

(۳) — راستوں کی لمبائی ۱۶۷۰ کلومیٹر سے ۲۳۷۰ کیلومیٹر تک پہنچ گئی ہے۔

(۴) — پہلے پرائمری ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں (کالج) کی تعداد بالترتیب ۱۰۴۷، ۴۲ اور صفر (۰) تھی مگر اب ۲۰۵۶، ۱۷۳ اور ۵ ہوگئی ہے۔

(۵) — پہلے پورے ضلع میں ۱۳ ہسپتال اور ۷ حفظانِ صحت کے مراکز تھے۔ اب ان کی تعداد میں ۶۹ اور ۱۷ کا اضافہ ہوا ہے۔

(۶) — امداد باہمی کے طور پر چلنے والی اناج کی میلوں کی تعداد ۳ تھی اور اب ۱۹ ہوگئی ہے۔

الغرض تھانہ ضلع نے گذشتہ دس سالوں کے دوران جو ترقی کی ہے یہ اس کا مختصر خاکہ ہے۔ مگر اس کی بیش رفت دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضلع اپنے صنعتی پھیلاؤ کی وجہ سے پورے مہاراشٹر میں نمایاں مقام حاصل کر سکتا ہے۔

★ ★ ★

سُنہری شام ہو
یا روپہلی چاندنی
سطح سمندر پر ہلکی ہلکی لہروں کا لُطف اٹھانے
اور سمندری ہواؤں سے اپنے دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے کیلئے

اپولو یونین موٹر لانچ سروس

آپ کی خدمت کیلئے ہمہ وقت تیار ہے

بمبئی کی بندرگاہ کے قریب ہی نہوہ، اورن اور علیفنٹا وغیرہ تاریخی مقامات کی سیر یا پکنک ٹرپ میں ہماری تیز رفتار، آرام دہ اور خوبصورت موٹر لانچیں آپ کی تفریح میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

ای۔ اے مُلّا — اپالو یونین موٹر لانچ سروس۔ اپالو بندر۔ بمبئی ۱

تندرستی ہزار نعمت ہے

تندرستی کے لئے ہمارے کھانے پینے میں ایسے بیش بہا خزانے ہیں اگر ان کا خیال رکھا جائے تو شاید دواؤں کی ضرورت بھی نہ پڑے ـــ اس اعتبار سے یہ نظم قارئین نقش کوکن کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی۔

ادارہ
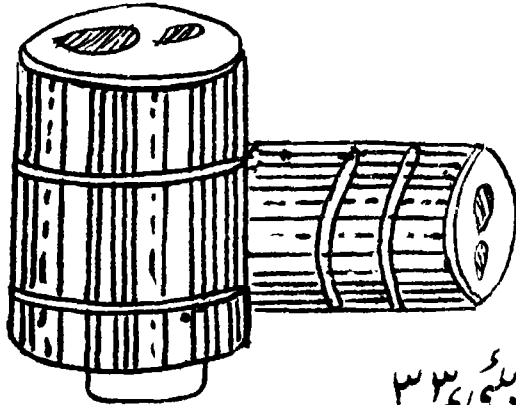
جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے — وہاں تک بچنا چاہئے دوا سے

اگر تجھ کو لگے جاڑے میں سردی — تو استعمال کر انڈے کی زردی

جو ہو محسوس معدے میں گرانی — تو چکھ لے سونف یا ادرک کا پانی

جو ہو خوں کم بنے بلغم زیادہ — تو کھا گاجر چنے شلغم زیادہ

جو بدہضمی میں چاہے تو افاقہ — تو کر لے ایک دو وقت کا فاقہ

جو پیچش ہو تو پیچ اسطرح کس لے — ملا کر دودھ میں لیموں کا رس لے

جگر کے بل پہ ہے انسان جیتا — اگر ضعفِ جگر ہے کھا پپیتا

جگر میں ہو اگر گرمی دہی کھا — اگر آنتوں میں خشکی ہو تو گھی کھا

تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے — تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے

جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس — تو پھر ملتانی مصری کی ڈلی چوس

زیادہ گرم دماغی ہے تیرا کام — تو کھایا کر ملا کر شہد و بادام

اگر ہو دل کی کمزوری کا احساس — مربّہ آملہ کھا اور انناس

اگر گرمی کی شدت ہو زیادہ — تو شربت پی بجائے آب زیادہ

جو دکھتا ہے گلا نزلے کے مارے — تو کر نمکین پانی کے غرارے

اگر ہے درد سے دانتوں کی بے کل — تو انگلی سے مسوڑوں پر نمک مل

ذیابیطس اگر تجھ کو ہے مارے — تو جامن تازہ کھا اور لے نظارے

جو ہے افکار دنیا سے پریشاں
خدا کی یاد سے کر دل کو شاداں

ذکیہ ہاشمی

ازدواجی مسائل
اور اُن کا حل

میاں بیوی کے تعلقات از خود خوشگوار نہیں ہوتے، اس کیلئے کوشش کرنی پڑتی ہے اور رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ ذکیہ ہاشمی کا یہ مضمون گھریلو زندگی خوشگوار بنانے میں یقیناً مددگار ثابت ہوگا۔ (ادارہ)۔

کیا آپ نے اپنے شوہر کی شخصیت کو سمجھ لیا ہے۔ کیا آپ یہ جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر کن باتوں کو پسند کرتے ہیں ــــ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ برسہا برس تک رفیق اور شریک زندگی ہونے کے باوجود عورتوں کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ مرد کیا چاہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ واضح شعور کے ساتھ اس مسئلہ پر سوچا نہیں جاتا۔ آئیے کچھ دیر کے لئے سوچیں کہ مرد بیویوں سے کیا چاہتے ہیں؟

سب سے پہلی بات تو یہ کہ مرد اپنا احترام چاہتے ہیں عیب جوئی اور نکتہ چینی کی عادت اچھی نہیں لگتی۔ وہ اس کے متوقع ہوتے ہیں کہ بیوی کے منہ سے ان کے حق میں چند تعریفی کلمات اور ممنونیت اور تشکر کے چند الفاظ نکلیں۔ مرد بیوی کی تعریف کے معاملے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ لیکن عورتیں اکثر اس بارے میں کنجوس ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے روشن پہلوؤں سے زیادہ تاریک پہلوؤں پر نظر رکھتی ہیں، اور ان کا بار بار تذکرہ کرتی ہیں۔ اور یہ عادت ایک خاص حد سے زیادہ ہونے کے بعد مرد کی طبیعت کو مکدر کرتی ہے اور ناخوشگواری کا احساس پیدا کرتی ہے،

اس لئے ہمیشہ کوشش کیجئے کہ آپ کی زبان یا طرز عمل سے ایسی کوئی بات ظاہر نہ ہو جس سے شوہر کو یہ احساس ہو کہ آپ کے دل میں اس کا احترام نہیں ہے۔ یا آپ کو اپنے شوہر میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آرہی ہیں۔ عام زندگی میں بے تکلفی کے باوجود ایسا رویہ اختیار کیجئے کہ جس سے شوہر کا احترام برقرار رہے۔

جدید تہذیب نے مساوات مرد و زن کا جو درس دیا ہے اس کے مضر ہونے کا اعتراف اب اہل یورپ بھی کرنے لگے ہیں۔ اسلام کی تو پہلے سے یہ تعلیم ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ یعنی مرد کو عورت پر برتری دی گئی ہے۔ اگر آپ اپنے رویہ سے مرد کے اس احساس برتری کو ٹھیس پہونچائیں تو ازدواجی زندگی کبھی خوشگوار نہیں رہے گی لیکن مردوں کو وہ روایتی احترام بھی پسند نہیں ہے جو عورت اور مرد کے درمیان ایک خلیج حائل کر دیتا ہے۔ جھوٹی شرم اور عزت کا تصور صحیح نہیں۔ اظہار محبت کو مرد بھی پسند کرتا جس طرح عورتیں یہ پسند کرتی ہیں ــــ جب مرد کام کاج

تھکے ہارے گھر پہونچتے ہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ گھر کی فضا پرسکون ہو، اور اس پرسکون فضا میں بیوی خلوص اور محبت سے ان کا خیر مقدم کرے۔ ہمارے گھروں میں کام کاج کی زیادتی اور دوسرے مسائل کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب شوہر گھر میں آتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ بیوی باورچی خانے میں مصروف ہے یا پھر بچوں کے ساتھ الجھی ہوئی ہے۔ اگر آپ کے شوہر کے ساتھ روزانہ یہی ماجرا پیش آتا ہے تو یہ افسوسناک ہے۔ اس طریقے کو ختم کیجئے۔ اپنا تمام کام کاج شوہر کے آنے سے پہلے ختم کر کے بالکل فارغ ہو جائیے اور جب وہ آئیں تو نہ کھانا پکانے کا مسئلہ ہو نہ بچوں کی ایں ایں سنائی دے۔ ایک پرسکون گھریلو فضا ہو اور شوہر محسوس کرے کہ بیوی ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہے۔ اس موقع پر کیا حرج ہے اگر آپ ان کا کوٹ آگے بڑھ کر تھام لیں، اور ٹائی کی گرہ کھول دیں، جرابیں سنبھالیں۔ گھر میں پہننے کے کپڑے ان کے حوالے کر دیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام اس بات کو ظاہر کریں گے کہ آپ انھیں اہمیت دے رہی ہیں۔ اور کون مرد ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ بیوی کی زندگی میں اس کی شخصیت کو اہم درجہ حاصل رہے۔

مرد جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس توقع کے ساتھ کہ یہاں ذہنی سکون ملے گا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جوں ہی شوہر نے قدم گھر میں رکھا بیوی نے کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے لا کر رکھ دیا: صبح منے کی فیس دینی ہے، درزی کا بل آیا ہے، اماں کو کھانسی ہو گئی ہے۔ حالانکہ یہ سب مسائل ایسے ہیں کہ انھیں بعد میں بھی شوہر کو بتایا جا سکتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مسائل کی گٹھری کھولنا کیا ضروری ہے۔ اس سے شوہر کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ گھر مسائل کی جگہ ہے، پریشانیوں کی جگہ ہے۔ سکون اور راحت کا مقام نہیں۔ اس لئے یہ یاد رکھئے کہ شوہر کے گھر میں آتے ہی فوراً ہی مسائل اس کے سامنے نہ رکھے جائیں۔ اسے آرام لینے اور پرسکون ہونے کا موقع دیا جائے۔ ویسے بھی مرد ایسی بیوی کو پسند کرتے ہیں جو ان کی زندگی کو پرسکون کر دے۔ ان کے لئے پیچیدگیاں نہ پیدا کرے۔

صفائی اور سلیقہ سب ہی مرد چاہتے ہیں، اور گھر کے صاف ستھرے اور سلیقے قرینے سے رکھنے کا ذمہ دار وہ بیوی ہی کو سمجھتے ہیں۔ اگر گھر میں یہ صورت رہے کہ مرد ایک چیز کو تلاش کرتا پھرے اور ان کا سراغ لگانا مشکل ہو، غسل خانے کی اشیاء باورچی خانے میں پڑی ہوں اور باورچی خانے کی چیزیں ڈرائینگ روم سے برآمد ہوں تو یہ کیفیت شوہر کے لئے یقیناً تکلیف دہ ہوگی۔ اور وہ اپنی بیوی سے ایسی محبت نہیں کر سکے گا جو اسے کرنا چاہیئے۔

اس معاملے میں صبح کا وقت بڑا اہم ہوتا ہے جب شوہر سو کر اٹھتا ہے تو اس موقع پر ہر چیز اسے مقررہ جگہ پر اور آسانی سے دستیاب ہونا چاہیئے۔ وقت پر ناشتہ ملنا چاہئے اور پھر جب وہ گھر واپس آتا ہے تب بھی گھر میں ہر چیز سلیقے اور ضابطے سے رکھی ہوئی نظر آنی چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ مرد گھر میں قاعدہ اور قرینے رکھنے میں تعاون نہیں کرتے۔ بچے الگ طوفان بدتمیزی برپا کئے رہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے کچھ اصول بنائے اور ان پر سختی سے عمل کیا تو آپ دیکھیں گی کہ شوہر بھی ان اصولوں کا احترام کریںگے اور بچے بھی۔ اور گھر میں صفائی اور سلیقہ مندی نظر آنے کا کریڈٹ آپ ہی کو ملے گا۔

مرد ایسی بیوی کو بھی پسند نہیں کرتے جو اپنے رشتہ داروں یا اپنی سہیلیوں کی ہو کر رہے یا ہر وقت پڑوس میں گھسی رہے۔ وہ توجہ چاہتے ہیں، اہمیت چاہتے ہیں، اور جب دیکھتے ہیں کہ یہ تو رشتہ داروں کو مل رہی ہے تو انھیں اپنی محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے شوہر کے گھر میں آنے کے بعد کا وقت شوہر ہی کے لئے مخصوص رکھئے۔ یہ نہ ہو کہ جب وہ گھر آئے تو پڑوس میں پہونچ کر آپ کو آوازیں دیتا پھرے یا اس کے علاوہ آپ

اسے گھر سونپ کر خود رشتہ دار کے گھر روانہ ہوں۔

سب سے زیادہ جذبات سے مرد گھبراتے ہیں۔ ایسی بیوی جو رشتہ داروں سے قصے قضیے کھڑے کرتی پھرے یا جو اڑوس پڑوس سے مستقل آمادہ جنگ رہے ایک سنگین مسئلہ ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ پریشان کن بات شوہر کے لئے یہ ہوتی ہے کہ اس لڑائی میں شامل ہونے کے لئے اسے بھی مجبور کیا جائے۔ اس لئے آپ کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ زندگی میں جھگڑے نہ ہوں ۔ ہو جائیں تو بڑھنے نہ پائیں اور شوہر کے سامنے نہ آئیں۔ لڑائی جھگڑے کی وجہ اکثر بچے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے بچوں سے ایسی محبت کہ ساری دنیا کے خلاف محاذ قائم کرنے پر مجبور کردے غلط ہے۔ اس سے نہ صرف آپ کا سکون بلکہ شوہر کا سکون بھی درہم برہم ہوگا ۔ اور مرد یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی گھریلو زندگی بھی بیرونی زندگی کی طرح ہنگاموں اور کش مکش سے پُر رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ محبت اور زندگی کے رومانوی پہلو کا ہے۔ مرد یہ بھی چاہتا ہے کہ عورت اس سے اظہارِ محبت کرے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اس محبت میں نہ اداکاری ہو نہ بے شرمی اور نہ بے حیائی۔ ہر مرد یہ خواہش رکھتا ہے کہ بیوی اسے صاف ستھرا، سلیقے، قرینے، زمانے کے ماحول اور وقت کے تقاضوں کے مطابق لباس پہنے۔ ایسی نظر آئے جو اسے اچھی لگے۔ یہ بات کوئی بھی مرد پسند نہیں کرسکتا کہ بے ڈھب بے ہنگم اور میلے کچیلے لباس میں رہے۔ نہ بال سلیقے سے بندھے ہوں اور نہ چہرے پر دلکشی اور جاذبیت کی علامت پائی جائے۔ اس لئے اپنے آپ کو بنا اور سنوار کر رکھنا یہ عورت کا حق ہی نہیں فریضہ ہے۔ آپ اس سے غفلت برتتی ہیں تو اپنے حق سے نہیں اپنے فریضے کی ادائیگی سے غفلت کی مرتکب ہوتی ہیں۔

سنگھار کی اشیاء کا مناسب استعمال اور لباس کی ماہرانہ تراش خراش اگر آپ کو دلکش بنا سکتی ہے تو اس دلکشی اور جاذبیت کو حاصل کرنا اپنا فرض سمجھئے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اداکاری مرد پسند نہیں کرتے۔ اس لئے لباس اور سنگھار میں ایسے طور طریقے جو بہت پر تصنع ہوں یا لب و لہجہ بدل کر یا بگاڑ کر منہ سے الفاظ ادا کرنا یا ایسی حرکات و سکنات جس سے بناوٹ ظاہر ہوتی ہو شوہر کو متاثر کرنے کے بجائے بیزاری کی کیفیت پیدا کرے گی۔

طبعی اور نیچرل انداز کو مرد جس طرح پسند کرتے ہیں بناوٹ اور تصنع کو نہیں کرتے۔ لیکن یہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ جب وہ گھر میں داخل ہو یا بیوی جب اس کے ساتھ باہر جائے تو ایک دل کش شخصیت نظر آئے۔

محمد شفیع محمد عباس بھاروے

تین چیزیں

تین چیزوں کو مت بھولو ـــــ اللہ، رسول اور قرآن
تین چیزوں کے لئے لڑو ـــــ عزت، ملک، مذہب
تین چیزوں سے ڈرو ـــــ دوزخ، قہر خدا، آہ مظلوم
تین چیزوں سے پرہیز کرو ـــــ نشہ، چغلخوری، جوا
تین چیزوں سے نہ گھبراؤ ـــــ مصیبت، محبت اور موت
تین چیزیں یاد رکھو ـــــ خالق، رسول اور موت
تین چیزوں کو پسند کرو ـــــ شفقت، خلق اور خوش دلی۔
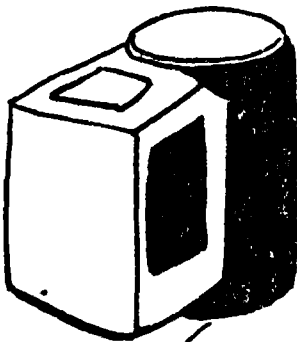
شمس کردوی، کویت

کویت

شہرت ہے جس کی چار سُو یہ وہ بلاد ہے
آسُودہ حال ہے خُش و خُرّم ہے شاد ہے

نایاب، شیریں قدرتی پانی ہے بس یہاں
پانی کے بدلے چشموں سے بس تیل ہے رواں

اس معدنی وسیلے سے کایا پلٹ گئی
افلاس کی گھٹا جو کہ چھائی تھی چھٹ گئی

ہونے لگا یہاں سے برآمد جو خام تیل
ہونے لگی کویت میں روپئے کی ریل پیل

تعمیرِ نَو پہ تیزی سے ہونے لگا عمل
خیموں کی جا پہ بننے لگے قصر اور محل

ویران صحرا حدِّ نظر تک تھا کل جہاں
واں آج بس گئی ہیں قرینے سے بستیاں

دلکش نمونے تعمیرِ فن کے ہیں جا بجا
بے ساختہ زباں سے نکلتا ہے مرحبا

کل ٹمٹماتی شمعوں پہ ہوتی تھی شب بسر
بجلی کے قمقموں سے منوّر ہے اب شہر

حمل و نقل کے واسطے تھے اونٹ ناتواں
اب ہیں عریض راہوں پہ کاریں رواں دواں

نایاب زندگی کی تھیں کُل ضروریات
درآمد، آب کی بھی تھی از دجلہ و فرات

اب ہیں قدم قدم پہ دُکانیں سجی ہوئی
یورپ کی امریکہ کی ہیں اشیاء بھری ہوئی

آرائشِ جمال کی اشیاء ہیں بے شمار
اس صنف پہ یہاں کی تجارت کا ہے مدار

اسکرٹ بلکہ منی اسکرٹ یاں پہ عام
شرم و حیا تو رہ گئی اب برائے نام

مُردوں کے گو لباس میں کوئی ہوا نہ فرق
عیش و نشاط میں مگر اکثر ہیں آج غرق

دَولت کا ہو گیا ہے نشہ ان پہ یوں سوار
قدموں سے روند ڈالا ہے اسلام کا شعار

چھوڑی نہیں جو کی ہے غلط اختیار راہ
ہو جائیں گے خدا نہ کرے ایک دن تباہ

شیخ

مرسلہ: ابوالمنصور

ملے گی شیخ کو جنّت ....

ملے گی شیخ کو جنّت مجھے دوزخ عطا ہوگا!
بس اتنی بات ہے جس کے لئے محشر بپا ہوگا
ہرن چند اختر

اگر دسے کچھ نہیں جاتا ہے مال، پی لے شیخ
ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں
امیر مینائی

بہت کچھ سن رہا ہوں شیخ سے جنّت کے بارے میں
مجھے تو یہ ترے گھر کا پتہ معلوم ہوتا ہے
انور

بسی ہے یہ میخانہ، تعجب اس پہ ہوتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی
سائل دہلوی

اے شیخ ہم سے سوچ سمجھ کر کلام کر
ہم پارسا نہیں تو گنہگار بھی نہیں
عشرت جالندھری

امیران بلا تو میکدے میں آتے رہتے ہیں
جنابِ شیخ کہئے خیر تو ہے تم کدھر آئے
ضیا انصاری

فرشتے بن رہے ہیں شیخ ایسے
کہ جیسے نسبتِ آدم نہیں ہے
نامعلوم

بڑھتے ہی جا رہے ہیں لات و ہُبل کے سائے
اور شیخ ہیں کہ اب تک آسودۂ حرم ہیں
ماہر القادری

ہے جنابِ شیخ کا فلسفہ بھی عجیب سارے جہاں سے
جو وہاں پیو تو حلال ہے جو یہاں پیو تو حرام ہے
جگر

اے شیخ تو چرا کے پیئے جب کبھی پیئے
تیری طرح کسی کی نہ نیّت خراب ہو
ریاض خیرآبادی

شیخ جی میکدہ نہ جنّت ہے
تم بھی پی کر جوان ہو جائے
ریاض خیرآبادی

شیخ لاکھوں وعظ گو فرمائے گا
ایک ہی جنّت کے نغمے گائے گا
میکدے کی سرحدیں چھو لے اگر
جانے کتنی جنّتیں بتلائے گا
عرش ملسیانی

اپنا تو یہ عقیدہ ہے سنئے جنابِ شیخ
کوئی حسیں پلائے تو پینا ثواب ہے
نامعلوم

وضو ہو خونِ دل سے موت سجدے پر کرے سبقت
جنابِ شیخ ارکانِ نمازِ عاشقاں سمجھے
بیدم وارثی

اطلاعات و معلومات

اورینٹل سوسائٹی میں فیضی صاحب کی شمولیت

یہ خبر خوشی سے سُنی جائے گی کہ جرمن اورینٹل سوسائٹی نے جناب آصف فیضی صاحب کو اپنا اعزازی رکن منتخب کیا ہے۔ یہ سوسائٹی صرف مستشرقین عالموں پر مشتمل ہے۔ ان کا ایک عالمانہ رسالہ نکلتا ہے جو بہت توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جن میں صرف تحقیق کے مضامین شائع ہوتے ہیں یا کتابوں پر عالمانہ تبصرے۔

اس سوسائٹی کی ممبری صرف دو قسم کی ہے۔ ایک تو دستوری دوسری اعزازی۔ اعزازی ممبر بیس سے زیادہ نہیں بنائے جاتے۔ ان میں سے جب کسی ایک عالم کی موت واقع ہوتی ہے تب اس کی جگہ نئے ممبر کا انتخاب ہوتا ہے۔ یہ مجلس یورپ و امریکہ میں بہت عزت و توقیر سے دیکھی جاتی ہے۔ اسلئے ہم پروفیسر آصف فیضی کو اس انتخاب پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اسی طور سے علوم اسلامی خاص کر قانون اسلامی پر اپنا مطالعہ و کام جاری رکھیں گے۔

(ادارہ)

شہر تھانہ میں بیت المال کا قیام

از سلیمان ہاشمی
نمائندہ نقش کوکن

گذشتہ ہفتہ شہر تھانہ میں بیت المال کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو سود سے بچانا ہے۔ یوں تو شہر تھانہ کے بعض محلے جیسے راباوڑی، شیواجی نگر اور مہاگیری وغیرہ میں بیت المال قائم ہیں جو محدود طور پر قرض حسنہ فراہم کرتے ہیں۔ مگر عرصہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ شہری سطح پر ایک بیت المال قائم کر کے بڑے پیمانے پر لوگوں کی امداد کی جائے۔ چنانچہ سربرآوردہ اور غیر حضرات کے تعاون سے ایک بیت المال قائم کیا گیا۔ جس میں متفقہ رائے سے مندرجہ ذیل حضرات کا انتخاب ہوا۔

دائمی صدر :- ایڈوکیٹ اسحٰق نزویل — صدر :- پروفیسر داؤد دلوی — نائب صدر :- محمد حسین ابراہیم باپے — جنرل سکریٹری :- جناب غلام مصطفےٰ شیخ مجوب — جوائنٹ سکریٹری :- جناب ملک تحصیلدار — خازن :- جناب مشتاق احمد کنزاکر۔

ممبران مجلس منتظمہ

صدر :- حاجی سلیمان گھاڈگے — ممبران :- (۱) شمس الدین گھڈو لے — (۲) عبدالغفار عبدالرحمٰن پٹیل (۳) محمد قاسم شمس الدین خابندے (۴) ہارون رشید (۵) عبدالمجید نبی بخش (۶) قطب الدین عبدالعزیز قاضی (۷) عبدالرزاق حسن میاں بربان (۸) جماعت علی صاحب قاضی — (۹) حاجی سلیمان میمن۔

ضلع تھانہ کے حلقہ ہائے اسمبلی میں رائے دہندگان کی تعداد

مارچ میں ہونے والے اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر ضلع تھانہ کو گیارہ حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان حلقوں میں رائے دہندگان کی کل تعداد ۱۱ لاکھ ۵۸ ہزار ۴۴۴ ہے جن میں عورتوں کی تعداد ۵ لاکھ ۴۳ ہزار ۶۶۲ اور مرد ۶ لاکھ ۱۴ ہزار ۸۱۷ ہے۔ حلقہ واری تعداد اس طرح ہے۔

(۱) تھانہ ۱۱۹۷۵۷۵ — (۲) کلیان ۱۲۷۶۲۰ — (۳) الہاس نگر ۱۱۸۵۴۸

(۴) بسین ۱۰۳۸۶۳ (۵) نرپاڈ ۱۰۳۴۹۹ (۶) بھیونڈی ۱۱۹۷۱۴
(۷) شہاپور ۸۸۹۴۲ (۸) پالگھر ۸۸۰۶۸ (۹) دھانو ۹۲۸۰۵
(۱۰) کاسا ۸۴۳۲۷ (۱۱) جوار ۸۶۵۰۷ -

ان حلقوں میں جوار، کاسا اور دھانو میں ادیباسیوں کے لئے محفوظ نشست (RESERVED SEATS) ہے۔

کل ہند نمائش میں رتناگیری کا آم اوّل

آم کی کل ہند نمائش میں اول درجہ کا انعام رتناگیری کے شری دشنو ہری جوشی کو ملا۔ اس سلسلہ میں ضلع پریشد رتناگیری کے محکمہ زراعت نے ایک جلسۂ عام منعقد کر کے انھیں ان کی عزت افزائی کی۔

شری جوشی رتناگیری کے شہر کے بائی اسکول میں مدرس ہیں اور کاشتکاری نیز باغبانی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ نے اس سے پہلے بھی ایک مقام حاصل کیا تھا۔

کوکن میں S.T. مسافر بردار گاڑیاں

کوکن پہاڑی علاقہ ہے۔ آمدورفت کے لئے انتہائی دشوار گذار۔ پھر بھی پچھلے بیس سالوں میں یہاں کافی ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں صرف ۵ لائنوں پر ۲۷ گاڑیاں دوڑا کرتی تھیں، آج ۳۸۰ راستوں پر ۳۹۲ گاڑیاں روزانہ سفر کرتی ہیں۔ ۳۴ لائنوں پر تو رات کی سروس بھی جاری ہے۔ پچھلے (دسمبر ۷۱) مہینہ میں صرف رتناگیری ضلع میں ۲۸ لاکھ مسافروں نے S.T. سے سفر کیا۔

تھانہ کی کھاڑی پر نئے پُل کا افتتاح

۲۹ جنوری ۷۲ء کو مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں تھانہ کی کھاڑی پر مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ وی پی نائیک کے ہاتھوں تھانہ کی کھاڑی پر تعمیر کئے جانے والے ۱۸۳۷ میٹر طویل پل کی رسم افتتاح انجام پائی۔ اطلاعات کے مطابق ساحل اور پنویل کو ایک شاہراہ سے ملانے والا یہ پل ۲ کروڑ ۷۲ لاکھ کی لاگت سے تیار کیا گیا ہے۔ اس پل کی وجہ سے ان علاقوں کے درمیان پایا جانے والا طویل فاصلہ ۲۵ کیلومیٹر کم ہو جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے پل پر خرچ کی جانے والی رقم کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ بڑی رقم ریاستی خزانہ پر بوجھ رہے گی۔ اور رقم پل پر سے گذرنے والی گاڑیوں سے ٹیکس کی شکل میں وصول کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے گذرنے والی گاڑیوں پر ٹیکس لگایا جائے گا۔ مسٹر نائیک نے مزید کہا کہ جب پوری رقم وصول ہو جائے گی تو یہ رقم اسی قسم کے نئے منصوبہ پر لگائی جائے گی۔

ہندوستانی ڈاک خانے

ملک کے کونے کونے میں ڈاک کی سہولتیں فراہم کرنا ایک ایسا عمل ہے جو مسلسل جاری ہے۔ یکم مارچ ۷۱ء کو ملک میں ۱۰۸۹۳۸ ڈاکخانے تھے جبکہ ۱۹۴۷ء میں صرف ۲۲۱۱۶ ڈاکخانے ہی تھے۔ اب ایک ڈاکخانہ ۱۰.۶۷ مربع میل کے علاقے اور ۴۰۳۲ افراد کی خدمات انجام دیتا ہے جبکہ ۱۹۴۷ء میں ۵۷ مربع میل کے علاقے میں ایک ڈاک خانہ ہوا کرتا تھا اور وہ ۱۶۱۳۴ افراد کی خدمات انجام دیتا تھا۔ بیشتر ڈاکخانے دیہی علاقوں میں ہیں۔ جہاں میں ساڑھے ۵ لاکھ سے زیادہ دیہات ہیں۔

ڈاک کے نظام میں کام اب بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ہر سال اوسطاً ۶۹۱۹۰ لاکھ اشیاء ڈاک سنبھالی اور تقسیم کی جاتی ہے جس سے حصول آزادی کے وقت کی تعداد کے مقابلے میں ۳۰۰ فیصد کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں ۱۸۳۰ لاکھ اشیاء

رجسٹرڈ ہوتی ہیں اور نو کروڑ ۵۰ لاکھ منی آرڈر ہوتے ہیں۔ چھ ارب گیارہ کروڑ سے بھی زیادہ کی مالیت کے منی آرڈر بھیجے جاتے ہیں۔ جبکہ ۴۹ - ۱۹۴۸ء میں ڈاک خانوں سے صرف ڈیڑھ ارب کے منی آرڈر ہوتے تھے۔

دی کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگیری کا شاندار قوالی پروگرام

۲۸ جنوری کی شب اپنے دامن میں نور و نغمہ کی ایک حسین دنیا سمیٹے صابو صدیق گراؤنڈ بائیکلہ میں جلوہ افروز ہوئی جہاں دی بمبئی سب کمیٹی دی کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگیری کے زیر اہتمام قوالی کا شاندار پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ ساڑھے نو بجے تک گراؤنڈ مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ شہر کے بیشمار معززین کا ایسا اجتماع شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ سوسائٹی کے ممبران اور والنٹیرز مہمانوں کے استقبال میں پیش پیش تھے۔ پروگرام کی نظم و نسق قابل ستائش تھا۔

عالی جناب مصطفٰے افقیہ نے پروگرام کی صدارت کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں سوسائٹی کے ممبران کو اس کامیاب پروگرام کے لئے مبارکباد دی۔ پروگرام کمیٹی کے چیرمین جناب الیف۔ ایچ لالہ جج نے کمیٹی کے اغراض و مقاصد پر مختصر اً روشنی ڈالی۔ پروگرام کمیٹی کے اعزازی سکریٹری جناب عبدالرحمٰن مورڈک نے معزز صدر، مہمانانِ خصوصی اور سامعین کرام کا شکریہ ادا کیا۔ اناؤنسنگ کے خوشگوار فرائض جناب شمس نے سنبھالے۔ صدر محترم جناب مصطفٰے افقیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے لکی پرائز کا ڈرا کیا اور خوش قسمت افراد کو انعامات تقسیم کئے۔ دیگر مقررین میں جناب حارث صاحب، جسٹس سرملا ریٹائرڈ جج گجرات ہائی کورٹ، جناب بڑودا والا ڈائرکٹر آف ازبیٹوٹن ورکس، جناب دسنوی صاحب، جناب چیناائی صاحب اور جناب نظام ناتھانی صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پروگرام میں عزیز نازاں قوال اور جانی بابو قوال نے اپنے کیف آگیں نغمات سے سامعین کو محظوظ کیا، اور یہ کامیاب پروگرام رات کے دو بجے بخیر و خوبی قومی ترانہ پر اختتام پذیر ہوا۔ پروگرام کی کامیابی کے لئے جناب الیف۔ ایچ لالہ (جج) جناب علی صاحب مقادم، جناب عبدالرحمٰن مورڈک، ایڈوکیٹ ایم۔ ایس ونو، محترمہ رقیہ لالہ، جناب عبدالقادر مقادم، پروفیسر احمد بہاؤالدین داودکر، بیرسٹر برڈے، جناب قاضی حسن، ڈاکٹر عبدالکریم نائیک، ایڈوکیٹ ناڈکر، کیپٹن حسین کاپڑے، جناب ڈی۔ کے دلوائی اور جناب فقیر محمد مستری صاحبان قابلِ مبارکباد ہیں جن کی انتھک کوششوں نے اس شب قوالی کو شاندار بنا دیا۔

الوداعی جلسہ

جناب عبدالقادر شمس الدین چوگلے (خازن زینت کلچرل سوسائٹی (ساؤتھ افریقہ) بروز پیر ۲۱ فروری کو افریقہ روانہ ہوئے ان کے اعزاز میں گودلکوٹ ویلفیر سوسائٹی کی جانب سے اتوار ۹ فروری شب ۸½ بجے الوداعی جلسہ جناب مقادم صاحب کے یہاں منعقد ہوا۔ گاؤں اور بیرون گاؤں کے باشندوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ گلپوشی صدر جناب عباس چوگلے نے کی۔ اس کے بعد ان کی کامیابی سفر و درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔

نامہ نگار علی میاں میر (نائب صدر) گودلکوٹ ویلفیر سوسائٹی۔

گودلکوٹ ویلفیر سوسائٹی (رجسٹرڈ)
کا سالانہ جلسۂ عام

گودلکوٹ ویلفیر سوسائٹی کا سالانہ جلسۂ عام بروز سنیچر مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۲ء شب میں ۹ بجے بر مکان جناب عمر مقادم صاحب ۱۲۰ بنات والا بلڈنگ تیسرا منزلہ (حبیب ہائی اسکول کے سامنے) ڈونگری اسٹریٹ بمبئی میں منعقد ہوگا۔

تمام ممبران سوسائٹی اور اہالیان گودلکوٹ سے گذارش ہے کہ وقت کی پابندی کا خیال فرماتے ہوئے جلسہ میں شریک ہوں۔ فرداً فرداً دعوت نامے ممبران کے پتہ پر ارسال کئے گئے ہیں۔ پھر بھی اگر کسی صاحب کو دعوت نامہ وقت پر دستیاب نہ ہوسکے تو اس اعلان کو دعوت نامہ سمجھ کر جلسہ میں حاضر ہونے کی زحمت گوارہ کریں۔

الداعی:- ابراہیم چوگلے (صدر) عمر مقادم (جنرل سکریٹری)
گودلکوٹ ویلفیر سوسائٹی

ایم اے فلمس کا افتتاح

بمبئی کی فلمی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب کہ سنیچر ۵ فروری ۱۹۷۲ء کو ایک عظیم تقسیم کار ادارہ ایم اے فلمس ڈسٹری بیوٹرس کا قیام عمل میں آیا۔ فلمی دنیا کی ایک اہم ترین شخصیت ایم اے طارق (چیرمین انڈین موشن پکچرز ایکسپورٹ کارپوریشن) نے دفتر کا افتتاح کیا۔

ایم اے فلمس نے فوری نمائش کے لئے دو فلموں کے حقوق حاصل کئے ہیں۔ مشہور فلم ساز ساون کمار کی رنگین فلم "گومتی کے کنارے" جس میں مینا کماری، ممتاز، سمیر جلوہ گر ہیں اور دوسری فلم امر کمار کا رومانی شاہکار "برکھا بہار" جس میں نوین نشچل اور ریکھا اہم کردار کررہے ہیں۔ اس مبارک موقع پر عمر تریوالی (متوطن سیطوڑہ، رتناگیری) اور ان کے شریک کار کو مبارکباد دینے کے لئے دوستوں اور خیرخواہوں کے علاوہ ایگزیبیٹر، فلم ساز، فلم اسٹار اور سماجی کارکنوں کی صبح ۱۱ بجے سے شام ۴ بجے تک آمدورفت جاری رہی۔

رتناگیری کا المونیم کارخانہ
تعمیری مرحلہ کا نقطۂ آغاز

کارخانہ کے اعلیٰ افسر شری گریبنٹ نے اخباری نمائندوں سے ملاقات کے دوران بتایا کہ ڈویژنل انجینیئر، ان کے معاونین اور عملہ کے دیگر افراد کی تقرری عمل میں آئی ہے۔ مگر چونکہ ۱۱۰ ٹن وزنی مشنری کی نقل اس علاقہ میں مشکل ہے لہٰذا جیٹی اور کرین کی تعمیر و تنصیب اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہی کارخانہ کی تعمیر عمل میں آئے گی۔ افسر مذکور نے بتایا کہ شروع میں ۲ ہزار لوگوں کو ملازمت دی جائے گی اور بعد ازاں حسب ضرورت اس میں اضافہ کیا جائے گا۔

اخباری نمائندوں کے ساتھ اس مجلس میں کارخانہ کے چیف انجینیئر کرنل ہرٹپ، محکمۂ ترقیات کے سربراہ شری بھٹاچاریہ، منصوبے کے نگران مالیات شری کامت، ڈویژنل انجینیئر داہوسکر وغیرہ شریک تھے۔

فاروق ہائی اسکول میں صفائی ہفتہ

فاروق ہائی اسکول، جوگیشوری، بمبئی میں ۷ فروری ۱۹۷۲ء سے ۱۲ فروری ۱۹۷۲ء تک صفائی ہفتہ منایا گیا۔ اس ہفتہ کے دوران تمام جماعتوں کے طلبہ نے اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی کی نظموں، غزلوں، تقریروں اور خوشخطی کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ بہترین طالب علم استاد کا بھی مقابلہ ہوا۔ ۱۲ فروری کو ہر جماعت کے طلبہ نے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے چارٹس، ماڈلس، ڈرائینگ اور کرافٹ کے نمونے اور رسالوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی نمائش کا انتظام کیا۔ متذکرہ بالا مقابلوں میں اول، دوم اور سوم نمبر سے کامیاب ہونے والے طلبہ کو عالی جناب عبدالغنی صاحب (اسسٹنٹ ایجوکیشنل انسپکٹر) نے میرٹ سرٹیفکٹس سے نوازا۔ نمائش کے مقابلہ میں ہفتم (ب) نہم (الف) اور دہم (ب) بازی مار گئیں۔ ان جماعتوں کو ڈاکٹر عبدالکریم نائیک شیلڈ سے نوازا گیا۔ جناب صدیقی صاحب اور پرنسپل خان صاحب نے اساتذہ اور طلبہ کے قابل تعریف کارناموں پر دلی مبارکباد پیش کی۔ اسکول کمیٹی کے اراکین جناب محمد یوسف پٹیل صاحب، جناب عبدالرحمٰن چھتری والا صاحب، جناب نور صاحب، اور اطراف سے آئے ہوئے معزز مہمانوں نے نمائش دیکھی۔

پڑدین تعلقہ گہاگر میں اسکول کیلئے امدادی پروگرام

۶ فروری ۱۹۷۲ء کی شب میں پڑدین اردو اسکول کی فلاح و بہبود کمیٹی نے اسکول کے اساتذہ اور گاؤں کی تینوں جماعتوں کے اشتراک و تعاون سے اوم شرما موگوی کا ڈرامہ "قاتل کون" کے نام سے اسٹیج کیا۔ ہدایت کاری کے فرائض شری گنگا دھر اور شری ہوڑ یکر نے انجام دئے۔ اس ڈرامہ کو پیش کرنے سے کمیٹی کو دو ہزار روپیہ کا خالص منافع ہوا جو قابل صد ستائش ہے۔ اس کھیل کو کامیاب بنانے میں جناب ارمان صاحب، اناڈیال، داداپیان گہاگر، باوا فلے وغیرہ کی مساعئ جمیلہ کو خاص دخل ہے۔

(نامہ نگار پروپگنڈہ سکریٹری ای اے کڈالکر)

بااخلاق سیاست

سوشلسٹ پارٹی کے اس رویہ کی تعریف کی جانی چاہئے کہ اس نے اپنی انتخابی مہم کے دوران وزیراعظم مسز اندرا گاندھی اور ان کے ساتھیوں پر ذاتی حملے نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ عموماً انتخابات کے دوران مخالف جماعتوں کے رہنماؤں پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں اور بسا اوقات یہ بیانات ناپسندیدہ اور رکیک ہو جاتے ہیں۔ وقتی طور پر کم پڑھے لکھے عوام ان دشنام طرازیوں سے خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی ذمہ دار اور باوقار سیاسی تنظیم ایسے طریقوں سے کامیابی پر فخر نہیں کر سکتی۔

شادی مبارک

گوولکوٹ ویلفیر سوسائٹی کے جائنٹ سیکریٹری جناب یوسف ناخدا کی شادی خانہ آبادی جناب عبدالصمد مقدم کی ہمشیرہ مریم کی کے ساتھ ۱۱ فروری ۱۹۷۲ء کو گوولکوٹ (چپلون) میں انجام پائی۔ اس موقعہ پر سوسائٹی کے عہدیداران و اراکین کثیر تعداد میں شریک تھے۔ صدر سوسائٹی جناب ابراہیم چوگلے نے دودھ کی گلپوشی فرمائی۔

سیکریٹریٹ کا نیا محکمہ

حکومت مہاراشٹر نے سیکریٹریٹ کا ایک نیا محکمہ قائم کیا ہے

اس کا نام سوشیل ویلفیر کلچرل افیسرز اسپورٹس اینڈ ٹورزم ڈپارٹمنٹ ہے۔ اس محکمہ کا وجود یکم دسمبر ۷۱ء سے ہوا۔ اس کے بجٹ میں ایجوکیشن اسپورٹس اور سوشیل ویلفیر ڈیپارٹمنٹ کا نام ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کر دیا گیا ہے۔

نئے محکمہ کو سوشیل ویلفیر اسپورٹس اینڈ یوتھ سروسز جو کہ ماضی میں محکمہ تعلیم سے منسلک تھے دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کلچرل افیسرز اور ٹورزم اور تھیٹرز اور ڈرامیٹک فارمیسز جو کہ سابق جنرل ایڈمنسٹریشن اور محکمۂ داخلہ کے تحت آتے تھے اس نئے محکمے میں شامل کر دئے گئے ہیں۔

اسی طرح مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بے گھروں کی بازآبادکاری سے متعلق معاملات اور ان کو معاوضہ منظور کرنے کے معاملات اور ایویکوی پراپرٹی ایکٹ وغیرہ محکمۂ ایجوکیشن اسپورٹس اینڈ سوشیل ویلفیر سے نکال کر محکمہ شہری ترقی صحت عامہ اور ہاؤسنگ میں شامل کر دئے گئے ہیں۔

شری آر جی سالوی جو اس محکمہ ایجوکیشن اسپورٹس اور سوشیل ویلفیر کے سکریٹری تھے ان کو سوشیل ویلفیر کلچرل افیسرز (اسپورٹس اور ٹورزم) کے نئے محکمہ میں بطور سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔

سوویت شاعر کی صدر نکسن سے ملاقات

بین الاقوامی شہرت کے سوویت شاعر یوجینی یوتشنکو نے ۳ فروری ۷۲ء کو وہائٹ ہاؤس میں صدر نکسن کے ساتھ ۷۰ منٹ گزارے۔ وہ اس وقت امریکہ کے کالجوں اور ملک کے مختلف حصوں میں واقع دوسرے اداروں میں اپنی نظمیں پڑھنے کے سلسلے میں پانچ ہفتے کا ایک دورہ کر رہے تھے۔

صدر نے اس فنکار کی کچھ تخلیقات پڑھی ہیں اور انھوں نے خود ہی ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

علماءِ کرام اور مسلم پرسنل لا

محترم مہتمم صاحب دارالعلوم دیو بند نے اپنے اعلان میں
بجا فرمایا ہے کہ مذہبی قوانین ترمیم و اصلاح سے بالاتر ہیں۔ البتہ مسلم پرسنل لا
جیسے رائج الوقت قوانین میں اگر نقص نظر آئے یا ان میں ضروری مسائل
شرعیہ کا اضافہ ناگزیر ہو تو اسے مسلم پرسنل لا کی تکمیل کہا جائے گا نہ کہ
اس میں ترمیم یا تبدیلی کے لئے کوئی دُرلہ نکالی جائے! ہمارا خیال ہے کہ
اس مجوزہ اجتماع میں شریک ہونے والے علماء کو مجتہدانہ بصیرت
سے کام لیتے ہوئے اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ مسلم پرسنل لا آیا
اس لئے ناقص ہے کہ وہ زمانہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا یا
اس لئے کہ پورے طور پر اسے عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔
بلاشبہ ضرورت ہے کہ مسلم پرسنل لا کے بعض گوشوں میں مزید شرعی
عناصر کا اضافہ کیا جائے لیکن زور اس بات پر دیا جائے کہ خود مسلمانوں
نے کہاں تک عمل کیا ہے۔ کیا شرعی قوانین کی خلاف ورزی نے تو وہ
خلا پیدا نہیں کی جسے بھرنے کیلئے سیاسی منصوبہ بازوں کو میدان میں آنے کا
موقعہ مل گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مجوزہ اجتماع کا علماء کرام کے حلقوں
میں خیر مقدم کیا جائے گا اور وہ اس میں خالی ہاتھ شریک نہ ہوں (الجمعیت)

مسلم پرسنل لا (کرنٹ ٹاپک)

آدم نصرت

محترم دارالعلوم دیو بند نے کہا —
مذہبی قوانین بالاتر ہیں ہر ترمیم سے
ہاں مگر —
رائج الوقت پرسنل لا میں نقائص ہوں اگر
اور مسائلِ شرعیہ کا ہو اضافہ ناگزیر
پھر تو یہ
لا کی یہ ترمیم گویا، لا کی اک تکمیل ہے
ورنہ
بالاتر ہے مسلم پرسنل لا ہر طرح ترمیم سے
ترمیم سے اصلاح سے —...

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

فارم ۴

بیان بابت ملکیت و جملہ تفصیلات نقش کوکن ممبئی

۱۔ مقام اشاعت : ممبئی۔
۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہوار۔
۳۔ پرنٹر و پبلشر : ڈاکٹر عبدالکریم نائیک
قومیت : ہندوستانی
پتہ :۔ پیارنل ڈونگری ممبئی ۹
۴۔ ایڈیٹر : عثمان حسین خان۔
قومیت : ہندوستانی
پتہ :۔ اجمل پریس ممبئی ۳
۵۔ ملکیت :۔ نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ
رجسٹرڈ نمبر ۳۰۰۰۶ E ممبئی۔

میں عبدالکریم نائیک اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا
تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

فقط
عبدالکریم نائیک
چیئرمین نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ

انتقال پُر ملال

★ انجمن اسلام جنجیرہ کے ممتاز رہنما اور بمبئی کے مشہور سماجی کارکن ڈاکٹر ضمیر الدین خطیب کے والد بزرگوار حاجی قطب الدین خطیب کا ان کے وطن جنجیرہ میں ۵ فروری ۷۲ء کو انتقال ہوگیا۔

★ میمن برادری کے ممتاز رہنما اور عمر کھاڑی حلقہ کے کانگریسی امیدوار میاں احمد مرچنٹ کے والد کا ۱۴ فروری ۷۲ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔ ۷۸ سالہ مرحوم محمد لطیف مسلمانوں کے ہر طبقہ اور فرقہ میں مقبول تھے اور کئی مسلم ٹرسٹوں سے ان کا تعلق تھا۔

★ عبد اللطیف خان ابراہیم خان سرگروہ جو بمبئی پورٹ ٹرسٹ میں شیڈ منیجر تھے یکم فروری ۷۲ء کو شب میں راہی عدم ہوئے۔

★ مشہور جراح حکیم ابوبکر صاحب کا ۲۸ جنوری ۷۲ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم علم جراحی کے علاوہ سماجی خدمت میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔

★ راجہ پور (ضلع رتناگیری) کے جناب علی میاں معین الدین ٹھاکور کے والد صاحب کا جنوری ۷۲ء کے اواخر میں انتقال ہوگیا۔

★ جناب زکریا شیخ احمد خونڈو کے والد کا ان کے وطن پاواس میں جنوری کے تیسرے ہفتہ میں انتقال ہوگیا۔

★ جناب عبد اللہ قاضی (نیور یکر) کی والدہ کا ۲۸ جنوری ۷۲ء کو ناگہانی طور پر انتقال ہوگیا۔

★ امام باڑہ (بمبئی) حلقہ کے کانگریسی رہنما جناب شریف مجاور کے چچا زاد بھائی کا ۵ فروری ۷۲ء کو انکے وطن رتناگیری میں انتقال ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ٥

NAQSH-E-KOKAN (BOMBAY) MARCH 1972 Regd. No. MH-723
Licensed to post without prepayment under **Licence No. 203,** Bombay.

Printed at AJMAL PRESS, Bombay-3. and Published from 44, Jail Road (East), Bombay-9. by Dr. A. M NAIK M.B.B.S for NAQSH-E-KOKAN Publication Trust, Bombay-9. Title Cover Printed at AMIN ART PRINTING PRESS, Bomby-9.

OCTOBER 1972

ماہنامہ نقش کوکن بمبئی

اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء

جلد ۱۱ شمارہ ۱۰

اعزازی ایڈیٹر :- (ڈاکٹر) عبدالستار دلوی

طابع و ناشر :- ڈاکٹر عبدالکریم نائیک

ملکیت :- نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ

زرسالانہ :- ۶ روپے

بیرونِ ملک :- ۱۵ شلنگ برٹش پوسٹل آرڈر

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :-

منیجر ماہنامہ "نقش کوکن"

۴۴ جیل روڈ ایسٹ، ڈونگری، بمبئی ۹

ٹیلی فون :- ۲۳۱۵۷۲

قیمت :- ۶۰ پیسے

مقام اشاعت :- اجمل پریس بمبئی ۳

اس شمارے میں

معزّز مہمانوں کی

پُرتکلف دعوت کیلئے

آئسکریم

شادی بیاہ
اور خوشی کے موقع پر

قسم قسم کی عمدہ، لذیذ اور وٹامن سے بھرپور

آئسکریم

بہترین انتظام اور اطمینان بخش خدمت کے لئے
ہمیں امتیازی مقام حاصل ہے۔

نرخ نامہ مفت

بڑے بڑے آرڈر پر خصوصی رعایت
حاصل ہے۔
تشریف لائیے

GAY
ICE CREAMS

یا فون کیجیے
۳۷۶۷۱۳
۳۷۹۲۴۷

۵۲-اے کلیر روڈ۔ ناگ پاڑہ۔ بمبئی نمبر ۸

ترتیب

اداریہ

(اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ترقی اُردو بورڈ اور گجرال کمیٹی اپنے طور پر مفید کام کر رہے ہیں اور اس سے اُردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں امید افزا فضا تیار ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت سے ہمارے مطالبات کیا ہونے چاہییں، اس موضوع پر "ہماری زبان" کی حالیہ اشاعت میں مشہور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اداریہ قلمبند کیا ہے۔ "ہماری زبان" کے شکریے کے ساتھ ہم یہی اداریہ اس بار نقش کوکن کے قارئین کی خدمت میں بھی پیش کر رہے ہیں — ادارہ)

اپنے مطالبات پیش کرتے وقت، اہلِ اُردو ذیلی و جزوی باتوں پر بہت زور دیتے ہیں۔ اربابِ حکومت اس "جزو طلبی" کو خوش آمدید کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے اُردو کا کوئی بھلا نہیں ہوتا لیکن ان کی مطلب براری ہو جاتی ہے۔

مثلاً ہم خوش ہیں کہ مرکزی سرکار نے اُردو کو بھی اعلیٰ تعلیم کی درسی کتب تیار کرنے کے سلسلے میں ایک کروڑ روپے کی خطیر رقم دی ہے اور مرکزی وزارتِ تعلیم کی نگرانی میں اردو ترقی بورڈ قائم کر دیا ہے۔ خوشی کے اس لمحہ میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جو درسی کتب بورڈ کی نگرانی میں تیار ہو رہی ہیں (اور یہاں بھی حلقۂ صد کام نہنگ، در بیان ہے!) کس اور کس کے کام آئیں گی۔ کیا ملک میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی ایسا ادارہ ہے جو ان کو استعمال میں لا سکے؟ بالخصوص سائنس کی جو درسی کتب تیار کی جا رہی ہیں ان کا استعمال کب اور کہاں ہو گا؟

ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ اُردو اکیڈیمیاں قائم کر دی گئی ہیں۔ لیکن ان اکیڈیمیوں کے دفتر عمل میں نشستن و گفتن و برخاستن کے بعد کچھ عطیات اور انعامات کے سوا اور کیا ملتا ہے؟ اردو کے نظامِ تعلیم کے احیا کے سلسلے میں یہ کیا کام انجام دے رہی ہیں یا دینے کی سکت رکھتی ہیں؟

ہمارے مطالبات کا نقطۂ آغاز دراصل دستورِ ہند کی دفعہ ۲۹ ہونی چاہیے جس میں لسانی اقلیت کو رد کرنے کا بھرپور بندوبست کیا گیا ہے: "ہندوستان کی سرزمین یا اس کے کسی حصے کے شہریوں کے کسی گروہ کو، جس کی الگ زبان، رسم خط یا کلچر ہو اسے برقرار رکھنے کا حق ہوگا۔" اس بنیادی حق کے لیے آگے چل کر دفعہ ۳۴۷ میں یہ انتظام کیا گیا ہے:

> "اگر اس بارے میں کوئی مطالبہ کیا جائے اور راشٹرپتی کو اس کا اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی ریاست کی آبادی کے ایک قابلِ لحاظ حصے کی خواہش ہے کہ وہ ریاست اس زبان کو، جسے وہ حصہ بولتا ہے، تسلیم کرے تو راشٹرپتی کو اختیار ہوگا کہ وہ ہدایت کریں کہ وہ زبان پوری ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں ان مقصدوں کے لیے استعمال کی جائے جن کی وہ صراحت کریں۔"

ہمارا مطالبہ ہونا چاہیے کہ صدرِ جمہوریہ اپنے اسی خصوصی اختیار کا استعمال کرتے ہوئے ایک اعلامیہ کے ذریعے کم از کم اتر پردیش، بہار، دہلی، آندھرا، مہاراشٹر اور میسور کی ریاستوں میں حسب ذیل مقاصد کے لیے اردو استعمال کیے جانے کی ہدایت کریں:

- اُردو کے نظامِ تعلیم کی از سرِ نو تشکیل: جن اضلاع میں اردو بولنے والی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے وہاں اردو میڈیم کے اسکولوں اور کالجوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جن اضلاع میں یہ آبادی اس سے کم ہے وہاں چیدہ مقامات پر سرکاری اسکولوں میں اردو میڈیم کی متوازی کلاسوں کی تنظیم کی جائے۔
- اُردو نظامِ تعلیم کی نگرانی کے لیے مذکورہ بالا ریاستوں کی وزارتِ تعلیم میں اُردو کے شعبوں کا قیام۔
- اُردو کی درسی کتب، تربیت اساتذہ اور دیگر امور کی جو اس نظامِ تعلیم کو چلانے کے لیے ضروری ہیں، ریاستی حکومتوں کو ذمہ دار قرار دینا۔
- مذکورہ بالا ریاستوں میں اُردو کی تعلیم کے لیے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ بورڈوں کی تشکیل۔
- اردو تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ کے خلاف ملازمتوں وغیرہ میں کسی قسم کا امتیاز نہ کرنا بشرطیکہ وہ ریاست کی بڑی زبان سے واقف ہوں۔
- جن اضلاع کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے وہاں کے انتظامیہ میں دو لسانی افسروں کا تقرر اور سرکاری اعلانات وغیرہ کا اُردو میں اجراء۔
- ضلع سطح کی عدلیہ میں اُردو کے لیے سہولتوں کا فراہم کرنا۔
- اُردو کا مسئلہ ایک قومی سطح کا مسئلہ ہے اس لیے اسے نہ تو ریاستی حکومتوں کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے محدود اختیارات پر۔ دستورِ ہند کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اس میں مرکزی وزارتِ تعلیم کا بھی دلچسپی لینا ضروری ہے۔ اس لیے ایک ایسے مرکزی ادارہ کا قیام عمل میں لانا جو مختلف ریاستوں کے اُردو نظامِ تعلیم میں تعاون و اشتراک کی صورت پیدا کر سکے۔

ان مطالبات کے تسلیم کیے جانے اور اُردو کی سرکاری و قانونی حیثیت کا تعین ہو جانے کے بعد اردو ترقی بورڈ اور اردو اکیڈیمی جیسے ادارے اور ان کے پروگرام خود بخود بامعنیٰ ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا تو یہ سب بے معنیٰ اور ہوائی تیر رہیں گے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

اُردو املا

(نوٹ: گذشتہ شمارے کے اعلان کے بموجب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔ ہم نقش کوکن کے قارئین سے عموماً اور قلمی معاونین سے خصوصاً گذارش کریں گے کہ اس مضمون کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اپنی تحریر میں اُس املا کو اپنائیں جو اُردو املا میں پیش کیا گیا ہے۔ ادارہ)

ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور ان قاعدوں کی بنیاد صحیح اصول پر ہو۔ اگر قاعدے معیّن نہ ہوں تو زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔ اور اُردو ابھی تک اس قسم کے خطرے میں ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی غرض کہ ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرّر ہیں، ہر لکھنے والا ان کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ مگر اُردو والے اپنے تئیں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔ املا کی خرابی یا بے ضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدن قوم کو پیش آئیں تو اُس کے زبان دانوں نے فوراً اِس خرابی کی اصلاح کی۔ ترقّی کرنے والی قومیں اس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں۔ عام طور پر اصلاح کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا اپنی رائے کو دخل دے کر ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرے بغیر تحقیق کیے ہوئے اس غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی یا وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پا گئی، عوام کے لیے یہ ایک بہت بڑی سند ہوگئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہیں۔ بڑا گروہ مقلدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے اور تدارک یا اصلاح کی ذمہ داری اہلِ تحقیق پر عائد کی جاتی ہے۔

پس ایسی خرابیوں کا انسداد اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کر کے نہ صرف قاعدے بنائیں بلکہ ہر ممکن ذریعے سے انہیں عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ اس وقت صرف چند ضروری مسئلے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) مختفی ہ یا الف؟

جہاں تک تلفظ سے بحث ہے اُردو میں مختفی 'ہ' کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ مختفی ہ فارسی کی چیز ہے۔ اُردو ہندی کے لفظوں میں نہیں آسکتی۔ لفظ کی ابتدا یا بیچ میں کبھی نہیں آتی۔ آخر ہی میں آسکتی ہے۔ اُردو اور ہندی کی طرح فارسی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ لفظ کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے۔ البتہ بعضے فارسی لفظ ایسے ہیں کہ پُرانی فارسی زبان میں ان کے آخر میں ک تھا جو ک سے گ ہوا اور پھر گر گیا۔ اگر اس ک یا گ سے پہلے الف تھا تو وہ بغیر کسی دقّت کے قائم رہا۔ جیسے پُرانے اژدھاک سے اژدھا رہ گیا۔ دقّت ان لفظوں کی کتابت میں آپڑی جن کے آخر میں ک تھا اور اس سے پہلے زَبر۔ اس لیے کہ آخر حرف پر حرکت رہ گئی اور عام قاعدے کے بموجب اس آخر حرف کو ساکن ہونا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر صرف ایک لفظ کو لے لیجیے:

"بندہ" پرانی فارسی میں بندک اور بندگ تھا۔ بعد کو (یعنی اسلامی دور سے کچھ پہلے ہی) گ گر گیا تو "بند" رہ گیا اور کتابت میں

"بندہ" اور "بند" میں کوئی فرق نہ رہا۔ پہلوی تحریر میں تو پُرانی کتابت (یعنی بت بک) ہی جاری رہی مگر جب عربی لفظ اختیار کیے گئے تو فکر ہوئی کہ آخیر حرف کی حرکت کو جو تلفظ میں آتی ہے تحریر کس طرح نمایاں کریں۔ تدبیر یہ ٹھہری کہ ایک ہ اخیر میں لکھیے اور اس کو زبر کی طرح پڑھیے۔ ہ کی آواز اس میں نام کو نہ ہو۔ اسی لیے اس کا نام مختفی پڑ گیا اور اس کے مقابلے میں اصلی ہ کو ملفوظ کہنے لگے۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ فارسی میں ہوا اور عربی میں ان دونوں اصطلاحوں کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

فارسی لغات کی اکثر کتابوں میں ہر موقع پر یہ اشارہ کر دیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے اخیر میں جو ہ ہے وہ مختفی ہے یا ملفوظ۔ فارسی میں بھی املا کے متعلق ایسی احتیاط برتی جاتی ہے اور کبھی کوئی لفظ جس کے اخیر میں الف ہے۔ ہ سے نہیں لکھا جاتا۔ سوا اس کے کہ قافیہ کی ضرورت سے "آشکارا" کو "آشکارہ" اور "خارہ" کو "خارا" لکھ دیا۔ آج سے تیس پینتیس برس پہلے تک اردو والے بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک بات اور بھی اس سلسلے میں بیان کرنے کے لائق ہے، وہ یہ کہ فارسی والوں نے جب عربی کے بہت سارے لفظ اپنی زبان میں لیے تو ان میں سے کسی کسی میں تصرف بھی کیا۔ جن میں سے ایک تصرف یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ عربوں کے یہاں ایک ایسا حرف ہے جو بعض اسموں کے آخر میں آتا ہے۔ شکل اس کی ہ کی ہے مگر وہ اسے ت پڑھتے ہیں اسی لیے اس پر دو نقطے لگا دیتے ہیں (ۃ) جب اس گول ۃ والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آ پڑتا ہے اور آواز ۃ پر ٹوٹتی ہے تو اسے ملفوظ ہ کا سا مزا ملتا ہے اور اس سے پہلے زبر بھی ہوتا ہے۔ مگر اس ہ کا تلفظ گہرا نہیں ہوتا کیوں واسطے کہ الفاظ کا زور اس پر ختم ہوتا ہے اور اس وجہ سے ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز ان کی مختفی ہ سے بہت ملتی جلتی ہے اکثر صورتوں میں اسے ہ مختفی کی طرح برتنا شروع کر دیا اور کہیں کہیں اسے ت قرار دے کر اسے اسی طور سے بولنے اور لکھنے لگے۔ عزۃ۔ خدمۃ۔ محبۃ وغیرہ کو عزت، خدمت، محبت بنا دیا اور درجۃ مدرسۃ دیکھ کر درجہ۔ مدرسہ۔ کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال دیا

جیسے اجازہ اور اجازت، ارادہ اور ارادت، افاقہ اور افاقت وغیرہ۔ ان لفظوں میں جہاں جہاں "ۃ" "ہ" ہو گئی وہاں وہ مختفی ہی قرار پائی۔ یہ غرض لفظ فارسی سے اُردو میں آئے تو یہاں بھی ان کا تلفظ وہی رہا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا۔

اسی طرح اُردو میں مختفی ہ فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھ مخصوص ہے مگر اس ہ کی اصلیت کو لوگوں نے بھلا دیا اور خود اپنی تحریر کے لیے کوئی ہنجار قائم نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدمذاقی پھیلی اور ٹھیٹ اُردو لفظوں میں بھی لوگ مختفی ہ لکھنے لگے۔ ہندی کے دیوناگری خط میں تو ایک آ کی ہے اور اس کا نمائندہ اُردو میں سوا الف کے اور کوئی حرف ہو ہی نہیں سکتا۔ ہندی لفظ تو ایک طرف رہے طرہ یہ کہ وہ عربی فارسی لفظ بھی جن کے آخر میں الف ہے ہ سے لکھے جاتے ہیں۔ یہ املا سراسر غلط ہے، قاعدہ اس کا یوں ہے:

ا۔ ہندی لفظ ہو تو الف سے لکھا جائے (سوا بعض مقاموں کے ناموں کے۔ جیسے آگرہ، کلکتہ، پٹنہ، کس واسطے کہ نام ہیں اور ہمیشہ اسی طرح لکھے جاتے ہیں) مقاموں کے ناموں کے سوا جتنے لفظ ہیں ان کو الف ہی سے لکھنا چاہیے۔ جیسے، اکّا (اسے "یکّہ" لکھنا یوں بھی غلط ہے کہ تلفظ کے سراسر خلاف ہے۔ فارسی میں یہ لفظ گاڑی کے معنوں میں موجود بھی نہیں ہے، ہمارے اُردو لفظ ایک سے بنا ہے، نہ کہ فارسی 'یک' سے۔ اسی طرح "دم بتی کا اکّا"، "تاش کا اکّا" نیز ایک زیور جسے عورتیں ایک ہی بازو پر باندھتی ہیں اور اس میں ایک ہی بڑا نگینہ ہوتا ہے جس میں زیادہ نگینے ہوتے ہیں اسے "نونگا" کہتے ہیں) اکیلا، آنولا، باجا، باجرا، بادلا (ایک قسم کا نفیس کپڑا) باڑا ("امام باڑا" وغیرہ مرکبوں میں بھی آتا ہے) بٹوا، بٹوارا، بچپنا، بچکانا، بچھڑا، بچھونا، بکھیڑا، بُلبلا، بنجارا، بھانجا، بھتیجا، بھروسا، بھیڑیا، تانگا، پانوا، پتا (نشان کے معنوں میں) پتّا، پتّا، پتا (باپ) پتلا، پتیلا، پٹاخا، پٹارا، پٹھا، پچھتاوا، پراٹھا، پسینا، تارا (جسے فارسی میں ستارہ کہتے ہیں) تایا (چچا جو باپ سے عمر میں بڑا ہو) چارا (گھاس وغیرہ) چبوترا، چرایتا، چرمرا، چرسا، چرچا، چکارا، چانٹا، [illegible]

پینا، چھلا، داسا مدوّ بیّار، ڈُبلکا (دو پلک والا ایک مصنوعی نگ جسے بلور کے دو ٹکڑوں کو ملا کر بناتے ہیں) ڈخما (یعنی دو خم والا ینچا) ڈکلا، دھکّا، دھوکا، ڈُودیا، دیڑھ خما (یعنی ڈیڑھ خم والا) راجا، سرتا، کتھّا، کویلا، کھلونا، لڑکا، مہینا، میلا، ناتا (رشتہ داری)۔ یاد رہے کہ مذکر صفتیں بھی الف ہی سے صحیح ہیں۔ جیسے چُلبلا، دھوکا، نچلا۔

اسی طرح وہ لفظ بھی جو یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں۔ جیسے بلّا (تمغہ وغیرہ کے معنوں میں) ڈراما، فرما، کمرا، مارکا (نشان) وغیرہ۔ اور یہی حال ان لفظوں کا ہے جو فارسی عربی سے نکلے تو ہیں مگر خود ان زبانوں میں ان کا وجود اس ہیئت میں نہیں ہے۔ جیسے بدلا، بے فکرا، تو دوتا، کبابیا (کباب والا) برفیا (برف والا) خاصا (اچھا، خاصا، پورا کے معنوں میں) بعضا (بعض) مسالا، ملیدا (ف۔ مالیدہ) دسپنا وغیرہ۔

خاصا (جمع۔ خاصے اور مونث خاصی) اور بعضا (بعضے، بعضی) میں کے الف یا ی کو ہ سے ظاہر کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ جن معنوں میں خاصہ فارسی میں استعمال ہوتا ہے اگر کبھی ان معنوں میں استعمال ہو تو البتہ اسے ہ سے لکھنا ٹھیک ہوگا۔ مسالا ہر معنے میں اس اور الف سے لکھنا چاہیے۔ (۱) گرم مسالا (۲) مسالا (گوٹا کناری وغیرہ) (۳) مسالا (کسی چیز کے اجزا یا ضروریات یا لوازمات وغیرہ)۔ مصالح لکھنا یوں غلط ہے کہ یہ مصلحت کی جمع ہے۔ یا اسے لفظ کو ان معنوں سے اصلاً کوئی تعلق نہیں۔ مزید براں یہ کہ تلفظ بھی مختلف ہے۔ یہی حال مصالحہ کا ہے۔ مصالحہ کے معنے ہیں لڑنے والے دو فریقین کے مابین صلح۔ ملیدہ کا تلفظ بھی فارسی مالیدہ سے بدل گیا ہے اور اس نے ایک خاص مفہوم اختیار کر لیا ہے۔ پس اسے بھی اس طرح لکھنا چاہیے جس طرح ہم بولتے ہیں۔ دسپنا اور فارسی دست پناہ میں معنی اور تلفظ دونوں بدلے ہوئے ہیں۔ دست پناہ فارسی میں چمٹے کے معنوں میں نہیں بولا جاتا بلکہ اس کے معنی ہیں دستانہ۔

اُن لفظوں کے آخر میں بھی الف لکھنا چاہیے جو ایک اردو اور ایک فارسی یا عربی جُز سے بنے ہیں۔ جیسے ڈیڑھ خما (وہ چیز جس میں ڈیڑھ خم ہو) تماشا، چھماہا، پچرنگا، ستر نگا وغیرہ۔

<u>اس سے ایک کلیہ ہاتھ آیا کہ جب کسی اور زبان کا لفظ اردو میں دوسرے معنی اور اسی کے ساتھ دوسرا تلفظ اختیار کرلے تو اس کا املا ٹھیٹ اردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیے۔</u>

<u>۲۔ جو لفظ خود فارسی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں وہ ہرگز ہ سے نہ لکھے جائیں۔ ان لفظوں کی تفصیل یہ ہے:</u>

(الف) وہ جامد اسم یا صفتیں جن کے آخر میں الف ہے وہ حرف اصلی کی حیثیت رکھتا ہے جیسے اژدھا، آسیا (چکی) آشکارا، آشنا، بوریا، چلیپا، پارسا، خارا (ایک قسم کا پتھر) دارا، درا (گھنٹا، "بانگِ درا") دلاسا، دوبالا، دوتا، سیما (دیوسیما یعنی دیو کی شکل والا) سارا (خالص، جیسے "عنبر سارا" میں) شوربا (شور + با۔ با کے معنی ہیں پکائی ہوئی چیز۔ یہ لاحقہ کھانوں کے بہت سے ناموں میں آتا ہے) شیوا (فصیح کے معنوں میں جیسے "شیوا زبان" مگر ڈھنگ اور حرکات و سکنات کے معنوں میں جو لفظ ہے وہ "ہ" سے لکھا جاتا ہے: "شیوہ") ناشتا، تمنا، گندنا۔

(الف) فارسی فعلوں سے بنے ہوئے اسم فاعل اور صفت مشبہ وغیرہ۔ جیسے بیا، بنا، نابینا، دانا، زیبا، پذیرا، جویا، گویا، جہاں آرا، جاں فزا، جاں فزا، دلربا، صبر آزما، ہوش ربا وغیرہ۔

(ج) بعض لفظ جن کے آخر سے کوئی لفظ گر کر الف رہ گیا ہو جیسے پا (پای) خدا (خدای) نا (نای) وغیرہ۔ یا جیسے "آوا" (آواز کا مخفف ہے) افغا (افغاں کا مخفف) وغیرہ۔

(د) وہ لفظ جو ہا زیادہ کر کے جمع بنے ہوئے ہیں۔ جیسے سدہا، ہزارہا

(ہ) بعض لفظ یا نام جن کے آخر میں پیار یا حقارت یا ندا کے لیے الف بڑھا دیا گیا ہو جیسے بازاریا (بازاری) بشیرا، رکنا، طالبا، ملنگا، سعدیا وغیرہ۔ [یاد رکھنے کی بات ہے کہ "شفیعا" ایک قسم کا خط ہے جسے ملا شفیعا نے ایجاد کیا تھا۔ اس لیے "خط شفیعا" مشہور ہوا۔ اسے "شفیعہ" یا "شفیعہ" لکھنا غلط ہے]

۳۔ ترکی لفظ جو فارسی اُردو میں مستعمل ہیں اور جن کا املا الف سے ہی ہونا چاہیے۔ آلتمغا، تمغا، طغرا، اس طرح تمغا، تراقت اور طغرہ سُلطانی

غلط ہوگا۔ صحیح تمغائے شرافت اور طغرائے سلطانی ہے۔

۴ - عربی کے جو لفظ خود عربی میں ہی الف سے لکھے جاتے ہیں ان کو ہ سے لکھنا صحیح نہیں۔ وہ الف ہی سے لکھے جائیں۔ ان لفظوں کی تفصیل یہ ہے:

(الف) وہ اسم جو افتعال یا استفعال کے وزن پر مصدر ہیں اور ان کے آخر میں الف کے بعد ایک ہمزہ ہے۔ یہ ہمزہ اُردو میں گر جاتا ہے اور الف رہ جاتا ہے۔ جیسے: ابتدا، اجتبا، ارضا، ارتقا، اصطفا، اقتدا، اکتفا، التوا، امتلا، انتہا، استثنا، استسقا، استرضا، استدعا، استفتا، استقرا، استقصا، استنجا، استیلا وغیرہ۔

(ب) یہ لفظ جن میں سے بعضے اسم جامد ہیں اور بعضے صفت، ان کو بھی ہ سے لکھنا غلط ہے: حلوا، سقا، شہلا (نرگس شہلا) غرّا (شاعر غرّا) بیضا (ید بیضا) محابا، مدارا، مدادا وغیرہ۔

(ج) بعض مذکر نام الف پر ختم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے آخر میں ایک ہمزہ بھی تھا۔ سو وہ اردو میں گر چکا، اور بعضوں کے آخر میں ہمزہ تھا ہی نہیں صرف الف تھا۔ وہ ان میں سے کسی میں ہ تھی:

یحییٰ، زکریا، سادیا، مسیوا وغیرہ۔

(د) بعض مونث ناموں کی بھی یہی حالت ہے:

زہرا (حضرت فاطمہؓ کا نام) سارا، حوّا وغیرہ۔

(ہ) بعض جمعیں: جیسے بقایا، برایا، ثنایا، رعایا، عطایا، وصایا، ہدایا وغیرہ۔

(و) بعض متعلق فعل جن کی تنوین فارسی اور اُردو میں گر گئی ہے۔

جیسے اصلا، ظاہرا وغیرہ۔

(س) ان لفظوں کے آخر میں الف مقصورہ تھا جسے عربی کے قاعدے سے یوں (ی) لکھتے ہیں۔ مگر فارسی اور اُردو میں اس کے لیے ایک معمولی الف لکھتے ہیں۔ ہ سے ان لفظوں کو لکھنا سراسر غلط ہے:

تماشا، تقاضا، ماجرا، مدعا، معما، مربّا، حلوا، منقّا، دعوا، تقوا، مصفّا، مطلا، معرا وغیرہ۔

[بعض لوگ عربی املا کی پیروی میں دعوا، اور تقوا یا مربّا اور منقّا کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھتے ہیں جو جائز ہے۔ مگر اُردو میں سادے الف کو ترجیح ہونی چاہیے]

فائدہ:۔ بعضے عربی یا فارسی لفظ ایسے ہیں کہ ان کے آخر میں ہ آتی ہے۔ مگر جب ان کی جمع بناتے ہیں تو اس مختفی ہ کو الف سے بدلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یعنی ان تمام مونث اسموں اور بعضے مذکر اسموں کی جمع میں ہ کو الف سے بدل کر جمع کی علامت لگاتے ہیں۔ جیسے "بیوہ" سے "بیوائیں" "بیواؤں"، "دایہ" سے "دایائیں" "دایاؤں"، "قحبہ" سے "قحبائیں" "قحباؤں"، "قابلہ" سے "قابلائیں" "قابلاؤں" وغیرہ اور "خلیفہ" سے "خلیفاؤں"، "علامہ" سے "علاماؤں"۔

[بعض لوگ بیوؤں اور دایوں بولتے ہیں جو صحیح نہیں]

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اُردو کا خاص حرف الف ہے اور ہر موقع پر ہمیں اپنے کام میں لانا چاہیے سوائے چند فارسی اور عربی لفظوں کے جن کا املا ہ ہے (اور اس ہ کی آواز الف کی سی ہے) اور جن عربی اور فارسی لفظوں کے آخر میں ہ ہے ان کے آخر میں بھی ہم بعض حالتوں میں ہ کی جگہ الف سے لکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک حالت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ دو تین حالتیں اور بھی ہیں۔

(۱) جب قافیہ میں مختفی ہ الف کے مقابل ہو تو اس مختفی ہ کو لکھنے میں الف سے بدل دینا چاہیے۔ جیسے:

تو فلہائے بے جا کا گلا کا۔

(۲) ایسے لفظوں میں جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں اور ان کی غیریت محسوس نہیں ہوتی ہ کی جگہ الف لکھنا جائز ہے۔ جیسے "مزہ" کی جگہ "مزا"۔

(۳) ایسے الفاظ جن میں اُردو بولنے والوں نے کوئی تصرف کر لیا ہو، جیسے "دوبالا" "دوخما" (یعنی دو خم والا) وغیرہ۔

(۲) مختفی ہ یا "ے"

(الف) مختفی ہ پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کی جمع میں تو یا تلفظ آواز کے مطابق لکھتے بھی "ے" ہی ہیں۔ جیسے "دو بچے"

کھیل رہے تھے"۔ مگر جب وہی لفظ واحد محرف حالت میں ہوتے ہیں اور تلفظ ان کا وہی ہوتا ہے جو جمع قائم کی حالت میں ہوتا ہے تب بھی اکثر لوگ ان کو ہ سے لکھتے ہیں۔ یہ کسی طرح درست نہیں۔ انھیں لکھنا بھی ویسے ہی چاہیے۔ جیسے وہ بولے جاتے ہیں۔ یعنی یوں:۔

"وہ چھٹے درجے میں پڑھتا ہے"۔ "میں مدرسے جاتا ہوں"۔ "اس بچے نے اس معمے کو حل کرلیا"۔ "شیر کے پنجے میں بڑی طاقت ہوتی ہے"۔ "اس واقعے سے سب کو حیرت ہوئی"۔

(ب) پانچ کے بعد کے عدد کو عام لوگ عام طور پر "چھہ" مختفی ہ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس لفظ کا فصیح تلفظ "چھے" ہے۔ یوں کوئی وجہ نہیں کہ اس طرح نہ لکھا جائے۔

(ج) "کیونکر" کی جگہ اگلے وقتوں میں "کیونکہ" بولتے تھے اور ے کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے "کیونکہ" (یعنی کیوں کہ جس میں "کہ" کاف بیانیہ ہے) لوگوں نے "کہ" اور "کے" کے معنوں میں فرق نہ کر کے "کیونکے" کو "کیونکہ" بنا دیا اور پرانے استادوں سودا، میر، درد وغیرہ کے دیوانوں میں "اصلاح" فرمادی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں تصحیف ہے۔ "کیونکر" کے معنی میں "کیونکہ" اب تحریری زبان سے گویا خارج ہو گیا ہے۔ لیکن بعض شہروں کے لوگ بول چال میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ پس نہ صرف پرانے اساتذہ کے کلام میں بلکہ بول چال کی بنا پر اس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اس لفظ سے کہیں نہ کہیں دو چار ہوں گے۔ اس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر "کر" کا قائم مقام ہو تو "کے" اور نہیں تو "کہ" لکھا جائے۔ جیسے:۔

نہ جانے کیونکے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی (غالب)

(۳) نون غنہ :۔

بعض لفظ جن میں نون غنہ ہے۔ کئی طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے صرف اسی طرز کو اختیار کرنا چاہیے جو تلفظ میں سب سے زیادہ قریب ہو۔ "کنوا" "کنواں" "کواں" تین طرح لکھتے ہیں۔ تینوں میں بہتر "کنوا" ہے۔ (کنوے۔ کنووں) اسی طرح "دھنوا" (اور دھنوے، دھنووں)، "گانو" (جمع: گانووں) "چھانو"، "دانو" (جمع دانووں) پانو (جمع پانووں)

اس طرح پر "کنواں"، "دھنواں"، "کواں"، دھواں": "پاؤں"، "گاؤں"، "داؤں"، "چھاؤں" وغیرہ صورتیں ترک ہو جائیں گی۔ البتہ "ڈھلواں" "گٹھواں" "چڑھواں" اور ترتیبی گنتیاں جیسے پانچواں، ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں وغیرہ اور پانچویں پانچویں (مونث) وغیرہ درست ہیں۔

گنتی کے لفظوں میں (گیارہ سے اٹھارہ تک) آخر کا حرف ہ ہے۔ بعض لوگ ان کے آخر میں ان لکھ دیتے ہیں اس لیے کہ بعض خطوں میں "گیاراں" "باراں" وغیرہ بولتے ہیں اور جو لوگ گیارہ بارہ بولتے ہیں کبھی کبھی اس طرح لکھ بھی جاتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ کس واسطے کہ ان لفظوں میں ہ اصلی اور ملفوظ ہے۔ پس ان گنتیوں کو ہ کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ یعنی گیارہ، بارہ۔ اب جس کا جی چاہے وہ گیاراں یا باراں بول لے۔ یہ وہی بات ہے "ہوا" کو بعض جگہ "وا" بولتے ہیں۔ مگر اس طرح لکھ نہیں سکتے۔

بعض لوگ "دونوں" کو "دونو" بغیر نون غنہ (ں) کے لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ صحیح ہے "دونوں" جیسے "تینوں"، "چاروں"، "پانچوں" "چھیوں"، "ساتوں" وغیرہ۔

جمع منادا کے ساتھ ساتھ کبھی لوگ ایک نون غنہ بھی لکھ دیتے ہیں یعنی "اے لڑکوں"۔ یہ درست نہیں۔ بغیر نون کے لکھنا چاہیے۔ جیسے "اے لڑکو" "صاحبو!"

جھوٹ کہتا نہیں میں، سچ جانو
کافرِ عشق ہوں مسلمانو! (قلق لکھنوی)

(۴) ہمزہ (ء)

(الف) اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ہمزہ الف کا قائم مقام ہے

پس جب دو حرف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو ان کے بیچ میں ہمزہ آسکتا ہے۔ نہیں تو نہیں۔ "آؤ" "جاؤ" "گیت گاؤ"، "دو لڑکے آئے"، "آپ آئے"، "میں آؤں تو کیا لاؤں؟" "میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں" وغیرہ میں ہمزہ لکھا جائے۔ مگر "بناؤ سنگھار"، "بھاؤ تاؤ"، "سمجھاؤ"، "گھماؤ"، "گڑھاؤ" میں ہمزہ کا کچھ کام نہیں۔ اسی طرح "گائے" "چائے" "رائے" اور "پائے" میں بھی ہمزہ نہ چاہیے۔ اور یہی حال "دیؤ" اور "سیئو" اور "ریؤ" "وریا" وغیرہ کا ہے۔ ان لفظوں میں الف ی۔ الف دیلے ومل کر ایک آواز دیتے ہیں اس لیے ان کے بیچ میں ہمزہ کی گنجائش نہیں۔

(ب) "لیے" (دونوں معنوں میں) "ایک نے دو سو روپے دیے اور دو گھوڑے لیے۔" "اس نے اپنے لیے چار جوڑے لیے اور بھائی کے لیے ایک ہی جوڑا۔" "سیکڑوں دیے جل رہے ہیں۔ یہ بھی دیوالی کی بہار ہے۔"

اوپر کے جملے میں دیے اور لیے کی بہت سی مثالیں آگئیں۔ ہمزہ کہیں نہیں آنا چاہیے۔ چاہیے، دیکھیے، لیجیے وغیرہ میں بھی ہمزہ نہیں بلکہ ے ہے۔ اسی طرح "تھالیوں"، "گالیوں" وغیرہ میں۔

ہمزہ اسی وقت آئے گا جب اس سے پہلے زبر ہو۔ اگر اس سے پہلے زیر ہوگا تو ے آئے گی۔ یعنی گئے میں ہمزہ ہے مگر کیے میں ے۔

(ج) جہاں ہمزہ لکھنا ضروری ہے وہاں اکثر لوگ کاہلی کے مارے اسے چھوڑ جاتے ہیں، جیسے:-
"بچھوؤں" کو "بچھوؤں"، بلکہ "بچھوں"۔ "لکھنؤ" کو "لکھنو"۔
"ہندوؤں" کو "ہندووں"۔ یہ درست نہیں۔

(۵) ن ب اور م ب

جب کسی لفظ میں نون غنہ کے بعد ہی ب ہو تو یہ دونوں حرف مل کر م کی آواز دیتے ہیں۔ جیسے انب سے آم (جس کی تصغیر "انبیا" کا تلفظ "امبیا" بلکہ "امیا" ہوتا ہے) نیب سے نیم، سیبب سے سیم، ان لفظوں کو میم ہی سے لکھنا چاہیے۔ فارسی عربی لفظوں زنبور، تنبورہ، شنبہ، گنبد، جنب میں جو ساکن ن ہے وہ تلفظ میں میم ہو جاتا ہے مگر لکھا "ن" ہی جاتا ہے۔ البتہ جب "گنبد" سے اردو والوں نے "گمز" بنادیا اور اس کی تصغیر "گمزی" تو ان دونوں لفظوں کو میم ہی سے لکھنا پڑا۔ پس قاعدہ یہ نکلا کہ فارسی، عربی کا لفظ ہو تو املا میں ان ہی باتوں کی پیروی کی جائے نہیں تو میم لکھا جائے۔

(۶) ذ یا ز؟

فارسی اور عربی لفظوں میں ذ اور ز کے لکھنے سے متعلق ہمارے ملک میں بڑا اختلاف ہے۔ سب سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی نے ایک خط میں جو انھوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا، یہ خیال ظاہر کیا کہ ذ عربی کے مخصوص حرفوں میں ہے۔ اس لیے فارسی لفظوں کو ز سے لکھنا چاہیے نہ کہ ذ سے۔ ادیبوں اور شاعروں کے گروہ میں یہ مسئلہ مدتوں زیر بحث رہا۔ اور اب بھی کبھی کبھی یہ بحث چھڑ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذ عربی کے ساتھ مخصوص نہیں اور حقیقت میں ث بھی مخصوص نہیں۔ یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں ان دونوں حرفوں کی آوازوں کا وجود تھا۔ چنانچہ عربی زبان میں جو لفظ یونانی اور فارسی کے لیے گئے ہیں ان میں یہ دونوں حروف ملتے ہیں۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ "استاذ" کی د پر عربوں نے تصرف کرکے ایک نقطہ لگا دیا۔ اصلیت یہ ہے کہ انھوں نے ایرانیوں سے استاذ ہی لیا اور اسی طرح بولنے اور لکھنے لگے۔ خود ایرانیوں کی زبان میں بعد کو وہ "ذ" "د" ہو گئی۔ اس لیے کہ اسلامی زمانے میں بلکہ شاید اس سے کچھ پہلے ہی ث اور ذ کی آوازیں زبان سے جاتی رہیں۔ پھر "ذ" "د" ہو گئی۔ مگر انے نئے لفظوں میں "ذ" کا تلفظ "ز" سے بدل گیا۔ لیکن ان لفظوں کو لوگ پرانی عادت کے مطابق "ذ" ہی سے لکھتے رہے۔ جیسے "آذر"، "گذشتہ"، "پذیرفتن"، "تذرو"، "کاغذ"۔ ایک گنبد ایسا لفظ ہے جو دونوں طرح سے لکھا اور بولا جاتا ہے یعنی "گنبذ" اور "گنبد"۔ ہندوستان میں لوگوں نے اس لفظ کی اسی دوسری صورت سے "گمز" بنالیا اور اس کی تصغیر "گمزی" ہوئی۔ ایران کے بعض مقامات میں "تذرو" کی جگہ "تدرو" اور

"کاغذ" کی جگہ "کاغذ" بھی سنا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان فارسی لفظوں میں اگر آواز کا لحاظ کیجیے تو ز صحیح ہے اور قدیم زبان اور کتابت کو مانیے تو ذ صحیح ہے۔

اردو میں "گزر اور گزار" اور مشتقات کو زیادہ تر ز ہی سے لکھتے ہیں اور یہ بے جا نہیں، مگر ذ بھی ان لفظوں میں صحیح اور جائز ہے۔

"آذر" اور "کاغذ" کو ہمیشہ اور "پذیرا" وغیرہ کو اکثر ذ سے لکھتے ہیں۔ ان کو یوں ہی رہنے دینا چاہیے۔ ان فارسی لفظوں کے علاوہ جن لفظوں میں ذ آتی ہے وہ عربی سے آئے ہیں۔ اب چاہے وہ ٹھیٹ عربی ہوں یا کسی اور زبان سے مستعار۔ ایسے لفظوں میں عربی املا کی پیروی لازم ہے۔ اگر آواز کے لحاظ سے اُردو میں ایک اکیلی ز ہی ذ، ض اور ظ کی قائم مقام ہے۔

چند عربی اور فارسی لفظوں کا غلط املا رواج پا گیا ہے۔ البتہ محتاط لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان لفظوں میں یہ مثالیں زیادہ اہم ہیں:-

(۱) "بحرِ زخّار" کو بعض کم سواد لوگ "بحر ذخّار" لکھتے ہیں۔ غالباً اس دھوکے میں کہ "ذخّار" "ذخیرہ" سے بنا ہوگا۔ اصلیت یہ ہے کہ "زخّار" کو "ذخیرہ" سے اصلاً تعلق نہیں۔ بلکہ "زخّار" کے معنی ہیں "بہت امنڈتا ہوا (سمندر) یا چڑھا ہوا دریا۔

(۲) "ذکی" اور "زکی" اپنی جگہ دونوں صحیح ہیں۔ مگر لوگ "زکی" کے محل پر بھی "ذکی" لکھا کرتے ہیں۔ یعنی "زکی الدین" یا "محمد زکی" ز سے لکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ "زکی" کے معنی ہیں پاک اور "ذکی" کے معنی ہیں تیز فہم، اور قابلِ ملامت بھی۔

(۳) "زکریا" کو بعض لوگ غلطی سے ذ سے لکھتے ہیں۔ بلکہ بعضے تو یہ ستم کرتے ہیں کہ "ملازم" میں بھی ذ لکھ دیتے ہیں۔

(۴) "آزوقہ" عربی لفظ نہیں ہے۔ فارسی ہے اور اس کا املا ز سے صحیح ہے۔ غلطی سے لوگ ذ سے لکھ دیتے ہیں اور یہ غلطی فارسی کی کتابوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔

(۵) "آزر" (حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام) آزر ز سے ہے۔ اسے فارسی لفظ "آذر" سے کوئی تعلق نہیں۔

(۶) "ذات" عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "نفس" یا "نفسِ نفیس" یا "شخص"۔ "نژاد" یا "قوم" وغیرہ کے معنی نہیں ہیں۔ ان معنوں میں جو لفظ اُردو میں بولا جاتا ہے وہ حقیقت میں سنسکرت کا لفظ "جات" سے نکلتا ہے۔ ہندی میں ت کا کسرہ اس لیے گر گیا کہ کسی لفظ کا آخر حرف متحرک نہیں ہو سکتا۔ اُردو والوں نے ج کو ذ کی آواز سے بدل دیا۔ چاہیے تھا کہ اس لفظ کو ز سے لکھتے لیکن عربی لفظ ذات کے دھوکے میں اس کو بھی ذ ہی سے لکھنے لگے۔ اس غلط طریقے کو یقیناً ترک کر دینا چاہیے۔ اور جہاں "نژاد" "قوم" وغیرہ کے معنی ہوں وہاں ز ہی سے لکھنا چاہیے۔ جیسے "زات پات"، "زات جماعت"، "زات بات"۔ "وہ زات کا برہمن ہے۔" "اس کی زات کھری ہے۔"

(۷) عربی کا ایک لفظ "ذرّہ" ہے (جس کی ر پر تشدید ہے) اس کے معنی ہیں کسی چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا۔ اُردو میں یہ لفظ بولا جاتا ہے اور انھیں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے جو صرف صفت اور متعلق فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جس کے معنی ہیں "تھوڑا"۔ اس کی ر پر تشدید نہیں اور آخر میں الف ہے ہ نہیں۔ مگر بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ چونکہ اس لفظ کے پیدا ہونے کا باعث عربی لفظ "ذرّہ" ہے اس لیے اسے بھی ذ ہی سے لکھنا چاہیے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تلفظ میں ایک چھوڑ دو دو تصرف ہوئے۔ معنوں میں فرق ہو گیا۔ یہ کہنا چاہیے کہ اُردو نے ایک نیا لفظ پیدا کر لیا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ز سے نہیں لکھا جائے۔ ادیبوں اور شاعروں کی رایوں میں کتنا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ذ سے لکھو اور کچھ لوگ کہتے ہیں اس کا املا ز ہی سے صحیح ہے اور ذ سے غلط۔ اصولاً ز کو ترجیح ہے۔ اس لیے کہ عربی لفظ "ذرّہ" سے اسے اب نہ تلفظ کی رو سے کچھ واسطہ ہے نہ معنی کی جہت سے بلکہ "زرا" ٹھیٹ اُردو لفظ ہو گیا۔

(۷) ص یا س ؟

فارسی والوں نے اپنی زبان کے بعض لفظوں کو عربی حرف سے لکھنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ ہم آواز لفظوں کا ایک دوسرے سے امتیاز ہو سکے۔ "صد" سو کے معنی ہیں۔ حقیقت یں س سے ہے مگر اس کا رواج ایسا متواتر ہے کہ اب اس غلطی کی اصلاح کچھ ناممکن سی ہو گئی ہے۔ "شصت" (ساٹھ) دونوں طرح سے لکھا جاتا ہے اس لیے اگر اردو میں کبھی اس فارسی لفظ کے استعمال کی ضرورت پڑے تو شست لکھنا بہتر ہوگا۔

"مسالا" کی بحث اوپر آ چکی ہے (دیکھو الف اور مختفی ہ کا بیان)

(۸) ط یا ت ؟

فارسی اور ترکی کے بعض لفظ کسی نہ کسی وجہ سے ت کی بجائے کبھی ط سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے طپش، طپیدن، طشت، طوطی۔ محتاط لوگ ت ہی سے لکھتے ہیں اور ہم کو بھی یہ املا اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی تپش، تشت، تشتری، توتا، توپ، تماچا، تیار کو طیار بھی لکھتے ہیں۔ ہم کو تیار اختیار کرنا چاہیے۔ سوائے اس کے کہ یہ لفظ "اڑنے والا" کے معنوں میں استعمال ہوا ہو۔

(۹) کچھ اور لفظ

بہت سے ایسے لفظ ہیں کہ وہ صحیح لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا غلط املا بھی ایک حد تک رائج ہو گیا ہے۔ ان میں سے چند خاص توجہ کے قابل ہیں :-

صحیح املا	معنے	غلط املا
ازدحام	ہجوم، بھیڑ	ازدہام، اژدھام، اژدحام
اسراف	فضول خرچی	اصراف
تباشیر	بنس لوچن	طباشیر
تریاق	زہر کا مارک	طریاق
تلاطم	سمندر یا دریا کا تھپیڑے مارنا	طلاطم
توتیا	....	طوطیا
دوات	روشنائی کا برتن	داوات
عیوض	بدلا	عیوض
مرہم	زخم کی دوا	ملہم
مُسرف	فضول خرچ آدمی	مصرف
مع	ساتھ، سمیت	معہ

★

یوسف ناظم

ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے!

پچھلے چند برسوں نہ صرف دُنیا کا جغرافیہ بدل گیا ہے۔ بلکہ خود آدمی کا جغرافیہ زیر و زبر ہو کر رہ گیا ہے۔ [زیر و زبر ہونا اُس کیفیت کا نام ہے جس میں کوئی ٹھوس یا رقیق شئے پہلے درہم اور بعد میں برہم ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر "زلفِ یار" زلفِ یار رقیق نہیں ہوا کرتی۔ زلفِ یار کے برہم ہونے کی وجہ سے کسی کے دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگتی ہے۔ اور وہ شخص چند خاص امراض میں مبتلا ہو شروع کرتا ہے]۔ آدمی کے جغرافیہ میں سب سے اہم چیز اُس کا چہرہ ہوا کرتا ہے۔ یہ چہرہ عام طور پر چاند کی شکل کا ہوتا ہے۔ مریخ مشتری اور زہرہ کے نمونے کے چہرے ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن جب سے آدمی کا جغرافیہ زیر و زبر ہو گیا ہے۔ دنیا میں بے چہرہ لوگ بکثرت پائے جانے لگے ہیں۔ اس میں ہوائی فیملی پلاننگ میں صرف ۵۰ فیصد کامیابی حاصل ہونے کی وجہ سے۔ لوگ وجود میں آتے ہیں۔ لیکن اُن کے چہرے نازل نہیں ہو سکے!

حال میں چہرہ شماری کے جو اعداد حاصل ہوئے ہیں۔ اُن کی روشنی میں علم الابدان کے ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں سبھی لوگ بے چہرہ ہو جائیں گے۔ قدرت کے کارخانے میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

بے چہرہ لوگوں کی پیدائش، افزائش اور بعد میں اُن کی آرائش کے لیے نشے کی چیزوں کا استعمال ضروری ہے۔ لیکن وہ دقیانوسی اور فرسودہ چیزیں نہیں جو گذشتہ زمانے میں رائج تھیں۔ اور جن کے لیے شاعر نے کہا ہے۔ ع

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔

پہلے زمانے میں آدمی بے چارہ ادب اور قاعدے کے مارے دم سادھے رہا کرتا تھا۔ اُسے دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ زمانہ اب گزر گیا۔ آج دم مارنے پر کوئی پابندی نہیں۔ ایر کنڈیشنڈ کالونی ہو یا کالج کا بیت الخلا، کھلا میدان ہو یا تنگ و تاریک کوٹھری [illegible] عورت، لڑکا یا لڑکی ہر شخص کو دم مارنے کے مقابلے میں ویسی ہی آزادی ہے جتنی شاعر کو مہمل شعر کہنے کی۔

آدمی کو بے چہرہ بنانے میں حشیش بہت مفید پائی گئی ہے [illegible] لوگ غور دیں [illegible] حاصل ہونے کے یقین کے ساتھ نوجوانوں کے لیے حشیش ہی کی سفارش کرتے ہیں۔

حشیش کے چند روزہ استعمال سے بزرگی کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دھوپ میں کھڑے ہو کر بال سفید کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

حشیش کے چند روزہ استعمال سے

بیس بائیس سال کا نوجوان کم سے کم پچپن سال کا مشفق بزرگ نظر آنے لگتا ہے۔ ورنہ اُس بزرگی کو حاصل کرنے کے لیے [illegible] کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ بچپن کو پچپن میں منتقل کر دینا حشیش کا معمولی کرشمہ ہے حشیش کے ملنے کا پتہ کابل ہے۔ حشیش میں یہ خوبی بھی ہے کہ حشیش کے استعمال کے بعد اگر کوئی لات بھی مارے

[illegible] نہیں چلتا۔ حشیش یوں تو بہت پرانی چیز ہے۔ لیکن اسے مقبول ہونے میں ذرا دیر لگی۔ دنیا کا دستور یہی ہے۔ اچھی بات دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ حشیش کا دم مارنے کے بعد آدمی بھوک پیاس اور بیاس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

آدمی کو بے چہرہ بنانے میں دوسری چیز جو زود اثر مانی گئی ہے وہ "میری جوانا" کہلاتی ہے۔ [نام ہی اس کا کتنا خوبصورت ہے۔ یہ علی بابا والی مرجانا سے کم کار آمد نہیں۔] میری جوانا ہمارے دان نہیں ملتی۔ اگر ملتی بھی تو شاید ہم اس کی اتنی قدر نہ کر سکتے۔ ہمارے ہاں اس کا بدل افیون اور گانجے میں ڈھونڈا جاتا ہے۔ لیکن افیون آدمی کو بے چہرہ بنانے کے مشن میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ [اس کا استعمال بس چند خاص موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ جیسے نوجوان جوڑے رات کے وقت اپنے چھوٹے بچوں کو سلانے کے لئے افیون کھلا دیا کرتے تھے] بھنگ بھی فضول شئے ہے۔ اسے کتنا گھونٹنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر گھونٹ گھونٹ کر جو بھنگ پلائی جاتی ہے، وہ بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اور دو گلاس پینے کے بعد بھی آدمی ہوش میں رہتا ہے۔ اتنی قیمتی بھنگ پینے کے بعد بھی اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اس نے پتلون پہن رکھی ہے یا نہیں۔ بھنگ جو مٹھائی کی شکل میں کھائی جائے قدرے بہتر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بھی آدمی بے چہرہ نہیں بنتا۔ میری جوانا، سگریٹ کی طرح خوبصورتی سے پیئے جانے کی چیز ہے اور ایک ہی پائپ سے کئی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔ گانجے میں میری جوانا کی کچھ شباہت اور اس کے کچھ اثرات ہیں۔ لیکن گانجا اونچی سوسائٹی کی چیز نہیں۔ گانجا سنا ہے دھنیا لگانے کے لئے ضروری غذا ہے۔ اور خانقاہوں اور تکیوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف میری جوانا تکیوں میں نہیں، لحاف میں استعمال کیے جانے کی چیز ہے۔

بے چہرہ بننے کے لیے کوکین بھی عمدہ چیز ہے۔ اس کے خواص یہ ہیں کہ آدمی کیسا ہی وہ مُردہ ہو یا پژمردہ، چند لمحوں میں تر و تازہ بنا دیتی ہے۔ اس میں ایک نپولین کو فوجی نیا دینے کی طاقت ہے۔ آدمی کے اندر مارشل اسپرٹ پیدا کرنا اس کی خاصیت ہے۔ کوکین کھایا ہوا آدمی جس ملک کو چاہے فتح کر سکتا ہے۔ اور اس کام کے لیے اسے اس ملک تک جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوکین کی ایک خوراک کا مختصر فائدہ یہ ہے کہ آدمی کم سے کم تین دن اور تین رات جاگ سکتا ہے۔ اور بلا کھائے پئے چار پانچ میل بھاگ سکتا ہے۔ کوکین کھانے کے بعد آدمی اگر ملک گیری کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ تو وہ ریس کورس جا کر گھوڑ دوڑ دیکھ سکتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ خود دوڑ رہا ہے۔ کوکین کی خوراک کے بعد آدمی اپنے فرضی دشمنوں کا قلع قمع کر کے فتح کے نقارے بجا سکتا ہے۔

بے چہرہ بننے کے معاملے میں سب سے کارآمد چیز ال ایس ڈی کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ (ال ایس ڈی۔ ال ال ڈی کی طرح کوئی آنریری ڈگری نہیں۔ اور نہ پی ڈبلیو ڈی کی طرح کا کوئی محکمہ ہے) ال ایس ڈی کھانے یا پینے کی چیز نہیں۔ اسے انجکشن کے طریقے سے لینا پڑتا ہے۔ آدمی ازل سے آج تک اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ خود کو سمجھ پائے۔ ال ایس ڈی میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خود کو دوسروں کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں۔ وہ خود کو غائب ہوتا بھی محسوس کرتا ہے اور عوام الناس کی موجودگی میں "تخلیہ" کا لطف اٹھاتا ہے۔ اور کبھی وہ خود کو "اور زیادہ موجود" محسوس کرتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے ال ایس ڈی کا انجکشن ضروری ہے۔ اس انجکشن کی مدد سے آدمی اپنے "اندرون" کے سفر پر بھی روانہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے اندر بخوبی اتر سکتا ہے۔ یہ سہولت کسی اور چیز میں نہیں۔ بغیر ال ایس ڈی کے آدمی صرف دور ہی دور سے اپنے اندر جھانک سکتا ہے۔ اتنے لمبے فاصلے سے اپنے اندر جھانکنے کی وجہ سے اسے اپنا اندرون صاف نظر نہیں آتا۔ ال ایس ڈی ان سب مسائل کا آسان حل ہے۔ اس کے بعد تحت الثریٰ میں جانے کے لئے کسی سب میرین یا آسمان پر جانے کے لئے کسی راکٹ

کی ضرورت نہیں رہتی ۔

حشیش، میرو جانا، کوکین اور ایل ایس ڈی کا اگر پابندی سے استعمال کیا جائے تو آدمی نہ صرف قلیل عرصے میں بے چہرہ ہو کر ماڈرن ہو جاتا ہے بلکہ ان چیزوں کے استعمال سے اس کا اندرون اتنا پاک و صاف ہو جاتا ہے کہ اسے بیرون کی صفائی کے لیے نہانے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ وہ ان چیزوں کے سہارے برسوں بغیر نہائے رہ سکتا ہے ۔ ایک ایسا آدمی اگر بازو کے محلے میں موجود ہو تو اُس کی خوشبو آپ کے محلے میں ضرور پہنچے گی ایک ایل ایس ڈی مار کا شخص اور میونسپلٹی کی ایک کچرا وین میں یہ فرق ہوتا ہے کہ میونسپل کچرا گاڑی مقررہ راستوں پر چلتی ہے۔ اور یہ شخص کسی راستے یا واسطے کا پابند نہیں ہوتا !

بدیع الزمان خاور

نعت

نبیوں میں ذی شان محمدؐ
اک کامل انسان محمدؐ

جن کو بھولے گا نہ زمانہ
کر گئے وہ احسان محمدؐ

میرے آقا میرے والی
یثرب کے سلطان محمدؐ

مجھ کو اپنے پاس بُلا لو
میں تم پر قربان محمدؐ

خمو صیدی

دھوئیں کی سیہ دلدلوں سے

دھوئیں کی سیہ دلدلوں سے ابھرتی ہوئی روشنی کی شعاعیں

ابھی سست رو ہیں

مگر ہر طرف پھیلتی جا رہی ہیں

(یہ اپنا علاقہ بڑھاتی رہیں گی)

گھنی رات کے سائبانوں کے نیچے

اندھیرے کی چادر میں جو منہ لپیٹے پڑے تھے — وہ منظر

نظر کے افق پر نمودار ہونے لگے ہیں

ٹھٹھرتی ہوئی خاموشی کی گپھاؤں میں خوابیدہ الفاظ —

انگڑائیاں لے کے بیدار ہونے لگے ہیں

فضا میں کہیں یک بیک نقرئی گھنٹیوں کی صدا گیت گانے

لگی ہے

(صدا اپنا جادو جگاتی رہے گی)

افق سے افق تک جو چھائے ہوئے تھے

وہ کہرے کے بادل بکھرنے لگے ہیں

اُجالے زمیں پر اُترنے لگے ہیں

در و بام شہر تمنا کا چہرہ نکھرنے لگا ہے

کہ اب رشتہ رشتہ سنورنے لگا ہے

(سنورتا رہے گا)

نظر زندگی کے خد و خال پہچانتی جا رہی ہے

کہ گم گشتہ صبح ملاقات یاراں

شب ہجر کی آخری سرحدیں پار کرتی .... چلی آ رہی ہے

عبدالرحمٰن مومن

ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ سوانح حیات*

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب " مقالات احسانی " کے آخری باب میں "طریقہ اشغال مطلقہ یا اطلاقی تصوف" کے عنوان سے صوفیہ کے دو گروہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ صوفیوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو نوافل، ذکر و اذکار وظائف اور اسی قسم کے دیگر اشغال دینی کو بہت اہمیت دیتا ہے اور انہیں صوفیانہ طرز زندگی کا ایک لازمی جزو سمجھتا ہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے صوفی عوام الناس سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں گذارتے ہیں۔ صوفیوں کا دوسرا گروہ رجحان طبع کے لحاظ سے پہلے گروہ سے مختلف ہے۔ یہ قرآنی لفظ " احسان" کی تشریح پہلے گروہ کی طرح اوراد و وظائف کے سیاق میں نہیں کرتا۔ اس قسم کے صوفی وضع قطع، عبادت اور دیگر امور دینی میں اپنے آپ کو عوام سے ممتاز رکھنا پسند نہیں کرتے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر عوام میں ہوتا ہے اور ان کے مشاغل اور دلچسپیاں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ لوگ ان کی واردات قلبی کا اندازہ مشکل ہی سے لگا پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک " احسان " کا براہ راست تعلق دل سے ہے۔ اوراد و وظائف سے ماورا ان کی بصیرت عوام الناس سے تعلق خاطر کو قربت الٰہی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس طریق احسانی کو مولانا گیلانی مرحوم نے طریقہ اشغال مطلقہ یا اطلاقی تصوف کہا ہے۔

میرے خیال میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کی تہ دار شخصیت مولانا گیلانی کے بیان کردہ اطلاقی تصوف کی کئی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ کہنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ذاکر صاحب کو صوفیہ کے زمرے میں شامل کیا جائے یہاں دکھانا یہ مقصود ہے کہ ذاکر صاحب کا طریقۂ زندگی، تصور حیات اور انداز فکر بہت حد تک صوفیہ کی عالی نظری اور وسعت قلبی کا آئینہ دار تھا۔ بمبئی کے مشہور مجلہ السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا (مطبوعہ جولائی ۱۹۶۹ء) میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر ایک مضمون لکھا تھا۔ مضمون میں ایک جگہ مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سچے مسلمان کے اوصاف حمیدہ کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی ۔ ذاکر صاحب نے قرآن مجید کی اس آیت کا حوالہ دیا جس میں ان لوگوں کو سب سے اعلا مقام سے سرفراز کیا گیا ہے جو راتوں کو اٹھ کر اپنے گناہوں پر آنسو بہاتے ہیں ۔ مجیب صاحب لکھتے ہیں کہ بہت وقفہ بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ بات ذاکر صاحب کے متعلق بھی ہو سکتی ہے ۔ جس چیز کو صوفیائے کرام نے اخفاء عبادت کہا ہے اس میں ذاکر صاحب زیادہ کامیاب تھے کیوں کہ ان کی گفتگو، ذوق اور گوناگوں دلچسپیوں سے ان کی مذہبیت کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔

ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے ایک ذاکر حسین میموریل کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی کے ذمہ جو کام کیے گئے تھے ان میں ایک کام یہ بھی تھا کہ ذاکر صاحب کی ایک مستند اور جامع سوانح حیات مرتب کی جائے۔ یہ کام ذاکر صاحب مرحوم کے دیرینہ رفیق پروفیسر محمد مجیب کو سونپا گیا۔ زیر تبصرہ کتاب یہی سوانح حیات ہے جسے مجیب صاحب نے بڑی کاوش اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے عبدالغفور نورانی ذاکر صاحب کی مختصر سی سوانح شائع کر چکے ہیں جو زیادہ تر تاریخی اور واقعاتی مواد پر مشتمل ہے ۔ مجیب صاحب کی مرتب کردہ سوانح کی

---

* DR ZAKIR HUSAIN: A BIOGRAPHY مرتبہ پروفیسر محمد مجیب، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۷۲۔

بڑی خوبی یہ ہے کہ اس ذاکر صاحب کی زندگی اور نظریات سے متعلق بہت سی شخصی اور غیر معروف باتوں کا بھی تذکرہ ہے اور وہ بھی بڑے شخصی انداز میں اس کے باوجود مجیب صاحب نے سوانح نگار کی دیانت دارانہ حیثیت قائم رکھی ہے۔ بعض جگہ رشید احمد صدیقی کی دلچسپ کتاب "ذاکر صاحب" کے انداز بیان کی سی چاشنی ملتی ہے۔

کتاب ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے دو بابوں میں ذاکر صاحب کے خاندانی اور ابتدائی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرا باب جامعہ ملیہ سے متعلق ہے بعد کے دو ابواب ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات کی تشریح و توضیح کے لیے وقف ہیں۔ بقیہ ابواب ذاکر صاحب کی بقیہ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے متعلق ہیں۔ مجیب صاحب نے ذاکر صاحب مرحوم کے کارناموں، ان کے ذاتی خصائل اور اطوار کا تذکرہ بڑی خوبی اور شگفتگی سے کیا ہے۔

ذاکر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ جامعہ ملیہ ہے۔ جس انداز میں انہوں نے بے لوث و مخلص خادمین قوم کی ایک جماعت جس میں مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین کا نام سرفہرست ہے، تیار کی اور اپنی فکر و کردار سے اس میں عالی ہمتی لگن اور بلند حوصلگی کی روح پھونکی وہ انداز ایک زمانہ تک تعمیری کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ بنا رہے گا۔

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

ذاکر صاحب نے جرمنی میں ورنر زومبارٹ جیسے شہرۂ آفاق ماہر اقتصادیات کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کیا تھا۔ ہندوستان میں ایسے بہت سے ادارے تھے جہاں وہ آرام سے رہ کر کام کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے جامعہ ملیہ کی خدمت کا کام اپنے ذمہ لیا جو اس وقت مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں آکر انہوں نے انجمن تعلیم ملی کی تشکیل کی اور جامعہ کا انتظام سنبھالا۔ اس وقت انہوں نے مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد حسین اور دیگر رفقاء کے ساتھ یہ حلف لیا،

وہ ۱۵۰ روپے سے کم مشاہرے پر بیس سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے ذاکر صاحب کی تنخواہ اس وقت سو روپے مقرر کی گئی کچھ دنوں کے بعد ان کے ساتھیوں نے بھی سو روپے لینا منظور کر لیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے اپنی تنخواہ اسّی روپے مقرر کر والی۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۸ء تک ذاکر صاحب کی تنخواہ اسّی روپے ماہوار رہی۔ اس دوران انہیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ۷۰۰ روپے ماہوار پر وائس چانسلری کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے مسترد کر دی۔ یہ مثال ہے بے لوث خدمت اور ایثار کی، جس کا ڈھنڈورا تو سبھی پیٹتے ہیں لیکن واقعتاً شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آج ہمارے یہاں بہت سی مثالیں ہیں کہ ہمارے نوجوان بیرونی ممالک سے ڈگریاں لے کر آتے ہیں اور اپنے ملک ہندوستان میں، جو ظاہر ہے ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے ویسی ہی مراعات، سہولتیں اور آسائشیں چاہتے ہیں جو انہیں بیرونی ممالک میں میسر تھیں اور جب ایسی سہولتیں انہیں نہیں ملتیں تو کچھ ہی دنوں بعد اپنا وطن چھوڑ کر چل دیتے ہیں، ایسی جگہ جہاں تن کے تقاضے اچھی طرح پورے ہو سکیں۔

تعلیم اور تعلیمی اقدار سے ذاکر صاحب کا شغف کچھ جبلی قسم کا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے خیالات و نظریات کو جرمنی میں جلا ملی۔ مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ جرمنی میں قیام کے دوران اگرچہ ان کا موضوع تحقیق ہندوستان میں انگریزوں کی زرعی پالیسی سے متعلق تھا انہوں نے جرمن فلاسفہ اور ماہرین تعلیمات بالخصوص کرشین شٹائنر (Korschenteiner) ریکرٹ (Rickert) ولہلم ڈیلتھے (W. Dilthey) اور شلائر ماخر (Schleiermacher) کے افکار کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کے خیالات و افکار میں ذاکر صاحب کو اسلامی اقدار کی جھلک نظر آئی۔ انہوں نے مشہور جرمن فیلسوف سپرانگر (Spranger) کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ جرمنی میں انہوں نے ایسے بہت سے ماہرین تعلیمات سے

ملاقات کی جنہوں نے تجرباتی مدرسے کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلے میں جرمن میں قیام کے دوران کا ایک دلچسپ واقعہ مجیب صاحب نے بیان کیا ہے جو ذاکر صاحب کی شگفتہ مزاجی اور خوش دلی کا آئینہ دار ہے بات ۱۹۲۳ء کی ہے۔ موسم بہار اپنے شباب پر تھا۔ ذاکر صاحب پر آمد بہار کا سب سے زیادہ اثر معلوم ہو رہا تھا۔ ذاکر صاحب کھلے کالر کی قمیص پہنے ہوئے تھے اور ان کے بالوں سے باد بہاری اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ واپسی کے ایک تفریحی مقام پر جانے کے لئے جہاں جھیلیں اور جنگل کثرت سے ہیں، ذاکر صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹرین میں بیٹھے۔ ٹرین میں انہیں صرف کھڑے رہنے کی جگہ مل سکی۔ ذاکر صاحب دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک اسٹیشن پر چند لڑکیاں ٹرین یا اپنی سہیلیوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے ذاکر صاحب کو دروازے پر کھڑا ہوا دیکھا اور ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کھلکھلا کر ہنسنا شروع کیا۔ جب ذاکر صاحب نے خلاف توقع ان کی ہنسی کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دیا تو انہوں نے اور ہنسنا شروع کیا جوں ہی ٹرین کھسکنے لگی ذاکر صاحب نے فرانسیسی تھیٹر کے انداز میں لڑکیوں کی طرف ہوا میں بوسہ لہرایا۔

بات ہو رہی تھی تعلیم کی۔ ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم صرف رسمی طور پر سیکھنے سکھانے کا نام نہیں، اور نہ ہی مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود ہے۔ تعلیم کا رشتہ طالب علم کے تمام تر وجود سے ہے اور تعلیمی اقدار اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنما ہونے چاہئیں۔ ذاکر صاحب کے اس کلیتی تصور تعلیم پر جرمن فلسفہ خصوصاً ([illegible]) کا اثر غالب ہے جس کی رو سے انسانی تجربات اور احساسات پر کلیت اور جامعیت کی روح غالب ہوتی ہے۔ لہٰذا اقدار کا دائرہ اثر تجربات و احساسات کے پورے نظام پر محیط ہونا چاہیئے۔ تعلیم کی غرض و غایت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "طالب علم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو واہموں اور تعصب سے بچائے رکھے اور بری خصلتوں کو اپنے آپ سے دور رکھے۔ تعلیم کی اشاعت اس کی تعلیم کا ایک جز ہونا چاہیئے۔ طالب علم کو علم بانٹ، علم حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن اسے زندگی کی ضروریات سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر وہ ان ضروریات سے غافل ہے تو وہ نہ اپنے خاندان کی کفالت کر سکتا ہے اور نہ ہی بنی نوع انسان کے کام آ سکتا ہے اگر وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے تو اسے انسان کہلانے کا حق نہیں ہے اور وہ دنیا میں کوئی خاطر خواہ کام انجام نہیں دے سکتا۔" رسمی اور مدرسی تعلیم سے ہٹ کر انہوں نے تعلیم کا ایک نیا اور صحت مند نظریہ پیش کیا "ضرورت کہ ہمارے مدرسوں کو صرف کتاب خوانی کی جگہ کے بجائے باہمی تعاون کے کاموں کا مرکز بنائیں جہاں ملک کے نوجوانوں میں سماجی اور سیاسی ذمہ داری کا شعور پیدا ہو سکے۔ اسکول ایک ایسی جگہ ہونی چاہیئے جہاں ہمارے نوجوانوں کو تعمیر سیرت اور کردار سازی کا موقع مل سکے۔" اس غرض کے حصول کے لیے انہوں نے "بنیادی تعلیم" کے نظریے کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ بنیادی تعلیم کے نظریے کے مطابق نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیئے کہ مدرسہ خود اپنی کفالت کر سکے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ طلبہ دستکاریاں یا اس قسم کے محنت کے کام بھی کریں تاکہ تعلیم کے ساتھ ان کی جسمانی نشو و نما بھی متوازن طور پر ہو سکے۔ ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم سماجی اور اخلاقی شعور سے عبارت ہے۔ یہ سماجی اور اخلاقی شعور چند اقدار کے تابع ہوتا ہے۔ تعلیم ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کرتی ہے جس میں موجودہ حالات و کوائف کا بے خوفی اور تنقیدی انداز میں جائزہ لیا جا سکے۔ ان کے نزدیک یہ بات انسان کی عقلی اور اخلاقی راست بازی کے سراسر خلاف ہے کہ موجودہ کوچوں کا توں صرف اس لیے قبول کر لیا جائے کہ واقعتاً حالات ایسے ہیں یا انہیں کم سمجھ لوگوں کی جو اکثریت میں ہیں حمایت حاصل ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اقدار کی تلاش میں ہماری رہنمائی کرے اور کڑے سے کڑے حالات میں ان اقدار پر ہماری استقامت کی ذمہ داری لے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی شخصیت ہمہ جہتی قسم کی تھی ایک طرف

ان کو پودوں اور پھولوں سے بے حد انس تھا تو دوسری طرف شعر و شاعری کی طرف بھی طبیعت مائل تھی۔ مولانا روم کے اشعار سے طبعی انسیت تھی۔ طرح طرح کے پتھر اور اس قسم کے آثار جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ اقتصادیات تو ان کا خصوصی مضمون تھا ہی، فلسفہ اور ادبیات میں بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ افلاطون کی کتاب "جمہوریت" کا راست جرمن سے اردو ترجمہ اس کا آئینہ دار ہے۔ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم سے ذاکر صاحب کو طبعی لگاؤ تھا اور اسی سلسلے میں انہوں نے مشرقی و مغربی علماء کے افکار کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ملنے جلنے والوں میں ہر مذہب و ملت اور مکتب خیال کے لوگ شامل تھے اور سبھی ان کی باتوں سے یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے تھے۔ مجیب صاحب نے جہاں ذاکر صاحب کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا ہے وہیں ان کے تساہل کے بارے میں بھی کئی باتیں لکھی ہیں لکھنے لکھانے کے معاملے میں ذاکر صاحب بہت ہی کسل مند واقع ہوئے تھے اور تقریر یا مضمون عین وقت پر لکھنے بیٹھتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈمی نے ان کو اقتصادیات پر لیکچر دینے کی لیے مدعو کیا۔ حسب دستور ذاکر صاحب دوستوں کے ساتھ اس بات پر گفتگو کرتے رہے کہ لیکچر کس طرح پڑھا جائے وغیرہ لیکن انہوں نے کاغذ پر کچھ نہیں لکھا۔ لیکچر کی تاریخ سے تین روز پہلے وہ لکھنے بیٹھے اور مسلسل ۴۸ گھنٹوں تک لکھتے رہے۔ لیکچر اس وقت مکمل ہوا جب آخری ٹرین کی روانگی کا وقت بالکل سر پر تھا۔

ذاکر صاحب بڑے فراخ دل اور وضعدار واقع ہوئے تھے جامعہ ملیہ کی ملازمت کے زمانے میں بھی جب ان کی گذر اوقات خاصی مشکل سے ہو رہی تھی انہوں نے اپنی وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ لباس کی وضعداری سے وہ کھاتے پیتے گھرانے کے معلوم ہوتے اور جب کوئی ان سے قرض مانگتا تو انہیں انکار کرتے نہ بنتی۔ اس سلسلے میں مجیب صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

قائم گنج سے اپنے اہل و عیال کو بلوانے سے پہلے ذاکر صاحب نے مکان کے لیے کچھ فرنیچر خریدا۔ شاہ صاحب نام کے ایک حضرت ذاکر صاحب کے ملاقاتیوں میں سے تھے اور جامعہ کے ایک استاد کے والد بزرگوار تھے انہوں نے ذاکر صاحب کی تمام کرسیاں دعاریتاً لے لیں اور لوگوں سے یہ کہتے پھرے کہ ذاکر صاحب نے کرسیاں انہیں تحفے میں دی ہیں۔ دوسرے روز ذاکر صاحب نے کچھ اور کرسیاں خریدیں۔ اس زمانہ میں مجیب صاحب ذاکر صاحب کے پڑوس ہی میں رہا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب نے مجیب صاحب سے کہا کہ شاہ صاحب یہ کرسیاں بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد شاہ صاحب دو ملازموں کے ہمراہ کرسیاں لینے آدھمکے مجیب صاحب سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا "آپ ذاکر صاحب کے پاس سے سب کچھ لے جانا چاہتے ہیں؟" شاہ صاحب ناراض ہو کر چلے گئے۔ ذاکر صاحب کو اس سے بڑی تکلیف پہونچی۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟" انہوں نے مجیب صاحب سے کہا۔

ذاکر صاحب کو بچوں سے فطری انس تھا، خصوصاً یتیم اور بے سہارا بچوں سے۔ ذاکر صاحب کو سنی اوقاف دہلی کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ انہوں نے دریا گنج کے یتیم خانے کو اپنی ذاتی نگرانی و انتظام کے لیے منتخب کیا۔ انہوں نے مجلس اوقاف کی کمیٹی کی جو رپورٹ تیار کی اس سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے: "اس ادارہ کو یتیم خانہ نہ کہا جائے "بچوں کا گھر" اس کے لیے مناسب نام ہوگا۔ ادارے کے منتظم کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ بچوں سے ایسا برتاؤ کیا جائے کہ ان کے ذہن سے یتیمی کا احساس مٹ جائے۔ اس سلسلہ میں بچوں کے کھانے اور لباس سے متعلق خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کو دوسروں کے یہاں کھانا کھانے کو نہ بھیجا جائے۔ نہ ہی ان کو دوسروں کا پہنا ہوا کپڑا دیا جائے۔ ان کے کپڑوں سے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ یتیم ہیں۔ ان کو چندہ وغیرہ جمع کرنے کے لئے نہ بھیجا جائے۔"

اگرچہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے اقسام سے متعلق سپرانگر کے

خیالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین نے لکھا ہے کہ ذاکر صاحب کی شخصیت میں سماجی اور مذہبی پہلوؤں کا غالب اور خوبصورت امتزاج تھا۔ (نقوش، شخصیات نمبر) یوسف جبر علی کی وفات پہ ایک اچھے مسلمان کا ذکر صاحب نے جو خاکہ کھینچا ہے وہ اُن پر بھی صادق آتا ہے۔ اچھے مسلمان کی تعریف اسلاف نے اس طرح کی ہے کہ اس کی فراخ دلی دریا کی فراخ دلی کی طرح ہوتی ہے، اس کی رحمت سورج کی رحمت کی طرح ہوتی ہے، اس کی مہمان نوازی زمین کی مہمان نوازی کی طرح ہوتی ہے۔ وہ ضرورت مند لوگوں کے کام آتا ہے، بے سہاروں کی مدد کرتا ہے اس کے غم اور کاوشیں لوگوں کے غم اور کاوشوں سے عبارت ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی انہیں میں گذارتا ہے اور اس سلسلہ میں جو بھی مصیبتیں آتی ہیں انہیں برداشت کرتا ہے اور جو اس کا برا چاہتے ہیں ان سے فراخدلی اور ایثار کے ساتھ پیش آتا ہے۔" اور اس سلسلہ میں ذاکر صاحب کے یہاں ہندو مسلمان کا بھید بھاؤ نہ تھا ان کے دل کے دروازے تمام لوگوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرح سے ان کی زندگی اقبال کے ان اشعار کی عملی تفسیر تھی۔

حرفِ بد را لب بر آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

ذاکر صاحب سیاست کی بھول بھلیوں میں کبھی نہیں پڑے۔ اس کے باوجود انہیں جو بھی منصبِ عالی ملا اسے انہوں نے خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی ذات سے لوگوں کو جو بھی فائدہ پہونچ سکتا تھا اس سے انہوں نے کبھی اعراض نہیں کیا۔ انکی صدارت کے زمانہ میں ملک کے مشہور علمی و تحقیقی ادارے دار المصنفین اعظم گڈھ کا جشن طلائی منعقد ہوا۔ ذاکر صاحب نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور خطبۂ صدارت بھی پڑھا۔ اس موقع پر حکومت ہند کی طرف سے انہوں نے دار المصنفین کے لیئے پچاس ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے حکومت یوپی سے بھی دس ہزار روپے دلوائے۔

ذاتی طور پر ذاکر صاحب کی جو بات مجھے سب سے پیاری نظر آئی وہ ان کی رواداری اور وسعت قلبی ہے۔ صدر بننے کے بعد جب وہ شنکراچاریہ اور منی سشیل کمار کے درشن کے لیے گیے تو لوگوں نے مختلف خیال آرائیاں کیں۔ بعضوں نے کہا کہ انہوں نے شنکراچاریہ کے پیر چھوئے وغیرہ۔ اس پر مسلمانوں نے کافی ناراضگی کا اظہار کیا مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ پاؤں چھونے کی بات غلط ہے۔ ذاکر صاحب نے خود اپنے ایک دوست سے بیان کیا کہ انہوں نے صرف شنکراچاریہ کے قدموں پر پھول رکھے۔ جب مجیب صاحب نے اس بارے میں ان سے دریافت کیا تو وہ صرف خاموش رہے ان کے چہرے کے تاثر سے مجیب صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ ذاکر صاحب کا منشا تھا، مجیب صاحب خود اس بات کو سمجھیں۔

دوسرے مذاہب اور ان کے بانیوں کو ذاکر صاحب نے ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا اور ان کی تعلیمات کے گوہر پاروں کو انکی حقیقت شناس نظروں نے ہمیشہ دل و دماغ کے نہاں خانوں میں جگہ دی کہ الحکمۃ ضالۃ المومن [illegible] (حدیث: حکمت مسلمان کی کھوئی ہوئی چیز کی طرح ہے، یہ اسے جہاں بھی نظر آتا ہے فوراً اسے بازیکڑ لے آتا ہے) اپنی اس وسعتِ قلب و نظر سے ذاکر صاحب نے نہ صرف اپنے دل و دماغ کی تشفی کیں بلکہ اوروں کے دلوں کو بھی ترپایا۔ ذیل کا اس واقعہ سے جو مجیب صاحب نے السٹریٹیڈ ویکلی کے مذکورہ شمارہ میں بیان کیا ہے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ذاکر صاحب نے ایک بار مجیب صاحب سے خود بیان کیا۔ کچھ عرصہ پہلے پنجاب یونیورسٹی کی ایک

تقریب کے لیے میں گرو گوبند سنگھ پر ایک مضمون لکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کاغذ پر پانی کے قطرے جیسی کوئی چیز دکھائی دی۔ مجھے کافی حیرت ہوئی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ قطرے میرے آنسوؤں کے تھے۔ میں نے آنسو پونچھے اور دوبارہ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ لیکن یہ خیال رہ رہ کر میرے ذہن میں آتا رہا کہ پنجاب یونیورسٹی میں سامعین کے سامنے مضمون پڑھتے میرے آنسو نکل آئیں تو کیا ہوگا۔ اور ہوا ایسا ہی۔ پڑھتے وقت میرے آنسو بہہ نکلے۔ میں ذرا متفکر سا ہوگیا۔ میں اس امید میں تھا کہ مجھے روتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ لیکن جب میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو ہر طرف یہی عالم تھا۔ تمام لوگ چشم پرنم تھے۔"

یہ کچھ جھلکیاں مخلص صاحب کی مرتب کردہ سوانح کی، کتاب پڑھنے والے ایسے بیسیوں واقعات اور کیفیات سے دوچار ہونگے اور ان کی نظر میں ذاکر صاحب کی عظمت کے چراغ اور بھی روشن ہوں گے۔ مجیب صاحب مخلص نے یہ سوانح عمری لکھ کر نہ صرف ذاکر صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اہل بصیرت کے لیے تازگیٔ قلب و نظر کا ایک سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ مفکر، ادیب عالم تو پیدا ہوتے رہے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے لیکن "معنی لفظ آدمیت" کے حامل کم پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گورڈن نے امریکی فلسفی اور ماہر نفسیات ولیم جیمز کی وفات پر کہا تھا "سب کچھ کہنے سننے کے بعد انسانی پہلو ہی سب سے دیرپا ہوتا ہے۔ محقق، مفکر معلم سب، انسان میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ انسان ہی آخری اور سدا باقی رہنے والی قدر ہے۔" ذاکر صاحب مرحوم انہی لوگوں میں سے تھے جن کے وجود اور شخصیت کا ہر پہلو "معنی لفظ آدمیت" سے سرشار تھا۔

جام بنتے ہی رہیں گے مگر آئے گی کہاں
پھر یہ فردوس کے پھولوں میں بسی گل ساقی

آخری پتّی

(او ہنری کے افسانے (The Last Leaf) کا منظوم روپ)

روپ نگر میں ایک مکاں تھا — پیپل کا اک پیڑ وہاں تھا
اس گھر میں تھی ایک حسینہ — جیسے انگوٹھی میں ہو نگینہ
شعلہ بدن، شعلہ آگیں تھی — وینس کی تصویر حسیں تھی
نازک سی رنگین کلی تھی — پیپل کے سائے میں پلی تھی
پت جھڑ کا جب موسم آیا — اس کے لیے بے چینی لایا
اک اک پتّی ٹوٹ رہی تھی — دل کے سکوں کو لوٹ رہی تھی
یاس سے یہ سب دیکھا کرتی — دل ہی دل میں رویا کرتی
اس نے اک پتّی کو تاکا — اپنے دل میں پھر یہ سوچا
گر جائے گی جب یہ پتّی — مٹ جائے گی اس کی ہستی
روز اسی پتّی کو تکتی — آہیں بھرتی اور سسکتی
غم سے یوں دوچار ہوئی وہ — بالآخر بیمار ہوئی وہ
روز اطبّا آتے جاتے — بیماری کا بھید نہ پاتے
سوچ میں ڈوبے فکر میں غلطاں — سب تھے حیراں اور پریشاں
ایک مصوّر اس کے قریں تھا — اس کا ہر اک نقش حسیں تھا
روز نیا اک نقش بناتا — نقش بناتا اور مٹاتا
رہتا تھا وہ فکر میں غلطاں — اس کے دل میں تھا اک ارماں
فن کا اک اعجاز دکھاؤں — قدرت کا شہکار بناؤں
اس نے طبیبوں کو جب دیکھا — ایک سے اس نے آخر پوچھا
اُس نے انوکھی بات بتائی — غم کا سبب ہے بس اک پتّی

اس نے بھی وہ پتی دیکھی — پھر اس کو تدبیر یہ سوجھی
خوش خوش وہ اپنے گھر آیا — کاغذ پر یوں رنگ جمایا
پتی کی تصویر بنائی — نقلی سے اصلی شرمائی
رات میں زور کا طوفاں آیا — ساتھ میں بادو باراں لایا
ٹوٹ گئی وہ پتی جس دم — چشمِ مصوّر ہو گئی پُرنم
سردی سے وہ کانپ رہا تھا — جسم کو اپنے ڈھانپ رہا تھا
سڑکوں پر سیلاب رواں تھا — لیکن اس کا عزم جواں تھا
فوراً جا کر سیڑھی لایا — پتی کو ڈالی پہ سجایا
گھر آیا پھر شاداں شاداں — اپنے فن پر نازاں نازاں
فرطِ خوشی میں جھوم رہا تھا — موئے قلم کو چوم رہا تھا
تن من کا کچھ ہوش نہیں تھا — حالانکہ مے نوش نہیں تھا
سر پر دیکھا موت کا سایا — ہر سو اک اندھیرا چھایا
آخر میں وہ فن کار بچارا — ایسے میں دنیا سے سدھارا
صبح ہوئی بیدار حسینہ — ماتھے پہ تھا اس کے پسینہ
اس نے نظر جب شاخ پہ ڈالی — اپنی جگہ وہ پتی پا لی
دیکھ کے پھر مسرور ہوئی وہ — فرطِ طرب سے چور ہوئی وہ
اپنی قسمت پر تھی نازاں — رہنے لگی وہ شاداں فرحاں
چند ہی دن میں ہو گئی اچھی — غور سے اس نے دیکھی پتی
پتی کو مصنوعی پایا — دانتوں میں انگلی کو دبایا
سامنے آئی ساری حقیقت — دل میں جلی پھر شمعِ محبت

لیکن وہ فن کار کہاں تھا
جس کا یہ شہکار جواں تھا

رشید قاسمی

(انشائیہ)

افواہ

علامہ اقبال نے دعا کے متعلق کبھی فرمایا تھا۔ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ممکن ہے علامہ کی زندگی دعا طاقتِ پرواز کی حامل رہی ہو۔ پر آج شاید اس کے پر ٹوٹ چکے ہیں۔ دل سے نکلی ہوئی بات بھی اب درجۂ قبولیت حاصل نہیں کر پاتی۔ نئی زمانہ تو بقول شخصے وہ عالم ہے کہ ؎

آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ہاں تو صاحب مذکورہ دعا کے ضمن میں شعر مذکور یوں سمجھ لیجئے تقریباً بیکار ہی ہو گیا۔ البتہ ذرا سے تصرف کے ساتھ اسے افواہ پر صادق لانا یا منطبق کرنا کوئی مشکل نہیں۔ ذرا یوں پڑھیے گا۔ ؎

منہ سے جو بات نکلتی ہے سحر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

افواہ کے پر نہیں ہوتے لیکن اڑان شکتی بے پناہ ہوتی ہے۔ حضرت جبرئیل کے پر سدرۃ المنتہا کے آگے نکلنے پر جل اٹھتے تھے مگر ہمارے شہپرِ تخیل تو اس حد تک پہنچتے پہنچتے ہی تمازت کی شدت سے جھلس اٹھتے ہیں۔

افواہ کذب و افترا کی پروردہ، غیبت کی یار غار اور مبالغہ کی عزیزہ ہے۔ افواہ ہے کہ ہی افواہ شیطان کی دست راست ہیں۔ شیطان کی شیطنیت کی بدولت قصۂ آدم میں رنگینی پیدا ہوئی۔ افواہ کے اعجاز نے روکھی پھیکی باتوں کو چٹخارا دے دیا۔ سیدھے سادے خاکوں میں رنگ بھر دیا۔ درحقیقت کہئے اڑی اس کا رنگ بھی اپنے ساتھ لے اڑی۔ افواہ عموماً اہم ہستیوں کے بارے میں اڑتی ہے یا یوں کہیے کہ اڑ اڑ کے شخصِ متعلقہ کو اہم بنا دیتی ہے۔ افواہوں کی بخشی ہوئی شہرت "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا" سے مختلف نہیں۔ افواہ کا کام ہے اڑنا، اڑنا، مدام اڑنا۔ جشنِ مدام ہی میں افواہ کی گرمی کا راز مضمر ہے۔ اسی لئے تو لوگ بانگ کہتے ہیں۔ "افواہ گرم ہے" افواہ تعمیر سے متنفر ہے تو تخریب کی دلدادہ۔ تعریف سے گریز کرتی ہے اور تضحیک کے درپے رہتی ہے۔ اسکی سرشت میں قدرت نے لچک دی ہے جتنا دبانے کی کوشش کیجیے اتنا ہی وہ ابھرے گی۔ افواہ نشو و نما کے ارتقائی منازل بتدریج طے کرتی ہے۔ اول تو گرم ہوتی ہے، پھر پھیلتی ہے، اس کے بعد گشت لگانے کا مرحلہ آتا ہے۔ پرواز اس رفتار کی آخری کڑی ہے اور حشر! کچھ نہ پوچھیے اکثر خلاؤں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

افواہ کی عمر چھوٹی ہوتی ہے۔ ایک ہی افواہ طویل عرصے تک آفاق پر منڈلاتی رہے تو یار لوگ بور ہو اٹھتے ہیں۔ ذہنِ انسان کبھی ایک ہی افواہ پر قناعت نہیں کر سکتا۔ وہ نت نئی افواہیں چاہتا ہے۔ اس کا دماغ متواتر ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتا رہتا ہے۔ دم بدم افواہ اڑتی رہے تو دلبستگی کا ایک ذریعہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اور جو فضا میں کوئی افواہ مصروفِ گشت نہ ہو تو ہوا جیسے ساکت ہو کر رہ جاتی ہے۔ قوا مضمحل ہو جاتے ہیں اور اعصاب پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔

افواہ کی دو قسمیں ہیں ۔ قسم اوّل ان افواہوں پر مشتمل ہے جو محض تفنن طبع کی خاطر گھڑ دی جاتی ہیں ۔ فارغ البال حضرات سینما و تالیفات کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں اور "خوش باش دمے ۔ زندگانی این است" والے نظریے پر ایمان رکھنے والے صاحبان بے پر کی پبلسٹی کرتے پھرتے ہیں ۔ اس نوع کی افواہیں خالصتاً بے ضرر ہوتی ہیں ۔ ضرر رساں افواہیں وہ ہوتی ہیں جو کسی منظم سازش کا نتیجہ ہوں ۔ ان افواہوں کو زہر کی پوٹ سمجھ لیجیے ۔ جس کے نام سے اڑتی ہیں اس کی زندگی تلخ بنا دیتی ہیں اور قوم اور مملکت کا محکمۂ دفاع تک ان سے خائف رہتا ہے ۔ ادھر دو ملکوں میں جنگ کا اعلان ہوا ۔ ادھر پوسٹروں پر جا بجا یہ الفاظ نظر آنے لگے " افواہیں نہ سنیے افواہیں نہ پھیلائیے " مگر افواہیں نہ سننا قطعی ممکن نہیں ۔ اس لئے کہ افواہ کا بنیادی تعلق سماعت سے ہی ہے ۔ اور ایک بار سننے کے بعد پھیلانے کو کس کم بخت کا دل نہ چاہے گا ۔ دل ہی تو ہے ۔

سائنس کی ترقی نے افواہ کی بقا کے لئے ماحول کو نہ صرف سازگار بلکہ خوشگوار بنا دیا ہے ۔ ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلیفون اور ٹیلی ویژن نے وقت اور مسافت کا طلسم یکسر توڑ دیا ہے ۔ افواہ کے حلقۂ اثر کو لامحدود کر دیا ہے ۔ اب وہ پہلی سی قید مقامی نہیں رہی ۔ سائنس کی گراں قدر خدمات کے طفیل ہم گھر بیٹھے عالمگیر افواہوں سے محظوظ ہوتے ہیں ۔ زندہ باد اے افواہ زندہ باد ۔

افواہ بازی ایک آرٹ ہے ناچنے گانے اور جیب کاٹنے کی طرح ۔ پتنگ بازی کی طرح افواہ بازی بھی ہمارا پسندیدہ شغل ہے ۔ روحانیت پرست ہونے کے ناتے ہم ایسی تمام چیزوں کے شائق ہیں جو اوپر آسمان کی اور ہو جاتی ہوں ۔ افواہ پتنگ سے کئی زیادہ تیز گام ہے ۔ کسی بزرگ کے سامنے افواہ کی تیز گامی پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا ۔ بزرگ ناتواں لہرا کے بولے ۔

"وہ اسے تو پتنگ کا شوق بہت جی
بڑی چنچل بڑی نازک بدن ہے
جوانی ہے کہ بجلی کی کرن ہے "

افواہ کے لیے صیغۂ تانیث استعمال ہوتا ہے شاید اس لئے کہ عورت اور افواہ دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے میل کھاتا ہے اس لیے نہیں کہ مرد افواہ بازی نہیں کرتے ۔ مرد تو جب افواہ بازی پر اُتر آتے ہیں، ہمت مردانہ اور جرأتِ رندانہ کے نئے نئے باب وا کر جاتے ہیں ۔ عورتوں کی افواہ بازی تو چھالیہ کترتے ہی دم توڑ جاتی ہے ۔ مگر ہر کس بقدر ہمت اوست ۔

مجرم کا سراغ لگانا آسان ہے ۔ افواہ کا نقطۂ آغاز معلوم کرنا سخت مشکل ہے ۔ بھلا کہیں سایے کو بھی پکڑا جا سکتا ہے ۔ عموماً سر پھرے ہی افواہ کا سرا پانے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں ۔ افواہ اُڑنے کی صورت میں بہترین صورت یہی ہے کہ چپ سادھی جائے ۔ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر افواہ خود بخود مر جائے گی ۔ اور یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ افواہ کی عمر چھوٹی ہوتی ہے ۔ نئی افواہ مارکیٹ میں آجائے تو پرانی افواہ کو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہیں پوچھتا ۔ پوچھنا تو درکنار غریب کے وجود تک کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے ۔ تو کیستی من کیستم ۔ کیا آپ نہیں جانتے دنیا کا حافظہ کمزور ہے ؟

ایک صاحب نے مینا خریدی ۔ گھر جا کر دیکھا تو وہ لنگڑی نکلی ۔ الٹے پاؤں دوکاندار کے پاس گئے اور بہت خفا ہوئے کہ
" منہ مانگے دام لیا اور دھوکا دیا "
دوکاندار نے سنجیدگی سے کہا،
" قبلہ! آپ کو مغنیہ درکار ہے یا رقاصہ ؟ "

★

ظفرالاسلام ظفر

غزل

چرچے ہیں مرے، گل بدنوں سیم بروں میں
میں بھی سر فہرست ہوں آشفتہ سروں میں

یہ رازِ درونِ دل کس سے کہوں کس سے چھپاؤں
اک تجزیۂ دل بھی ہے ان خوش نظروں میں

ٹوٹا ہوا دل جوڑنے والا نہیں ملتا
پھرتا ہوں لیے شیشۂ دل شیشہ گروں میں

دل حوصلہ دار سے گزرا تن تنہا
ہمراہی کے اوصاف نہ تھے ہم سفروں میں

اب قاسمِ انوار دربانی ہے دربانی
محلوں میں چراغاں ہے اندھیرا ہے گھروں میں

حیرت گوکنی

تبرکات

ہے برابر شورِ ناقوس و اذاں میرے لیے
مجھ کو سجدوں سے غرض مسجد ہو یا بت خانہ ہو

مسجد و مندر کی یہ تفریق بے معنی سی ہے
سب کرشمے ہیں یہ اپنے ہی خیالِ خام کے

ہے برہمن و واعظ کا کرم باہم ہیں کشیدہ دیر و حرم
جھگڑا جو مٹا دے دونوں کا وہ ہستیٔ کامل آجائے

تعصب کا ہٹایا ہم نے پردہ اپنی آنکھوں سے
مٹا دی اس طرح تفریق دل سے کفر و ایماں کی

کیوں دل میں اس کے خواہشِ دیر و حرم رہے
ہوگا جو بار یاب تری بارگاہ میں

ہے شیخ و برہمن کا ایک مقصد
کشمکش سبحہ و زنار کیوں ہے

منصور اب کہاں کہاں سرمد سے حق نگر
تازہ کریں جو قصۂ دار و رسن ابھی

یہ رنگ و بو کی دنیا آئینہ خانہ ہے وحدت کا
تعدد سے فقط عاری ہے یہ کثرت مثالوں کی

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

(آخری قسط)

ہندوستان کی جنگ آزادی میں علما کا مثالی کردار

جہادی تنظیم کے اثرات

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ خاں اور دوسرے مورخین جگہ جگہ وہابی جہادیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تنظیم کے اثرات بہت دور دور تک پہنچے ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں۔

۱۔ سو دو سو کے قریب وہابی جہادی بن کر ٹونک سے آئے۔

۲۔ جے پور، ہانسی، حصار، بھوپال سے بھی جہادی آئے۔ تین چار سو جہادیوں کا مجمع ہوگیا۔

۳۔ دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلا بخت خاں وغوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا۔ اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کے میر لشکر اور بخت خاں ان کا مولانا ہوا۔ (تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۶۷۵)

۴۔ الٰہ آباد سے مولوی لیاقت علی خاں جہادیوں کے سرغنہ کی عرضی آئی (تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۶۷۰)

۵۔ غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی ٹونک سے تقریباً پانچسو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ ان کو سپاہ کی صورت میں مرتب کیا اور یہ ذرہ سوار جہادی غازی یا شہید بننے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

(تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۶۸۶)

اسی طرح منشی جیون لال کے روزنامچہ میں بار بار جہادیوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

۲۵ر جون ۱۸۵۷ء۔ گوڑگاؤں اور قرب وجوار کے دوسرے علاقوں سے چار سو مجاہدین دہلی میں آئے۔

۳۰ر جون ۱۸۵۷ء۔ پانچ سو مجاہد انگریزوں کے پاس سے ایک ہاتھی چھین کر لائے اور اُسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

۲ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر میں حسب ذیل فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے تیاری کر رہا ہوں۔

چار پیدل فوجیں، سات سو سوار، چھ بھاری توپیں جنہیں کھینچنے کے لیے گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ تین میدانی توپیں، ایک سو مجاہدین۔

۹ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ جنرل بخت خاں نے سواروں اور پیدل فوج کے سپاہیوں کے ساتھ انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا۔ اور بہت سے افسروں اور پیدل فوج کے سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ کہتے ہیں تو پچیوں نے جنرل بخت خاں کو پہچان لیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے۔

۱۲ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ ٹونک سے چھ سو مجاہد آئے اور آج بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے اطلاع دی کہ ابھی دو تین ہزار اور آنے والے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا میرے پاس تم لوگوں کے رسد کا انتظام نہیں ہے۔

۲۲ جولائی ۱۸۵۷ء۔ نجیب آباد سے تقریباً دو سو جہادی آئے اور شہر سے باہر قیام پذیر ہوئے۔

۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء۔ جہادیوں کا ایک قائد اعظم ٹونک سے آیا اور بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی۔

۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء۔ میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ انھیں کھلانے کے لیے میرے پاس روپیہ نہیں رہا۔ فیاض نے کہا شہر والوں کو حکم دیجیے کہ وہ ان کے کھانے کا بندوبست کریں۔

۴ اگست: — نصیر آباد سے چند جہادیوں کا معروضہ موصول ہوا کہ چھ ہزار سپاہی ایک دل ایک جان ہو رہے ہیں۔

۵ اگست: — جہادیوں نے شکایت کی کہ صرف ہم ہی ایسے ہیں جو انگریزوں سے نہایت جوش کے ساتھ لڑتے ہیں اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

۶ اگست: — مولوی صدر الدین خاں کے مکان پر آئے پچاس سپاہیوں نے یورش کر دی لیکن یہ دیکھ کر کہ وہاں جہادی مقابلہ کے لیے تیار ہیں واپس ہو گئے۔

۱۰ اگست: — محمد میر خان کے صاحبزادے بڈھن نے آج جہادیوں میں دو ہزار کی رقم تقسیم کی۔

۲ ستمبر: — جنرل کے چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے میدان میں لڑنے کے لیے نکلے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور ان کے کئی سو ساتھی مارے گئے۔

۱۴ ستمبر: — گوروں اور سکھوں کی فوج ہمت کر کے جامع مسجد پہنچ گئی۔ جامع مسجد میں یہ دیسی مسلمان جامع تھے۔ انھوں نے انگریزوں پر حملہ کیا۔ اور ان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

جہادیوں سے خونریز جنگ

۷ ستمبر سے انگریزوں نے مورچے تیار کر کے بڑی بڑی قلعہ شکن توپوں سے گولا باری شروع کی۔ اور ایک ہفتہ کی شبانہ روز گولا باری اور آتش فشانی کے بعد ۱۴ ستمبر کو اس قابل ہوئے کہ کشمیری گیٹ کے دراز سے فوج کا ایک کالم شہر کے اندر داخل کر سکیں۔ ۱۹ ستمبر تک قدم قدم پر اتنا شدید مقابلہ ہوتا رہا کہ بارہا انگریزی فوج کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ان دو ہفتوں میں انقلابی فوجوں کے متفرق دستوں نے جس طرح داد شجاعت دی وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ گر وطن عزیز کے پایہ تخت کے ایک ایک چپہ پر جنہوں نے اپنے سر کٹھائے، جانیں قربان کیں شہر پناہ کے سنگین حصار میں شگاف پڑ جانے کے بعد جنہوں نے اپنے بہادر سینوں کی چٹانوں سے ان شگافوں کو بند کیے رکھا ان کے لیے شاہد عینی حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ جو انہوں نے زندگی کے آخری لمحات میں قلمبند کیے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"پھر نصاریٰ (انگریزی فوجیں) شہر اور اس کے پھاٹکوں پر دربانوں اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے۔ ادھر حالت یہ تھی کہ جہادی جو ہر وقت حاضر رہتے تھے اور انقلابی فوجوں کی ایک جماعت شدت سے ان کو شہر سے روکتی بھی تھی اور ان پر حملے بھی کرتی رہتی تھی۔ اور نصاریٰ جو کچھ جاہ رہے تھے قدم قدم پر ان کے آڑے آتی تھی۔ دونوں فریق کے پیدل اور سواروں کا شدید مقابلہ پوری قوت سے رات دن جاری رہتا تھا"

(الثورۃ الہندیہ یعنی باغی ہندوستان)

اس زمانے میں جب شہر کا گوشہ گوشہ انقلابی فوجوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور شہر کے ایک ایک کوچے سے انگریز دشمنی کے آوازے بلند ہو رہے تھے مولانا خیر آبادی فرماتے ہیں۔

" چار ماہ تک برابر کی جنگ جاری رہی اور باوجودیکہ دشمن (انگریز) ہر طرح مضبوط تھا، اس کے پاس فوجیں بھی زیادہ تھیں اور سامان جنگ بھی بہت تھا مگر کسی طرح وہ شہر میں داخل ہونے کا موقع نہ پا سکا۔ اس کے حملوں کو روکا جاتا تھا اور اس کے ہر اقدام کو پسپا کر دیا جاتا تھا۔ یہ غازی غیور و باحمیت

میں بڑی شدت سے جوابی کارروائی کرتے اور ڈٹ کر میدان جنگ میں مقابلہ کرتے تھے گھمسان کے وقت ثابت قدم رہتے جہاں بھی موقع ملتا پینترا جما کر آگے بڑھتے۔ اسی میں ایک بڑی تعداد نے شربت شہادت نوش جان کیا اور سعادت ابدی اور اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے۔" (باغی ہندوستان)

جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے نیچے کھلے میدان میں ۱۴ ستمبر کو جو خونریز معرکہ ہوا ہے اسے خواجہ حسن نظامی نے شہر کے بہت سے بڑے بوڑھوں سے زبانی دریافت کر کے قلمبند کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"جامع مسجد میں اس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لیے جمع تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز مسجد کو بارود سے اڑانا چاہتے ہیں۔ ان سب کے پاس تلواریں تھیں۔ بندوقیں نہ تھیں۔ ان کا ایک آدمی منبر پر چڑھا۔ اور اس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا "تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے جس کو مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازہ کی طرف آئے۔ اور جس کو جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازہ کی طرف چلا جائے۔ کہ ادھر دشمن کی فوج نہیں ہے۔" یہ تقریر سن کر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ان میں سے ایک بھی جنوبی دروازے کی طرف نہیں گیا۔ ان سب نے تلواریں میان سے کھینچ لیں۔ سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر شمالی دروازہ کی طرف دوڑے۔

ٹسکاف کی فوج نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے۔ مسجد کی سیڑھیاں ان کی لاشوں سے بھر گئیں۔ مگر مسلمان تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر اس پھرتی سے آگے بڑھے کہ ٹسکاف کو دوسری گراب مارنے کی مہلت نہ مل سکی۔ اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ ٹسکاف صاحب اور ان کی فوج کو ان پرجوش آدمیوں کے مقابلہ سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ مسلمانوں نے کشمیری گیٹ کے گرجا تک ان کا تعاقب کیا۔" (دہلی کی جانکنی ص ۳۳ و ص ۳۴)

راقم الدولہ ظہیر دہلوی جو آٹھ بجے صبح سے حالات کا جائزہ لینے کے لیے گھوم رہے تھے اور اس حادثہ سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد جامع مسجد پہونچے انھوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ کوتوالی سے لے کر جامع مسجد تک لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور خاص جامع مسجد کے قریب لاشوں کا انبار ہے کہ جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہے۔"

(داستان غدر ص ۱۱۳)

بہرحال یہ مسلمان جس تعداد میں جامع مسجد کے اندر جمع تھے وہ سب کے سب شہر کے باشندے نہیں بلکہ باہر سے آئے ہوئے مسافر تھے۔ اور یہ وہی جہادی تھے جو دشمن کے مقابلہ پر لڑتے رہے اور جب۔ انقلابی فوج شکست کھا کر پیچھے ہٹی تو جہادی اسی کے گھر آ پڑے جس کے نام پر قربان ہونے کے لیے آئے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں نے قربان ہو کر اپنی تمنائیں پوری کرلیں۔

علماء دہلی پر آفتیں

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں شکست کے بعد جب انگریزوں کا غلبہ ہو گیا تو انھوں نے دل کھول کر انتقام لینا شروع کیا۔ جن پر شبہ ہوا کہ یہ بغاوت میں شریک رہا ہے یا اس کا حامی رہا ہے اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ بلا تامل قتل کیا جاتا۔ پھانسی کا عمل جاری کر دیا جاتا۔ جو زخمی جہادی مسجدوں میں پڑے ہوئے تھے وہ پہلے اس لڑائی میں مقابلہ کر کے زخمی ہوئے تھے اور اب دار و رسن کی سنت ادا کر رہے تھے۔

دہلی اس زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھی۔ بڑے بڑے جید اور نامور علماء، شعراء، مصنفین تھے۔ ان میں سے اکثر کا کسی نہ کسی نوع سے بغاوت سے تعلق ضرور رہا۔ جن لوگوں نے جہاد کے فتوے پر دستخط کیے تھے اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے انگریزوں کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کیا تھا سب پر آفتیں ٹوٹ پڑیں۔

مولانا مفتی صدرالدین آزردہ جیسے صاحب کمال کو سخت آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے جاتا رہا اور تمام جائداد و املاک بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی تھی سرکار میں ضبط ہو گئی اور فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کی پاداش میں کئی ماہ تک نظر بند رہے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڑھ سے وابستگی کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ پھانسی کے بجائے صرف سات سال کی قید تجویز ہوئی آفتاب ہند مولانا امام بخش صہبائی نہ صرف خود گولیوں کا نشانہ بنائے گئے بلکہ ان کے کنبے کے اکیس افراد کو قطار میں کھڑا کر کے گولیوں کی باڑھ ان پر چلائی گئی۔ اور سب کے سب ختم ہو گئے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں۔

"غرض کہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے ان میں کئی اشخاص باکمال نامور فرد روزگار مارے گئے۔ جو دہلی کی ناک اور یگانہ آفاق تھے جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ہوگا۔ میاں محمد امیر پنجہ کش خوش نویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں، مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندان لوگ ———— سنا گیا ہے کہ اسی محلے کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازہ سے دریا پر لے جا کر بندوقوں کی باڑ ماردی گئی اور لاشیں دریا میں پھینکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔" (داستان غدر ص ۱۲۸)

مفتی صدرالدین آزردہ کو صہبائی کی شہادت کی خبر پہنچی تو بے اختیار زبان سے نکلا ؎

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

جہاد حریت میں علمائے مظفر نگر اور سہارنپور کی شرکت

دہلی سے شمال کی جانب تقریباً چالیس میل کے فاصلے سے شروع ہونے والا علاقہ جس طرح زمین کے لحاظ سے زرخیز ہے ویسے ہی انسانیت اور علم و فضل کے لحاظ سے بڑا مردم خیز اور بلحاظ سیاست انقلاب انگیز واقع ہوا ہے۔ جب ہندوستانیوں کے سیاسی شعور نے انگریزی اقتدار کے مقابلہ کے لیے انگڑائی لی۔ تو سب سے پہلے یہی علاقہ تھا جس نے حضرت سید احمد شہید کے مجاہدانہ اقدام کے لئے سب سے پہلے اپنی حدود کو فرش راہ بنایا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے خویش حضرت مولانا عبدالحئی اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ عیسائیت کی تردید میں سرگرم کار اور عیسائی پادریوں کے دانت کھٹے کرنے والے عالم حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اسی علاقہ کے تھے۔ یہ مولانا کیرانوی وہ بزرگ ہیں جن کے دستخط ۱۸۵۷ء کے تاریخی فتوے پر بھی ثبت ہیں۔ جب جنرل بخت خاں اور مولانا سرفراز علی نے دہلی پہونچ کر باغیانہ تحریک کو منظم کر لیا اور انقلابی کارروائیاں مکمل کر لیں تو اس علاقے کی جماعت علماء کے نمائندے کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لینے مولانا رحمت اللہ کیرانوی دہلی تشریف لائے۔ اور صورت حال دیکھ کر انہوں نے یقین کر لیا کہ اب جہاد کی شکل پیدا ہو چکی ہے۔

حضرت سید احمد شہید کی درسگاہ معرفت کے فاضل مولانا نصیر الدین دہلوی شیخ طریقت حاجی امداد اللہ صاحب بھی اسی علاقہ میں ارشاد و ہدایت کا غلغلہ بلند کیے ہوئے تھے۔ حریت کاملہ کا جذبہ بے پایاں اپنے دلوں میں لیے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ۱۸۵۷ء کی ابتدا ہوئی انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنا گوارا نہ کیا۔ ضبط و نظم اور قانون کی پوری پابندی کے ساتھ آگے بڑھے۔ وہ جماعتی نظم جو اب تک اس علاقہ میں ایک اصلاحی حیثیت رکھتا تھا اس نے سیاسی ڈھنگ اختیار

کرلیا۔ باقاعدہ نظام حکومت کا خاکہ بن گیا۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحب امیر، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن صاحب اور مولانا محمد منیر صاحب جیسے زعماء کو فوج، حفاظت، فصل خصومات اور عدل وقانون کے امور سپرد کیے گئے۔ اس موقع پر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود بادشاہ کو بھی ضبط ونظم قائم کرنے اور اس جیسے نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے۔ چنانچہ نواب شبیر علی مرادآبادی کو اس مقصد کے لیے دہلی بھیجا گیا لیکن بروقت اقدام نہ کیا گیا۔ حالات کا انتظار رہا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی دہلی سے واپسی کے بعد سب کے حوصلے بلند ہوگئے۔

مئی کا مہینہ ختم ہوکر جون کا مہینہ گذر رہا تھا اور یہ سرفروشان تگ ودو منظم جدوجہد اختیار کرنے ہی والی تھی کہ اسی اثناء میں رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت صاحب کے بھائی کا حادثہ پیش آگیا۔ وہ ہاتھی خریدنے کے لیے سہارنپور تشریف لے گئے کسی نے مخبری کردی مجسٹریٹ ضلع سہارنپور نے ان کو گرفتار کرکے پھانسی پر لٹکوادیا۔

ادھر یہ معلوم ہوچکا تھا کہ دہلی میں علماء کی جماعت جہاد کا فتوی صادر کرچکی ہے۔ ادھر اس تازہ حادثے نے تازیانے کا کام کیا۔ علماء کی جماعت اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحب کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کی سر ہتھیلی پر لے کر ایک منظم مکراؤ کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

شاملی کے میدان میں معرکہ آرائی

سہارنپور، مظفرنگر، تھانہ بھون، کیرانہ اور گنگوہ کے علماء معرکہ آرائی کے لیے آگے بڑھے۔ اس معرکہ کی کیفیت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی جو مجاہدوں کے امیر حاجی امداداللہ کی زیارت سے مشرف ہوچکے ہیں اپنی کتاب "نقش حیات" میں لکھتے ہیں ۔

"پھر جہاد کی تیاری شروع ہوگئی اور اعلان کردیا گیا۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی میمنہ اور میسرہ کے افسر مقرر کیے گئے۔ چونکہ اطراف وجوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقوی وعلم کا بہت زیادہ شہرہ تھا، ان حضرات کے اخلاص وللہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے، ہمیشہ سے ان کی دینداری اور خداترسی دیکھتے رہے تھے اس لیے ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بے حد معتقد تھے۔ اس لیے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہیں تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار رہتے جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے۔ مگر ہتھیار پرانی قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں۔ کارتوسی را ئفلیں نہ تھیں۔ یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوگئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں حکومت قائم کرلی گئی۔ انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے۔"

"خبر آئی کہ توپخانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن لارہی ہے۔ رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش پیدا ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، توڑے دار بندوقیں اور برچھے وغیرہ تھے۔ مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی۔ توپخانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا "فکر مت کرو" سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حاجی امداداللہ صاحب نے افسر مقرر کردیا۔ آپ اپنے ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور

سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں سب ایک دم فیر کر دینا۔ چنانچہ جب پلٹن مع توپخانہ باغ کے سامنے پہنچی تو سب نے بلا تامل فیر کر دیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپخانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپخانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنون حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔"

شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی حفاظت بھی وہاں رہتی تھی قرار پایا اس پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ [illegible] پولس اور فوج کی وہاں موجود تھی مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ ان کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا۔ مگر حافظ صاحب کی شہادت کے بعد پہلے پہل یہی خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپے پھرتے تھے۔ ایک ایک سپاہی گوروں کی جماعتوں کو بھگائے پھرتا تھا۔ مگر بعد میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ پہلے کسی کھیت میں گورا چھپا ہوا تھا تو کاشت کار عورت نے اسے کھرپے سے قتل کر ڈالا۔ مگر بعد میں معاملات الٹے ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند (مولانا محمود الحسن) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش و خروش، جنگ و جدال کا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے لئے کیا گیا تھا۔

بہر حال حافظ صاحب کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو گئیں اور اب سب اپنے اپنے اوطان کو واپس گئے۔"

کیرانہ کا محاذ

ضلع مظفر نگر کے پرگنہ شاملی میں زمینداری شیوخ اور گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ جوش بھی تھا۔ چنانچہ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا اور مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ جب شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا اور پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام ہو گیا تو کیرانہ کے محاذ پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی قیادت کر رہے تھے۔ مجاہدین کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لیے ان کی قیادت چودھری عظیم الدین حضرت مولانا کے ساتھ کر رہے تھے۔

عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم اور تربیت کے لیے کیرانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا تھا جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اور اعلان ہوتا تھا "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔"

اس جملے کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا عوام کو سنایا جاتا تھا۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورا فوج اور توپخانہ داخل ہوا محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپخانہ نصب کیا گیا اور گورا فوج نے دربار کا محاصرہ کر لیا، ہر گھر کی تلاشی لی گئی عورتوں، بچوں اور ہر شخص کو فرداً فرداً دربار سے باہر نکالا گیا۔ اس لیے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب پنجیٹھ مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں مولانا اپنی باقی ماندہ جماعت کے ساتھ پہونچے۔ خود پنجیٹھ کے لوگ بھی مجاہدین میں شریک تھے۔ اسی دوران میں گورا فوج کے ایک گھوڑ سوار دستے نے پنجیٹھ کا رخ کیا۔ کیرانہ اور تمام قرب و جوار کے حالات کی اطلاع مولانا کو ملتی رہتی تھی چنانچہ پنجیٹھ کے مکھیا کو جب فوج کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے

فوراً جماعت کو منتشر کردیا۔ اور مولانا سے خواہش کی کہ "کھرپا" لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ چنانچہ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ گورا فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری جہاں میں گھاس کاٹ رہا تھا۔ اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں۔ اور میں فوج کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ فوج نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ مکھیا کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے گاؤں کی تلاشی لی گئی۔ مگر مولانا کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ فوراً فوجی دستہ کیرانہ واپس ہوگیا۔ حالات پر قابو پا لیا گیا۔ اور حضرت مولانا کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ وارنٹ جاری ہوا۔ آپ کو مفرور باغی قرار دیا گیا۔ اور گرفتاری کے لیے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان ہوا۔

حضرت مولانا اپنا نام مصلح الدین بدل کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ آپ کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا۔ ایمانی عزم و ہمت اور استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھ پور کے مہیب ریگستانی جنگلوں کو پا پیادہ عبور کرتے ہوئے بندرگاہ سورت پہونچے، اس زمانہ میں سورت بندرگاہ سے بھی جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز سال بھر میں صرف ایک مرتبہ ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے روانہ ہوتا تھا اور اسی طرح جدہ سے آتا تھا۔ اور ایک خط کا محصول چار روپے تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترک وطن کرتے وہ ساتھ ہی دنیاوی تعلقات اور باہمی علائق کو زندگی ہی میں ختم کر دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی جائداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں (جو کہ مولانا کا سابق وطن اور ان کے جد امجد حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی جائے مزار ہے) مخبر کمال الدین کی شناخت پر جائداد قرق کر کے نیلام کی گئی۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے ۳۰ رجنوری ۱۸۶۲ء میں کیا۔

مولانا کی جائدادوں میں سرائے کمبور، سرائے جوڑے، سرائے شیخ فضل امینی، سرائے قصاباں، سرائے لوہ آباد، سرائے با... اور وسیع قطعات زمین اور مکانات صرف ایک ہزار چار سو بیس میں نیلام ہوئے۔ جبکہ ان کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ مزروعہ علاقے اور سکنائی جائداد اور زراعتی زمینیں اس کے علاوہ ہیں جو بحق سرکار ضبط ہوگئیں۔ کاغذات جائداد نیلام سٹ انڈکس مشمولہ کا یہ عنوان ہے۔

"انڈکس مشمولہ فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی"

بہرحال طویل سفر کے آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے مولانا مکہ معظمہ پہونچے۔ اس کے بعد اس مجاہد حق نے مدرسہ صولتیہ قائم کر کے عرفانی کارنامہ انجام دیا۔ مولانا کا وصال ۲... ۱۸۹۱ء کو مدینہ منورہ میں ہوا۔ اور یہی خاک پاک آپ کی ابدی آرام گاہ بنی۔"

(ماخوذ از مضمون مولانا محمد عارف الاسلام عثمانی الجلا... روزنامہ الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن۔ واضح ہو کہ مضمون نگار حقیقی پردادا کے برادر کلاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہیں بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد ۴)

علی گڑھ میں مقابلہ

بغاوت کی آگ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک قصبے دوسرے قصبے پھیلتی ہی جا رہی تھی علی گڑھ کی فضا میں سکون تھا یکایک ایک برہمن گرفتار کیا گیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ اس سپاہیوں کو ورغلایا اور یہ منصوبہ بنایا کہ ہم باہر سے بار لائیں گے تم اس کے ساتھ شامل ہو کر افسران کو مار ڈالنا۔ کو اسے دیسی سپاہ کے روبرو پھانسی دے دی گئی سب چپ چاپ یہ منظر دیکھتے رہے۔ یکایک ایک سپاہی آگے بڑھا اور برہمن کی لٹکتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز

"بھائیو! دیکھو جس نے دھرم کی خاطر جان قربان کر دی۔"
اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ دلوں کی دنیا میں طوفان برپا ہوگیا۔ انھوں نے افسروں کو تو کوئی آزار نہیں پہونچایا۔ البتہ فرنگیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جلد سے جلد علی گڑھ چھوڑ دیں۔

فرنگی رخصت ہوئے تو فوجیوں نے جیل خانہ توڑا۔ قیدی چھڑائے۔ خزانہ قبضہ میں لیا اور دہلی روانہ ہوگئے۔

یہ فوج کا عمل تھا۔ اب شہر والوں کی کارگزاری ملاحظہ فرمایئے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب، مولانا ریاض الدین صاحب شارح قصیدہ بردہ کے صاحبزادے تھے۔ زمام آپ کے حوالہ کی گئی۔ تقریباً دو ماہ تک شہر کا نظم و نسق آپ نے سنبھالے رکھا۔ جولائی یا اگست میں انگریز تازہ دم فوجیں لے کر آگرہ کی جانب سے علی گڑھ پر حملہ آور ہوئے۔ تو مولانا اپنے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ ٹنڈاک کی سڑک پر انگریزی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ مقابل تازہ دم اور تمام ساز و سامان سے مسلح تھا۔ اس کی فوج باضابطہ قواعد والی تھی۔ اور اس طرف جوش آزادی اور ولولہ قربانی تھا جس نے آپ کو میدان جنگ میں ثابت قدم رکھا۔ یہاں تک کہ بہتر[۷۲] ساتھیوں کے ساتھ آپ نے اسی میدان میں جام شہادت نوش کیا۔ ان بہتر شہداء کو جامع مسجد میں لایا گیا اور یہیں دفن کیا گیا۔ مولانا عبدالجلیل شہید کو بھی ان شہداء کے بیچ میں دفن کیا گیا۔ ان تمام شہداء کے مزارات جامع مسجد کے شمالی دروازے کے بالکل قریب ہیں۔

مولانا کی شہادت کے بعد انگریز خونخوار درندے کی طرح سارے شہر میں گھوم رہا تھا۔ جہاں کوئی مسلمان صورت ملا شہید کر دیا گیا۔ مدتی مسجد کے سامنے پھول چوراہے اور چوراہہ عبدالکریم پر پھانسیاں لٹکادی گئی تھیں۔ جہاں کہیں کسی دشمن نے چغلی کھائی کہ یہ بھی شریک جہاد تھا اس کو فوراً پھانسی دے دی جاتی تھی۔ مجاہدین کے بیوی بچوں کو تلاش کر کے چن چن کر تہِ تیغ کیا جا رہا تھا۔ مولانا عبدالجلیل شہید کے تمام مکانات اور جائداد کو کھدوا کر پھینک دیا گیا۔"

(یہ قلمی بیان قاضی محمد سفیان قاضی شہر علی گڑھ کا ہے جو مولانا عبدالجلیل شہید کے پوتے ہیں اور الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے (بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی)

"ایمان اور احتساب نفس کے ساتھ جو رمضان کے روزے رکھے گا تو اس کے اگلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔"
حدیث

رفیق عابد (زاہدی)

کاروانِ خیال

حضرت نشور واحدی

یہ یونہی حضرت نہیں بن گئے ہیں بلکہ فی الواقع حضرت ہیں اور بچپن ہی سے حضرت ہیں۔

ان کے والد گرامی مرحوم جناب شیخ جمیل احمد صاحب بڑی ٹھوس اور پُر مغز علمیت والے بزرگ تھے۔ بڑے سنجیدہ، بہت ہی ذہین و متین، پُر وقار، کم سخن، وضعدار اور نفاست پسند تھے۔ صنائع بدائع، اصطلاحات و محاورات پر بڑی غائر نظر تھی۔ لفظوں کی پرکھ، ان کے متعلق معلومات اور ان کے حسب نسب سے بڑے آگاہ تھے۔ لفظوں کے انتخاب اور ان کے محل استعمال سے، فن کارانہ اور استادانہ طور پر واقف تھے۔ وہ پُرانے دور کے صاحب علم تھے جو علمی روایات و واقعات سے بغاوت کو جرم قبیح مانتے تھے، باریک بینی ان کی گھٹی میں داخل تھی۔ علم کلام کے اصول و قواعد سے مستقل طور سے روشناس تھے۔ اور کلام میں نفاست و نزاکت کے ساتھ اس کے رچاؤ اور لیساؤ کو پسند فرماتے تھے۔ مجال نہیں کہ کوئی غلط تلفظ بول کر ان کے آگے سے نکل جائے۔ ان کا قول تھا کہ بندش چست و درست ہو، دروبست متوازن۔ پوری فصاحت میں بلاغت کی ہلکی سی آمیزش کلام میں ستم نہیں حسن پیدا کر دیتا ہے اور برمحل و بے ساختہ استعارات اسے سجاتے ہیں۔ تشبیہات تاثرات اور ذہنی رجحانات کو یکسو کر کے کلام کی طرف جذب کر دیتے ہیں مگر ان سب کے برتنے میں چابکدستی اور نزاکت طبعی و لطافت

بلندی کی سخت ضرورت ہے۔

اور وہ بزرگوار واقعی نزاکت خیالی اور نفاست طبعی میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

ان کی یکسانیت مزاجی نے ان کو اسی راہ پر تا زندگی استوار رکھا۔ سرمو فرق نہ آیا۔

آدمی بڑے مستقل مزاج اور خلیق و مشفق تھے۔ تاہم نوعمر و نوجوان جو تحصیل علوم میں مصروف تھے ان سے گھبراتے اور کتراتے اس لیے تھے کہ نہ جانے کب وہ امتحان لینے پر اُتر آئیں اور کوئی علمی بات پوچھ دیں تو ہمارے مفروضہ علم و فضل کی پول کھل جائے۔ اور وہ ایسے نوجوانوں سے بالکل مخاطب نہ ہوتے جو ان سے دور دور رہتے اور اس کو پسند کرتے جو بے تکلف، ذہین، طباع اور علم کے جویا۔ ان کو اپنے کم عمر بیٹے حفیظ الرحمٰن پر بھروسہ تھا کہ جب وقت آئے گا تو یہ برسوں کی منزل دنوں میں طے کرے گا اس وقت ہم دونوں کی عمر تو دس سال کی تھی میرے والد نے بچپن سے مجھے اپنے ساتھ رکھ کر انشائے یوسفی، شاہنامہ، بہار دانش، ابوالفضل، پنج گنج، زبدہ، نحو میر، صرف میر اور شرح مائۃ عامل وغیرہ تک پڑھا دیا تھا۔ جب تک گھر رہتا اپنے یار غار حفیظ الرحمٰن کا صبح سے بڑی رات تک ساتھ رہتا۔ ان کے والد کہتے تم رفیق کے ساتھ رہا کرو۔ وہ اکثر شعری باریکیاں مجھے بتلاتے۔ پھر حفیظ علم کی طرف متوجہ ہو گیا تو قاری، فاضل، عالم اور محدث، شاعر اور

استاد وقت بننے میں اسے ذرا دیر نہ لگی ۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک بہترین، قاری اور شاعر تھا ۔ اور غلیل بازی اور شکار ماہی میں میرا تگڑا ساتھی اور اسی عنفوان میں برجستہ گوئی کی مشق جاری رہی اور ہماری دوستی پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی ۔ وہ اوائل عمری میں آبروئے وطن، آبروئے برادری اور آبروئے دوستی تھا اور آج آبروئے غزل ہے ۔ تاہم یہ یقین کامل ہے کہ وہ جہاں اور جس ماحول میں جس وقت ہے میری یاد سے اس کا دل یکسر خالی نہیں اور علیٰ ہذا القیاس ۔ مگر میرے لیے تو اس کی یار متاعِ حیات ہے اور ان لمحات زریں کی یاد جو گلی ڈنڈے سے شروع ہو کر شکار ماہی اور شعر گوئی پر منتج ہوئی عزیز از جاں ہے آج میں شدید بیماری میں مبتلا ہو کر گھر آتا ہوں (دونوں شادی شدہ ہو کر اپنی زندگی کی حدود میں قدم رکھ کر بہت کچھ ذمہ دار بن چکے ہیں) نشور واحدی کانپور سے آجاتے ہیں ۔ مجھ سے ملے میری کیفیت دیکھی ۔ میری والدہ ماجدہ سے احوال پوچھے ۔ اطمینان دلایا ۔ کہ میں آگیا ہوں اس کو ٹھیک کردوں گا ۔ آپ پریشان نہ ہوں ۔ اب وہ صبح سے لے کر گیارہ بجے رات تک میرے یہاں جم گئے ۔ قرأت کے مختلف نمونے پیش کیے جا رہے ہیں ۔ مثنوی مولانا روم کا ترجمہ سنایا جا رہا ہے تاآنکہ پرہیزی کھانے صحت مندانہ غذاؤں میں تبدیل ہوگئے ۔ میری بیماری مجھ سے اس طرح خفا ہو کر بھاگی جیسے کبھی کی دید شنید نہ تھی اور پھر پندرہ بیس دنوں کے بعد مشاعروں اور سیر و شکار کے پروگرام بننے لگے ۔

میرے موضع کے چھوٹے بڑے سبھی اہل علم تھے اور بڑی تعداد اسکولوں اور کالجوں اور دیگر سرکاری عہدوں پر مامور تھی ۔ لیکن ایک اصول کے تحت گرمیوں میں سب چھٹیاں لے کر وطن آجاتے ۔ علمی نشستیں رہتیں ۔ الفاظ پر بحثیں ہوتیں ۔ اساتذۂ قدیم (فارسی اردو) پر تبصرے ہوتے ان کے مقامات متعین ہوتے ۔ پڑھنے والے نوجوانوں کے جائزے لیے جاتے ۔ اور مشاعرے کا انعقاد ہم دونوں (نشور واحدی اور عابد زاہدی) کے سپرد ہوتا ۔ اطراف جوانب میں اعلان کرایا جاتا ۔ آیندہ روند کے کھانے پینے کا انتظام ہوتا جو بزرگوار یا نوجوان صاحب علم تو تھے مگر شاعر نہ تھے ان کو بھی تیار کیا جاتا ۔ ہم دونوں بیس بیس ۲۵ ۔ ۲۵ غزلیں کہہ کر بزرگوں کی خدمت میں پیش کر دیتے اور وہ انفرادی مزاج اور معیار کے مطابق تقسیم کرتے ۔ ریہرسل ہوتی ۔ ابتدائی اور آخری تقریریں مرحوم اخی محترم حامد المکی واحدی اور شاہ محمد عمر صاحب کے ذمے ہوتیں ۔ اول الذکر کوئنس کالج بنارس میں تھے اور آخر الذکر نیکا لی کالج الہ آباد میں ۔ یہ دونوں بزرگوار فارسی کے مجتہد کہلاتے تھے اور بڑی ٹھوس قابلیتوں کے مالک تھے ۔

اکثر اپنی تقریروں میں ہم دونوں کی ہمت افزائیوں کے لیے کہا کرتے کہ ان دو لڑکوں (نشور و عابد) پر ہم کو اور ہمارے موضع والوں کو ناز اور فخر ہے ۔

یہ تو خیر ان لوگوں کا کرم بزرگانہ تھا اور ہماری حوصلہ افزائی ولولۂ عمل بڑھتا اور عزائم بلند ہوتے ۔

مشاعروں میں ہندو مسلمان سبھی آتے ۔ جی کھول کر حصہ لیتے ۔ اور بزرگان وطن تیاریوں میں جی کھول کر مدد کرتے ۔

افسوس انقلابات زمانہ نے یہ بساط اس طرح الٹ دی کہ آج وہ بھرا پرا گاؤں جہاں علم و فن اور ان لہروں پر لہریں لیتے تھے اس طرح اجڑا کہ دو تین نفوس قدسی کے علاوہ سب وطن چھوڑ گئے ۔ ان کے نقوش ہر قدم پر بکھرے پڑے ہیں اور ہر ذرہ صدائے عبرت دے رہا ہے ۔ جس عالی شان مسجد کے کنگرے سے میلوں نعرۂ تکبیر و تہلیل گونجتا تھا حسرت سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے ۔

پردہ داری می کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

(باقی)

تحفۂ خلوص*

جالب مظاہری

دلوں میں بھی سرور ہے فضا بھی کیف بار ہے
یہ کون آج دہر میں خوشی سے ہم کنار ہے
جگہ جگہ لطافتیں، قدم قدم مسرتیں
نظر نظر سکون ہے، نفس نفس قرار ہے
فضائے محفلِ طرب ہے روکشِ فضائے خلد
چمن چمن، روش روش، بہار ہی بہار ہے
شرابِ زندگی سے ہے طرب کدہ بھی رقص میں
سرور ہی سرور ہے، خمار ہی خمار ہے
کلی کلی میں ہے نہاں سرور بخشِ زندگی
سرور بخشِ زندگی، چمن میں خار خار ہے
سنور رہی ہے زندگی، نکھر رہی ہے زندگی
فلک ہے آج مہرباں، نصیب سازگار ہے

دلوں میں رقص کر رہے ہیں حوصلے نئے نئے
نگاہوں میں ابھر رہے ہیں ولولے نئے نئے

ہر ایک فرد آج ہے دماغ سرخوشی لیے
ہر ایک ذرہ آفتاب کی ہے روشنی لیے
ہر ایک منظرِ طرب بنا ہے جنتِ نظر
ہر ایک قلب آج ہے سرورِ سرمدی لیے
جوانیوں کا کارواں رہِ عمل میں ہے رواں
قدم قدم یہ آرزوئے دل نئی نئی لیے
ستارہ اوج پر ہے آج احمد و جیہہ کا
سرور بخشِ زندگی کی سرخوشی جلی لیے

عطا ہوئی بنا بنی کو آج شانِ خسروی
رہیں نہ کیوں دماغ میں خیال برتری لیے
بندھا ہے آج عہد شرع حشر تک کے واسطے
حیاتِ نو سے ساتھ میں سرورِ دائمی لیے

زمیں پہ آج رحمتِ خدائے ذوالجلال
ہر ایک ذرہ آج کائنات کا نہال

عروسِ صبح آگئی بہار بے نقاب ہے
جہاں پہ نور چھا گیا، طلوعِ آفتاب ہے
اٹھا ہے شورِ تہنیت حریمِ عیش و ناز سے
اثر بھی ساتھ ساتھ ہے دعا بھی ہم رکاب ہے
نہیں ہے قلب باپ کا جو آج اختیار میں
وفورِ انبساط سے سرورِ بے حساب ہے
شفیق مہرباں ماں کی ہے زبان پر رواں
یہی دعائے قلب تھی جو آج کامیاب ہے
نگاہِ شوق مرحبا! مذاقِ طبع حبذا
عجیب انتخاب ہے، حسین انتخاب ہے

خدا کرے اسی طرح ہمیشہ شادماں ہو
قدم قدم پہ زندگی کی راہیں کامراں ہو

---

* (بہ تقریب عروسی عزیزہ گل ریز، دختر عارف بانکوٹی صاحب)

مرتبہ: عبدالحئی اثیم

"موجودہ نظامِ تعلیم" ـــــــ ایک تبصرہ

ہمارے نظامِ تعلیم کے متعلق کئی باتیں ایسی ہیں جو آزادیٔ وطن کے بعد سے، بڑی حد تک بغیر سوچے سمجھے دہرائی جا رہی ہیں۔ بلا شبہ موجودہ نظامِ تعلیم کی بنا انگریزوں نے ڈالی، اور ہم نے اسی ڈھانچے پر عمارت کھڑی کی جو پختہ ہونے کی بجائے دن بدن کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ موجودہ دور کا بی اے یا ایم اے آج سے چند برسوں قبل کے معمولی تعلیم یافتہ شخص کے تعلیمی معیار پر بھی پورا نہیں اترتا؟ یہ موجودہ نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستانیوں کا طرزِ رہائش، لباس، گفتار، آدابِ نشست و برخاست اور سوچنے سمجھنے کا انداز بالکل بدل چکا ہے۔ اگر میرا خیال صحیح نہیں تو اسے غلط بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نظامِ تعلیم درحقیقت ہمیں اپنے کلچر سے دور کر رہا اور ہماری ثقافتی و مذہبی اقتدار کو ہم سے چھین رہا ہے

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کا ثقافتی اور مذہبی کردار، اُردو، فارسی اور عربی زبان میں جھلکتا ہے۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے، ہم اُسے بول سکتے ہیں، لکھ سکتے ہیں اور روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں لیکن اس زبان کا رشتہ ہمارے ماضی کو زیادہ دُور تک ہمارے ساتھ وابستہ نہیں کرتا۔ ایک اُردو داں اس زبان کی مدد سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو برس پیچھے دیکھ سکتا ہے۔ وہ اُردو کی معرفت ڈھائی سو قبل کے حالات مثلاً امیر خسرو، نظام الدین اولیاء، معین الدین چشتی کے طرزِ زندگی کو سمجھنے اور ان کے افکار سے فیضیاب ہونے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے اسے فارسی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن افسوس کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں جو نئی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اُن کی وجہ سے فارسی کا چراغ بھی ٹمٹما رہا ہے۔ اس طرح ہمارا ذہنی جوہر فروغ نہیں پا سکے گا۔ اور ہمارا تعلیمی معیار پست ہی رہے گا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ اُردو، عربی اور فارسی کو اُردو اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں ہم نئی نسل کو عربی اور فارسی پڑھا نہیں سکتے تو عربی اور فارسی میں محفوظ عظیم سرمایے سے اپنا ذہنی ربط قائم کیے بغیر ہم آگے بڑھ بھی نہیں سکتے۔ اگر شبلی، حالی، اقبال، پطرس بخاری، آل احمد سرور اور فیض احمد فیض* عربی و فارسی سے نا واقف ہوتے تو اُن کا ذہنی سرمایہ محدود ہو جاتا اور اُن کی کوئی مایۂ ناز تخلیق ہمارے سامنے نہ آتی۔

"اگر آج اس جدید دور میں اسکولوں اور کالجوں میں عربی اور فارسی پڑھانا ممکن نہیں رہا تو پھر ایک نہایت وسیع منصوبے کے تحت فارسی اور عربی کی کلاسیک کتابوں اور اپنے عظیم مفکروں اور ادیبوں کی زندگیوں کو اُردو اور دیگر زبانوں میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ جس طرح حالی اور نذیر احمد انگریزی نہ جانتے ہوئے انگریزی زبان و ادب کی روح سے آشنا ہو گئے تھے اور زبان جانے بنا اسی آشنائی کو انھوں نے بصیرت میں بدل لیا تھا، اسی طرح نئی نسل عربی اور فارسی کو جانے بنا ان کی روح کو اپنی روح میں محسوس کرے اور ان کی بصیرتوں اور لطافتوں کی صحیح وارث بن سکے" بالفاظ دیگر عربی اور فارسی کتب کے تراجم اُردو اور دیگر زبانوں میں کیے جائیں تاکہ عربی اور فارسی سے نا واقف ہوتے ہوئے

* فیض احمد فیض انگریزی کے علاوہ عربی سے بھی ایم اے ہیں۔

بھی کم سے کم نئی نسل اُن کے لٹریچر سے واقف ہو سکے۔ لیکن افسوس تو اس بات پر ہے کہ ہمارے یہاں اکثر مصنف دو چار کتابیں تخلیق کر کے تھک ہار جاتے ہیں جبکہ امریکا، انگلستان، فرانس اور دیگر ممالک میں سائنس، تاریخ، ادب یا فنونِ لطیفہ پر ایک ایک مصنف درجنوں کتابیں لکھ ڈالتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میتھیو آرنلڈ، برٹرینڈ رسل، جارج برنارڈ شاہ اور ولیم جیمز جیسے مصنفین آخر ہمارے یہاں کیوں نہیں پیدا ہوتے؟

ثقافتی اور مذہبی اقدار سے ہٹ کر اگر ہم زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بغور جائزہ لیں تو بالآخر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام تر خرابیوں کی جڑ یہی کھوکھلا نظامِ تعلیم ہے جو آزادیٔ ہند کے بعد سے اب تک برابر چلا آرہا ہے۔ طلباء اور اساتذہ میں اس وقت جو ذہنی انتشار، جو ابہام، جو بے یقینی اور بے قابو پن پایا جاتا ہے وہ اسی کھوکھلے نظامِ تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے اور اگر مجھے صاف گوئی اور تلخ نوائی میں معاف رکھا جائے تو میں کہوں گا کہ اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان جیسے جمہوریت پسند ملک میں صحیح معنوں میں اب تک ایک بھی ماہرِ تعلیم پیدا نہیں ہوا۔ اگر آپ کے نزدیک کوئی ہو تو میری بے خبری دور کر کے مجھے ممنون کیجئے۔ ہمارے ہاں سینکڑوں انسپکٹرز آف اسکولز، ڈائرکٹرز آف ایجوکیشن، ڈگری کالجوں کے پرنسپل صاحبان، ٹریننگ کالجوں کے پروفیسرز، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز اور محکمہ ہائے تعلیم کے سکریٹریاں اور مشیرانِ کرام موجود ہیں۔ مگر یہ سب تعلیم کے نظم و نسق چلانے والے اور اپنے اپنے انتظامی فرائض انجام دینے والے اہلکار اور افسران ہیں۔ یہ لوگ تعلیم کے مہتمم اور منتظم ضرور ہیں لیکن تعلیم کے ماہر نہیں ہیں۔

"ماہرِ تعلیم بیک وقت اعلا درجے کا فلسفی، ماہرِ نفسیات، عالمِ دین و مذہب، اپنے عہد کا باخبر دانشور، مصنف اور ادیب ہوتا ہے جو اپنے زمانے اور اپنی قوم کی ایک ایک روحانی، ذہنی اور مادی ضرورت پر نگاہ رکھتا ہے اور اپنے عہد اور اپنی ثقافت کے مخصوص تقاضوں کے پیشِ نظر اپنی نئی نسل کی تربیت کا ایک جامع اور ہمہ گیر نظام مرتب کرتا ہے۔" اس کے پیشِ نظر ہم موجودہ نظامِ تعلیم پر نظرِ ثانی کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ کالجوں میں سائنس اور آرٹس کے مضامین میں ایک ایسی خلیج حائل کر دی گئی ہے کہ سائنس کے طلبا، تاریخ جیسے اہم مضمون کی تدریس سے قطعی محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا تعلیمی نصاب میں ایسی تبدیلیاں لانی چاہئیں کہ جن سے سائنس اور آرٹس کے طلبا، زیادہ سے زیادہ گروپوں کا مطالعہ کر سکیں۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں اس اصول پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ امریکا کے نظامِ تعلیم پر ایک نظر ڈالیں، اس کے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا ایک سرسری جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ پہلی جماعت سے لے کر انتہائی درجوں تک امریکی تعلیم میں جس قدر زور امریکا کی تاریخ پر دیا جا رہا ہے کسی اور چیز پر نہیں دیا جاتا۔ تعلیم کی بدولت اس کی تاریخ امریکی طالب علم کے ریشے ریشے میں سما جاتی ہے۔ یہی حال انگلستان اور باقی ترقی یافتہ ملکوں کا ہے۔ روس اور چین کے نظام ہائے تعلیم میں بھی اُن کی تاریخ کو بنیادی مقام حاصل ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلے معاشرے کی اصلاح اور تعمیرِ نو ضروری ہے۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں تعلیم کے اعلا معیاروں کو قائم کرنا ایک بے جا اور بے مقصد کوشش ہوگی۔ ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے میں کیا نہیں ہے؟ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ، دھوکا بازی کا چلن، رشوت، بلیک مارکیٹ، اسمگلنگ، جائز و ناجائز طریقہ پر روپیہ کمانے کی ہوس اور فلم کے ذریعہ عریانیت کا پرچار سبھی برائیاں موجود ہیں۔ یہ تمام چیزیں بچوں کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں لہٰذا اِن کی اصلاح اشد ضروری ہے، کیونکہ تعلیم و تربیت کا سارا عمل معاشرے کے گہرے اثرات کے تحت انجام پاتا ہے، اگر اچھی کتابیں، اچھے اساتذہ اسکولوں کا عمدہ ماحول اور تعلیم یافتہ طبقے میں پرورش، طالب علم کی ذہنی بالیدگی و نشو و نما کے لیے اشد ضروری ہے۔

معاشرے میں انقلاب لانے کے بعد نظامِ تعلیم مرتب کرنے والا اُن

موجودہ خرابیوں کا قلع قمع کرے جو قدرتی طور پر تعلیم کے راستے کی بے شمار رکاوٹیں بنی ہوئی ہیں۔ اور جن کے باعث آج ہمارا نظامِ تعلیم ناکام ہو رہا ہے۔ ان خرابیوں کا تفصیل وار تذکرہ بھی ضروری ہے۔

ہمارے نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خامی یا خرابی یہ ہے کہ طالب علم کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا جاتا کہ اُسے کس قسم کے معاشرے میں کیا رول ادا کرنا ہے؟ امریکا، برطانیا، فرانس، روس اور چین کے نظام ہائے تعلیم میں سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اسی امر کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

اُسے سائنس، ادب، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، نفسیات غرض سبھی علوم و فنون کے پڑھنے اور سیکھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں لیکن ان سب کے ساتھ اور ان سب سے زیادہ اسے ایسی سہولت فراہم کی جائے کہ وہ جان لے کہ وہ خود کون ہے؟ اُس کا معاشرہ کیسا ہے؟ اُس کا خاندان کیسا ہے؟۔ اور یہ سب جان کر وہ خود اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنی منزل متعین کرتے تاکہ اُسے ایک خاص وضع سے زندگی گزارنے میں آسانیاں پیدا ہوں ــ لیکن افسوس کہ ہمارے تعلیم میں اس چیز کی بھی کمی ہے ــ قدم قدم پہ امتحان لینے اور یوں اسے غیر دلچسپ بنانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے اچھی تدریس کے انتظام کی ضرورت ہے۔

اکثر کالج اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کی اقامت گاہوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور کھانے پینے کے ناقص اور خاصے مہنگے انتظام کے علاوہ کھانے کے کمرون، دارالمطالعوں اور دوسری ضروری جگہوں کی صفائی و ستھرائی اور ان میں رکھا ہوا فرنیچر اور دوسرا سامان نہایت غیر تسلی بخش ہوتا ہے جس کو دیکھ کر ایک معمولی ذہن مبصر بھی یہ اندازہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تعلیم کا انتظام کرنے والوں کے دل غالباً طلباء سے سچی ہمدردی اور اُن کی بہی خواہی سے عاری ہیں۔

اسکولوں اور کالجوں میں ایک کافی عمدہ اور آرام دہ لائبریری کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ طلباء زیادہ سے زیادہ وقت مطالعہ میں صرف کر سکیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں لائبریری کا غیر تسلی بخش انتظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزارہا طالب علم ہمارے ملک میں گریجویشن کر لیتے ہیں لیکن لائبریری سے ایک کتاب تو کیا معمولی رسائل کا بھی دورانِ تعلیم میں مطالعہ نہیں کرتے۔ ہمارے عام گریجویٹ کی نااہلی کا ہر طرف جو چرچا ہو رہا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ کالجوں اور اسکولوں میں لائبریری کا نہایت غیر تسلی بخش بلکہ نظر انداز شدہ انتظام ہے۔

جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے، تنخواہوں کی کمی کی شکایت پرانی ہے لیکن ان کی یہ شکایت بجا ہے کہ دوسری سروسوں کے مقابلہ میں یہاں ترقی کی گنجائش بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُستاد کے کام اور قابلیت کا ٹھیک اندازہ کرنے کا کوئی منطقی طریقہ، کوئی جدید پیمانہ ہمارے یہاں اب تک نافذ نہیں ہوا ہے۔ اساتذہ کے کام کو پرکھنے، اُن کی قدر و قیمت لگانے اور کارکردگی کے مطابق ان کی قدر کرنے، اُن کو ترقی دینے یا اُن کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کا کوئی معقول سسٹم یہاں رائج نہیں۔ بالفاظِ دیگر صلاحیت کو اُبھرنے کے لئے جس حوصلہ افزائی اور قدردانی کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے محکمہ تعلیم میں اس کا احساس ہی نہیں پایا جاتا۔ نہ صرف حوصلہ افزائی نہیں ہوتی بلکہ باضابطہ حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ہمارے عام علمی معیاروں کی پستی کا ایک بڑا سبب ہماری یہی بے اعتنائی ہے جس روز اساتذہ کے مستقبل اور ان کی ترقیوں اور عزت افزائی پر توجہ دی گئی، یقین جانیے اُس کے چند سالوں کے اندر اندر ہمارے علم و فہم کے معیار بلند ہو جائیں گے اور ان میں بڑی اُستواری اور تخلیقی ترقی رونما ہوگی۔

★ ★

★

★

اخبار و اذکار

رعایت برائے مجاہدینِ آزادی

آزادیٔ ہند کی پچیسویں سالگرہ کے موقعہ پر مغل لائن لمیٹیڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر وہ مجاہد جسے امسال حج کے لیے نشست مل چکی ہے اس کے جہاز کے کرایہ میں سے مبلغ ستر روپے ہدیتہً لوٹا دئے جائیں گے بشرطیکہ وہ اپنے مجاہدِ آزادی کا تصدیقی سرٹیفکٹ اپنے ضلع کے مجسٹریٹ سے حاصل کر کے بمبئی پہنچنے پر مغل لائن کے دفتر میں پیش کریں۔

عازمینِ حج کو اطلاع

عازمینِ حج کو مطلع کیا جاتا ہے کہ حسبِ روایات اناج اور شکر وغیرہ مہیا کرنے کا حج کمیٹی کے مرکز کی طرف سے معقول انتظام ہے۔ جو عازمین اپنے ساتھ اناج کا ذخیرہ لائے ہوں یا بمبئی سے خرید کر رکھ لیں تو اس کی حفاظت کا انھیں خود انتظام کرنا ہوگا۔ حج کمیٹی اس کے لیے ذمہ دار نہیں۔

جامع مسجد کا بورڈ آف ڈائرکٹرز
عزیز مُلّا کی نامزدگی

گزشتہ ہفتہ جامع مسجد بمبئی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کی ایک میٹنگ میں جناب عزیز مُلّا کو بورڈ کا ایک ڈائرکٹر نامزد کیا گیا۔ مسٹر عزیز مُلّا سماجی خدمات کے میدان میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ موصوف انڈو عرب سوسائٹی کے اعزازی سکریٹری ہیں اور عرب امور پر روزنامہ انقلاب میں مستقل کالم لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ تعلیمی میدان میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔

مسٹر عزیز مُلّا آزاد تعلیمی سنگھ اورنگ آباد کے اعزازی جنرل سکریٹری ہیں جس کے تحت فی الوقت چار کالج جاری ہیں۔ وہ مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ کے ٹرسٹی اور ــــــــــ جنرل سکریٹری بھی ہیں ــــــــــ

رتناگیری کے ماہی گیر نئی مصیبت سے دوچار

رتناگیری میں بھاٹیاں کھاڑی کا دہانہ امسال ریت جمع ہو جانے سے بحری آمد و رفت کے لیے ناقابلِ استعمال ہوگیا ہے جس سے ماہی گیروں کو سخت دشواری کا سامنا ہے۔ چونکہ اس علاقہ کے لوگوں کی گزر بسر کا واحد ذریعہ ماہی گیری ہے۔ نیز حکومت کے لیے بھی اس کی برآمد سے زرِ مبادلہ خاصی مقدار میں حاصل ہوتا ہے اس لیے حکومت کو اس امر کی طرف فوری توجہ دینے اور ریت ہٹا کر راستہ صاف کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

قلابہ ڈویژن (S.T) کیلئے
مشاورتی کونسل کی تشکیل

حکومتِ مہاراشٹر نے قلابہ ڈویژن (S.T.) کے لیے ایک مشاورتی کونسل تشکیل دی ہے۔ ڈویژنل کنٹرولر S.T. کارپوریشن قلابہ ڈویژن اس کونسل کے چیئرمین ہوں گے۔ دیگر اراکین میں چیئرمین ورکس کمیٹی ضلع پریشد قلابہ، ایگزیکیٹو انجینئر محکمہ تعمیرات قلابہ و دیگر چند حضرات کے ساتھ جناب ایچ. ایچ. وانگارے صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ یہ کونسل کارپوریشن کو سروس کے اوقات، مسافروں کی تکالیف و شکایات پر غور کرنے نیز مسافروں کو سہولتیں فراہم کرنے کے بارے میں مشورہ دے گی۔

شگوفہ زار

ممتاز اردو مزاح نگار خواجہ عبد الغفور صاحب (کمشنر آف سیل ٹیکس بمبئی) کی معرکتہ الآرا تصنیف "شگوفہ زار" منظرِ عام پر آگئی ہے۔ "شگوفہ زار" مزاح، ظرافت اور اسی سے متعلق سارے شعبوں پر محیط ایک ادبی دستاویز ہے۔ لیکن ساتھ ہی "قہقہہ زار" کی طرح محض دلچسپی کے لیے بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ یاد رہے کہ خواجہ صاحب کی "قہقہہ زار" لطائف سے بھرپور ایک دلچسپ تصنیف اس سے پہلے شائع ہو چکی ہے جو اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے دوسری زبانوں میں ترجمے کیے جا رہے ہیں۔ "شگوفہ زار" میں ابتداء میں طنز و ظرافت سے متعلق ساری اصطلاحات مع انگریزی ترجمے دی گئی ہیں اور پھر لطائف و مثالوں کے ذریعے انکی وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں چند کارٹون بھی شامل ہیں جو کتاب کی دلچسپی اضافہ کا باعث بنے ہیں۔

میونسپل کونسل رتناگیری کی تجویز

حکومت مہاراشٹر نے مہاراشٹر بندرگاہ کمیٹی کا انتخاب کیا ہے۔ اس کمیٹی میں ضلع رتناگیری کے بندرگاہوں کی دشواریاں پیش کرنے کوئی شخص شامل نہیں۔ اصل میں کوکن کے بندرگاہ اور خصوصیت سے رتناگیری بندرگاہ کے متعلق معلومات حاصل کردہ شخص کا اس کمیٹی میں انتخاب ہونا ضروری تھا، جو بحری آمد و رفت کی دشواریاں بھی جانتا ہو۔ آج رتناگیری بندرگاہ کو بارہ ماہی بندرگاہ کی حیثیت دینے کا کام جاری ہے۔ اسی طرح المونیم کارخانے کے ایجاد کی اسکیم عمل پیرا ہے جو رتناگیری کی ترقی میں اضافہ کرنے کا باعث ہے۔ ان اہم امور میں آنے والی دشواریوں کو سمجھ کر موقع برمحل حکومت کی اسکیم کامیاب بنانے میں زریں رائے سے مستفید کرنے کے لئے مقامی شخص کا انتخاب ہونا لازمی ہے۔ اس لئے اس قسم کی تجویز میونسپل کونسل رتناگیری نے کثرت رائے سے پاس کی ہے اور حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ کسی مقامی شخص کو کمیٹی ہٰذا میں شریک ہونے کا موقع عنایت کرے۔ (نامہ نگار)

شادیوں اور پارٹیوں میں تعداد پر پابندی

حکومت مہاراشٹر نے شادیوں اور پارٹیوں میں شرکت کرنے والے مہمانوں کی تعداد پر پابندیاں عائد کردی ہیں۔ حکومت مہاراشٹر کی جانب سے جاری ہونے والے گیسٹ کنٹرول آرڈر کے مطابق شادی کی تقریبوں میں اب سو سے زیادہ افراد شریک نہیں ہوسکتے۔ وزیر برائے امور غذا و سول سپلائز مسٹر بی۔ ڈی۔ ڈیکاٹے نے بتایا کہ یہ حکم فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔ موصوف نے کہا اس سلسلے میں مرکزی حکومت کی ہدایت پیش نظر یہ حکم جاری کیا گیا ہے۔

تھانہ پنچایت سمیتی پر اپوزیشن کا قبضہ

ضلع تھانہ پنچایت سمیتی کے چیرمین کے لئے مارکسٹ لیڈر رسا راجی سنا ریا کا انتخاب ہوا ہے۔۔۔ تھانہ ضلع میں تعلقہ پنچایت سمیتی واڈا رہ ہے جس پر اپوزیشن کا قبضہ ہے۔ بقیہ تمام بارہ پنچایتوں پر کانگریس کا قبضہ ہے۔ تھانہ ضلع پریشد کو مجاری رنگیہ نے مستعفی ہونے کے لئے۔ اور دیگر عہدہ داران کو ضلع پریشد ہال میں ایک استقبالیہ دیا۔

کوکن کی شافعی تنظیم

کرلا بمبئی میں رہنے والے چند نوجوانان کوکن نے ۱۵ اگست ۷۲ء کو ایک نوتعلیم یافتہ کوکنی شافعی تنظیم کی تشکیل کی اور مورخہ ۲۰ اگست ۷۲ء اتوار

کے روز جناب عبدالرحمن رہاٹویکر (مالک انا موٹر اسکول) کے زیر صدارت منعقدہ جلسۂ عام میں اس کے دستور العمل، نصب العین اور کمیٹی کا انتخاب کیا۔ اس تنظیم کو جناب عبدالرحمن رہاٹویکر کے علاوہ ڈاکٹر محمود دلوی ایم بی بی ایس، پروفیسر جمال ایم اے، جناب ریحی مقدم، جناب عبدالوہاب محمد پرکار بی اے بی ایڈ، مولانا محمد علی یونک، جناب محمد حسن ثناءاللہ ہرنک، جناب عبدالرزاق شیخ محمد لانبے، جناب محمد عمر انتولے صاحب، جناب عباس حسن دلوی وغیرہ کوکن کے ممتاز افراد کا تعاون حاصل ہے۔

عازمین حج بیت اللہ

حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جانے والے خوش نصیب عازمین کے ناموں کے انتخاب کے لئے مغل لائن کی جانب سے بمبئی کے ممتاز شہریوں اور حج کمیٹی کے اراکین کی موجودگی میں ۲۴ اگست ۷۲ء کو قرعہ اندازی کا آغاز ہوا۔ امسال جملہ ۱۴ ہزار حاجیوں کا کوٹہ حکومت ہند نے مقرر کیا ہے اور ۲۸ ہزار درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔

قرعہ کا افتتاح کرتے ہوئے حج کمیٹی کے چیرمین احمد زکریا صاحب نے کہا کہ پچھلا سال حج کمیٹی کے لئے آزمائش کا سال تھا۔ کوئی ۱۴ ہزار حاجی جو بمبئی پہنچ گئے تھے جنگ کی وجہ سے رکنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر بفضل تعالیٰ جنگ ختم ہوئی اور سب سے پہلا جہاز بمبئی سے روانہ ہوا وہ حاجیوں کا جہاز تھا۔ جناب احمد زکریا صاحب نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ اس سال سے حکومت ہند نے زر مبادلہ ۱۶۶۰ سے بڑھا کر ۲ ہزار روپے کر دیا ہے۔ آپ نے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر سگی اور ڈپٹی جنرل منیجر جناب سید دادرکر صاحب کو بطور خاص خراج تحسین پیش کیا۔

حکومت کوکن کے جہازوں کے کرایہ میں اضافے کے خلاف

مہاراشٹر کے وزیر مملکت برائے تجارت شری جی ایس نائیک نے امید ظاہر کی ہے کہ حکومت ہند موگل اسٹیم شپ کمپنی کو کرائے میں ۳۰ فیصد اضافے کی اجازت دینے سے قبل ریاستی حکومت سے ضرور رائے لے گی۔ کوکن کے عوام نے اس سلسلے میں جو احتجاجات کئے ہیں [illegible] ان کی جانچ کی ہے۔ انھوں نے کہا کرایہ میں اضافہ نہ کیا جائے۔

مجاہدین آزادی پنشن کیلئے اب بھی درخواستیں دے سکتے ہیں

وزیر مملکت برائے امور داخلہ شری کرشن چند پنت نے لوک سبھا میں ۳ اگست کو کہا کہ مجاہدین آزادی کے لئے پنشن کی درخواستیں دینے کی غرض کے لئے کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے مجاہدین آزادی پنشن کیلئے

رتناگیری ضلع کے مسلم طلبہ کو وظیفے

کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگیری کی سب کمیٹی نے سنہ ۱۹۸۲ء - ۸۳ء کے لیے رتناگیری ضلع کے حسب ذیل طلبہ کو یکمشت وظیفے منظور کیے ہیں جو کہ ضروری شرائط کی تکمیل پر دیے جائیں گے:۔

(۱) مریم تاج الدین مجاور — پچاس [۵۰] روپے
(۲) نورالدین اسمٰعیل پرکار — پچاس [۵۰] روپے
(۳) عبدالبشیر عمر سُروے — ساٹھ [۶۰] روپے
(۴) عزیزہ عبداللہ چکٹے — ساٹھ [۶۰] روپے
(۵) فیض احمد حسین اُپادے — ساٹھ [۶۰] روپے
(۶) نورالنساء رکن الدین قاضی — ساٹھ [۶۰] روپے
(۷) انور حسین عبدالرحمٰن مجگاؤنکر — ساٹھ [۶۰] روپے
(۸) محمد علی احمد شیخ — پچھتر [۷۵] روپے
(۹) عاشق احمد راول — سو [۱۰۰] روپے
(۱۰) وقار احمد ابراہیم شیخ — سو [۱۰۰] روپے
(۱۱) نذیر احمد اسمٰعیل جوودے — سو [۱۰۰] روپے
(۱۲) نظام الدین عبدالستار خلیفے — سو [۱۰۰] روپے
(۱۳) نثار علی محمد پاٹنکر — سو [۱۰۰] روپے
(۱۴) مشتاق احمد اسحاق لانبے — سو [۱۰۰] روپے
(۱۵) مشتاق احمد علی مُلّا (رتناگیری) — سو [۱۰۰] روپے
(۱۶) محمد جلیل ابراہیم جوگلے — سو [۱۰۰] روپے
(۱۷) عبدالغنی ابراہیم تبلیے — سو [۱۰۰] روپے
(۱۸) نور جہاں یوسف کڈالکر — سو [۱۰۰] روپے
(۱۹) محمد حنیف داؤد خان — سو [۱۰۰] روپے
(۲۰) شریف حسن خان گرکر — سو [۱۰۰] روپے
(۲۱) ابراہیم عبدالرزاق پرکار — سو [۱۰۰] روپے
(۲۲) [illegible] محمد شیخ — سو [۱۰۰] روپے
(۲۳) امیر محمد قاسم تبیسکر — سو [۱۰۰] روپے
(۲۴) انور حسین بھوجبل — سو [۱۰۰] روپے
(۲۵) رفیق حسن حبیب قاضی — سو [۱۰۰] روپے
(۲۶) ابراہیم علی کھوت — سو [۱۰۰] روپے
(۲۷) الناصر عبداللہ قاضی — سو [۱۰۰] روپے
(۲۸) عبدالغنی عیسیٰ کھوت — سو [۱۰۰] روپے
(۲۹) داؤد حسین شاہ پٹیل — سو [۱۰۰] روپے
(۳۰) اشرف محمد مھسکر — سو [۱۰۰] روپے
(۳۱) عبدالقادر محمود دلوی — سو [۱۰۰] روپے
(۳۲) محمد سلیم علی ودمانے — سو [۱۰۰] روپے

کل میزان دو ہزار آٹھ سو پچھتر روپے
(۲۸۷۵ — ۰۰ روپے)

(ڈاکٹر) عبدالکریم نائیک
سکریٹری بمبئی سب کمیٹی
کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگیری۔

قوالی کا پروگرام

۹ نومبر کو شب میں ساڑھے ۸ بجے صابو صدیق گراؤنڈ پر دابھول ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے قوالی کا ایک عظیم الشان پروگرام ہو رہا ہے جس میں ہندوستان کے نامور قوال جناب یوسف آزاد اور جناب جانی بابو حصہ لے رہے ہیں۔ اس پروگرام سے حاصل ہونے والی رقم سے دابھول میں شروع کردہ نئے اردو ہائی اسکول کی عمارت پر خرچ کی جائے گی۔ علم دوست حضرات سے پرزور اپیل ہے کہ اس کارِ خیر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

اعزازی جنرل سکریٹری [illegible]

ی مسلم یونیٹی سنٹر کا قیام

۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء کو کرلا کے کوکنی مسلمانوں کا ایک جلسۂ عام کارنیکا
سکول کے وسیع و شاندار ہال میں الحاج ابراہیم چونا والا کی صدارت
قد ہوا۔ اس جلسے میں کوکنی برادری کی مخیر و مقتدر شخصیتیں، تاجر
م پیشہ حضرات کے علاوہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک قابلِ لحاظ
وجود تھی۔ شرکاء نے یونیٹی سنٹر کی افادیت اور اہمیت کو
ں کرتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ادارے
دستور العمل کو منظور کیا اور سالِ رواں کے لیے عہدیداروں کا
ب عمل میں آیا۔

ار :۔ صدر : الحاج ابراہیم چونا والا۔

نائب صدر : بیرسٹر علی میاں انتولے۔

سکریٹری :۔ جناب اختر راہی۔

ٹ سکریٹریز :۔ جناب علی ایم شمسی۔ جناب عبد الرحمٰن رہٹو یلکر
مولانا محمد علی بیونا ک۔

خازن :۔ جناب عبد الوہاب دلوی

عہدیداران ۱۹ اراکین پر مشتمل مجلسِ عاملہ کا انتخاب عمل میں آیا۔
ت کے فوراً بعد حاضرین میں سے کئی ایک لوگوں نے ادارے کی
ت قبول فرمائی۔ لوگوں کے جوش و خروش اور عملی تعاون کے نتیجے میں
لسے میں ادارے کے لیے قابلِ لحاظ چندہ فراہم کیا گیا۔ ادارہ
دہندگان کا شکر گذار ہے۔ ممبر سازی کا کام جاری ہے۔ کوکنی
ں کے مخیر حضرات، تجربہ کار سماجی کارکنوں اور تعلیم یافتہ نوجوان طبقے
یل ہے کہ وہ کوکنی مسلم یونیٹی سنٹر کی رکنیت قبول فرمائیں اور ادارے
اصد کی بر آوری کے لیے اپنا بھرپور تعاون پیش کریں۔ ادارے کا
دفتر ستار منزل، ہال روڈ کرلا بمبئی ۷۰ ہے۔

بھارت ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری جناب کے بی۔ پلٹے
ب نے اس ادارے کی سرگرمیوں کے لیے بلا معاوضہ کارنیکا ہائی اسکول
کا ہال اور مائک دینے کا وعدہ فرماتے ہوئے کہا کہ بھارت ایجوکیشن سوسائٹی
اور کوکنی مسلم یونیٹی سنٹر آپس میں اسی طرح تعاون کرتے رہیں گے۔ اراکین ادارہ
جناب کے بی پلٹے صاحب کے بے حد ممنون و مشکور ہیں۔

آدرش ہائی اسکول کراچی میں تحریری مقابلہ

۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو یومِ آزادی کے جشن سیمیں پروگرام کے تحت
اسکول کے طالب علموں میں تحریری مقابلہ ہوا۔ سینئر گروپ (۱) ذرا نم ہو تو
یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی (۲) آزادی کے ۲۵ سال۔ جونیئر گروپ (۱) آزاد
بھارت میں طالب علموں کے فرائض (۲) مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا،
بنگلہ دیش کی تخلیق کے نقطۂ نظر سے۔

مقابلہ میں اسکول کے ۲۱۶ طالب علموں میں سے سینئر گروپ میں
۱۰۷ اور جونیئر گروپ میں ۱۱۱ طالب علموں نے حصہ لیا۔ انعام یافتگان کے نام
حسبِ ذیل ہیں:۔ سینئر گروپ: (۱) عبد الرحمٰن حسین پرکار متعلم درجہ یازدہم
(۲) ایوب عبد الکریم سروے متعلم درجہ یازدہم (۳) سید احمد سید عبد الکریم
بخاری متعلم درجہ دہم۔ جونیئر گروپ: (۱) عبد الغنی عبد اللہ صابلے متعلم
درجہ نہم، (۲) عبد الکریم محمد قاسم چوگلے متعلم درجہ نہم (۳) مراد علی ابراہیم
سروے متعلم درجہ نہم

بزمِ ادب کا انتخابِ نو

بزمِ ادب، آدرش ہائی اسکول، کراچی (کھیڈ) گذشتہ دو سالوں
سے ہائی اسکول کے طلباء و طالبات میں تحریری اور تقریری فن
کو ابھارنے کا کام انجام دے رہی ہے۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں سالِ
رواں کے لیے بزمِ ادب کے اراکین کا جو انتخاب عمل میں آیا وہ
حسبِ ذیل ہے :۔

رفیق ابراہیم پرکار	سکریٹری
ایوب عبد الکریم سروے	نمائندہ اردو سیکشن
میمونہ محمد حسین حمدولے	〃 ہندی 〃
حسن میاں داؤد کھوت	〃 مراٹھی 〃
عبد الرحمٰن حسن [illegible]	〃 انگریزی

قرعہ کی تفصیلات

کیا کو حسب ذیل قسموں میں تقسیم کر دیا گیا تھا:۔

۱۔ وہ عازمین حج جو کہ ۱۹۷۲ء کی ویٹنگ لسٹ پر تھے اور نہ جا سکے تھے۔

۲۔ وہ عازمین جن کی درخواستیں ۳ بار مسترد ہوئی ہیں۔

۳۔ وہ عازمین جن کی درخواستیں ۲ بار مسترد ہوئی ہیں۔

۴۔ وہ عازمین جن کی درخواستیں پچھلے سال مسترد ہوئی ہیں۔

۵۔ وہ عازمین جنھوں نے پہلی بار درخواست دی ہے۔

پہلی قسم کے سارے عازمین کو اس بار موقع دے دیا جائے گا۔ باقی کوٹے میں سے ۴۰ فیصد الاٹمنٹ دوسری قسم کے حاجیوں کو ملے گا۔ ۳۰ فیصد تیسرے اور ۲۰ فیصد چوتھی قسم کے لئے۔ نئے حاجیوں کے لئے ۱۰ فی صد کوٹہ رکھا گیا ہے۔ قرعہ اندازی کے نتائج عازمین کو ایک ہفتے کے اندر اندر معلوم ہو جائیں گے۔ ناکام امیدواروں کی درخواستیں ڈرافٹ کے ہمراہ جلد ہی واپس کر دی جائیں گی۔

سب سے زیادہ نشستیں یو پی کے لئے یعنی ۳۳۴۷ رکھی گئی ہیں۔ مغربی بنگال کے لئے ۱۸۸ نشستیں ہیں۔ مہاراشٹر کو ۱۱۲۶۔ جموں و کشمیر کو ۸۸۸ گجرات کو ۷۴۳ نشستیں ہیں۔ دہلی کے لئے ۱۰۵، ناگالینڈ اور پنجاب کے لئے ایک ایک سیٹ کا کوٹہ ہے۔

قومی یکجہتی سب کمیٹی کی دوبارہ تشکیل

حکومت مہاراشٹر نے شری وی۔ پی۔ نائیک وزیر اعلیٰ مہاراشٹر کی زیر صدارت قومی یکجہتی کی ریاستی سطح کمیٹی کی اسٹینڈنگ کمیٹی کی دوبارہ تشکیل کی ہے۔ کمیٹی کے دیگر اراکین یہ ہیں:۔ شری وی۔ پی۔ پاگے، چیئرمین مہاراشٹر لیجسلیٹو کونسل۔ شری ایس۔ کے۔ وانکھیڈے، اسپیکر مہاراشٹر قانون ساز اسمبلی۔ شری وسنت راؤ پی پاٹل۔ وزیر آبپاشی۔ شری ایم۔ ڈی۔ چودھری، وزیر مالیات۔ شری آر۔ ایس۔ گوائی۔ ڈپٹی چیئرمین مہاراشٹر قانون ساز کونسل۔ شری این۔ جی۔ گورے، ایم پی۔ شری خلیج بھائی عبدالقادر ایم پی۔ شری دھونڈی راؤ تے ایم پی۔ شری یو۔ ایس۔ پاٹل ایم ایل اے۔ شری ڈی۔ بی۔ پاٹل ایم ایل اے۔ شری جی۔ این۔ جات والا ایم۔ شری ڈی۔ ایس۔ بھاردے۔ ڈاکٹر پی۔ جی۔ گجیندر گڈکر۔ شری اے۔ کے۔ حافظکا۔ شری مصطفےٰ فقیہ۔ شری معین الدین حارث۔ شری نول ٹاٹا۔ معز ایمینسر، ویسٹرن کارڈینل گریشس۔ ڈاکٹر اے۔ جی۔ پوار۔ شری بابا ہرنام سنگھ مہنت۔ شری اے۔ جی۔ شیورے۔ شری حمید دلوائی۔ شری ایچ۔ ایم۔ ایم۔ اصلاحی۔ صدر جمعیۃ العلمائے مہاراشٹر۔ شری اقبال گایا۔ شری رجنی پٹیل۔ شری جی۔ بی۔ نیولکر۔ شری بھاؤ صاحب چوان۔ پونہ اور بمبئی کے شریف۔

بمبئی
ماہنامہ

محترمہ زینب پٹھان کے آرٹ کا نمونہ

ماہنامہ نقش کوکن بمبئی

نقش کوکن بمبئی

دسمبر ۱۹۷۲ء

جلد ۱۱ شمارہ ۱۲

اعزازی ایڈیٹر: (ڈاکٹر) عبدالستار دلوی

مجلس مشاورت:

ڈاکٹر میمونہ دلوی
یوسف ناظم
بدیع الزماں خاور
یونس اگاسکر

طابع و ناشر: ڈاکٹر عبدالکریم نائیک

ملکیت: نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ

زر سالانہ: ۸ روپے

بیرون ممالک: ۱۵ شلنگ برٹش پوسٹل آرڈر

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہ نامہ نقش کوکن
۴۴ جیل روڈ ایسٹ - ڈونگری - بمبئی ۹

ٹیلیفون: ۳۳۱۵۷۲

قیمت: ۷۵ پیسے

مقام طباعت و اشاعت: امیل پریس بمبئی ۳

اس شمارے میں

توجّہ طلب

ظاہر میں تو رواج ایک خفیف سی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس کی حکومت نہایت زبردست ہے۔ اور اس کی مخالفت کرنے کا یارا ہمارے ملک کے مقدس لوگوں کو بھی نہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ شریعت کے جس قدر احکام رواج کے سند یافتہ ہیں، وہی زیادہ مستحکم خیال کیے گئے ہیں۔ روزہ اور نماز دونوں برابر درجہ کے فرض ہیں، بلکہ نماز کی نسبت زیادہ الفاظ تاکید کے آئے ہیں۔ مگر رواج نے یہ تفرقہ پیدا کر دیا ہے کہ ہم بے نمازی سے اس قدر نفرت نہیں کرتے جس قدر کہ روزہ رکھنے والے سے۔ اس قسم کی ہزاروں ترجیحیں رواج نے قائم کر دی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مقدس مذہبی شخص موجودہ تعلیم کے آثار سے نہایت غیظ میں آتا ہے، اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، چہرہ لال ہو جاتا ہے، گردن کی رگیں پھول آتی ہیں، بے ساختہ ملحد، کافر، زندیق، ملد کہہ بیٹھتا ہے، معتقدین بھی خیال کرتے ہیں کہ مولانا کی حرارتِ مذہبی کس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ مگر یہی وہ موقع ہے جہاں اس مسئلے کی نسبت انسان بہت زیادہ غلطیاں کرتا ہے۔ اگر وہ دل کو ٹٹول کر دیکھے تو معلوم ہو جائے کہ وہ ملک کے رسم و رواج کا وابستہ ہے اور جو غصّہ اس کو پیدا ہوا ہے، صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کا پیارا قانون رواج ٹوٹا جاتا ہے۔ ورنہ شریعت کی مصلحتیں تو ہمیشہ زمانے کے ساتھ ہوتی ہیں اور زمانہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

اُن کو غور کرنا چاہیے کہ موجودہ طرزِ زندگی میں کتنی باتیں دوسری قوموں کی موجود ہیں۔ کیا اُن کا لباس، انگرکھا، پائجامہ، ٹوپی عرب کا ہے، کیا ان کی خط و کتابت کی زبان (یعنی فارسی) آتش پرستوں کی زبان نہیں ہے۔ کیا اُن میں سیکڑوں رسمیں ہندوؤں کی رائج نہیں ہیں۔ مگر ان باتوں پر تو اس کو کچھ غصّہ نہیں آتا۔

اے ملک کے معزز لوگو! زمانے کی مخالفت کا کسی شخص کو یارا نہیں ہے۔ اسی کا ساتھ دینے میں بھلائی ہے۔ ہوا بدل گئی ہے، زمانے کا رُخ دوسری طرف پھر گیا ہے۔ اس سے الگ ہو کر کہاں جاؤ گے؟ وَاَیْنَ الْمُفَرُّ مِنَ الْقَدَرِ (جو چیز مقدّر ہو چکی ہے اُس سے گریز نا ممکن ہے)

علامہ شبلی نعمانی: باقیاتِ شبلی مرتبہ: مشتاق حسین
صفحہ ۲۹ - ۲۶

ترتیب

اداریہ

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

کے تحت ہم نقشِ کوکن کے پچھلے شماروں میں اُردو کے مسائل سے متعلق اپنے خیالات پیش کر چکے ہیں اور اس کی بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ جو حقوق اس کے ہیں اس زبان کو ملنے چاہئیں۔ زبانیں اربابِ حکومت کے ہاتھوں پروان بھی چڑھتی ہیں اور ان کی بے التفاتی اور عدم توجہی سے وہ زوال آمادہ بھی ہو جاتی ہیں۔ آزادی کے بعد سے اُردو پر جو عرصۂ حیات تنگ رہا ہے اس کی تلافی کے اب سامان پیدا ہو چلے ہیں۔ حکومت اور اربابِ اقتدار کی اُردو کے سلسلے میں سنگ دلی اور کھوری میں اب نرمی اور گداز کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ مرکزی حکومت نے ترقی اُردو بورڈ قائم کیا ہے اور اُردو میں علمی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے اور تالیفات کا کام بھی شروع ہو چکا ہے تاکہ میر و غالب کی یہ زبان شاعرانہ بلند پردازی اور تشبیہہ و استعارے اور علاماتی اسلوب کے ساتھ جیسے شاعری، افسانہ اور مضامین میں برتا جاتا ہے، جدید علمی اور سائنسی ضروریات کا بھی دور دور تک ساتھ دے سکے۔ تاریخ، فلسفہ، نفسیات، معاشیات، طبیعیات، کیمیا، لسانیات وغیرہ مختلف علوم کے لیے اصطلاح ساز کمیٹیاں اصطلاحیں بنانے میں مصروف ہیں، یہ کام چند ماہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور انھیں اصطلاحوں کی بنیاد پر مذکورہ مضامین میں یونی ورسٹی کے معیار کی کتابیں لکھی جائیں گی یا ترجمہ ہوں گی۔ تعلیمی سطح پر اُردو کے واسطے سے حکومت کی جانب سے مطلعِ امکان کھلا ہے تو سحر بھی ہو جائے گی، مگر ہندوستان کی دیگر زبانوں کے خلاف اُردو کے ساتھ سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ ہر علاقہ کی ہے لیکن اس کی کوئی ریاست نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی، تامل، تلگو اور کنڑ وغیرہ کی طرح جہاں پر یہ زبانیں اپنی اپنی علاقائی یونی ورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم بنیں گی، اعلا تعلیم کی سطح پر اُردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے برتنے کے فی الحال کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں، اس سلسلے میں اُردو کے عاشقوں کی نظریں بار بار علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف اٹھتی رہی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کی تیار کی ہوئی علمی اور سائنسی کتابوں سے اردو کی اکیڈمک ترقی تو ضرور ہو سکتی ہے، تاہم جب تک

انھیں عملی زندگی میں استعمال کرنے کے مواقع فراہم نہ ہوں، خاطر خواہ فایدہ نہیں ہو سکتا اور افسوس ہوگا اگر یہ کتابیں بھی دارالترجمہ حیدرآباد کی کتابوں کی طرح تحقیقی اداروں یا کالج لائبریریوں کی زینت بن کر رہ جائیں۔ حکومت کو ان کتابوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ شمال و جنوب میں اردو زبان کے بولنے والوں کے پیش نظر دو اردو یونی ورسٹیاں بھی ضرور قائم کرنی چاہئیں تاکہ کروڑوں روپے کے صرفے سے تیار کی ہوئی یہ کتابیں پڑھی اور پڑھائی جا سکیں، اردو کا یہ مسئلہ ہندوستان میں صحت مند جمہوریت کی بقا کا مسئلہ بھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت اردو کی علمی اور سائنسی ترقی کے ساتھ یونی ورسٹی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کی ضرورت پر بھی نہ صرف غور کرے گی بلکہ بہتر صورت میں اس پر عمل بھی کرے گی۔

ہم اُردو کی رفتارِ ترقی کے لیے حکومت سے شاکی رہے ہیں۔ ہماری شکایات بجا، مگر اسی کے ساتھ ہمیں اردو کے سلسلے میں اپنے اعمال اور افعال کا جائزہ بھی لینا ہوگا، کیا ہم اردو والوں نے خلوصِ دل سے اپنی زبان کی ترقی کے لیے قیمتی کام کیے ہیں؟ حکومتوں کی سرپرستی سے زبانیں ترقی کی اعلا منزلوں کو پالیتی ہیں، تاہم حکومت کی سرپرستی کی غیر موجودگی میں، زبان کے بولنے والے بھی اگر چاہیں تو زبان کو مرنے سے بچا سکتے ہیں، ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے، یہ تعداد ایسی ہے کہ اگر منظم صورت میں کسی مسئلہ کو ہاتھ میں لے اور ایثار و خلوص سے اپنے مسائل کا حل تلاش کرے، تو اس کا حل نکالنا مشکل نہیں۔ اگر اردو، حکومت کی بے توجہی کا شکار رہی ہے تو اسی کے ساتھ خود اپنے بولنے والوں سے اُن کی بے توجہی کی بھی شاکی ہے۔ ہم نے اپنا وقت اردو سے متعلق باتوں میں زیادہ صرف کیا ہے کام میں کم۔ اب جب کہ حکومت اس مسئلے پر توجہ دے رہی ہے، ہمیں بھی اپنے فرائض کو روبہ عمل لانا چاہیے۔ عام سطح پر ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھا کے اور اردو کی کتابیں اور رسالے خرید کے بھی اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

اردو کی محبّت کے ہم جو دعوے دار ہیں
تو اب ہمیں "رسم محبت" تک محدود نہیں رہنا چاہیے
بلکہ اپنے عقیدے کی صورت میں حرزِ جان بنانا چاہیے۔

نظیر اکبرآبادی

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جُوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی بز کانیں لگا لگا کہتا ہے کوئی لو، کوئی کہتا ہے لارے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہیں لعل و جواہر سے بے بہا اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے اور اُلٹا ہے جوں توا گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر اچھا ہی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ماہنامہ نقش کوکن بمبئی

دسمبر ۱۹۶۲ء

مجیّن لاہوری

ماڈرن آدمی نامہ (پیروڈی)

مونچھیں بڑھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی   داڑھی منڈا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
مرغے جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی   دلیا پکا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور لنچ اڑا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رشوت کے نوٹ جس نے لیے وہ بھی آدمی   دو روز جس نے فاقے کیے وہ بھی آدمی
جو آدمی کا خون پیے وہ بھی آدمی   جو پی کے غم کا زہر جیے وہ بھی آدمی
آنسو بہا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مسکرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں سجا سجا   اور آدمی ہی پھرتے ہیں ٹھیلا لگا لگا
"ہر مال چار آنا" کی دیتے ہیں یہ صدا   پولیس ان کا کرتی ہے چالان جا بہ جا
کیبن بنا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اس کو گرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ جھونپڑے میں قید وہ بنگلے میں شاد ہے   یہ نامرادِ زیست ہے، وہ بامراد ہے
"ہر کالا چور" قابلِ صد اعتماد ہے   یہ زندہ باد اِدھر، وہ اُدھر مردہ باد ہے
نعرے لگا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
چندہ جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

لٹھے کے تھان جس نے چھپائے سو آدمی   پھرتا ہے چیتھڑے ہی لگائے سو آدمی
بیٹھا ہوا ہے غلّہ دبائے سو آدمی   راشن نہ کارڈ پر بھی جو پائے سو آدمی
صدمے اُٹھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دھوئیں چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

پروفیسر داؤد اکبر بارگیر

بمبئی یونی ورسٹی کے
فارسی عربی کے
پہلے پروفیسر: میرزا حیرت

میرزا اسماعیل حیرت، ۱۸۳۷ء میں طہران میں پیدا ہوئے۔
ان کا خاندان ایران میں بہت شریف اور نامور تھا۔ سیاسی انقلابات کی وجہ سے ان کا بچپن پرسکون نہیں تھا۔ ابھی ان کی عمر چار سال کی تھی کہ ان کے والد میرزا محمد علی کا انتقال ہوا۔ ماں کی پرورش نامقبول اور ناموافق تھی۔ شرافتِ خاندانی اور اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سترہ برس کی عمر میں صوبۂ گیلان کی صوبہ داری پیش کی گئی۔ سیاسی حالات اور وہاں کے رسم و رواج کو مدنظر رکھتے ہوئے میرزا حیرت نے اسے قبول نہیں کیا۔ تمام عزیز و اقربا ناخوش ہوئے۔ شاہی دربار میں بھی وہ وقعت نہ رہی۔ غرض زندگی تلخ ہوئی اور وہاں کے تعیّش، تصنّع، تملّق، نمائش، مذہبی اور سیاسی انقلابات اور نیرنگ بازی سے بھری ہوئی زندگی سے تنگ آکر ۱۹ سال کی عمر میں میرزا حیرت نے اپنے وطن مالوف کو ترک کیا۔ انھوں نے ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ کی سیاحت کی۔ تقریباً تین سال قسطنطنیہ میں قیام کیا اور فرنچ اور ترکی زبانیں اچھی طرح سیکھیں۔ وہاں سے مصر پہنچے۔ دوسرے سال حج حرمین شریفین کرنے کے بعد صنعا میں درویشانہ زندگی بسر کرنے کے ارادے سے عدن آئے۔ وہاں سیر و تفریح کر رہے تھے کہ روسی جاسوس سمجھ کر انگریزوں نے ان کو گرفتار کیا اور وہ وہاں سے بمبئی کے راستے بیلگام لائے گئے۔

یہ واقعہ میرزا حیرت کی زندگی میں بڑا انقلاب انگیز ہے یہاں پہنچ کر وہ دو سال تک برابر بحالت نظر بندی رہے۔ رجمنٹ کے افسر لوگ اُن سے فارسی پڑھنے لگے، گویا وہ مُنشی کا کام انجام دیتے تھے، مگر اس عرصے میں انھوں نے انگریزی اچھی طرح سیکھ لی۔ جب اس بندھن سے خلاصی پائی تو انھوں نے کچھ سال دکن، گجرات اور سندھ کی سیاحت کی۔ ۱۸۶۵ء میں انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار کی اور خلیج فارس کے محکمۂ تار میں نوکر ہو گئے۔ بعد ازاں بمبئی میں گورنمنٹ کے محکمۂ فارسی کے مترجم مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں انھوں نے گورنمنٹ کی درخواست پر سرجان مالکم کی تاریخ ایران کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اگرچہ یہ کتاب صرف ایک ترجمہ ہے لیکن دنیا میں اس نامور فاضل کی ایک یادگار رہے گی۔ حکومت نے ان کی قابلیت کی قدر کی اور ان کو مئی ۱۸۷۲ء الفنسٹن کالج میں فارسی عربی کا پروفیسر مقرر کیا۔

الفنسٹن کالج کا قیام، بمبئی یونی ورسٹی کی تاسیس سے ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ ابتدا میں یہاں فارسی عربی پڑھانے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ السنۂ شرقیہ کے کچھ یوروپی پروفیسر تھے، ضرورت کے مطابق وہی فارسی عربی پڑھایا کرتے تھے، الفنسٹن ہائی اسکول کے فارسی کے مُدرّس بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ایک عرصے کے بعد ۱۸۶۹ء میں مولوی عبدالفتاح کا ریڈر کے طور پر تقرر ہوا تھا۔ انھوں نے میرزا حیرت صاحب کا تقرر ہونے تک درس و تدریس کا کام کیا۔ وہ بی۔ اے تک کے امتحانوں کے ممتحن بھی ہوا کرتے تھے۔

پروفیسر میرزا حیرت صاحب نے ۱۸۷۲ سے ۱۸۹۸ تک اپنا فرض نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ان کا استقلال ان کے پاکیزہ صفات، ان کے شریفانہ اطوار، ان کی بلند حوصلگی اور وسعتِ خیالات کا اثر اُن سب پر پڑا جو اُن سے واقف تھے یا جنھوں نے ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ کالج کے وہ طلبہ جو اس زمانۂ دراز میں رہے، آئے اور گئے ان کی آنکھوں میں اس نامور شخص کی صورت اور ان کے دلوں میں اس کی قابلیت، عجیب خیالات اور جوہرِ شرافت و جوانمردی کا اثر باقی رہا۔ تمام طلبہ اور دیگر اساتذہ ان کی بہت عزت کرتے اور ان سے محبت رکھتے تھے۔ اپنی اعلا قابلیتوں، حیرت انگیز اور نہایت وسیع مطالعہ نیز عربی و فارسی اور دیگر زبانوں میں وسعتِ نظر کی وجہ سے پروفیسری کے عہدے کے لیے وہ نہایت موزوں تھے، بلکہ وہ مثال تھے اس امر کی کہ ایک بہتر سے بہتر پروفیسر ایسا ہونا چاہیے۔ کالج کو ایسے شخص کی پروفیسری سے بڑا اعزاز اور فخر تھا۔ ان کو اساتذہ کے ہزارہا عربی اور فارسی اشعار یاد تھے اور موقع پر بلا تامّل سیکڑوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ عربی فارسی انشا پردازی میں وہ عدیم النظیر تھے۔ کالج میں پڑھاتے وقت کبھی کتاب ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ ان کا حافظہ اس قدر صحیح تھا کہ اپنی یاد سے پڑھتے چلے جاتے اور اس خوبی سے تمام مطالب کی تشریح اور اُن پر تنقید کرتے تھے کہ طلبہ کو حیرت ہوتی تھی۔ ہندوستان میں وہ عربی و فارسی کے استادِ یگانہ سمجھے جاتے تھے اور ایران میں بھی ان کا شمار مشہور انشا پردازوں میں تھا۔ وہ ایک اعلا درجے کے شاعر بھی تھے۔ حکومتِ ہند نے ان کو شمس العلما کا خطاب عطا کیا تھا۔ میرزا صاحب کی ایک ایک خصوصیت اعلا درجے کی تھی۔ ان کا دماغ، ان کا حافظہ، ان کی قوتِ مشاہدہ، ان کی فیاضی سب غیر معمولی تھی۔ ان کی نظروں میں روپے کی حقیقت خاک دھول کے برابر تھی، سوائے اس حالت کے جب کہ وہ کسی بے کس مظلوم کی امداد میں خرچ کرتے۔ انھیں اپنے فرضِ منصبی کا بہت بڑا خیال تھا اور اپنے فرض کے ادا کرنے میں اپنی صحت تک کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے فلاسفر اور انسانی فطرت کو نظرِ غائر سے دیکھنے والے تھے۔ وہ اپنے قوم و ملک کے تمام علوم و فنون سے واقف تھے اور درحقیقت ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اسلامی ممالک کی سیاسی اور علمی تاریخ میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور قدیم سے قدیم علمی اور تاریخی حالات ان کی نظر میں ایسے ہی تھے جیسے موجودہ زمانے کے واقعات۔ انھیں خاص دلچسپی دینیات سے تھی اور آخر دم تک وہ دنیا کے تمام مذاہب کے علم اور مذہبی صداقت کی جستجو میں سرگرم رہے۔ مئی ۱۸۹۸ء میں وظیفہ یاب ہوئے اور اکتوبر میں دنیا سے رحلت فرما گئے۔

ان کے پہلے شاگرد فریدونجی دستور تھے (جو پہلے دکن کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہوئے اور بعد میں بمبئی یونی ورسٹی کے ۱۹۰۲ سے ۱۹۰۴ تک رجسٹرار تھے)۔ ان کے دوسرے شاگرد فیض اللہ بھائی لقمانجی تھے، جنھوں نے ۱۸۷۶ میں عربی اور علم الحساب کے ساتھ پہلے درجے میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ان کے تیسرے شاگرد مولوی سراج الدین ابن مولوی عبدالفتاح تھے اور دکن کالج میں ۱۸۹۲ سے ۱۹۰۶ تک فارسی کے پروفیسر رہے۔ ان کے چوتھے شاگرد قاسم سمر تھاریانی تھے جو بارہ سال تک ان کے شاگرد، معاون اور بعد میں ان کے جانشین بنے۔ ۱۸۹۱ میں فارسی اختصاصی مضمون کے کر سیکنڈ کلاس میں بی۔ اے پاس ہوئے، اور فارسی اور انگریزی کے ساتھ ۱۸۹۳ میں سیکنڈ کلاس میں ایم۔ اے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۹۸ تک ان کے معاون رہے اور اس کے بعد ۱۹۰۵ تک الفنسٹن کالج میں فارسی عربی کے پروفیسر رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۵ میں ہوا (اور شیخ محمد اصفہانی ۱۹۰۶ سے ۱۹۱۶ تک الفنسٹن کالج میں پروفیسر کے عہدہ پر رہے)۔ ان کے پانچویں شاگرد مولوی محمد یوسف کوکن گھکھے تھے جو عربی کے ساتھ ۱۸۹۵ میں بی۔ اے اور ۱۸۹۸ میں ایم۔ اے میں کامیاب ہوئے۔ دیوان بہادر زویری، سر رستم مسانی، کویاجی، کوکا، بھلابھائی ڈیسائی، محمد رحمت اللہ سایانی وغیرہ بھی ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

رشید کوثر فاروقی

چند روز کیرالا میں

ٹرین کی رفتار وقت کی رفتار کا مقابلہ کر رہی تھی اور دل کشا مناظر کا کارواں مختلف سمت میں دوڑ رہا تھا جیسے کوئی رنگین تصویر ایک طرف سے کھلتی اور دوسری طرف سے لپٹتی جاتی ہے۔ کہیں سبز رنگ کی مختلف پرچھائیاں لہراتی ہوئی، کہیں بادامی، سُرمئی اور سیاہ پہاڑ بادلوں کی طرح اُڑتے ہوئے۔ کوئی پہاڑ کچھ دوری پر ہوتا اور اُس پر نگاہ جا ٹھہرتی تو بہت دُور تک ساتھ دیتا اور مختلف زاویے بناتا یا دیر تک نیم دائرے میں رقص کرتا جاتا۔ کسی مصوّر کا فن پارہ قریب سے دیکھیے تو بچوں کی ابتدائی مشق محسوس ہوتا ہے جس میں رنگوں کی تمیز، مفہوم کا تعین اور تناظر (PERSPECTIVE) کا شعور فاصلہ پیدا کرتا ہے۔ مصوّرِ فطرت کی تصویر قریب ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے وجود پر کوئی عظیم تر وجود چھایا جا رہا ہو ــــ ایک تحیّر، ایک ارتفاع، ایک مُبہم سی کیفیت ــــ لیکن یہی منظر دُور ہوتا جائے تو فاصلے سے درمیان کا غبار اور نظارے کی دل پذیری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وقت اور موسم کی تراش و خراش اور سالانہ بارشوں کے موقلم نے پہاڑوں کو بھی وہ حُسن دے دیا ہے کہ چشمِ بینا ہو تو دیکھتے رہیے اور گوشِ شنوا ہو تو سُنتے بھی جائیے۔ کوہستانی سلسلے کے نشیب و فراز بھی مایوسیوں اور تمنّاؤں کی خاموش کہانیاں ہیں۔ کہیں منارے ترشے ہوئے، کہیں محرابیں بنی ہوئی، کہیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی عظیم قلعہ کھنڈر میں بدل گیا ہو۔ کہیں مخروطی، کہیں مدوّر، کہیں مستطیل اور مربع نما شکلیں، انسانی علمِ ہندسہ میں وجود و عدم اور قیام و تغیّر کا یہ درس کہاں جو فطرت کی ان سنگ تراشیوں میں ہے۔ نگاہ دیر تک بلندیوں پر نہیں ٹھہر سکتی لیکن بلندیوں سے اُتر کر پچھتاتی نہیں کیونکہ یہاں کی پستیاں بھی جاذبِ نظر ہیں۔ پہاڑوں کا دامن زمین کے دامن سے ملتا ہے تو سبز رنگ کی دھوپ چھاؤں کیسی دلآویز ہوتی ہے۔ آخر یہ کیسا دیس ہے کہ مخملیں سرسبزیوں کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ دھان کے کھیتوں کے قافلہ ہائے متّصل، ان کی گھنیری جھل جھل کرتی ہوتی ہریالی کا زیر و بم جیسے مخمل کا فرش ہوا کی تیزی سے اُبھر اُبھر کر بیٹھ جائے۔ ناریلوں کے ناچتے ہوئے جھرمٹ: کوئی درخت سرو قد، کوئی کمر جھکائے ہوئے۔ خصوصاً جہاں کہیں تالاب یا چشمہ آ جاتا ہے وہاں کمانوں کی طرح جھکے ہوئے درخت جیسے پانی کے آئینے میں اپنی تصدیق کرنا چاہتے ہیں اور یونانی دیومالا کی "نرجس" (NARCISSUS) کی طرح اپنے حُسن کے عشق میں آپ گرفتار ہوں۔ جا بجا ڈلی (BETEL-NUT) کے نازک اندام درختوں کے خیاباں ــــ سفید چاندی کے سے چھریرے بدن پر چتر سبز رنگوں اُٹھائے ہوئے، اپنے تیر جیسے قد پر حیران۔ ڈلی کے یہ باغات دیکھ کر کبھی گمان گزرا کہ آسمان سے سیکڑوں شہاب ایک ساتھ ٹوٹ پڑے ہیں اور فضا میں عمودی لکیریں چھوڑ گئے ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوا جیسے قلعۂ آگرہ کے دیوانِ عام میں ستونوں کی قطاریں ہوں اور چھت پر ہری پالش کر دی گئی ہو۔ درختوں کے پتوں پر کرنوں کی آنکھ مچولی، کچھ ناچتی ہوئی، کچھ چمکتی ہوئی، کچھ سنہری سوئیوں کی طرح بکھری ہوئی، کچھ دھنکی ہوئی روئی بن کر اُڑتی ہوئی۔ دھوپ ایسی کہ نگاہ اٹھتے اٹھتے

نہال ہوجائے، چھاؤں ایسی کہ دیکھتے دیکھتے آنکھ لگ جائے۔ انھیں مرغزاروں کی آغوش میں اکا دکا مکانات۔ چھوٹے چھوٹے۔ پیارے پیارے۔ کھپریلوں یا چٹائیوں سے چھائے ہوئے، جیسے ان میں انسان نہیں پریاں رہتی ہوں یا خوابوں کے فرشتے بسیرا لیتے ہوں۔ زمرّد کی ان وادیوں میں چرند اور چرند ایسے لگتے ہیں جیسے جادو سے پیدا کر دیے گئے ہوں۔ آسمان بے داغ، گہرے پرسکون سمندر کی طرح گمبھیر۔ زمین میں بیشتر سُرمئی اور کہیں کہیں سُرخی مائل بھی۔ مگر زمین بہت کم نظر آئی اور اکثر یہی گمان رہا ہے کہ یہ پرواز ہے، رفتار نہیں ہے۔ اس جنّتِ گزراں میں بارہا فردوس گوش کا عالم بھی رہا۔ جہاں کہیں ٹرین تنگ وادیوں کا پہلو چیرتی نکلی اس کی رفتار یا اس کی سیٹی کی آواز دیر تک گونجتی رہی جیسے بہت سی جھانجھیں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔ اور یہ تو خیر سرما کے اواخر ہیں، بارش میں اس سبز پوش ریاست کا حُسن کیا کچھ ہوتا ہوگا! جو سامنے ہے اُسے آنکھیں دیکھتی ہیں! جو سامنے نہیں اسے تصوّر دیکھتا ہے! پہاڑیوں سے گرتے ہوئے دودھیا جھرنے، گھاٹیوں سے اُمڈتے اور جھومتے ہوئے بادل، میدانوں میں بل کھاتے ہوئے شفاف جھرمل پانی کے چشمے، غسل کرتے ہوئے درختوں کی پاک دامنی، فضا کی اچھوتی پاکیزگی، ہوا کا کنوار پن، سبزہ زاروں کی طراوت۔ میں نے سوچا ہمارا ہندوستان کتنا حسین ہے، اُس کی آغوش کتنی کشادہ، کتنی گداز، کتنی دل نواز ہے۔

لیکن ہم ہندوستانی کتنے کافر نعمت و بے توفیق ہیں، صورت کے اس جمال کو سیرت کے حُسن سے ہم آہنگ نہیں کرتے۔ ہم بے سعی و طلب ہاتھ آنے والی نعمتوں کے پرستار ہیں اور محنت و حصول کی لذّتوں سے ناآشنا۔ ہم جغرافیہ سے محبّت کرتے ہیں لیکن ہمیں تاریخ سے وحشت ہوتی ہے۔

"حضرات اپنا اپنا سامان تیار رکھیں، منزل آنے والی ہے۔"

ایک ساتھی نے چونکا دیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا کسی منزل کی بھی ضرورت ہے اور کیا سفر بجائے خود منزل نہیں ہے۔ دنیا کی زینت و کشش کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ہم یہاں مہمان و مسافر ہیں۔ آگرے والوں کے لیے تاج محل میں اور اہلِ کشمیر کے لیے کشمیر میں وہ حُسن کہاں جو سیّاحوں کو نظر آتا ہے۔ راستے سے گزر لیے اور راستہ دلآویز ہو تو رہ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ رہ پڑیے تو ماحول کا حُسن نہیں ماحول کے تقاضے اہم ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد کیا صورت ہوگی؟ شاید جہنّم کے عذابوں میں ایک یہ بھی ہو کہ ہر شئے مقامی ہو اور جنت کی نعمتوں میں ایک یہ بھی کہ ہر چیز متحرک ہو، نو بہ نو ہو، بے کراں ہو۔ زندگی کے ساتھ زندگی اور مسرّت کے ساتھ مسرّت کا تنوع بھی جاوداں ہو۔ ہاں تو منزل کا نام آتے ہی یاد آیا کہ ہم پندرہ آدمیوں کا ایک قافلہ ہیں جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس میں شرکت کے لیے مہاراشٹر سے کیرالا آیا ہے۔

گاڑی کالی کٹ اسٹیشن سے کوئی آٹھ میل پہلے ایک دیہی اسٹیشن فروک (FEROKE) پر ٹھہر گئی۔ دراصل یہ "فاروق" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ کرم انگریزوں کے طرزِ تلفظ کا ہوگا لیکن نہیں سمجھ میں آیا کہ آزادی کے بعد "کانپور" کا انگریزی املا درست ہوا، "بنارس" "وارنسی" بنا لیکن "فروک" فاروق نہ بن سکا۔ خیر یہ بھی ممکن نہ تھا تو وہ مسلمان جنھیں معلوم ہے کہ اس بستی کا یہ نام سُلطان ٹیپو نے رکھا تھا، اسے "فروک" ہی کیوں کہتے ہیں؟ —

خیر ہم لوگ "فاروق" میں اُتر گئے۔ گاڑی کا قیام بہت مختصر اور سامان زیادہ۔ سامان اُتارنے میں رضا کاروں نے کوئی حصّہ نہیں لیا (یہ میں شکایتاً نہیں حکایتاً کہہ رہا ہوں، آگے میں اس کی توجیہ پیش کروں گا) ہمارے قافلے کے دو نوجوان طالبِ علم سامان پھینکتے رہے اور دور جاکر چلتی ٹرین سے اُترے۔ ہم سب نے مل جُل کر سامان اُٹھایا اور کاروں پر بار کیا جو ہماری منتظر تھیں۔ ہم بیٹھے اور ایک دل کش راستہ طے کرتے ہوئے چلے۔ راہ میں کئی چوبیں دروازے نظر آئے جن پر انگریزی اور ملایلم میں "شرکائے کانفرنس کو خوش آمدید" لکھا ہوا

تھا لیکن یہ خوش آمدید کچھ ضرورت سے زیادہ نمایاں تھا جس پر تبصرہ آگے آتا ہے۔ یمین و یسار کی سبز پوشیوں سے جمال اندوز ہوتے ہوئے ہم ایک گلابی صدر دروازے میں داخل ہوئے۔ گلابی عمارتوں کے ہجوم اور گلابی سنگریزوں کے فرش نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ یہ فاروق کالج ہے جسے ایک اونچے چٹیل میدان پر تعمیر کیا گیا ہے اور جو کالی کٹ یونی ورسٹی کا سب سے بڑا پوسٹ گریجویٹ کالج ہے۔ سنگلاخ زمین پر اتنی روح پرور عمارت دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ میدان کے چاروں طرف گھرے سبز جنگل ہیں جنھیں دیکھ کر سورۂ رحمان یاد آئی جس میں بہشت کے دو باغوں کو "مُدْھَامَّتٰن" کہا گیا ہے، فطرت کے جس صنّاع نے اس فنا پذیر دنیا کو ایسا نظر کش حُسن عطا کر دیا ہے اُس نے سرمدی اور دوامی جنتوں میں کیا کچھ گلکاریاں اور چمن چمن طرازیاں نہ کی ہوں گی۔

کاریں میدان کی ناف میں ایک برآمدے کے سامنے رکیں۔ کالج کے ذمہ دار دوڑ دوڑ کر آئے جن میں پرنسپل بھی تھے۔ صدر شعبۂ انگریزی بھی۔ اور بہت سے طلبہ بھی۔ سب کے چہروں پر منت گزاری کے جذبات جلی رنگوں میں تحریر تھے۔ ایک مشکل یہ ضرور تھی کہ وہ ہم سے انگریزی میں بات کرتے تھے اور آپس میں ملایلم میں بولتے تھے۔ ایمانی رشتہ الفاظ کا دست نگر نہیں ہوتا لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب تک مادری زبان یکساں نہ ہو، دل ایک دوسرے کی طرف بڑھتے تو ہیں ہم کنار نہیں ہو پاتے۔ بہر حال ہمارا سامان دار الاقامہ کی طرف لے جایا گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پانی کی قلت ہے اس لیے کچھ تامل کے بعد طے پایا کہ ہم کالی کٹ کے کسی ہوٹل میں قیام کریں۔ ہندو ہوٹل سے معاملہ ہوگیا لیکن جمعہ تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ نماز پڑھ کر کالی کٹ جائیں گے۔

کالج ہی کے ہال میں ایک وسیع خوشنما مسجد تھی جس کی بلندیوں سے کسی خوش آواز نے اذان کا شہد لنڈھا دیا۔ ہم مسجد میں داخل ہوئے۔ اس کا جوف بڑے بڑے کمروں پر مشتمل تھا جس میں دروازے استنے اور اس طرح بنائے گئے تھے کہ کھول دیے جائیں تو ایک میدان معلوم ہو۔ عورتوں کے لیے ایک مخصوص زاویہ تھا جس میں ان کی صفیں بنتی تھیں اور پردہ قائم رہتا تھا۔ خطبے کے لیے جو صاحب کھڑے ہوئے وہ کوئی تیس سال کے نوجوان تھے: میانہ قد، گندم گوں، دھان پان، چھوٹی سی داڑھی، معصوم و متبسم چہرہ۔ انھوں نے خطبۂ اولیٰ شروع کیا۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ملایلم بول رہے ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ بکثرت ہیں۔ جہاں کہیں قرآن سے اقتباس کرتے، تقریر کے قرینے کا کچھ سراغ مل جاتا ورنہ ہم ان کا منہ دیکھتے رہتے۔ خطبۂ ثانیہ وہی عربی میں تھا، جو انھوں نے باندازِ خطیبانہ پڑھا اور لطف دے گیا۔ مسجد نمازیوں سے معمور تھی اور خوشی کی بات یہ تھی کہ نوجوان ہی نوجوان تھے، جو نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ نماز کے بعد میں نے پہلو کے ہم نماز سے امام کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ہمارے عربی کالج میں عربی کے استاد ہیں اور ملایلم کے مشہور اہلِ قلم بھی۔ میں ان کے پاس گیا اور انگریزی میں ان کا تعارف چاہا۔ وہ میری بات نہیں سمجھے لیکن طلبہ نے انھیں میرے بارے میں کچھ بتایا اور مجھ سے کہا کہ ہمارے امام انگریزی نہیں جانتے۔ میں نے ذہناً عربی صرف و نحو کے صفحات الٹنا شروع کر دیے اور انگریزی میں بے تکلف جو کچھ کہا گیا تھا اُس کا ترجمہ کرنے لگا۔ میں رفتار و گفتار دونوں میں چاق ہوں، اس تاخیر و تامل سے مجھے ندامت ہوئی اور اس بدنصیبی کا احساس بھی کہ عربی میں گفتگو کرنے کی مشق نہیں بہم پہنچائی۔ معاً اندازہ ہوگیا کہ مطالعے اور مکالمے میں کتنا فرق ہے۔ ٹٹول ٹٹول کر اپنے محدود ذخیرۂ الفاظ سے جملے بنائے اور کسی طرح مافی الضمیر ادا کیا۔ اُن کی عربی جدید نہیں تھی کیونکہ جدید عربی میں اُن عرب نوجوانوں سے سُنتا ہوں جو میرے طلبا ہیں۔ ــــ لیکن نہایت فصیح و سلیس تھی جس پر اسلوبِ قرآنی کا پرتو تھا۔ اُنھوں نے جواباً مجھے بتایا کہ خطبۂ اولیٰ میں انھوں نے [illegible] کی

کی مادّی ترقّی اور اخلاقی افلاس پر تنقید کی تھی اور واضح کیا تھا کہ اسلام رُوح اور جسم دونوں کا ایک ساتھ ارتقا چاہتا ہے۔ امام موصوف کی جو ادا مجھے بہت پسند آئی وہ ان کے لہجے کا اعتماد اور اس کے ساتھ ہی بے ساختہ انکسار تھا۔ ایک دُور افتادہ اسلامی بھائی سے ملنے کی خوشی نے اُن کے چہرے کا فروغ بڑھا دیا تھا۔ غرورِ علم و امامت نام کو نہیں، انگریزی داں "معززین" یا اُردو ساو مشاہیر کو دیکھ کر "دورِ کوٹ کے اماموں" میں قریاد کرتا ہوا احساسِ کم تری جو ہوتا ہے اس کی چھاؤں بھی نہیں، حالانکہ دونوں انتہائیں میں نے عام پائی ہیں۔ وہ دونوں کالجوں کے طلبہ کے ساتھ شیر و شکر ہو کر چل رہے تھے۔ طلبہ ان سے مانوس بھی تھے اور قدرے فاصلہ بھی قائم تھا۔ شباب، وقار، اُخوت اور انکسار کے عناصرِ اربعہ کا صحت مند اعتدال توازن۔ اللہ ایسوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔ آمین!

نماز کے بعد ہمیں بندرو ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ جو یہاں سے ۹ نو میل ہے تاکہ ذرا دم لے لیں۔ یہ راستہ جس سے کانفرنس کے دوران آنا جانا رہا اس قدر خوبصورت تھا کہ ہر بار یہی جی چاہتا کہ طے نہ ہو۔ بعض راہیں منزلوں سے زیادہ حسین ہوتی ہیں۔ اس راہ کا سب سے خوبصورت منظر دریائے فاروق تھا جس کے دونوں طرف گھنے اور شاداب ناریلوں کی قطاریں تھیں جنھوں نے ندی پر ایک محرابِ مسلسل سی بنا دی تھی۔ اُن کی خُنک چھاؤں نے سطحِ دریا کو سُرمئی اور پُر اسرار بنا رکھا تھا۔ بندرو ہوٹل کا تمام عملہ ہندو ہے اور نہایت خلیق و شفیق۔ ہوٹل سارے کا سارا اُجلا اور ستھرا، کمرے آئینہ بنے ہوئے، فرش سے کر چھتوں تک ایک داغ نہیں، کہیں کوئی تنکا نہیں۔ ہر گوشہ گرد و غبار سے پاک بلکہ نور پاش۔ طشتریاں اور گلاس تو خیر، نمک دان اور مرچ دان تک نہایت مُصفّا۔ ملازموں کا لباس خالص دودھ کی طرح سفید وردی۔ افسوس کہ زندگی کے تمام شعبوں کی طرح مسلمان یہاں بھی پسماندہ ہیں۔ نہ ان کے ہوٹلوں میں یہ صفائی، نہ یہ خوش تمیزی اور نہ یہ اخلاق حالانکہ ان خوبیوں کی جتنی تاکید اسلام نے کی ہے، کسی دین نے نہیں کی۔

انسانی نفسیات و اعصاب پر رنگوں کا اثر سب کے علم میں ہے لیکن مجھے ایک فوری اور دلچسپ تجربہ ہُوا۔ ریزرویشن کے باوجود تین دن کے سفر میں جھپکیوں اور جماہیوں کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا۔ آنکھوں میں تلخی اور سوزش کا ایسا احساس کہ بار بار بند کرنے پر بھی چین نہ ملتا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچا یا گیا لیکن چونکہ تھوڑی ہی دیر بعد افتتاحی نشست تھی اس لیے نیند نہ آئی تاہم کوئی بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ بڑی تازگی اور آنکھوں میں خنکی محسوس ہوئی جیسے ایک سکون آور نیند کے بعد اٹھا ہوں۔ غور کیا تو وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ ہوٹل کے اندرونی حصوں اور تمام کمروں میں سبز رنگ کا پینٹ تھا۔ کیرالا کی فضائے اخضر نے یہاں کے ذوقِ جمال کو خوب سنوارا ہے۔

کانفرنس فاروق کالج ہی تھی جو اگرچہ یہاں سے ۹ میل دُور ہے تاہم کاروں کی اتنی وافر تعداد موجود تھی کہ ہم جب چاہتے کالی کٹ سے فاروق اور فاروق سے کالی کٹ جا سکتے تھے۔ ہم ۵ بجے فاروق کالج پہنچ گئے ـــــ یہ کانفرنس جنوبی ہند کی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے منعقد کی تھی۔ گذشتہ سال اس کا جلسہ مدراس میں ہوا تھا اب کی برس کالی کٹ میں ہوا، جہاں اسے کل ہند تنظیم کی حیثیت دی گئی۔ کالی کٹ اجلاس کی تاریخیں ۲۵، ۲۶ اور ۲۸ دسمبر تھیں۔ ۲۵ دسمبر کو اس کے پروگرام میں پرچم کشائی، سائنس اور کُتب سے متعلق نمائش، افتتاحی جلسہ، سوسائٹی سے متعلق طلبہ کا سالانہ اجتماع وغیرہ شامل تھے۔ ۲۶ دسمبر کو جلسۂ عام منعقد ہوا جس کے صدر جسٹس بشیر احمد سعید تھے جو جنوبی ہند کے مسلم تعلیمی وقف کے مؤسّس ہیں۔ اس جلسے کے بعد مندوبین کا پہلا اجتماع ہوا جس میں مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کی سماجی و تعلیمی سرگرمیوں پر رپورٹیں پیش کی گئیں۔ اس کی صدارت میسور ہائی کورٹ کے سابق جج میر اقبال حسین نے کی۔ اسی روز مسلمان اور اطلاقی (جاری ہے)

تعلیم" پر بھی مذاکرہ رہا جس کے صدر مہاراشٹر کالج، بمبئی کے پرنسپل عبدالقدوس عظیم الدین منشی صاحب تھے۔ ۲۷ر دسمبر کا پہلا اجلاس "دینی تعلیم" کے موضوع پر مذاکرہ تھا جس کے صدر کالی کٹ یونیورسٹی کے وائس چانسلر محمد غنی صاحب اور مہمان خصوصی یونس سلیم صاحب تھے۔

اس کے بعد مندوبین کا دوسرا اجتماع منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر عبدالغفور نے آئین پیش کیا۔ شام کے اجلاس میں "ہندوستانی مسلمانوں کا اقتصادی احیا" کے عنوان پر مذاکرہ ہوا۔ انجمن خیر الاسلام مہاراشٹر کے معتمد عمومی محمد علی مٹھا اس مذاکرے کے صدر تھے۔ آخر میں مندوبین کا تیسرا اجتماع ہوا جس کی صدارت آل انڈیا ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر منتخب جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے کی۔ عصرانے کے بعد تمام مندوبین و مدعوئین موٹر کاروں کے ایک جلوس کی شکل میں کالی کٹ پہنچے جہاں منچرا میدان میں عوامی جلسہ تھا جس کے صدر یونس سلیم صاحب تھے۔ کانفرنس قومی ترانے پر ختم ہوئی۔

میرے نزدیک کانفرنس کا مفید ترین اجلاس مندوبین کا پہلا اجتماع تھا جس میں نمایندہ شرکا نے اپنی اپنی ریاستوں کے حالات اور مختلف اداروں کے مفصّل اعداد و شمار پیش کیے۔ اس طرح تقریباً پورے ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی تصویر سامنے آگئی۔ ان رپورٹس کی روشنی میں سب سے بہتر ریاست مہاراشٹر محسوس ہوئی جہاں کے مسلمان اُردو کی ترویج اور دینی و دنیوی تعلیم کی ترقی کے لیے مسلسل جد و جہد کر رہے ہیں اور سب سے زیادہ پس ماندہ و قابلِ رحم کشمیر جہاں کی مردم شماری کہتی ہے کہ مسلمان اکثریت میں ہیں۔ رہیں یوپی اور بہار جیسی ریاستیں سو ان کا پوچھنا کیا۔ وہاں کے اربابِ قیادت کو نفسا نفسی اور سیاسی داؤ پیچ سے فرصت کہاں کہ تعمیر و تعلیم کے میدان میں اُتریں۔ ان ریاستوں سے کوئی رپورٹ ہی نہیں آئی جو پڑھی جاتی۔

کانفرنس میں تقریریں بہت ہوئیں۔ میں صرف اُن تقریروں کا ذکر کرتا ہوں جو کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز، اہم یا فکر انگیز تھیں۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا سید عبدالوہاب بخاری نے قرآن پاک سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو اتحاد کی تلقین کی۔ انھوں نے اس کانفرنس کے مخالفین پر طنز سے گریز کیا اور بندگانِ ہوس کی طرح منافرت کی آگ کو ہوا نہیں دی۔ یورپ میں نشأۃِ جدیدہ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دراصل مسلمان ہی علوم جدیدہ کے بانی ہیں، اور مسلمانوں کے لیے علومِ جدیدہ کی اہمیت اُس حدیث سے ثابت کی جس میں ہر مسلمان عورت اور مرد کے لیے حصولِ علم کو فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا سبب یہی ہے کہ وہ علومِ جدیدہ سے بے بہرہ یا بڑی حد تک غافل ہیں اور اپنی معاشی ترقی کے لیے جد و جہد نہیں کرتے۔ سر سیّد کے کام کو انھوں نے دورِ حاضر کا عظیم ترین کارنامہ اور سر سیّد کو مسلمانانِ ہند کا صدرِ جلیل قرار دیا۔ انھوں نے بار بار قرآن حکیم سے سائنس اور سائنسی علوم و اعمال کی ناگزیری کو اس طرح واضح کیا کہ علّامہ مشرقی کے طرزِ تعبیر کی یاد تازہ ہو گئی۔ خطبۂ افتتاحیہ کے دوران انھیں بیگم جسٹس بشیر احمد سعید کی صاحبہ نے جو شاہ نشست پر موجود تھیں، لکھ کر ایک پرچہ دیا جس میں تعلیمِ نسواں پر توجہ کرنے کی درخواست کی تھی، چنانچہ انھوں نے پورے زورِ بیان اور تفصیل سے باور کرانے کی سعی کی کہ جب تک عورت علومِ جدیدہ کی جولاں گاہ میں نہیں کود پڑتی، مردوں میں بھی احیائے علوم کا کام بے اثر رہے گا۔

خطبۂ صدارت مدراس ہائی کورٹ کے سابق جج بشیر احمد سعید صاحب نے پڑھا۔ انھوں نے مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی اور مسلم لیگ کے درمیان ناچاقی پر قلق کا اظہار کرتے ہوئے کہا ایسی باتوں سے مسلم دشمن عناصر کے دل باغ باغ ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کے تعمیری اور ترقیاتی عزائم کو سراہتے ہوئے کہا کہ جنوبی ہند نے اکثر تمام ملک کی رہنمائی کی ہے اور آج پھر وہ پورے ملک کی قیادت کے لیے اٹھا ہے۔ انھوں نے یقین آفریں لہجہ میں فرمایا کہ اکثریت کے بعض طبقات نے مسلمانوں کو قومیت دشمن اور فرقہ پرور قرار دیا ہے جب کہ مسلمان سچے وطن دوست

ہیں اور جو لوگ ان کی وطن دوستی پر شبہ کرتے ہیں وہ انتہائی قوم دشمن اور فرقہ پرست ہیں۔ دستور سازوں نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی خاطر بنیادی حقوق پر ایک باب بھی مرتب کیا ہے۔ جب تک ان بنیادی حقوق پر ہاتھ صاف نہیں کیا جاتا اقلیتوں کو حق ہے کہ دستور نے انھیں جو تحفظات دیے ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ مطالبہ فرقہ وارانہ نہیں، عین قوم پرستانہ ہیں۔

انھوں نے اس حقیقت کا بھی اظہار کیا کہ دستور کے رہنما اُصول پر دیانت کے ساتھ عمل نہیں کیا گیا ورنہ ۲۳ برسوں میں دوسری اقلیتوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً تعلیمی اور اقتصادی ترقی میسّر آتی اور وہ بھی اکثریت کے ہم دوش و ہمسر ہوتے۔ حکومت نے اقوام مندرجۂ فہرست اور دوسرے غیر مسلم فرقوں کے ساتھ، جو حقیقی اقلیت نہیں ہیں بلکہ اصل میں اکثریتی فرقے کا ایک حصّہ ہیں، جو کچھ کیا ہے اُس کا سواں حصّہ بھی مسلمانوں کو نصیب ہوتا تو صورتِ حال قطعاً مختلف ہوتی۔ ہم نے صدر مملکت اور وزیر اعظم سے بارہا گذارش کی کہ ایک مسلم اقلیتی کمیشن مقرر کیا جائے لیکن نہیں کیا گیا۔ جب تک دستور کی دفعہ ۲۶ سے دفعہ ۳۰ تک بنیادی حقوق کی جو ضمانت دی گئی ہے اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا حالات یہی رہیں گے پھر کیا اس مقدس فرض کی تعمیل کا مطالبہ جُرم ہے؟

اُردو کے مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسے ابھی تک ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت نہیں دی گئی۔ حتّٰی کہ یو۔ پی میں بھی اُردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنایا گیا۔ مرکزی حکومت نے اس سلسلے میں کچھ نیم دلانہ سفارشیں کی ہیں لیکن محسوس نتائج کہیں نظر نہیں آتے اور ریاستیں اُردو کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کرتیں۔ سنسکرت کے احیا اور ہندی کے اجرا پر زرِ کثیر صرف کیا جا رہا ہے جب کہ اُردو شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی تنہا زبان ہے جو الٰہ آباد، لکھنؤ، کانپور، ناگپور، گوالیر، بڑودہ، پٹنہ اور بھوپال کے کوچہ و بازار میں رائج ہے۔ تانگے والے، ٹیکسی والے، خوانچہ فروش بلکہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے سرکاری افسر بھی اُردو ہی بولتے ہیں۔ بایں ہمہ اکثریتی فرقے کے بعض شریر عناصر برابر اس فکر میں رہتے کہ اسے مسلمانوں سے مخصوص کر کے نکّو بنا دیا جائے۔

اقلیتوں کی تعلیم گاہوں اور اُن کی مجالس منتظمہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دستور نے لسانی اور مذہبی دونوں قسم کی اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے کے قیام اور انتظام کا حق دے رکھا ہے لیکن ملک کے بہت سے حصّوں میں اقلیت کی مجالس منتظمہ کو پریشان کیا جا رہا ہے۔ جہاں کہیں وہ حکومت کے بعض ایسے احکام کی جو صریحاً دستور کے خلاف ہوں، پابندی نہیں کرتے، انھیں امدادی رقم بند کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے یہاں تک کہ یونی ورسٹیاں بھی جنھیں "علمی معابد" کہا جاتا ہے اقلیتوں کے مفادات نظر انداز کر رہی ہیں اور حکومت کی جابرانہ پالیسیوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ صدر نے یاد دلایا کہ گذشتہ کانفرنس کے موقع پر انھوں نے جنوبی ہند میں ایک مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ مسلمانوں کو اپنی زبانوں، اپنے رسم ہائے خط اور اپنی تہذیب کی بقا عزیز ہے تو اس یونی ورسٹی کا قیام ناگزیر ہے چاہے اس کے لیے کتنے ہی ایثار کی حاجت کیوں نہ ہو۔

ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر رائے دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ اختیار نہ یونی ورسٹیوں کو حاصل ہے نہ حکومتوں کو کہ کسی ذریعۂ تعلیم کو پرائیویٹ خصوصاً اقلیتی کالجوں کے سر تھوپ دیں۔ یہ کالجوں کی خود مختاری، شہریوں کی آزادی اور دوسرے بنیادی حقوق کی پامالی ہے۔ اس طرح کی حرکتیں وہی حکومت کرتی ہے جس کا دماغ نشّۂ اقتدار سے چل گیا ہو، اور ان کا نتیجہ امن شکن مظاہروں کی شکل میں رونما ہوتا ہے کیونکہ عوام کی غالب تعداد محسوس کرنے لگی ہے کہ اقتدارِ حاضر کے مقابلے میں تشدّد ہی سے مطلب براری ہوتی ہے۔ ہوش مند حکومت کا یہ کام ہے کہ طلبہ اور ان کے والدین کو وسیلۂ تعلیم کے انتخاب کی مکمل آزادی دے۔

جسٹس بشیر احمد سعید نے مرکزی حکومت کے سہ لسانی فارمولے
کو بدترین ناکامی سے موسوم کرتے ہوئے کہا کہ ریاستوں نے اسے ایک
مضحکہ بنا کر رکھ دیا ہے اور اس سلسلے میں جو بے انصافیاں عام ہیں
ان کا بیشتر نقصان مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے مثلاً جہاں علاقائی زبان ان کی
مادری زبان نہیں ہے وہاں اگر وہ مادری زبان اختیار کریں تو ان کے لیے
روزگار کے مواقع نہیں۔ صنعت و حرفت کے میدان پر نظر ڈالیے۔ یہاں بھی
تصویر اتنی ہی دھندلی ہے۔ میڈیکل، انجینئرنگ اور دوسرے پیشہ آموز کاموں
میں مسلمانوں کو برائے نام داخلہ ملتا ہے۔ وہ تناسب آبادی ہی کے لحاظ
سے اپنا حصّہ نہیں پاتے چہ جائے کہ کوئی رعایت دی جائے۔ پھر جب ہم
دیانت دارانہ مطالبات پر اصرار کرتے ہیں اور دستور کی دفعہ ۱۵ سے رجوع
کرتے ہیں تو ہمیں فرقہ پرست کہا جاتا ہے۔

موصوف نے اس پر بڑی تشویش ظاہر کی کہ عورتیں اگرچہ ہماری
آبادی کا نصف حصّہ ہیں تاہم ½ فیصد پڑھائی جاتی ہیں اور ½۹۹ فی صد تعلیم سے
محروم ہیں[1]۔ عورتوں کی اعلا تعلیم (یعنی سیکولر تعلیم) کا فقدان اور مسلمانوں کا
ہولناک افلاس دونوں مسلمانوں کی راہِ ترقی میں دو زبردست چٹانیں ہیں۔ آپ
دو ہاتھوں سے جتنا کام کر سکتے ہیں اتنا ایک ہاتھ سے نہیں کر سکتے بلکہ دو فی صدی
بھی نہیں کر سکتے[2]۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ اس جیتی جاگتی حقیقت کا
ادراک کر لینا چاہیے کہ دنیا زندگی کے ہر میدان میں مسابقت
(COMPETITION) کی دنیا ہو گئی ہے لہٰذا ہم مقابلے کی اسپرٹ کے
بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور مقابلے کی اسپرٹ مردوں کی عام تعلیم کے ساتھ
عورتوں کی آزادانہ (LIBERAL) تعلیم کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس
مقصد کی تکمیل کے لیے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی تاسیس کا
خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ تنظیم سیاست سے اس وقت تک دور رہے گی جب تک ایسے
مسائل نہ پیش آجائیں جنھیں سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھے بغیر چارہ نہ ہو۔

کانفرنس کی دوسری اہم تقریر یونس سلیم صاحب کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ
قرآن اور اسلام کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے علم کی اہمیت واضح کی چنانچہ مسلمانوں
نے اقوامِ عالم کو مختلف علوم و فنون سے مستفیض کیا اور عرصۂ دراز تک انھوں نے
دنیا کی سیاسی، علمی اور عملی رہ نمائی کی لیکن جب سے علم کا دامن چھوٹا وہ
وہ محکوم و ذلیل ہو گئے۔ سر سیّد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھوں نے
کہا کہ مرحوم نے انگریزی کے واسطے سے علوم جدیدہ پر زور دے کر مسلمانوں
کو نئی زندگی دی لیکن نئے حالات کا تقاضا کچھ اور ہے۔ انگریزی کی
اہمیت گھٹتی جا رہی ہے اس لیے ہمیں ہندی اور دوسری ریاستی
زبانوں پر توجہ دینا چاہیے۔ نسلِ نو خصوصاً جنوبی ہند کے باشندوں
کو انھوں نے اُردو کی طرف بیش از بیش التفات کی دعوت دی
تاکہ مسلمانوں کی سطح پر یہ زبان ملک میں رابطے کی زبان بن سکے
اور مسلمان اس کے دینی اور ادبی سرمایے سے استفادہ
کر سکیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہب و تہذیب
کی اہمیت محسوس کراتے ہوئے کہا کہ مادّی ارتقا کے طوفان
نے ہمیں اسلامی تعلیمات سے دور کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ نوجوان دین
کا مطالعہ کریں اور کالجوں وغیرہ میں مذہبی تعلیم اور مساجد کی تعمیر کا اہتمام
رکھا جائے۔ انھوں نے مرکزی وقف کمیٹی کی ایک اسکیم کا نہایت
پُر امید لہجے میں ذکر کیا جس کے تحت دینی مدارس سے فارغ طلبہ کو سائنس،
اور تاریخ وغیرہ سے اور گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو دینی علوم سے
روشناس کیا جائے گا۔

(باقی اگلے شمارہ میں پڑھیے)

---

[1] موصوف کے نزدیک تعلیم اگر وہی تعلیم ہے جو کالج اور یونی ورسٹیوں میں ہو تو اور بات ہے ورنہ یہ اعداد و شمار صحیح نہیں۔ جن گھرانوں میں لڑکے پڑھائے جاتے ہیں اکثر لڑکیوں کو
بھی پڑھایا جاتا ہے البتہ لڑکیوں کی تعلیم عموماً دینی اور ابتدائی ہوتی ہے۔

[2] صدرِ محترم کا استعارہ بے محل ہے۔ مرد عورت دونوں کے تعاون کے معنی یہ نہیں کہ سارے ہاتھ ایک ہی کام میں لگ جائیں۔ جو کام ایک کے کرنے کا ہے
اس میں اگر دو لگ جائیں تو ایک کی صلاحیت ضائع ہوتی ہے اور کام بھی بگڑتا ہے۔ اسلام کی نظر میں عورتوں کے فرائض و وظائف دوسرے ہیں۔ افسوس کہ اس قسم کے خطیبانہ جملوں سے
کلام میں زور پیدا کیا جاتا ہے اور یہی لوگوں کے لیے دلیل گمراہی بن جاتے ہیں۔

منوج بسو
ترجمہ: ڈاکٹر شکنتیا جوہری

بنگلہ کہانی

بحث

ہیرالال اور چارو شیلا کی آج سے چالیس سال قبل شادی ہوئی تھی — شادی کی پہلی رات تھی، ساری لڑکیاں چلی گئی تھیں اور میاں بیوی صرف دو ہی رہ گئے تھے۔

کمرے میں بیوی بجائی ہوئی ایک کونے میں سکڑی ہوئی بیٹھی تھی، ہیرالال بھی بہت کوشش کرنے کے باوجود اس سے بات نہیں کر سکے — پلنگ کے نیچے ذرا سی آہٹ ہوئی "یہ کیا؟" کہہ کر ہیرالال پلنگ کے نیچے اتر کر دیکھنے لگے۔ بلّی گھس گئی تھی، کھڑکی سے باہر نکل کر بھاگ گئی — ہیرالال ہنس کر بولے:

"بلّا تھا، میں سمجھا کوئی لڑکی چھپی بیٹھی ہے۔"

بیوی پہلی بار بولی "بلّا نہیں بلّی تھی۔"

ہیرالال کہنے لگے "ایک کالا سا بلّا روزانہ گھر میں آتا ہے۔"

چارو شیلا بولی "کالی نہیں سفید رنگ کی بلّی تھی۔"

ہیرالال تھے بڑے ضدی، زور سے کہنے لگے "نہیں کالا تھا، میں نے صاف دیکھا ہے۔"

چارو شیلا نے بھی اپنی آواز اونچی کی اور کہنے لگی "سفید تھی، میں نے بھی اپنی آنکھوں سے برابر دیکھا ہے۔"

"نہیں کالا تھا کالا........"

"نہیں جی سفید تھی سفید........"

"نہیں کالا تھا، کالا تھا کالا......"

"سفید تھی، سفید تھی، سفید تھی، سفید......"

لڑکیاں گھر کے اندر نہیں تھیں بلکہ باہر کھڑکی سے کان لگائے بیٹھی تھیں، کہنے لگیں "یہ پیار و محبت کی باتیں کیسی ہیں؟"

"انھیں شاید پتا چل گیا ہے کہ ہم یہاں ہیں۔"

"ہم جب تک یہاں ٹھہریں گے تب تک بلّی ہی کی باتیں چلتی رہیں گی، دھت تیری کی!"

ساری رات وہی کالے سفید کی بحث چلتی رہی، بلّی بھاگ گئی تھی، اس لیے فیصلہ ہو نہیں سکا۔

چالیس سال پہلے ۱۹۳۰ کی سہاگ رات کی یہ داستان تھی۔

پچھلے سال ہیرالال اور چارو شیلا دونوں "گنگا سمندر" کی سیر کو جا رہے تھے۔ شروع میں بس کا سفر تھا اور بعد میں ناؤ کا — لوگوں کی کافی بھیڑ تھی، کنارے پہ ہر طرف کشتیاں لگی ہوئی تھیں اور ہر کوئی ناؤ میں پہلے چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ جگہ نہ پانے کی وجہ سے کنارے ہی پر رک گئے، مگر یہ میاں بیوی ناؤ میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ناؤ نالے سے سمندر میں جا پہنچی، ہوا تیزی سے چلنے لگی اور سمندر میں طوفانی شور بلند ہوا۔ ہیرالال ہائے ہائے کر کے چلّائے "میں لٹ گیا، میری جیب کٹ گئی، میرا بٹوا کوئی لے گیا۔" کٹی ہوئی جیب اوپر اٹھا کر کہنے لگے "دھاردار چھری سے کٹی ہے، معلوم بھی نہ ہوا۔"

سب نے دیکھا، چارو شیلا نے بھی دیکھا، وہ جھٹ سے کھڑی

ہوگئی اور کہنے لگی :

" چھری کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو، معلوم ہو ہی جاتا ہے، جیب بلیڈ سے کٹی ہے۔" ہیرالال کہنے لگے : "بلیڈ سے کبھی نہیں۔ ایسی ایسی چھریاں آتی ہیں کہ جیب تو کیا گلا کاٹنے پر بھی پتا نہ چلے۔"

چاروشیلا درمیان میں بول اٹھی " ارے بلیڈ ہی سے کٹی ہے، صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔"

" نہیں، چھری سے ......!"

ہیرا اور چاروشیلا کو کشتی میں جگہ پاس پاس نہ ملی تھی، درمیان میں پانچ سات لوگوں کا فاصلہ تھا، لوگوں کو بھی مزا آگیا۔ کہنے لگے " دونوں کو قریب جانے دو، خوب جم جائے گی، منہ سے اگر نہ نپٹی تو ہاتھ چلے گا۔"

لوگوں نے ان دونوں کو ایک ساتھ بیٹھنے کے لیے جگہ بنادی اور آن کی آن میں محشر بپا ہوگیا۔

میاں کہنے لگے " چھری ......"

بیوی کہنے لگی " نہیں بلیڈ ......"

بیوی فوراً ہیرالال کے پاس جا پہنچی۔ ناؤ زور سے ڈولنے لگی۔ چاروشیلا اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور دھڑ سے سمندر میں وہیں جا گری جہاں پانی کا زور تھا۔

" ڈوب گئی ڈوب گئی۔" ہنگامہ برپا ہوگیا۔

جتنی بھی کشتیاں جارہی تھیں سب نے اپنے رُخ بدل دیئے اور تیزی سے اس طرف بڑھنے لگیں۔ پانی میں چاروشیلا جان کی بازی لگاکر تیرنے لگی اور بیچ بیچ میں کہتی " نہیں بلیڈ سے۔"

بیچاری ہانپنے لگی، زیادہ بولنے کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔

ہیرالال چونکہ ناؤ میں تھے اس لئے انھیں زیادہ سہولت تھی " بچاؤ بچاؤ " کہتے اور بیچ بیچ میں کہتے تھے " نہیں چھری سے ......"

ہاتھ کو چھری جیسے ہلاتے اور اشارہ سے چھری چلانا بتاتے تھے۔

تھکی ہاری چاروشیلا پانی میں ڈبکیاں لینے لگی اور ڈوبتے ہوئے بیچ بیچ میں جی جان سے کوشش کر کے سر اُٹھا کے اوپر آ کے کہتی تھی " نہیں بلیڈ سے ......"

ساتھ ہی ساتھ ہیرالال بھی ناؤ میں سے زور زور سے چلاّتے " نہیں چھری سے ......"

اس کے بعد بیوی کی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ میاں مارے خوشی کے چلاّنے لگے :

" رک کیوں گئی ؟ ہار قبول کرتی ہو یا نہیں ؟"

لوگوں نے پانی میں جھک کر بے ہوش چارو کو کشتی میں اٹھالیا لیکن نہیں وہ ہاری نہیں تھی۔ انگوٹھے اور پہلی انگلی کو بلیڈ کے ڈھنگ سے جوڑے ہوئے تھی، اگر بول نہیں سکتی تھی تو انگلی سے دکھا تو سکتی تھی۔

بیگم ثریا سلیم

غزل

ہے جو تخئیل کے اجزائے پریشاں کی تلاش
رنگ لائے گی مرے دیدۂ حیراں کی تلاش

آدمیت کا یہ فقدان، خدا خیر کرے
آج انساں کو زمانے میں ہے انساں کی تلاش

یہ اندھیرے، یہ دھندلکے، یہ حوادث کے ہجوم
حشر تک کرتے رہیں گے دلِ انساں کی تلاش

چند معصوم، دھڑکتے ہوئے سینے لے کر
کر رہے ہیں کسی خورشیدِ درخشاں کی تلاش

ہم تھے گلشن میں تو ہوتا تھا نشیمن کا طواف
برق کرتی نہیں اب کیوں درِ زنداں کی تلاش

اس گلستاں میں ثریاؔ یہ فسردہ غنچے
کیا کریں اور یوں ہی وسعتِ داماں کی تلاش

محشر بدایونی

غزل

فکر بُری اک پل کی
آج کی ہو یا کل کی

برکھا رُت کی یادیں
بوندیں ہلکی ہلکی

جام کسی کا ٹوٹا
آنکھ ہماری چھلکی

کیا ابرو کیا مژگاں
سب راہیں مقتل کی

جب دیکھیں وہ آنکھیں
سوجھی راہ غزل کی

ہجر اور اب تک محشرؔ
شاید بھول اجل کی

مظہر عابدی

غزل

تجھ سے جب زندگی دُور تر ہو گئی
آرزو اور بھی معتبر ہو گئی

مل گئیں یادِ ماضی کی تابانیاں
آج تکمیلِ زادِ سفر ہو گئی

سُن رہی تھی توجہ سے دنیا مگر
داستاں خود بہ خود مختصر ہو گئی

فائدہ کیا جو ہو زیست بے تمکنت
یوں تو ہر آدمی کی بسر ہو گئی

کچھ تو مظہرؔ مروت برتنی پڑے
مجھ پہ اُن کی توجہ اگر ہو گئی

یعقوب راہی

(ایک رپورتاژ)

شہاب جعفری سے نئی شاعری تک

شاہد علی خاں مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر بن کر دہلی پہنچ چکے ہیں لیکن آج بھی بمبئی کے کچھ ادیب اور کچھ ادب نواز، سنیچر کی شام کو مکتبہ جامعہ بمبئی کے دفتر میں جمع ہوتے ہیں۔ شہاب جعفری بمبئی آئے ہیں۔ ادبی حلقوں میں ان کے آنے کی خبر پہنچ چکی ہے۔ ایک سنیچر کو میں حسب معمول شام کے چھ بجنے کے قریب مکتبہ جامعہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ محافظ حیدر کے ساتھ گجرات ریسٹورنٹ میں شہاب جعفری بیٹھے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد گجرات ریسٹورنٹ میں جاتا ہوں۔ محافظ حیدر کے پاس کوئی صاحب بیٹھے ہیں۔ متوسط قد، سانولا رنگ، گول چہرہ، کھلی پیشانی۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی چمک رہی ہے۔ انھیں دیکھ کر چالیس سال عمر کا اندازہ ہو رہا ہے۔ چہرے سے معصومیت ٹپک رہی ہے۔ لباس اور رنگ و روپ سے سورج کی تیز دھوپ کا اثر جھلک رہا ہے۔ محافظ حیدر میرا تعارف کرا رہے ہیں۔ میں شہاب جعفری سے پہلی مرتبہ مل رہا ہوں۔ میں ان کے لیے تقریباً نیا ہوں لیکن میرے لیے وہ جانے پہچانے اور کچھ "پرانے" سے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں شہاب جعفری کا شعری مجموعہ "سورج کا شہر" چھپا ہے۔ میں اس کو پڑھ چکا ہوں۔ اس کے گرد پوش پر ان کی تصویر بھی دیکھ چکا ہوں۔ شہاب کو دیکھ کر وہ تصویر پھر نظروں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ وہ تصویر ایک جامد لمحے کا عکس ہے اور سامنے بیٹھا ہوا شہاب متحرک فکر و ذہن کا ترجمان ہے۔

محافظ حیدر کے ساتھ کچھ اور نئے چہرے بھی ہیں۔ تع[arف] ہونے پر معلوم ہوا کہ ایک علی ظہیر صاحب ہیں اور دوسرے ع[...] ("کاسۂ روح" کے مصنف) دونوں شاعر ہیں اور ان کا تعلق مخدوم محی الدین کے حیدرآباد سے ہے۔ علی اور علی ظہیر کی فرمائش پر محافظ حیدر اپنی دو پرانی نظمیں سنا رہے ہیں۔ پھر شہاب جعف[ری] اپنی ایک نظم سنانے لگے ہیں۔ ندا فاضلی ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔ شہاب نے اپنی نظم پڑھنا بند کر دیا ہے۔ ندا اور شہاب ایک دوسرے سے خیریت پوچھ رہے ہیں۔ ندا شہاب سے اپنی نظم دوبارہ سنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ شہاب اپنی نظم سنا چکے ہیں۔ مجھے کسی ریسٹورنٹ میں یا سرِ راہ کوئی شعر سنانا پسند نہیں ہے۔ میں اسے شعر کی توہین سمجھتا ہوں۔ شعر کو سننے اور سنانے کے لیے ایک شعری یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی یکسوئی راستے کی بھیڑ میں اور ریسٹورنٹ کے شور و غل میں میسر نہیں ہوتی۔ خیر! فضیل جعفری، محمود چھابرا، انور زکریا تشریف آچکے ہیں۔ باقر مہدی کا انتظار ہو رہا ہے۔ فضیل جعفری کہہ رہے ہیں کہ شہاب کے اعزاز میں ایک نشست ہونی چاہیے۔ ندا فاضلی اور دیگر احباب بھی یہی چاہتے ہیں۔ آخرکار یہ طے پایا کہ محمود چھابرا کے یہاں آئندہ اتوار کی شام کے ساڑھے پانچ بجے ایک نشست ہوگی جس میں باقر مہدی، شہاب جعفری کے بارے میں تعارفی تقریر کریں گے۔ شہاب اپنے شعری نظریے پر روشنی ڈالیں گے اور

اپنا کچھ کلام سنائیں گے۔

اتوار کی شام کے ساڑھے پانچ بجے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ باندرہ پہنچ گیا ہوں۔ محمود چھاپرا باندرہ ہی میں مقیم ہیں۔ وہ خود نہ ادیب ہیں نہ شاعر لیکن بمبئی کے ادبی حلقوں میں ادب نواز اور ادبی کارکن کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ سائی پشپ - SAI) (PUSPA کے دوسرے منزلے پر موصوف کا دولت کدہ ہے۔ ہم سائی پشپ میں جانے کے لیے مڑ رہے ہیں۔ دور سڑک پر علی اور علی ظہیر دکھائی دے رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ محمود چھاپرا کے دولت کدہ کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ شہر میں نئے نئے وارد جو ٹھہرے۔ ہاں! بمبئی جیسے شہر میں دوست احباب اور ان کے مکانات بڑی مشکل سے ملتے ہیں اور یہاں لوگ اکثر و بیشتر "بھٹک" اور "بہک" جاتے ہیں۔ میں علی اور علی ظہیر کو آواز دے کر اپنی طرف بلا رہا ہوں ہم لوگ سائی پشپ کے دوسرے منزلے پر پہنچ چکے ہیں۔ سامنے کے کھلے کمرے میں محمود چھاپرا دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم کمرے میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ بیگم محمود چھاپرا، باقر مہدی، فضیل جعفری، ندا فاضلی، اشتیاق محمد خان (سپرنٹنڈنٹ جعفر سلیمان ہوسٹل بمبئی) اور خمار قریشی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ندا فاضلی حسب دستور لطیفے سنا رہے ہیں۔ باقر مہدی اور دیگر حضرات اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کمرے میں گاہے گاہے باقر کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ ندا فاضلی بس بولے ہی جا رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں خمار قریشی ندا سے بولنے کا حق چھین رہے ہیں۔ فضیل، اشتیاق خان اور دوسروں کے چہروں میں مسکراہٹیں اُبھر اُبھر کر بکھر رہی ہیں۔ محمود چھاپرا کو اب یاد آیا ہے کہ جاں نثار اختر کو لے آنا ہے۔ وہ انھیں لانے جا چکے ہیں۔ شہاب جعفری بہت ہی تاخیر سے آ رہے ہیں۔ حاضرین کو سلام کر رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی ابھی چھاپرا کے ساتھ جاں نثار اختر اور یوسف ناظم تشریف فرما ہو رہے ہیں تصدیق سہاوری جتندر بلو، احمد سوز، زکریا شریف اور کچھ دیگر حضرات بھی آ گئے ہیں چائے کا انتظام ہو رہا ہے۔ کچھ میٹھے اور کچھ نمکین بسکٹ کھائے جا رہے ہیں۔ چائے پی جا رہی ہے۔ نشست کی صدارت کے لیے یوسف ناظم کا نام پیش کیا جا رہا ہے۔ یوسف ناظم صدارتی تقریر میں کہہ رہے ہیں کہ ہم نے یہ جلسہ کم وقت میں منعقد کیا ہے، اور اسی لیے حاضرین کی بہت بڑی تعداد نہیں ہے۔ یوسف ناظم باقر مہدی سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ شہاب جعفری کا تعارف کرائیں۔

باقر مہدی کہہ رہے ہیں کہ ہم آج دوستانہ ماحول میں کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں شہاب جعفری کو ۱۷/۱۸ سال سے جانتا ہوں۔ میں شروع میں انھیں وقار کہتا تھا۔ وقار شہاب جعفری کا اصلی نام ہے۔ وہ گذشتہ ۱۷/۱۸ سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ وہ میرے ہم عصر ہیں۔ میرے ہم عصروں میں قاضی سلیم اور خلیل الرحمٰن اعظمی بھی شامل ہیں۔ ہم تینوں کے مقابلے میں شہاب جعفری بہت بعد میں جدید ادبی رجحانات اور تحریکات سے متاثر ہوئے۔ ہم لوگوں کی ابتدائی شاعری میں جن ترقی پسند شاعروں کے اثرات جھلکتے ہیں ان میں مجاز، فیض اور سردار جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن ہم لوگ بہت جلد ان شاعروں کے اثرات سے بچنے لگے اور جدید ادبی رجحانات کی طرف متوجہ ہوئے۔ ویسے پچھلے کچھ برسوں سے پرانے ترقی پسند شاعر بھی جدید رجحانات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ جاں نثار اختر کی تازہ غزلوں میں اس تبدیلی کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ شہاب جعفری کا شعری مجموعہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۱ء تک کا شعری سرمایہ شامل ہے۔ شہاب کو اپنا شعری مجموعہ بہت پہلے شائع کروانا چاہئے تھا۔ "سورج کا شہر" میں بہت ہی کم نظمیں اچھی ہیں۔ ویسے صرف اچھے کلام پر تنقید ہوتی ہے خراب غزلوں یا نظموں کو سامنے رکھ کر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ کلیات میر میں ۳/۴ حصہ اشعار خراب ہیں۔ مگر میر کی استادی اور شاعرانہ اہمیت صرف باقی ۱/۴ حصہ ہی پر مشتمل ہے۔ شہاب کو وزیر آغا کا مقدمہ عجیب حقی

کا خط اور کسی ممتاز کے نام لکھے ہوئے خطوط اپنے شعری مجموعے میں شائع
نہیں کرنا چاہیے تھے۔ وہ ادب لطیف قسم کی چیزیں ہیں جن سے جعفری
کو سمجھنے میں مدد نہیں ملتی۔ میرے ہم عصروں میں شہاب کی سب سے
نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھیں ہم سب سے زیادہ
زبان و بیان پر عبور حاصل ہے۔ ان کے یہاں ڈھونڈنے سے بھی کوئی
فنی غلطی نہیں ملتی۔ شہاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ شہاب نے مختلف
اصنافِ سخن میں مشق کی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔
گیت بھی لکھے ہیں اور منظوم ڈرامے بھی قلمبند کیے ہیں۔ شہاب کی تیسری
بڑی خوبی یہ ہے کہ شہاب نے خوبی سے ہندوستان کی Mythology
سے استفادہ کیا۔ انھوں نے سورج کو مختلف معنوں میں استعمال
کیا ہے ——— ان کے
یہاں سورج کہیں روشنی کا سمبل ہے کہیں زوال کا اشاریہ ہے اور
کہیں انا کی علامت۔ مجھے شہاب جعفری کے شعری مجموعے میں دو نظمیں
بہت پسند آئی ہیں۔ "سورج کا زوال" اور "شہر انا"۔ اس مختصر سی تقریر
کے بعد باقر نے شہاب جعفری سے درخواست کی کہ وہ اپنا شعری
نظریہ پیش کریں اور آخر میں اپنا کچھ کلام سنائیں۔

شہاب جعفری اپنے اعزاز میں منعقد کی ہوئی نشست کے
لیے شکریہ ادا کر رہے ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ میں تقریر کا آدمی نہیں
ہوں پھر بھی اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنی شاعری کے پس منظر کی تشکیل
میں جن نظریات کا اثر رہا ہے اُن کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔
باقر مہدی کی باتوں سے کچھ چیزیں ذہن میں آئی ہیں اور میں اپنے دیباچے
میں بھی ذکر کر چکا ہوں کہ میری شاعری کی عمر میں مختلف قسم کے خیالات
آتے اور جاتے رہے ہیں۔ ترقی پسند ادب کا آخری دور، اس کے
زوال کا زمانہ، ادبی جمود، میر کے لب و لہجے کا احیا، میراجی کے اثرات
اور جدیدیت — لیکن میں نے کبھی بہتی ہوئی ہوا کے ساتھ چلنے کی
کوشش نہیں کی۔ کسی فیشن کی گرم بازاری سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوا۔
مجھے کسی چیز کی تقلید پسند نہیں۔ میں فن کے لیے sincerity کو
پسند کرتا ہوں۔ ہاں اپنے ذہن کی کھڑکیاں ضرور کھلی رکھتا ہوں۔ میں نے
ترقی پسندی کے عہدِ زوال میں آنکھ کھولی ہے۔ ترقی پسند شاعری کا ۱۹۴۹ء
کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔ پہلے ترقی پسندوں کے سامنے آزادی کا
نصب العین تھا۔ لیکن آزادی کے بعد کوئی واضح نصب العین نہیں
رہا — بیچ میں ہی باقر مہدی، ندا فاضلی، فضیل جعفری، یعقوب راہی
اور دوسرے احباب شہاب کو ٹوک رہے ہیں۔ ان کی نظر میں
ترقی پسندی کا زوال ۱۹۵۶ء سے شروع ہوتا ہے ۱۹۴۹ء سے نہیں۔
۱۹۴۹ء کے بعد بھی سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شاعر اپنے
فکر و فن کی تازگی کا ثبوت دیتے رہے۔ سردار کی "پتھر کی دیوار"، مجروح
کی "غزل"۔ فیض کے "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" ۱۹۴۹ء کے بعد
کی پیداوار ہیں۔ شہاب جعفری اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہہ رہے
ہیں کہ اس زمانے میں ایک قسم کا بحران (crisis) شروع ہو چکا
تھا۔ ۱۹۵۶ء/۱۹۵۷ء میں ترقی پسند شاعری پر مختلف رسالوں
میں بحثیں ہو رہی تھیں۔ میں نے بھی اس سلسلے میں مضامین لکھے
ہیں۔ جدید رجحانات کے لیے یہ ایک طرح کا MAKING PERIOD
تھا۔ رفتہ رفتہ پانچ چھے سال میں یہ معلوم ہوا کہ ترقی پسندی کا پرانا
CONCEPT وقت کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ پاکستان میں
جدیدیت کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں سوغات (بنگلور) کے
ذریعے جدید رجحانات فروغ پانے لگے۔ رسالہ "تحریک" اور اس کے
بعد "شب خون" جدید میلانات کی نمائندگی کرنے لگے۔ ترقی پسندی
کی مخالفت ہونے لگی۔ اس سے ایک خلفشار پیدا ہوا۔ فرد اور سماج کا
تعلق زیرِ بحث آنے لگا۔ جدید ادیبوں اور شاعروں نے سماج سے
رشتہ توڑ لیا۔ میں جدیدیت کے اس رُخ کا مخالف ہوں اور ترقی پسندوں
کے پارٹی لائن کے پروپیگنڈے کا بھی مخالف ہوں۔ میں نظریاتی اعتبار
سے بائیں بازو کا آدمی ہوں۔ جدیدیت اور NON-COMMITMENT

کے نام پر جماعت اسلامی اور دیگر نظریات کا جو پروپیگنڈا ہونے لگا ہے، اُس کی بھی میں مخالفت کرتا ہوں۔ کوئی بھی ادیب کسی بھی نظریہ کا حامی ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس نظریے کا پروپیگنڈا کرتا پھرے۔ میں ضرور مارکسزم کا ماننے والا ہوں۔ میری نظر میں فنکار کا فن سب سے اہم بات ہے۔ اقبال، دانتے اور تُلسی داس کے یہاں اپنے اپنے نظریات ہیں لیکن ان کی کامیابی اور عظمت اسی میں ہے کہ اُن کی تخلیقات میں افقی چابکدستی ہے نہ اُن کے فن پر نظریہ حاوی نہیں۔ بلکہ اُن شاعروں اور ادیبوں نے اپنے نظریے کو اپنے فن کی گرفت میں رکھا ہے۔

ترقی پسند شاعروں اور اختر الایمان سے قطع نظر اس وقت ہمارے سامنے شاعروں کی دو نسلیں ہیں۔ ایک نسل کی نمایندگی باقر مہدی، قاضی سلیم، خلیل الرحمان اور میں کر رہا ہوں اور دوسری نسل کی نمایندگی 'شب خون' اور تحریک کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ پہلی نسل نے ترقی پسندی کا زمانہ دیکھا ہے اور دوسری نسل نے موجودہ بحران کے ادب کو دیکھا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے بھی دونوں الگ ہیں۔ ایک نسل اشتراکی نظریات سے متاثر ہے اور دوسری نسل ALIENATION اور CRISIS سے دوچار ہے۔ دونوں نسلوں میں CONFUSIONS ہیں لیکن ان کی نوعیت الگ ہے۔ نئے شاعروں میں تڑپ محسوس ہو رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ زندگی کیا ہے۔ ان کے لباس، رہنے سہنے کے ڈھنگ، معاشرہ سے برتاؤ غرض کہ ان کی ہر بات میں جھلاہٹ ہے۔ کسی کی جھلاہٹ میں خلوص بھی ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر کے یہاں رسالوں میں چھپنے اور تنقید کے مضامین میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش ہے۔ نئی نسل کو چاہیے کہ وہ زمانے سے ہم آہنگ ہو۔ وہ عصری بحران اور اس کے ذہن کو سمجھے۔ اس نسل کو زبان و بیان میں تبدیلی کرنے کی اجازت ضرور ہے لیکن یہ دیکھنا یہ ہے کہ نسل جس DISTORTED MAN کی تلاش کر رہی ہے، وہ اُسے یہ نسل پروجکٹ کر رہی ہے یا نہیں۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ نئی نسل کے فکر و ذہن سے کوئی نیا آدمی پروجکٹ نہیں ہو رہا ہے بلکہ وہی پُرانا CAVE MAN نکل رہا ہے۔ مجھے ماضی کی طرف واپسی پسند نہیں ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آج کے انسان کی اپچ کیا ہے؟ کیا ماضی پرستی ہی سب کچھ ہے؟ شہر میں رہ کر گاؤں کی طرف واپسی کا رجحان ماضی پرستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہماری نئی شاعری شکووں کی شاعری ہے۔ یہ سچ ہے کہ شہر میں انسان کی بے توری ہو رہی ہے۔ ہم نے جن قدروں کو اپنے گاؤں کے ماحول میں سیکھا ہے اور اپنے آبا و اجداد کی زبانی سُنا ہے، محبت، مروّت، وفا شعاری، قربانی کی وہ قدریں ٹوٹ رہی ہیں۔ لیکن کیا ہم صنعتی شہر اور مشینی زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے؟ کیا ہم نئی اقدار کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ جدیدیت کو میں صرف بحران ہی پیدا کرنا نہیں سمجھتا۔

باقر مہدی بیچ ہی میں پوچھ رہے ہیں: ANARCHISM اور CHAOS ضروری ہے کہ نہیں؟ شہاب کہہ رہے ہیں کہ ہاں میں انارکی کا قائل ہوں۔ کسی ایک حصار میں بیٹھنا مجھے بھی پسند نہیں لیکن میں اس بحران اور انارکی کے اظہار کے لیے ترسیل کے الیے کو پسند نہیں کرتا۔ کبھی کبھی اشاروں اور کنایوں میں کہنے کا موقع آتا ہے۔ لیکن جان بوجھ کر مہمل گوئی کا میں مخالف ہوں۔ یہ سب کچھ SHOCK TREATMENT کے لیے ٹھیک ہے۔

شہاب جعفری نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ ندا فاضلی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ (شہاب جعفری) کی تقریر غور سے سُن رہا تھا۔ آپ نے نئی شاعری سے بحث کرتے ہوئے جو قطعیت کا لہجہ اپنایا ہے، یہ سب سُنی سُنائی باتوں کا اثر ہے۔ آپ نے تعمیمی انداز میں زیادہ باتیں کیں کوئی مثال پیش نہیں کی۔ آپ نے دو نسلوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ نسل جس نے ترقی پسندی کے اثرات میں پرورش پائی

ہے اور دوسری وہ نسل جو پچھلے چند برسوں میں اُبھری ہے۔ آپ نے پوری بحث میں اپنی باتوں کو سیاسی نظریات پر پھیلایا ہے۔ اور آپ نے دوسری نسل پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ غالباً اس نسل کے شاعروں کو ANTI-MARXIST سمجھ کر کیے ہیں۔ بہت سے نئے شاعر ایسے ہیں جو ANTI-MARXIST نہیں اور نہ ہی یہ نئی شاعری کی پہچان ہے ــ میرے خیال میں ادبی نسلوں کا بٹوارا برسوں میں نہیں ہو سکتا کیونکہ پچھلے دو سال میں کچھ ایسے شاعر پیدا ہو رہے ہیں جو پچھلی دو نسلوں سے الگ معلوم ہوتے ہیں، اور اس طرح ایک تیسری نسل پیدا ہو گئی ہے۔ میں اس نسل میں علی کی مثال پیش کرتا ہوں۔ ان کا نثری نظموں کا ایک مجموعہ "کاسۂ روح" پچھلے سال چھپ گیا ہے۔ ندا فاضلی شہاب سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ اس طرح کی نثری نظمیں لکھنے والوں کو کس نسل میں شمار کریں گے؟ شاعری کو نسل اور برسوں کے پیمانے پر جانچنے کا طریقہ غلط ہے آپ نے جدیدیت پر بحث نہیں کی ہے۔ جدید ادب کی پہچان کا جو تجرباتی رویہ ہے اور جس طرح سے اس کی نشو و نما ہو رہی ہے اُس پر آپ روشنی نہیں ڈال سکے ہیں۔ جدید (نئی) شاعری INVOLVEMENT کی شاعری ہے۔ اس میں انفرادی تجربے کی صداقت سے الفاظ میں برقیت جاگتی ہے۔ کسی ادب کو سیاسی نظریے کے پیمانے پر جانچنا غلط ہے۔ ہر ادب جمالیاتی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ ہر نیا ذہن اپنے اظہار کے لیے نیا لسانی ڈھانچا تلاش کرتا ہے۔ اس لیے اس کے یہاں الفاظ کی سطح مختلف ہوتی ہے۔ شاعری میں الفاظ اپنے لغوی معنی کھو دیتے ہیں۔ وہ اپنے پس منظر میں نئے معنی رکھتے ہیں۔" میں سوچ رہا ہوں جدید ادیبوں کے سامنے ندا کتنی سطحی بات کر رہے ہیں۔ وہ آگے فرما رہے ہیں کہ کمار پاشی کے یہاں جو ماضی پرستی ہے اور جو دیومالائی الفاظ آئے ہیں وہ لغوی معنی نہیں رکھتے بلکہ ان کے ذریعہ کمار پاشی عصری حسیت کے اظہار کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف آپ (شہاب جعفری، خلیل الرحمان اعظمی اور آج کے دیگر حاضرین) لب و لہجے کی کلاسیکیت کے شکار رہے ہیں۔" شہاب کے چہرے پر سرخی اُبھر آتی ہے۔ وہ ندا سے کہہ رہے ہیں "مجھے اس کا علم ہے کہ شاعری میں الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ میں ہوں یا آپ شعر کہنے والا ہر شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ الفاظ کی سطح مختلف ہوتی ہے۔" شہاب اور ندا ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھا رہے ہیں۔

فضیل جعفری کہہ رہے ہیں کہ MOST REACTIONARY اور MOST PROGRESSIVE دونوں قسم کے رجحانات ادب کے لیے نقصان دہ ہیں۔ شعر و ادب میں ردّ و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فضیل ندا کو سمجھا رہے ہیں کہ شہاب نئی شاعری سے غیر مطمئن نہیں ہیں۔ وہ صرف نظریاتی سطح پر اختلاف رکھتے ہیں شہاب جعفری اور باقر مہدی نے اپنے ہم عصروں کا ذکر کرتے ہوئے خلیل الرحمان اعظمی کا ذکر کیا تھا۔ فضیل کہہ رہے ہیں کہ میں نئے شاعروں کے ساتھ خلیل الرحمان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔ اُنھیں وہی لوگ نیا شاعر سمجھتے ہیں جو حلقۂ علی گڑھ میں شامل ہیں۔ شہاب جعفری نے کہا تھا کہ نئے شاعر CAVE MAN کی تلاش کر رہے ہیں۔ فضیل جعفری فرما رہے ہیں کہ شہاب نے غالباً کمار پاشی کے کلام کو سامنے رکھ کر نئی شاعری پر الزام لگایا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ اگر شہاب کسی ایک شاعر کو سامنے رکھ کر نئی شاعری کے بارے میں کوئی ایک رائے قائم نہ کریں۔ یعقوب راہی یاد دلا رہے ہیں کہ خود شہاب کی شاعری میں وزیر آغا نے ماضی پرستی، اور ہندوستان کی MYTHOLOGY کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ شہاب جعفری کے ایک دوسرے اعتراض کے جواب میں فضیل کہہ رہے ہیں کہ گاؤں اور صنعتی شہر کی اقدار میں جو CLASH ہے وہ فطری چیز ہے۔ اور یہ CLASH صرف بمبئی جیسے شہروں کے

شاعروں مثلاً باقر مہدی اور ندا فاضلی ہی کے یہاں موجود نہیں ہے۔
ترقی پسند تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے فضیل کہہ رہے ہیں ترقی پسندوں
نے مارکسزم کو بنیادی طور پر سمجھا ہی نہ تھا، اور ان کا کوئی نظریاتی
معیار بھی نہ تھا۔ ایک زمانہ یہ تھا کہ یہ لوگ نہرو کو گالیاں دیا کرتے
تھے لیکن بعد میں نہ صرف نہرو کی تعریف کرنے لگے بلکہ پدم بھوشن
اور پدم شری جیسے سرکاری خطابات کو اپنا نصب العین بنانے لگے،
اور آج بمبئی میں معمولی کانگریسی وزیر کی تعریف کرکے خراج تحسین وصول
کر رہے ہیں۔ فضیل جعفری کہہ رہے ہیں کہ نئی شاعری صرف گلے
شکوے کی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اس میں موجودہ بحران کا تذکرہ بھی
ہے۔ یہ بحران ہمارے یہاں متوسط طبقے میں ہے اور جدید شاعری
کا ایک موضوع بحران بھی ہے۔ میں ہر شاعری کی طرح موجودہ شاعری کو
بھی فنی بنیاد پر جانچنے کا حامی ہوں۔ میں موجودہ شاعری کو اس لیے
نئی شاعری کہتا ہوں کہ اس سے پہلے اس قسم کی شاعری نہیں ہوتی
اور نہ ہو سکتی تھی۔

فضیل جعفری سے اتفاق کرتے ہوئے یعقوب راہی
کہہ رہے ہیں کہ خلیل الرحمان اعظمی کے یہاں ان کے ہم عصر شاعروں
باقر مہدی اور قاضی سلیم کی طرح فکری و فنی ارتقا کی منزلیں نہیں
ملتیں اور نہ ہی ان کے یہاں آج کی زندگی سے کوئی ذہنی رشتہ ملتا ہے۔
خلیل الرحمان کی غزلیں کتابی ذہن اور مستعار جدیدیت سے مملو ہیں
اور ان کی نظموں پر بھی فرسودگی کی گہری چھاپ ہے۔ ادبی نسلوں کا
ذکر کرتے ہوئے یعقوب راہی کہہ رہے ہیں کہ ہاں! عمر کے اعتبار سے
شاعروں کو ادبی نسلوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ شہاب جعفری،
خلیل الرحمان، قاضی سلیم اور باقر مہدی ہم عمر اور ہم عصر سہی
لیکن آخر الذکر دو شاعر فکر و بیان کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں سے
مختلف ہیں۔ شروع میں وہ بھی اپنے ہم عصروں کی طرح ترقی پسند تحریک کے
اثر میں رہے لیکن آج نہ صرف وہ اپنے ابتدائی کلام کو رد کر چکے ہیں

بلکہ آج ان دونوں شاعروں کا انداز فکر و بیان عصری حسیت میں رچ بس
گیا ہے اور وہ موجودہ کرب و احساس کو اپنی انفرادیت میں گھول کر
پیش کر رہے ہیں۔ ایک کے یہاں SPIRITUALMAN کے نقوش
مل رہے ہیں اور دوسرے کے یہاں REVOLUTIONRY جنم لے رہا
ہے۔ یعقوب راہی کہہ رہے ہیں کہ میری نظروں میں نئی شاعری نہ صرف
بحران اور انتشار کی شاعری ہے بلکہ اس کی ایک اہم خصوصیت احتجاج
(PROTEST) بھی ہے۔ یہ احتجاج سماجی ناہمواریوں اور سیاسی بدعملیوں
کے خلاف بھی ہو سکتا ہے اور روایتی زبان و بیان کے خلاف بھی اور اس احتجاج
کی زبان انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی۔

بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ باقر بھی دوبارہ کچھ کہیں۔ باقر مہدی فرما
رہے ہیں کہ شہاب اگر اپنے شعوری نظریے تک اپنی تقریر کو محدود رکھتے تو نہ اور
دوسروں کو تنقید کرنے کا موقع نہ ملتا۔ میں سماج سے ALIENATION کو
برا نہیں سمجھتا۔ آج اگر شاعروں اور ادیبوں کا رشتہ سماج سے کٹا ہوا ہے تو کل وہ
جڑ بھی سکتا ہے کیونکہ سماج سے فنکار کا تعلق بنتا اور بگڑتا بھی ہے اور [illegible] بھی
ہے۔ نئی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔ آج کی شاعری پر سماج حاوی نہیں بلکہ آج کا
شاعر کے اندر سماج بکھرا پڑا ہے۔ میں جدید شاعری کو صرف نظریاتی اور [illegible]
یا محض جمالیاتی کسوٹی پر جانچنے کا قائل نہیں ہوں میں ان دونوں کا امتزاج چاہتا ہوں۔
باقر کا یہ جملہ سن کر میرے ذہن میں ندا فاضلی کا وہ جملہ آ رہا ہے کہ ہر ادب جمالیاتی کسوٹی پر
پرکھا جاتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ندا فاضلی کا نظریہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہر معیاری شعر
و ادب فکری اور فنی بنیادوں پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ باقر مہدی آخر میں فرما رہے ہیں کہ
جدید شاعری کے لیے جدید امیجری کی بے حد ضرورت ہے۔ آخر میں شہاب
جعفری کہہ رہے ہیں کہ میں فضیل اور باقر سے بڑی حد تک متفق ہوں میں موجودہ نسل کے
تجزیاتی ذہن، انفرادی تجربے کی صداقت اور اس کی جھلاہٹ کو سمجھتا ہوں اور کسی کو یہ
گمان نہ ہو کہ میں جدید شاعری کو CONDEMN کر رہا ہوں میں خود جدید رجحانات سے
متاثر ہوں اور اپنے آپ کو ذہنی اعتبار سے موجودہ نسل کے قریب پاتا ہوں۔ اس مختصر
جواب کے بعد شہاب نے اپنی ایک غزل اور کچھ نظمیں سنائیں، سوچ کا شہر، ٹھہرانا، سورج کا

حمید ارموری

جو پیام حیات بھی ہے اور پروانۂ موت بھی

سانپ کا زہر

" اگر آپ کے پاس سانپ ہے تو اُسے محفوظ رکھیے کیونکہ اس کا زہر سونے سے زیادہ قیمتی ہے ۔!؟ یہ ہیں وہ الفاظ جو بھارت کے ایک سرکردہ سائنسداں ڈاکٹر پی ۔جے ۔ دیور اس نے ایک مقالے میں کہے ہیں ۔ انھوں نے مزاحیہ انداز میں یہ ریمارک بھی کیا کہ " اگر کسی دن حکومت سانپ کے زہر پر کنٹرول کا آرڈر جاری کرے تو انھیں کوئی تعجب نہیں ہوگا ۔!! " کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے بموجب سرطان جیسے جان لیوا مہلک امراض کے علاج کے لیے سانپ کے زہر کا مطالبہ روز بروز بڑھتا جارہا ہے ۔!

زہر کی اس بڑھتی ہوئی مانگ کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ایک گرام سانپ کے زہر کی قیمت کوئی دو سو پچاس (۲۵۰) ہے یعنی سونے کی قیمت سے دس پندرہ گنا زیادہ ۔!!

بظاہر سانپ کا زہر ایک سفید یا زردی مائل رنگ کا سیّال ہوتا ہے لیکن اصل میں یہ ایک پیچیدہ حیاتیاتی مرکب ہے جس میں کوئی اسّی فیصد پانی ہوتا ہے ، باقی لحمیات (PROTIENS) خمیر (ENZYMES) اور تھوڑے بہت نامیاتی نمک ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ خون میں زہر کے خلاف عمل کرنے والے تریاق بھی شامل ہوتے ہیں ۔ زہر میں جو موثر اجزا (ACTIVE PRINCIPLES) پائے جاتے ہیں ان میں کچھ تو اعصاب کے لیے خطرناک ہوتے ہیں ۔۔ اور بعض قلب کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں ۔ بعض خون کو گاڑھا کرنے کا سبب بنتے ہیں تو بعض خون کو پتلا (رقیق) کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ بعض تنفّس دلانے والے مرکز کو تباہ کر کے عضلات کو مفلوج کردیتے ہیں ۔ کچھ جبڑوں میں تشنّج پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے منہ سے جھاگ نکلا کرتا ہے ۔ اور کچھ ٹانگوں اور جسم کی بوٹیوں میں سکڑاؤ پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں جس کے باعث جسم میں اینٹھن پیدا ہوتی ہے ۔ بعض دماغ پر اثر کر کے مریض پر غنودگی کے دورے لایا کرتے ہیں ۔

ان ہی حقائق کے پیش نظر سانپوں کے ماہرین نے زہر کی تقسیم اس طرح کی ہے : ایک گروہ وہ ہے جو رگوں اور نسوں میں زہریلا اثر پیدا کر کے انھیں بیکار کر دیتا ہے ۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو خون کو اپنے زہریلے پن سے تباہ کیا کرتا ہے ۔ خون کے ذرّوں کو تباہ کر کے خون کی نالیوں میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے ، جس سے انجمادِ خون پیدا ہونے لگتا ہے ۔ جب دل کی باریک اور نازک رگوں میں خون جمتا ہے تو قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے ۔ اول الذکر ناگ ، کریت اور سمندری سانپوں میں ہوتا ہے جب کہ موخر الذکر گروہ کا زہر رسل وائپر اور فورسا میں پایا جاتا ہے ۔

زہر کا ذخیرہ غدود کی تھیلی میں ہوتا ہے جو سانپ کے منہ کے اندرونی اوپری حصّے میں ہوتی ہے ۔ ان زہریلے غدود کی تھیلی میں زہر کی اتنی مقدار ہوتی ہے کہ سانپ یکے بعد دیگرے دس افراد کو بہ آسانی ڈس سکتا ہے اور ان میں اپنا زہر دوڑا سکتا ہے ۔

سانپ اپنا زہر ، تھیلی میں سے کس طرح انسان کے

جسم میں چھوڑتا ہے اس کو اس مثال سے اچھی طرح سمجھایا جا سکتا ہے:
فونٹین پن میں روشنائی بھرنے کے لیے ایک پچکاری ہوتی ہے، جس میں ایک شیشے کی نلی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر ایک ربر کا پمپ ہوتا ہے اسے ہم فلر کہتے ہیں۔ جب نلکی میں سیاہی کھینچ کر نلکی کو بھر لیا جاتا ہے تو قلم میں ڈالنے کے لیے ربر کے پمپ کو دبایا جاتا ہے۔ دبانے سے روشنائی نلکی میں سے گزر کر قلم میں چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح عضلات کے دباؤ کے تحت سانپ کا دانت جب جسم میں داخل ہوتا ہے تو زہر کی تھیلی ایک دم سکڑ کر کچھ زہر دانت کے کھوکھلے حصے میں گزارتا ہوا زخم میں ٹپکا دیتا ہے۔

مختلف سانپوں میں زہر کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر سانپ کی جسامت اور عمر پر ہوتا ہے۔ ہافکن انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں زہر کی مقدار کی جو اوسط کھیپ (AVERAGE YIELD) مقرر کی ہے وہ اس طرح ہے:

کوبرا ——— ۱۵۰ ملی گرام
رسل وائپر ——— ۱۰۰ ملی گرام
عام کریت ——— ۲۰ ملی گرام
فورسا ——— ۵؍۴ ملی گرام

جب سانپ کسی کو ڈستا ہے تو اپنے زہر کے ذخیرہ کی مندرجہ بالا مقدار کا صرف خفیف سا حصہ زخم میں داخل کرتا ہے۔ یہ حصہ کتنا ہوتا ہے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکا۔ البتہ یہ بات مشاہدہ کی گئی کہ جب کبھی ان سانپوں کا ڈسا ہوا کوئی مریض کسی ڈاکٹر کے پاس بہ غرض علاج لایا گیا تو زہر کے اثر کو زائل کرنے کے لیے تریاق (ANTIVENIN) کی کافی مقدار کا انجکشن لگانا پڑتا ہے۔

اگر ناگ کا زہر ایک قطرہ خون کی رگ (شریان) میں داخل داخل ہو جائے تو وہ دل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ زہر جتنی جلدی دل اور دماغ کو پہنچے گا مارگزیدہ اسی قدر جلدی راہیِ ملکِ عدم ہوگا۔ ناگ کا زہر بہت تیزی سے اثر کرتا ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ ناگ کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔

تاہم ایسا ہونا ہر دفعہ ضروری نہیں کیونکہ زہر کا اثر مختلف آدمیوں پر مختلف ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی سانپوں کے زہر کی سمیّت (VENOM TOXICITY) تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف مختلف قسم کے سانپوں میں بلکہ ایک ہی قسم کے ایک سانپ کے زہر کا اثر اسی قسم کے دوسرے سانپ کے زہر کے اثر سے جدا ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سمیّت پر موسم بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سانپ کی صحت، غذا اور ماحول میں تبدیلی آجائے تو اس کے زہر کے اثر میں بھی ان باتوں سے فرق پڑ جایا کرتا ہے۔

زہریلے سانپ کے کاٹنے سے عموماً دو زخم بنتے ہیں جن سے سُرخ رنگ کا مادّہ مستقل رِستا رہتا ہے۔ ڈسی ہوئی جگہ پر معمولی دانتوں کے علاوہ زہریلے دانتوں کے نشان نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ تو بے محل نہ ہوگا کہ زہریلے سانپ کے کاٹنے سے ایک دانت کا نشان کبھی نہیں بیٹھتا۔ ہر صورت میں دانت کے دو نشان بیٹھتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی ۵؍۲ سنٹی میٹر فاصلہ بھی ہوتا ہے۔

زہریلے اور غیر زہریلے سبھی سانپوں میں چھوٹے چھوٹے دانت ہوتے ہیں جو ہُک کی طرح اندر کی جانب مُڑے ہوتے ہیں۔ یہ دانت ٹھوس ہوتے ہیں۔ پُرانے اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کی جگہ ایک مہینے کے اندر نئے دانت نکل آتے ہیں۔ البتہ زہریلے دانتوں میں کاٹنے کے لیے دو دانت جن کو انگریزی زبان میں (FANG) کہا جاتا ہے زائد ہوتے ہیں۔ یہ دو دانت جو ہُک کی طرح مُڑے ہوتے ہیں دوسرے دانتوں کی بہ نسبت کافی بڑے ہوتے ہیں۔

ان دانتوں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ پچکاری (SYRINGE) کی طرح کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان کا تعلق زہر کی تھیلی سے ہوتا ہے۔

ہوں کہ ان دانتوں کے آخری سرے پر سوئی کی نوک برابر ایک سوراخ ہوتا ہے جس سے گزر کر جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے، زہر زخم میں داخل ہوتا ہے۔ یہ دانت بعض سانپوں میں سامنے ہوتے ہیں اور بعض میں پیچھے۔ البتہ وائپر سانپ کے دانت اس کے متحرک جبڑے میں ہوتے ہیں تاکہ سانپ منہ کھولے تو یہ آگے گردش کر سکیں۔

ان دانتوں کا زخم کچھ اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ جب تک سانپ اپنے سر کو ذرا سا ایک جانب ٹیڑھا نہ کرے تو اس وقت تک زہر زخم میں اچھی طرح داخل نہیں ہوتا، اس لیے سانپ کی یہ فطرت ہے کہ جیسے ہی وہ کسی کو ڈستا ہے ویسے ہی اپنے سر کو ذرا سا ایک جانب ترچھا کر دیتا ہے۔ یہ عمل اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ کاٹے ہوئے کو محسوس تک نہیں ہوتا۔

اگر سانپ اپنا زہر کسی جاندار کے جسم میں داخل کر دے تو جلد یا بدیر زہر کے اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مختلف سانپوں کے ڈسنے سے مختلف اثرات و علامات ظہور پذیر ہوتی ہیں، جن کو دیکھ کر کاٹنے والے سانپ کو پہچانا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ناگ کے ڈسنے سے ڈسی ہوئی جگہ پر درد نہیں ہوتا۔ البتہ ایک یا دو گھنٹے بعد اس جگہ سوجن آجاتی ہے۔ مریض کی پلکیں بوجھل اور نظر دھندلی ہونی شروع ہوتی ہے۔ جبڑا نچلیں کمزور ہونے لگتی ہیں، اور آہستہ آہستہ بے حس و حرکت ہو جاتی ہیں۔ زبان موٹی ہو جاتی ہے جس کے سبب بات چیت میں لکنت واقع ہوتی ہے۔ منہ سے جھاگ آنے لگتا ہے۔ مریض پر غنودگی کے دورے پڑتے ہیں۔ سانس لینے میں مشکل پیش آتی ہے۔ اگر بروقت علاج نہ ہو تو پانچ گھنٹے کے اندر تنفسی نظام مفلوج ہو جاتا ہے اور مریض فوت ہو جاتا ہے۔ ناگ کے کاٹے کی اہم تشخیصی علامت یہ ہے کہ اس کے زہر میں باقاعدگی ہوتی ہے۔

کریت کے کاٹنے سے ڈسی ہوئی جگہ ورم نہیں آتی اور ڈسنے کے کئی گھنٹوں بعد تک بھی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ پھر اچانک علامات نمودار ہونے لگتی ہیں۔ مریض کے پیٹ اور جوڑوں میں شدید قسم کا درد ہونے لگتا ہے۔ سانس لینے میں دقت ہوتی ہے اور آخرکار سانس بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اس طرح چھ تا بارہ گھنٹوں کے اندر مریض موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

رسل وائپر کے کاٹتے ہی سخت سوزش شروع ہو جاتی ہے اور دو گھنٹوں کے اندر جسم کے مختلف حصوں پر سوجن آجاتی ہے۔ ڈسے ہوئے عضو کا رنگ مختلف ہو جاتا ہے۔ دھبے اور چھالے آجاتے ہیں۔ خون کی قے ہوتی ہے۔ نظر دھندلی ہو جاتی ہے اور سانس لینے میں مشکل پیش آتی ہے، سخت کھانسی بھی ہونے لگتی ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر سوجن پیشانی اور گھٹنے پر پھیل جائے تو سمجھنا چاہیے کہ زہر کا اثر تیز ہے۔ وائپر کا زہر خون اور نسیجوں کو تباہ کر کے خون کی نالیوں میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے، جس سے دوران خون میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر علاج نہ کیا جائے تو خون جمنے کے باعث مریض ایک دو دن میں مر جاتا ہے۔

فورسا (SAW-SCALED VIPER) کی علامات

وہی ہیں جو رسل وائپر کی ہیں۔ اس کے زہر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ خون میں بہنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زہر شدید قسم کے نقائص بھی پیدا کرتا ہے۔ اس سانپ کے زہر کا اثر کئی ہفتوں تک برقرار رہ سکتا ہے۔ علاج نہ ہو تو منہ، ناک، کان وغیرہ سے زیادہ مقدار میں خون بہہ جانے سے مریض مر جاتا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کے اندازوں کے مطابق ہر سال تیس ہزار سے چالیس ہزار تک لوگ سانپ کے ڈسنے سے مر جاتے ہیں۔ بھارت میں سانپ کے کاٹنے سے مرنے والوں کی تعداد کا سالانہ اوسط کوئی دس سے پندرہ ہزار تک ہے۔ یہ تعداد، شیر، ببر، چیتے، بھیڑیے، ریچھ، ہاتھی اور مگرمچھ سے تلف ہونے والی انسانی جانوں کا

بیسن گنا ہوتی ہے -!

ماہرینِ حیوانیات نے کثرتِ اموات کے دو سبب بتائے ہیں: اول سانپ کے کاٹے کی اکثر اموات صرف صدمہ، خوف اور دہشت ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں - دوم ایک موذی مرض ٹٹانس بھی ہو سکتا ہے جس کے جراثیم زخم کے ذریعے جسم میں داخل ہوتے ہیں اور موت کا سبب بنتے ہیں -

لیکن اسے سائنس کا اعجاز ہی کہنا چاہیے کہ کل تک جو زہر انسان کے لیے پروانۂ موت کا حکم رکھتا تھا آج سائنسدانوں کی کاوشوں کی بدولت پیامِ حیات بن گیا ہے - جس طرح فولاد فولاد کو کاٹتا ہے اُسی طرح سانپ کے کاٹے کا توڑ خود اس کے زہر سے ہی کیا جاتا ہے - یہ تریاق کا ٹیکہ ہے جسے اینٹی وینین سیرم (ANTI VENIN SERUM) کہتے ہیں، بہت ہی تیر بہدف ثابت ہوا ہے - اس کے بروقت لگا دینے سے سانپ کے زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور مریض کی جان بچ سکتی ہے -

اس سیرم کی تیاری کا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان میں پلنے جانے والے چار خطرناک زہریلے سانپ ناگ، کریت، رسل وائپر اور فورسا کے تازہ زہر کی خفیف مقدار کو گھوڑے کے جسم میں انجکشن کے ذریعے داخل کرتے ہیں اور زہر کی خوراک کو بتدریج بڑھاتے جاتے ہیں - اس طرح کئی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے گھوڑے میں زہر کے خلاف ایک تریاقی مادّہ پیدا ہونے لگتا ہے جو زہر کے اثر کو غیر موثر بناتا ہے - یعنی گھوڑے کے خون میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس پر ان زہریلے سانپوں کے زہر کا مطلق اثر نہیں ہوتا - یوں سمجھیے کہ گھوڑا زہر پروف (IMMUNE) ہو جاتا ہے - یہی تریاق گھوڑے کا سیرم (HORSE SERUM) کہلاتا ہے - جس میں پانی بھی شامل ہوتا ہے - جب یہ سیرم ایک خاص طاقت تک پہنچ جاتا ہے تو اسے گھوڑے کے جسم سے باہر

ڈال لیتے ہیں۔ پھر اس گھوڑے کے سیرم کو کیمیائی طریقے پر منجمد کر کے خشک کر لیتے ہیں۔ اس طرح خون کو پانی سے علاحدہ کرنے کے بعد اس کے تریاق کو چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں بند کر کے اس پر اینٹی وینین سیرم کی پرچیاں چسپاں کر دی جاتی ہیں۔

ہافکن انسٹی ٹیوٹ پریل بمبئی میں پالی ویل سیرم (POLY VALE SERUM) اور سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کسولی پنجاب میں اینٹی وینین سیرم تیار کیے جاتے ہیں جو مذکورہ بالا چار سانپوں کے زہر کو زائل کرتے ہیں۔ یہ سیرم پانچ سال تک کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ روس میں جو "اینٹی گرزا" سیرم استعمال کیا جاتا ہے وہ دس سال تک کام آتا ہے۔

اینٹی وینین سیرم لگاتے وقت ایک پیچیدگی کے پیدا ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ کیونکہ کئی افراد ان لحمی مادوں (پروٹینز) سے جو گھوڑے کے سیرم میں پائے جاتے ہیں، حساس (الرجک) ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً ایسے افراد کے لیے پیچیدگی سے دوچار ہونے کا خدشہ لگا رہتا ہے جو یہ حساسیت بہت زیادہ رکھتے ہوں۔ اسی لیے احتیاطاً ڈاکٹر اینٹی وینین انجکشن لگانے سے پہلے ان افراد کی جلدی آزمائش کر لینا ضروری خیال کرتے ہیں۔

جلدی آزمائش (SKIN TEST) کا طریقہ یہ ہے کہ مارگزیدہ کی جلد کے کسی حصے پر ہلکا کیا ہوا سیرم (DILUTED SERUM) تھوڑی سی مقدار میں قطرہ بہ قطرہ انجکشن کے ذریعے داخل کر کے اس کے ردِ عمل کو دیکھا جاتا ہے۔ پوری طاقت کی مقررہ خوراک کا انجکشن اس وقت لگایا جاتا ہے جب پہلے یہ اطمینان کر لیا گیا کہ تریاق کا کوئی برا اثر پیدا نہیں ہوا۔

دس سی سی (10.C.C.) اینٹی وینین (ANTI VENIN) کی خوراک کوبرا، رسل وائپر، عام کریت کے ۶ ملی گرام اور فورسا کے ۵ ملی گرام زہر کے اثر کو زائل کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

سانپ کے کاٹنے کے علاج میں سانپوں کی شناخت کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس سے ڈاکٹروں کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ متعلقہ سانپ کے زہر کے توڑ کا مخصوص ٹیکا لگایا جا سکتا ہے جو زیادہ زود اثر ہوتا ہے۔ اس سے مریض کی شفایابی کے امکانات بھی بہت زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی معلوم سانپ کے کاٹنے کے علاج کے لیے پالی ویل سیرم لگاتے ہیں جو بھارت میں پائے جانے والے چار زہریلے سانپوں ناگ، کریت، رسل وائپر اور فورسا کے زہر کو زائل کرنے کے لیے صد فی صد کامیاب ثابت ہوا ہے۔

ہمارے ملک میں آج بھی بعض لوگ ٹوٹکوں، منتروں اور جھاڑ پھونک سے سانپ کے کاٹنے کے علاج پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان ماورائی تدابیر اور روحانی علاج میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن ممکن ہے کہ اس علاج سے مریض اس لیے شفا پاتے ہوں کہ ان پر اس کا کوئی نفسیاتی اثر مرتب ہوتا ہو۔ نفسیات جسم اور اس کے افعال پر جس قدر قدرت رکھتی ہے اس کے بتانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

سابق ریاست حیدرآباد کے محکمۂ پولیس میں ایسے افراد کو ملازم رکھا جاتا تھا جو عمل کے ذریعے سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے میں شہرت رکھتے تھے، اور ان کو صرف اسی کام کی تنخواہ سرکاری طور پر دی جاتی تھی۔

بھیلوں اور گونڈوں اور دوسرے قبائلیوں میں بھی سانپ کے کاٹے کا علاج جھاڑ پھونک اور جڑی بوٹیوں ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ انجکشن یا سیرم جیسی نعمتوں سے بہت گھبراتے ہیں اور ان میں سانپوں کے کاٹے ہوئے گھریلو علاج ہی سے اچھے ہوتے ہیں۔

ایک نوجوان امریکی اسکالر کا جو شہر مدراس کے ایک قریبی گاؤں میں سانپوں پر ریسرچ کر رہے ہیں، یہ کہنا ہے کہ غیر زہریلے سانپ کے کاٹے سے بھی آدمی مر سکتا ہے جبکہ اسے یہ غلط فہمی

ہوجائے کہ زہریلے سانپ نے اسے ڈسا ہے۔ انسان میں موت کا
خوف اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اگر اسے یہ وہم ہی ہوجائے کہ سانپ نے
اسے ڈس لیا ہے تب بھی وہ مر سکتا ہے چاہے صرف کانٹا ہی کیوں
نہ چبھا ہو۔

اسی طرح ہر زہریلے سانپ کے ڈستے ہی آدمی کا فوت ہوجانا
کوئی ضروری نہیں ہے کیونکہ خطرے کا انحصار تو حالات پر ہوتا ہے مثلاً
یہ ممکن ہے کہ سانپ کی تھیلی میں اتنا زہر کا ذخیرہ موجود نہ ہو جتنا کہ کسی
انسان کو ہلاک کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ
یہی سانپ اس سے تھوڑی دیر پہلے کسی اور شکار کو ڈس چکا ہو اور
زیادہ تر زہر ضائع ہو چکا ہو یا زیادہ تر زہر کپڑوں ہی پر گر گیا ہو، اس سے
پہلے کہ اس کے دانت جسم تک پہنچیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سانپ نے
گھبراہٹ اور عجلت میں اچھی طرح نہ ڈسا ہو بلکہ صرف اس کے دانتوں
سے ہلکی سی خراش آئی ہو۔

لیکن اگر زہر کی مہلک خوراک یعنی کوبرا کے ۱۲ ملی گرام،
رسل وائپر کے ۱۵ ملی گرام، عام کریٹ کے ۶ ملی گرام اور فورسا کے
[illegible] ملی گرام کسی آدمی کے جسم میں داخل ہوجائے تو سوائے بروقت
اینٹی وینین سیرم کے انٹراوینس انجکشن کے کسی دوسرے طریقے
سے مریض کی جان بچانا ممکن نہیں۔

پہلی طبی امداد کے طور پر فوراً ہی زخم کے اوپر دل کی جانب
پٹے یا رسی سے ایک بندش (LIGATURE) باندھ دی جانی
چاہیے تاکہ دورانِ خون میں رکاوٹ آجائے اور دل تک زہر دیر میں
پہنچ سکے۔ زخم کو کسی چاقو یا ریزر بلیڈ سے کھول کر کشادہ کر دیں تاکہ
جس قدر زہر ملا خون بہہ سکے، اتنا بہہ جائے۔ اس طرح خون بہانے
سے بدن میں داخل ہونے والے سانپ کا زہر، مقدار میں کم سے کم
ہوجایا کرتا ہے۔ خراب خون چوس کر تھوک دینا چاہیے۔ مریض
کو سونے نہ دیا جائے۔ مریض کو چائے، کافی، برانڈی پلائی جائے
تاکہ اُن کو صدمہ پہنچنے سے محفوظ رکھا جاسکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ
فوراً مریض کو کسی قریبی کلینک یا اچھے مستند ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔

سانپ کے زہر کو صرف اس کے توڑ کے لیے ہی نہیں
بلکہ سرطان جیسے جان لیوا مرض کے علاج میں کام آنے والی ادویات
میں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔

اسے عصر حاضر کے سائنسدانوں کا ایک شاندار کارنامہ
ہی کہنا چاہیے کہ وہ سانپ کے مہلک زہروں سے بہت ہی شفا
بخش اشیا اخذ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ جرمن ڈیموکریٹک
جمہوریہ میں ایک دوا تیار کی گئی ہے جو مرگی کا علاج کرنے میں مدد دیتی
ہے۔ سوویت یونین میں سانپ کے زہر کی قلموں سے کئی ادویات تیار
کی گئی ہیں جو غیر معمولی جریانِ خون کی مختلف بیماریوں، گٹھیا، حساسیت
(ایلرجی) اور اعصابی خرابیوں کے علاج میں استعمال کی جارہی ہیں۔
امراضِ قلب کے علاج میں بالخصوص اسے شریانوں میں انجمادِ خون کو
روکنے کے لیے اور دندان سازی میں جریانِ خون کو روکنے کے لیے
بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

آیورویدک طریقۂ علاج میں سانپ کے زہر کو دق کے
علاج کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ طبِ یونانی میں کالے سانپ
کا عرق کھینچ کر اُس عرق کو پرانے جذام اور آتشک کو اچھا کرنے کے
لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مردانہ طاقت زیادہ کرنے کے لیے بھی
طبِ یونانی کے بعض نسخوں میں سانپ کے زہر کا ذکر ملتا ہے۔ سانپ
کے زہر کی بہت ہی معمولی خوراک کلیٹوں اور رسولیوں کے درد دور
کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ غرض سانپ کے زہر کے شفا بخش استعمال
کے باعث اس کی مانگ دنیا میں روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ چنانچہ
سانپ کا زہر حاصل کرنے کے لیے امریکا میں بڑے پیمانہ پر سانپوں کی پرورش
کا اہتمام کیا گیا ہے جہاں معاوضہ پر روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں سانپوں کو
پکڑ کر لایا جاتا ہے اور ان کی پرورش کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں

لکی ڈکا پرنس آف ویلز چڑیا گھر سانپوں کی پرورش کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ اسے ایشیا میں سانپوں کی پہلا پرورش گاہ بھی کہا جاتا ہے جس میں ہر نسل کے سانپ موجود ہیں اور انھیں پالا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں شہر مدراس سے کوئی ۱۱ میل دور ایک دیہات میں سانپوں کا پارک قائم کیا گیا ہے جو کئی کنووں کا مجموعہ ہے جس میں کوئی ۳۰۰ سانپوں کی پرورش کی جا رہی ہے۔ ان سانپوں کو دھوپ سے محفوظ رکھنے کے لیے کنووں کے اوپر گھاس پھوس کے چھپّر ڈالے گئے ہیں۔

اب تو امریکہ اور روس میں سانپوں کو پکڑنا ایک پیشہ بن گیا ہے لیکن سانپ پکڑنا موت سے کھیلنا ہے۔ جنھیں اپنی جانِ عزیز کو خطرے میں ڈالنے میں لطف آتا ہے وہی سانپ کی گردن پکڑنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ عموماً سانپ پکڑنے کے لیے ایک خاص چھڑی استعمال کی جاتی ہے جس کے آخری سرے پر ہک لگا ہوتا ہے جس سے سانپ کے سر کو زمین پر دبا کر اسے ہاتھ سے اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیتے ہیں۔ بھارت میں سانپ کو پکڑتے وقت دونوں ہاتھوں سے کام لیا جاتا ہے ـــ سانپوں کی پرورش گاہوں (SNAKE FARMS) میں سانپوں پر مختلف تجربے کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان کا زہر بھی نکالا جاتا ہے۔ خارجی دباؤ کے تحت زہر نکالنے کو زہر نچوڑنا (MILKING) کہتے ہیں۔ زہر نچوڑنے کے لیے سانپ کی گردن کو پکڑ کر اسے، ایک شیشے کے پیالے یا گلاس پر جس کے منہ پر سوتی کپڑا تان دیا جاتا ہے، ڈسنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جیسے ہی سانپ کپڑے کو کاٹتا ہے زہر کی تھیلی سکڑتی ہے اور زہر کے ایک یا دو قطرے دانتوں سے گلاس میں ٹپک جاتے ہیں۔

سانپ اگر جلدی جلدی کئی دفعہ ڈسے یا اُس کا زہر جلدی جلدی (وقفہ دیے بغیر) حاصل کیا جائے تو سانپ کمزور ہو کر مر جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے بھارت کے ایک سرکردہ سائنس دان ڈاکٹر پی۔ جے دیوراس نے کہا ہے:

"اگر آپ کے پاس سانپ ہے تو محفوظ رکھیے
کیونکہ اس کا زہر سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔" (بشکریہ آجکل)

ضیاہاتی

تخلیقِ خودی

تضمین براشعارِ علامہ اقبالؒ

ہر آدمی اس دور میں ہے برسرِ پیکار
ہر فرد نئے روپ میں آمادۂ تکرار
ہر دل میں نیا جذبۂ تفریق ہے بیدار
ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار

افکار جوانوں کے ہوئے زیروزبر کیا

ہوتی تھی خودی، زندہ کبھی خانقہوں سے
وہ شان وہ عظمت ہی گئی خانقہوں سے
امید نہیں آج کوئی خانقہوں سے
ممکن نہیں "تخلیقِ خودی" خانقہوں سے

اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

○

عثمان غنی عادل

غزل

بہت ہنس ہنس کے زہرِ غم پیے ہیں
تمھیں کیا علم ہم کیوں کر جیے ہیں
خدا اِن آنسوؤں کی لاج رکھے!
خوشی کے جوش میں ہم رو دیے ہیں
کسی صورت نہیں مرنا تو آئے
بہت مرنے کی خاطر جی لیے ہیں
عبث بدنام ہیں کانٹے چمن میں
عنادِل نے بھی دِل زخمی کیے ہیں
خوشی ہے نقطۂ موہوم عادلؔ
یہ سارے غم خوشی کے زاویے ہیں

عبدالقیوم نازاں

مشورہ

تمھارے دستِ حسیں کا خیال آیا ہے
جوابِ خط جو دعاؤں کے ساتھ آیا ہے

اِس ارمغانِ محبّت کی قدر کرتا ہوں
تمھارے جذبۂ اُلفت کی قدر کرتا ہوں

دیا ہے جہد و عمل کا ثمر دعاؤں نے
بَسا دیے ہیں ہزاروں نگر دعاؤں نے

مگر جو سب کے لیے ہو وہ التجا کرنا
وگرنہ میرے لیے پھر نہ تم دعا کرنا

دُعا کرو کہ وفا حُسن کا جواب بنے
دُعا کرو کہ ہر ایک ذرّہ آفتاب بنے

دُعا کرو کہ سنور جائے قسمتِ مجبور
دُعا کرو کہ نکھر آئے چہرۂ مزدور

دُعا کرو کہ زمانے میں جنگ عام نہ ہو
دُعا کرو کہ کوئی خطّہ ویتنام نہ ہو

دلوں پہ اہلِ سیاست کے داؤ چل نہ سکیں
حسد کی آگ میں خوشیوں کے باغ جل نہ سکیں

دُعا کرو کہ محبّت کے پھُول کھِل جائیں
دُعا کرو کہ جو بچھڑے ہوئے ہیں مل جائیں

تمیزِ رنگ نہ ہو، فرقِ نسل وذات نہ ہو
بشر ہو دُور بشر سے، اب ایسی بات نہ ہو

دُعا کرو کہ یہ دُنیا بہشت بن جائے
جو اہرمن ہو وہ یزداں سرشت بن جائے

ہمارا جذبۂ الفت نظر میں ڈھل جائے
دُعا کرو کہ شبِ غم سحر میں ڈھل جائے

ساحر شیوی

غزل

لاکھ چاہے نہ دل مگر دیکھو
کیسا اُجڑا ہے میرا گھر دیکھو

خونِ ناحق تو رنگ لائے گا
مجھ کو اِک بار قتل کر دیکھو

اعترافِ گنہ یہی تو ہے
شرم سے ایک بار مر دیکھو

ایک پل بھی نہ ٹھہری ڈھلتی چھاؤں
زیست کتنی ہے مختصر دیکھو

پھول صحرا میں کھل گیا ساحر
آج انساں کو چاند پر دیکھو

بدیع الزماں خاور

غزل

کیجیے فکر آج ہی کے لیے
کیا پتا کل کوئی جیے نہ جیے

زندگی کی حسیں تمنّا نے
زندگی بھر ہمیں فریب دیے

دن کسی کے خیال میں گزرا
رات آئی کسی کی یاد لیے

وقت کی تند آندھیوں میں بھی
ہم نے روشن کئی چراغ کیے

کس کو فرصت کہ دو گھڑی خاور
بیٹھ کر پیرہن کے چاک سیے

ستیہ نارائن سنہا

یادش بخیر

غیر ملکی اقتدار کے خلاف بھارت کی سرفروشانہ جدوجہد، جو ایک اعلا اخلاقی سطح پر کی گئی، بہادری اور جانبازی کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ستیاگرہ کی حکمتِ عملی نے، سیاسی جدوجہد کو صداقت اور عدم تشدد کے ایک بے مثل روحانی تجربے میں تبدیل کر دیا۔ مہاتما گاندھی کی حوصلہ افزا قیادت میں اس جدوجہد نے 'ادھرم' کے خلاف 'دھرم'، ناانصافی کے خلاف انصاف اور ظلم پسند طاقت کے خلاف اخلاقی قوت کی شکل اختیار کر لی۔

سانحۂ جلیانوالا باغ کے بعد گاندھی جی قوم کے مجروح وقار کے لیے نئی قیادت کی علامت بن گئے۔ اس واقعے نے اُن کو، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے "تعاون کے ایک پکّے حمایتی سے پکّے مخالف میں تبدیل کر دیا۔" انھوں نے برطانوی سرکار کو شیطانی سرکار اور اس کے اقتدار کو 'ایک لعنت' کہہ کر قوم کے غم و غصّے کا اظہار کیا۔ مہاتما جی نے اعلان کر دیا کہ بھارتی عوام "راون راجیہ" کو اب مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسے ختم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔ انھوں نے عدم تعاون کی اپنی تاریخی تحریک شروع کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ بیرونی حکومت سے "جس کا رہنما خدا نہیں شیطان ہے" تمام تعلقات منقطع کر لیں اور اپنے نیز اپنی قوم کے وقار کی حفاظت کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ تمام خطابات واپس کر دیں اور کونسلوں، عدالتوں اور تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ تاہم ایسا کرنے میں، انھوں نے کہا کہ پوری طرح عدم تشدد پر قائم رہیں۔ انھوں نے قیصرِ ہند کا میڈل واپس کر دیا جو انھیں پہلی جنگِ عظیم کے دوران ممتاز خدمات انجام دینے کے صلے میں عطا کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی یہ تحریک ہماری جدوجہدِ آزادی کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔

اس وقت تک سیاسی سرگرمیاں شہری علاقوں میں عموماً عرضداشتیں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ گاندھی جی نے سیاسی سرگرمیوں کو قصبوں اور دیہات میں عام انسانوں تک پہنچا دیا۔ ستیاگرہ اور عدم تشدد کے اپنے عقیدے کو پھیلانے کے لیے انھوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی۔ ان کے دلوں میں جوش بھر دیا۔ جلسے جلوس روزمرّہ کے معمول بن گئے۔ لاکھوں طلبہ نے اپنے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا۔ وکیلوں نے عدالتوں کی اور عام انسانوں نے ہر ممکن انداز میں غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کی۔

قومی جدوجہد کے طریقِ کار میں جب ۱۹۲۱ء کے قریب یہ موڑ آیا تو میں پٹنہ میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ گاندھی جی کی تحریکِ عدم تعاون سے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے نظریے نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ تعلیمی سرگرمیوں کو خیرباد کہنے کی گاندھی جی کی اپیل کا

میں خالف تھا۔ کانگریس کے ناگپور اجلاس کے بعد ملک گیر دورہ کرتے
ہوئے گاندھی پٹنے آئے تو انھوں نے ایک عظیم اجتماع سے
خطاب کیا۔ جس میں میں بھی موجود تھا۔ جلسے کے آغاز میں میرے
ایک کلاس فیلو منورنجن پرساد نے جو اعلا صلاحیت کا شاعر تھا،
ایک بھوجپوری گیت سنایا جو مجھے آج بھی یاد ہے:

کا کرتے گاندھی اکیل، تلک پرلوک گئے
رہے ڈھیر لوک تیکے، آپسے ہو ویریت گئے

(گاندھی اکیلے کیا کریں، تلک تو پرلوک سدھار گئے۔ اگرچہ ہمارے
ہی خواہ بہت ہیں لیکن وہ آپس میں تقسیم ہو گئے ہیں)

اس گیت نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا اور میری فکر کے دھارے
کو یکسر بدل دیا۔ جلسہ گاہ سے ہوسٹل آتے ہوئے میں نے پڑھائی چھوڑ کر
عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو جانے کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ اس
اچانک تبدیلیِ خیالات پر میرے ہوسٹل کے ساتھیوں کو خوشی
بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ اب ہم سب تحریک میں پوری طرح شامل
ہو چکے تھے لیکن ایک سال کے اندر اندر ان میں سے تقریباً سبھی لوگ
پڑھائی کے لیے واپس آ گئے لیکن میں باہر ہی رہا۔ انھوں نے
خط لکھ کر مجھ پر زور دیا کہ میں بھی کالج میں داخلہ لے لوں۔ میں نے
اُن سے کہہ دیا کہ میرے لیے اب واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا۔ میرے ضلعے کے رہنما نے مجھ سے دیہی علاقوں میں کام کرنے
کے لیے کہا۔ میری خدمات کو دیکھتے ہوئے جلد ہی مجھے سب ڈویژنل
کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ بہار کے شہری علاقوں کے
مقابلے میں دیہات کے عوام پر گاندھی جی کی تحریک کا زیادہ گہرا اثر تھا۔

گاندھی جی نے عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لیے
بھگوت گیتا، رامائن اور کبیر، نانک، تلسی بھگت اور میرا بائی
کی تعلیمات پر خاص توجہ مرکوز رکھی اور انھیں قوم کے کاز کے لیے
بڑا سے بڑی قربانی دینے کی ترغیب دی۔ انھوں نے لنگوٹی پہنی اور
خود کو سرتاپا غریبوں جیسا بنایا۔ اُن کے ملک گیر دوروں، پرارتھنا
سبھاؤں، تقریروں اور تحریروں نے آزادی کے لیے ایک تابندہ
خواہش پیدا کر دی اور لوگوں کے دلوں میں زندگی کے لیے ایک اُمید
جگا دی۔ یہ وہ لوگ تھے جو پس ماندہ اچھوت تھے اور صدیوں پرانی
ذہنی، اقتصادی اور سیاسی غلامی کے سبب ہمت ہار چکے تھے۔

آزادی حاصل کرنے کے لیے لاکھوں افراد کو صداقت
اور عدم تشدد پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دینے کا کام تقریباً ناممکن
تھا لیکن گاندھی جی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور غریبی اور جہالت
کے اندھیرے میں پڑے ہوئے مختلف ذاتوں، فرقوں اور عقاید
کے لوگوں کو ایک زبردست جنگی قوت کی صورت میں متحد اور منظم کر دیا۔
اُن کے ذریعے جو نفسیاتی انقلاب آیا اُس نے ایک قومی جذبے کی
تشکیل کی اور ستیا گرہ، لاٹھی چارج اور فائرنگ وغیرہ قومی زندگی
میں آئے دن کا واقعہ بن گئے۔ یہ ان کی شخصیت ہی کا اعجاز تھا کہ جو
بھی اُن کے قریب آیا اُن کی قربت کے فیض نے اُسے گوشۂ گمنامی
سے نکال کر عوامی زندگی میں ہیرو بنا دیا۔ انھوں نے عوام کو جرأت
اور بے خوفی عطا کی اور لوگوں کو تحریکِ عمل بخشی اور ملک کے لیے
جیل جانے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔
یہی نہیں، تختۂ دار کی طرف جاتے ہوئے بھی اُن کے ہونٹوں پر بندے ماترم
اور بھارت ماتا کی جے کے الفاظ ہوتے تھے۔

آزادی حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کو اپنانا کوئی آسان
کام نہ تھا۔ تاریخِ انسانی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب ملکوں
نے پُرتشدد ذرائع ہی سے آزادی حاصل کی۔ جب گاندھی جی پُرامن
ستیا گرہ کے تصور کے ساتھ بھارتی سیاست کے منظرِ عام پر آئے
تو بالخصوص سیاسی جدوجہد کے صفِ اول کے رہنماؤں نے انھیں
شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے ستیا گرہ کے
اخلاقی تصور کو جس میں تشدد کا شائبہ نہ تھا، سیاسی افادیت پر

شبہ کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے لوگوں نے ستیاگرہ اور عدم تشدد کو اپنا لیا کیونکہ یہ بھارتی ثقافت اور ہماری روایتوں کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ یہ امر اس وقت اور بھی مشکل ہو گیا جب گاندھی جی نے وسیلے اور مقصود کی پاکی پر زور دیا اور پوری قوم سے عدم تشدد کی راہ پر چلنے کے لیے کہا۔ بھارت جیسے وسیع ملک میں اس پر عمل درآمد ہونا غیر ممکن سمجھا گیا۔ یہ شبہ اس وقت پختہ ہو گیا جب چوری چورا میں تشدد کا مظاہرہ ہونے پر گاندھی جی نے ستیاگرہ کی تحریک کو معطل کر دیا۔ پرانے رہنماؤں نے کہا کہ انھوں نے بے بہا دردوں کی قربانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پورے معاملے ہی کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ تاہم گاندھی جی نے اصرار کیا کہ ملک جد و جہد کے لیے پورے طور پر تیار نہیں تھا۔ انھوں نے اعلا ترین قربانی دینے اور اعلا اخلاقی اقدار حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرنا جاری رکھا۔ قومی بیداری کے لیے انھوں نے کھادی سے ہریجن سدھار تک ہر قسم کی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔

عدم تعاون اور سول نافرمانی سے لے کر ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو" تحریک تک لمبا سفر ہے جہاں قدم قدم پر آزمائشوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی ہر طرح کے مظاہرے اور تحریکیں یکے بعد دیگرے رونما ہوئیں اور ہر ایک نے آزادی کی خواہش کو نئی طاقت اور گیرائی عطا کی ــــ اور آخر کار وہ نقطۂ عروج بھی آیا جب ۱۴، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو بھارت اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور بھارتی عوام کی صحیح معنوں میں نمائندگی کرنے والی مجلس آئین ساز نے خود مختار حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ جب صدیوں پرانے آزادی کے خواب کی تعبیر ملی تو سارے ملک میں جوش اور ولولے کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں نصف شب کی اس شاندار اور تاریخی تقریب کی یاد، جس میں مجھے کانگریس پارلیمانی پارٹی کے چیف وہپ کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا تھا، میرے حافظہ میں ہمیشہ تابندہ رہے گی۔ لال قلعے کی پر عظمت فصیل پر جب پنڈت نہرو نے قومی ترنگا لہرایا تو وہ منظر دراصل تمام بھارتی شہریوں کی مقدس خواہشات کی تکمیل کی عکاسی کر رہا تھا ـــ لیکن جب یہ تاریخی دن آیا تو وہ انسان جس نے اس دن کے حصول کو ممکن بنا دیا تھا بنگال میں تھا اور فرقہ وارانہ جنون کے نتیجے میں زخمی ہونے والوں کی دلجوئی کر رہا تھا۔

گاندھی جی کی شخصیت اس قدر عظیم تھی کہ جب ان کی شہادت پر یہ کہا گیا تو بجا ہی کہا گیا کہ:

"آئندہ نسلیں اس پر مشکل ہی سے یقین کریں گی کہ واقعی گوشت و پوست کے ایک ایسے انسان نے اس دھرتی پر جنم لیا تھا۔"

★

ایک طالب علم :

ہمارے دینی مدارس

عصر حاضر میں دنیا کے تعلیمی ادارے حیرت انگیز طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور ان کی ہمیشہ سے یہ کوششیں رہی ہیں کہ تقاضائے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے طلبا کو جدید علوم کی تعلیم سے کس طرح آراستہ کیا جائے اور یہ حقیقت ہے کہ ان اداروں کے منتظمین نے طلبا کو علوم جدیدہ کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کر کے اپنی فرض شناسی کا ثبوت ہی نہیں دیا، بلکہ آنے والی نسل پر احسان بھی کیا۔ ان اداروں کے طلبا نے میدانِ حیات کے مختلف شعبوں میں اپنی لیاقت اور قابلیت کو بروئے کار لا کر سماج و قوم کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو سائنس اور ٹیکنیکل میدان میں اترے اور اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کس طرح سے قدرت کے ان مخفی رازوں کو افشا کیا جائے جن میں خالقِ کائنات کی جانب سے بنی نوع انسان کے لیے فوائد غیر متناہیہ مضمر ہیں اور بلاشبہ انھوں نے مادی اشیا کی ترقی کو معراجِ کمال تک پہنچا کر ملک و قوم کو اقتصادی و معاشی بدحالی سے نکال کر خوش حالی کی منزلوں تک پہنچایا اور بعض وہ طلبا ہیں جو میدانِ سیاست میں اترے اور انھوں نے بھی اپنے ملک و ملت کے لیے خود غرضی سے عاری ہو کر عظیم الشان انقلابات برپا کیے۔ الغرض انھوں نے جو بھی تعلیم حاصل کی تھی وہی تعلیم ان کے لیے ایک خوشگوار مستقبل کے روپ میں نمودار ہوئی۔

ایک طرف مذکورہ اداروں کی ترقیاں اور طلبا کا تابناک مستقبل باعثِ مسرت ہے تو دوسری طرف اسی ترقی یافتہ دور میں مسلمانوں کے دینی مدارس اور ان کے طلبا کی حالت قابلِ رحم ہے۔ آخر اتنا بڑا فرق کیوں؟ وجہ ظاہر ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دینی مدارس کے نظام کی باگ ڈور ہے یا تو وہ ناعاقبت اندیش اور نااہل ہیں یا اس قدر دقیانوسی ذہنیت کے مالک ہیں کہ قوم کے بچوں کی زندگیاں تباہ و برباد ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ان کے اسباب و علل کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا پھر جان بوجھ کر یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ طلبا کو تقاضائے وقت کے مطابق قدیم نصاب تعلیم میں زبردست تبدیلی کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تعلیم سے آراستہ کیا جانا بے حد لازمی اور ضروری ہے انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا محض اس لیے کہ وہ جدید علوم کی تعلیم سے قاصر ہیں۔ وجہ اگر یہی ہے تو اپنی ہی کمزوری کی بنا پر ملت کے بچوں کی زندگیاں تباہ کرنا شاید اسلام کی عظیم ترین خدمت ہے۔ درحقیقت عمیق نظر سے دیکھا جائے تو ملتِ مسلمہ کے یہ ٹھیکیدار اور اسلامی تعلیمات کے علمبردار اسلام اور ملت دونوں کے لیے دیمک اور گھن کے کام انجام دے رہے ہیں۔ آپ بنفس نفیس ان اداروں کا معائنہ کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ دن بہ دن طلبا کی تعداد میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اساتذہ زیادہ اور طلبا کم رہ جائیں گے۔ مگر ایسی حالت میں بھی یہ لوگ کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اس تنزل کی اصل وجہ ان نااہل لوگوں کے ناعاقبت اندیش کارنامے ہیں جنھوں نے دینی اداروں کو صرف اپنا پیٹ پالنے کے لیے کھول رکھا ہے

ورنہ اگر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم کا مکمل بندوبست ہوتا تو کیا بعید تھا کہ طلبا کی تعداد میں کمی کے بجائے اضافہ نہ ہو۔ جگہ جگہ مدرسہ کھولنا اور وہی فرسودہ نصابِ تعلیم کو اپنانا، جس تعلیم میں دَورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ ہو اور جس کو حاصل کر کے طلبا اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے سماج میں باعزّت مقام حاصل نہ کر سکتے ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسی تعلیم داعیِ الی الرہبانیت ہے۔ اسلام جس کی کبھی اجازت نہیں دیتا۔ کیا حضورؐ نے وقت کے تقاضے کے مطابق صحابہؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ تو پھر آج کل کے اسلامی تعلیمات کے علمبرداروں نے انگریزی کو ابھی تک اپنے نصابِ تعلیم میں شامل کیوں نہیں کیا اور انھوں نے کمیونزم کے نظریات اور ان کے سائنٹفک دلائل و اعتراضات کے سدّباب کے لیے ایسی کون سی تعلیم اپنے طلبا کو دی ہے جو ان کے باطل نظریات غلط ثابت کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکے۔

زمانۂ ماضی میں اسلام پر غلط اور بے بُنیاد دلائل سے عیسائیوں اور دیگر اقوام کے حملوں کے وقت ہمارے اسلافؒ نے ان سے مقابلہ کے لیے علومِ عقلیہ کو اپنایا تھا اور اگر وجہِ جواز یہ بھی نہ ہو تو اسلام دین کے ساتھ دنیوی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کب بنتا ہے؟ آپ ہی خود فیصلہ کریں کہ یہ لوگ دین و ملّت کے حق میں کبھی رہنما و رہبر بن سکتے ہیں، کبھی نہیں۔ خدا ایسے لوگوں کے جُرم کو کس طرح نظرانداز کر سکتا ہے کہ جنھوں نے قوم کے پیسوں کو بٹورا اور ان کے معصوم بچوں کی زندگیاں برباد کیں۔ کیا یہ بربادی نہیں ہے کہ اکثر و بیشتر طلبا زندگی کے سنہرے چودہ پندرہ برس کی مدت تعلیم سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد جب جب سماجی اور معاشرتی دائرہ میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے اور ان کے چہرے پر مایوسی اور لاچارگی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ بس یہی چیز ان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ نتیجۃً وہ اپنے ذریعۂ معاش کے لیے ایسی راہیں تلاش کرنے سے گریز نہیں کرتے جو دین و ملّت کے لیے مضر اور بدنامی کا باعث ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بعض وہ طلبا ہیں کہ جنھوں نے اپنے ذریعۂ معاش کی کوئی دوسری راہ نہ پاکر مسجدوں کی چہار دیواریوں میں پناہ لی اور پھر کس و ناکس کے بے جا حاکمانہ رویہ کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں اور بعض وہ ہیں جو محض ذریعۂ معاش کے لیے نئے نئے مدارس قائم کر کے اس کی آڑ میں قوم سے چندہ حاصل کرتے ہیں اور بچوں کو وہی فرسودہ تعلیم دیتے ہیں۔ اس طرح مسلسل ملّت کی تباہی و بربادی کے سامان یکے بعد دیگرے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

راہی قریشی

دکھائی دے

اب کیا کہوں پڑوس میں کیا کیا دکھائی دے
شوہر ہمیشہ بیوی سے پٹتا دکھائی دے

یہ لاٹری ٹکٹ ہے مجھے اس لیے عزیز
ہر بار ڈھائی لاکھ کا سپنا دکھائی دے

صاحب کے سارے بچے اسی کشمکش میں ہیں
"آیا" کا چہرہ ممّی سے پیارا دکھائی دے

نو لڑکیوں کے باپ بنے اس امید پر
بیگم کی گود میں کوئی لڑکا دکھائی دے

اب مسجدوں میں یا تو مؤذن ہیں یا امام
لیکن ہر اک مزار پہ میلا دکھائی دے

پوتے کے ساتھ دادا کی حسرت بھی ہے یہی
گھونگھٹ کے نیچے چاند سا چہرہ دکھائی دے

راہی جو قرض لینے کو نکلے تو شہر میں
ہر رشتہ دار، دوست، پرایا دکھائی دے

پس منظر

بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا / لنڈورا ہی جیے گا :

ایک بلّی سر جھکائے مسکین صورت بنائے بیٹھی تھی۔ اتفاق سے ایک چوہا کہیں سے آ نکلا۔ بلّی اُسے دیکھتے ہی جھپٹ پڑی۔ لیکن چوہا بھاگ کر بل میں جا گھسا۔ بلّی کے ہاتھ صرف دُم لگی۔ چوہے کو بل میں چھپا دیکھ کر بلّی نے کہا "میاں چوہے میں تو تم سے کھیلتی تھی۔ باہر آؤ تو تمھاری دُم جوڑ دوں۔" چوہا بلّی کی چالاکی تاڑ گیا اور جواب میں بولا "بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی جیے گا۔"

تشریح : جب کوئی چکنی چپڑی باتیں کر کے اور فائدے کا یقین دلا کے دھوکا دینا چاہے لیکن سننے والا فریب کو تاڑ جائے تو یہ مثل کہہ کر ٹال دیتا ہے۔ "یعنی ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو تم سے بھلائی کی توقع نہیں ہے۔"

بُزِ اخفش :

اخفش عربی صرف و نحو میں اُستاد کامل تھا۔ کہتے ہیں طالب علمی کے زمانے میں اُس نے ایک بکرا پال لیا تھا، جسے اپنا سبق (آموختہ) سُنایا کرتے تھے۔ جب تک بکرا اپنا سر نہ ہلا دیتا یا بولانہ اٹھتا تب تک اخفش اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ عرصے کے بعد جب بکرا ذبح کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُس کا دماغ بھیجے سے خالی ہو چکا تھا۔

تشریح : بے سوچے سمجھے سر ہلانے یا ہاں میں ہاں ملانے والے کو بزِ اخفش کہتے ہیں۔

[illegible] :

ہندی مسلمانوں میں بچے کو مکتب میں بٹھانے کی ایک رسم ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ جب بچہ چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جاتا ہے تو [illegible] میں مہندی لگا کر نیا لباس پہناتے ہیں سر سے سہرا باندھتے یا گلے میں ہار پہناتے ہیں۔ عصر کے وقت خوانوں میں لڈو بھر کر رکھتے ہیں۔ پھر ایک تختی پر پہلے بسم اللہ اور پھر اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ لکھ کر بچے سے پڑھواتے ہیں۔ یہ رسم عموماً مولوی صاحب کے ہاتھوں انجام دی جاتی ہے۔ لیکن اب گھر کا کوئی فرد بھی بچے کو پڑھا دیتا ہے اور تختی کے بجائے کلام مجید سامنے رکھنے کا رواج پڑ گیا ہے۔ جب لڑکا یا لڑکی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں آیتیں پڑھ دیتی ہے تو مبارک سلامت کا شور برپا ہو جاتا ہے اور شیرینی تقسیم کی جاتی ہے۔ اس رسم کو مکتب بھی کہتے ہیں۔

تصریح : چونکہ پیشوائے اسلام پر سب سے پہلے سورۂ علق (اِقْرَأْ بِاسْمِ الخ) نازل ہوئی تھی اس لیے سب سے پہلے اس کا پڑھنا مُبارک سمجھا جاتا ہے۔

بسم اللہ کا ایک اور مطلب کسی کام کی ابتدا بھی ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن کی ہر سورہ اس سے شروع ہوتی ہے اور مسلمان اکثر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کہتے ہیں اس لیے آغازِ کار کو "بسم اللہ کرنا" کہتے ہیں۔ اگر ابتدا ہی میں ناکامی ہو یا کام بگڑ جائے تو کہتے ہیں :—

"بسم ہی غلط ہوگئی۔"

بلائیں لینا :

عورتیں جب کسی عزیز سے جو اُنھیں اولاد کی طرح پیارا ہوتا ہے، ملتی ہیں یا کسی بچّے سے خوش ہوتی ہیں تو اُس کے سر پر دونوں ہاتھ پھیر کر اپنی کنپٹیوں پر پیشت کی جانب سے انگلیاں چٹخاتی ہیں۔ گویا اُس کے سر کی بلائیں اپنے سر لیتی ہیں۔ اس فعل کو بلائیں لینا کہتے ہیں۔

مطلب : پیار و محبّت کا اظہار کرنا۔ قربان جانا۔

بلّی کی میاؤں کو کون پکڑے گا ؟
بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا ؟

حکایت نمبر ۱ : ایک بلّی نے چوہوں کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔ ایک دن سب چوہوں نے جمع ہو کر کہا "آؤ آج مل کر اس کا بندوبست کریں"۔ ایک نے کہا "میں لپک کر اُس کے پیچھے سے چمٹ جاؤں گا اور ناخون کتر ڈالوں گا۔" دوسرا بولا "میں اس کی ناک نوچ لوں گا۔" تیسرے نے کہا "میں اُس کے کھیچے بھاگوں گا۔" چوتھے نے کہا "میں اُس کی دُم سے لٹک جاؤں گا۔" غرض اسی طرح خیالی پلاؤ پک رہے تھے۔

ایک بڈھا چوہا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سب نے کہا "حضرت آپ بھی کچھ کہیے۔" وہ بولا "ارے بچّو! تم دیوانے ہو۔ جب وہ ایک مرتبہ غر" اکر کہے گی "میاؤں" تو سب کے ہوش اڑ جائیں گے۔ ساری چیزوں کو تو بچڑ ا اُس کی ۔ میاؤں کو کون پکڑ سکتا ہے (یا پکڑے گا) ؟ ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بلّی کی میاؤں سُنائی دی اور سب دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

حکایت نمبر ۲ : یہ قصّہ یوں بھی ہے کہ چوہوں نے مل کر سوچا کسی صورت بلّی کے گلے میں ایک گھنٹی باندھ دی جائے تاکہ اُس کے آتے ہی گھنٹی بج اُٹھے اور سب کو پتا چل جائے۔ اس طرح بھاگ نکلنے میں آسانی ہوگی۔ سب نے یہ تجویز پسند کی لیکن سوال یہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا ؟ اس پر سب کے چُپ لگ گئی۔ اتنے میں بلّی کی میاؤں سُنائی دی اور سب بلوں میں جا گھسے۔

ان دو قصّوں کی بنیاد پر اوپر کی دو کہاوتیں بن گئی ہیں۔

مطلب : کہاوت نمبر ۱ : ظالم کا رعب ایسا زبردست ہوتا ہے کہ کسی کی پیش نہیں جاتی۔

کہاوت نمبر ۲ : ظالم کی روک تھام میں پہل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بندر کا گھاؤ :

بندر کی یہ عادت ہے کہ جب اُسے زخم آجاتا ہے اور سوکھنے لگنے پر اُس میں خارش ہوتی ہے تو اُسے کھجا کھجا کر ہرا کر لیتا ہے۔ اس طرح زخم اچھا ہی نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ جو زخم اچھا ہی نہ ہوتا ہو اُس کے لیے "بندر کا گھاؤ" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اُس کام کے لیے بھی کہتے ہیں جو بڑھتا ہی چلا جائے اور کبھی ختم نہ ہو۔

مترادف اصطلاح : بندر کا پھوڑا۔

ساز و آہنگ

ابوالحسن تاناشاہ

ابوالحسن تاناشاہ گولکنڈہ کے آخری تاجدار تھے۔ یہ ساری پیٹ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ راجو کے مرید و معتقد تھے اور انھیں کی دعاؤں اور تائید سے سلطان کے داماد بنے اور سلطنت حاصل کی۔ شاعروں اور عالموں کے قدرداں ہونے کے علاوہ خود بھی خوش فکر شاعر تھے۔ زندگی بھر مغلوں سے صف آرا رہے۔ اورنگ زیب سے گولکنڈہ میں برسرِ پیکار رہے، مگر شکست کھائی اور قلعہ دولت آباد میں مقید کیے گئے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی سلطنت کا زمانہ ۱۶۷۲ء سے ۱۶۸۹ء تک کا ہے۔ صوفی منش اور قلندر مزاج تھے۔

غزلیں

○

اے سروِ گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کر مری انجمن میں آ

کب لگ رہے گا جیوں لبِ تصویر بے سخن
اے شوخ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ

چہتا ہوں وصفِ قد میں کروں فکرِ شعر کی
اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ

اے جان بوالحسن تو اچھے خوش لٹک ستیں
بندِ قبا کوں کھول کے صحنِ چمن میں آ

○

تج مکھ کو کوئی چندر کہتے کوئی سورتیں انور کہتے
کوئی حسن کا بندر کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

تج لب کوں کوئی شکر کہتے کوئی شہد سوں برتر کہتے
کوئی خضرِ جاں پرور کہتے، کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

کوئی چھو کی پیاری کہتے کوئی سوں اچھن ناری کہتے
ناریاں میں کوئی ناری کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کہتے

تج چک کوں کوئی کنچن کہتے کوئی ساحرِ پُرفن کہتے
کوئی حقۂ انجن کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

دو بن کوں تج کوئی گج کہتے یا دو سینناں تج کہتے
یا مد بھرے پنکج کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

ملنا تمن کا غیر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ مج کہتے
کس کس کا موں موندوں سجن کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

متاعِ ہنر

انتخاب قلی قطب شاہ : تصحیح و ترتیب : محمد اکبر الدین صدیقی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، جامعہ نگر ، دلّی ۲۵

اردو زبان و ادب کے ارتقا میں دکن کی خدمات بے شمار ہیں ۔ یہاں پر زبان سلاطین کے درباروں اور صوفیا کی خانقاہوں میں برابر پرورش پاتی رہی ہے ۔ دکن کی سرزمین نے سیاسی ، ادبی اور ثقافتی میدانوں میں قومی یک جہتی کو خوب پروان چڑھایا ، ان سلاطین کے لیے قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی صرف نعرہ نہیں بلکہ ایک عقیدہ تھا ۔ یہ عقیدہ سلطان قلی قطب شاہ کی شاعری ، وجہی کی نثر اور صوفیا کے رسالوں میں بکھرا ہوا ہے ۔ اس سرزمینِ دکن کو شعر و شاعری سے خاص طور سے لگاؤ رہا ہے ۔ اردو زبان کا اوّلین صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ جو اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور ادبی شعور کے لحاظ سے ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ اور اکبر کا ثانی تھا ، ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے ۔

کلیاتِ قطب شاہ جیسا کہ ماقبل السطور میں بیان ہو چکا ہے اردو کا پہلا شعری مجموعہ ہے ۔ شاعری کے لحاظ سے اس میں اردو کی ہر صنفِ سخن ، مثلاً غزل ، قصیدہ ، رباعی برابر کی حصّہ دار ہے ۔ موضوع کے لحاظ سے اس میں فطرت نگاری ، عشقیہ اور جمالیاتی نظمیں اور عید ، دیوالی ، شب برات ، بسنت وغیرہ پر نظمیں ہیں ۔ کلیاتِ قطب شاہ ڈاکٹر زور مرحوم نے پہلی بار مرتب کیا تھا ، اس کے بعد "غزالِ رعنا" اور "روپ رس" کے عنوان سے غزلوں اور نظموں پر مشتمل انتخابات شائع ہوئے ۔ ادھر مکتبہ جامعہ نے اردو کی معیاری کتابیں اور منتخبات سستے داموں شائع کرنے کا جو سلسلہ جاری کیا ہے اس میں قلی قطب شاہ کے دیوان کا انتخاب بھی ہے جسے دکن کے مشہور محقق پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے مرتب کیا ہے ۔ تقریباً ہزار ہزار صفحات پر مشتمل کلیات کو ایک مختصر مجموعہ میں سمونا بہت مشکل کام ہے تاہم صدیقی صاحب اس کڑی آزمائش سے بحسن و خوبی کامیاب گزرے ہیں ۔ انتخاب جامع اور دل پسند ہے ۔ اس میں شاعر کی شخصیت کے سارے پہلو اور اس کی ساری دلچسپیاں جمع ہو گئی ہیں ۔ صدیقی صاحب کے مختصر مقدمہ میں انھوں نے قلی قطب شاہ کی حیات اور شاعری کا جامع جائزہ لیا ہے ۔ پرانی اردو کو پڑھنا از خود ایک مشکل کام ہے ۔ اس مشکل کے پیش نظر انھوں نے الفاظ پر اعراب لگائے ہیں جس سے عام قاری کے لیے بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے ، طویل فرہنگ سے انتخاب کی تدریسی اور تعلیمی حیثیت بھی بڑھ گئی ہے ۔ طباعت خوب صورت اور دیدہ زیب ، قیمت صرف پانچ روپے پچاس پیسے ہے ۔ مکتبہ جامعہ دلّی ، بمبئی ، علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ (ع ۔ د)

☆

انتخاب سر سیّد :

تصحیح و ترتیب : انور صدیقی
ناشر : مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سر سیّد ہندوستانی مسلمانوں میں عہد آفریں شخصیّت کی
کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادبی، مذہبی، تعلیمی اور دنیوی، غرض ہر میدان
میں سر سیّد نے جو کچھ یادگار چھوڑی ہے وہ دوم درجہ کی چیز قطعاً نہیں۔
انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جو بھرپور
کوشش کی ہے اس کے نمونے ان کے ادبی مضامین، مذہبی و دینی
مقالات اور تعلیمی اور سیاسی تقاریر میں جا بجا نظر آئیں گے۔ ہندوستانی
مسلمانوں کی تہذیب و تعلیم سے ان کا یہ شغف مثالی ہے۔ اس
عہد آفریں شخصیت نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی زندگی کی سُست
رفتاری اور ترقی کو محسوس کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ خود عملی قدم
اٹھایا بلکہ ایک ایسا حلقہ پیدا کیا جو اس مقصد میں ان کا ہاتھ بٹا
سکے۔ حالی، شبلی، ذکاء اللہ، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کسی نہ کسی طرح
سر سیّد کے حلقہ سے وابستہ رہے، ان کی آواز میں سر سیّد کی آواز کی
بازگشت سنائی دیتی ہے۔ فی زمانہ سر سیّد پھر ایک مستقل موضوع بن کے
سامنے آئے ہیں۔ ایسے میں انتخاب سر سیّد ان کے پرستاروں کے
لیے ایک حسین تحفہ ہے جسے مکتبۂ جامعہ نے "معیاری ادب" کے سلسلے
کی کتابوں کے تحت سجایا ہے۔ یہ مضامین مجلس ادب، لاہور کے
مقالات سر سیّد کی بنیاد پر مرتب ہوئے ہیں تاہم مرتّب کی وضاحت
کے مطابق انھوں نے ان "مقالات سر سیّد" کی کمزوریوں سے اپنے آپ
کو بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ انتخاب متنوع موضوعات پر
پھیلا ہوا ہے، جس سے سر سیّد کی ادبی حیثیت اور ان کی نثر نگاری
کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک مضمون ہندو مسلم
اتحاد سے متعلق بھی ہے۔ اس موضوع پر سر سیّد کے متعدد مضامین یا
اقتباسات ہیں۔ حالات جو کروٹ لے رہے ہیں اس کے پیش نظر اچھا ہوتا
اگر ایک حصّہ اس قسم کے مضامین یا اقتباسات کے لیے مخصوص کر دیا جاتا
تاکہ قارئین کے سامنے سر سیّد کا سیکولر کردار اُبھر آتا۔ ابتدا میں
انور صدیقی صاحب کا مقدمہ ہے جس میں سر سیّد کی شخصیت کا عمدہ
تعارف پیش کیا ہے۔ اس سلسلے کی ہر کتاب کی طرح اس کتاب کی
طباعت بھی جاذب نظر ہے۔ سر سیّد کی زبان سمجھنا اب ہر شخص کے لیے
آسان نہیں، لہٰذا آخر میں ایک مختصر فرہنگ بھی ہے تاکہ اس کی مدد
سے سر سید اور قاری میں رشتۂ ترسیل برقرار رکھا جا سکے۔ (ع۔د)

مجموعۂ کلام: حروف

شاعر: بدیع الزماں خاور
صفحات: ۱۱۲ ، قیمت: چار روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتا: پی۔ کے پبلیکیشنز، دہلی ۔ ۶

خاور بانکوٹی کا نام اردو والوں کے لیے نیا نہیں، وہ جانے پہچانے ہیں اور ان کا کلام ہندوستان کے اکثر اردو رسایل میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتا رہتا ہے۔ اب تک ان کا کوئی مستقل مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اب پہلی بار پریم گوپال متل کے اہتمام سے ان کا یہ پہلا مجموعۂ کلام شایع ہوا ہے۔

حروف میں خاور کی تقریباً چالیس نئی نظمیں، تیس غزلیں اور متفرق اشعار ہیں، جو بہت زیادہ نہیں مگر ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں ہماری پوری طرح رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں تا حدِ نظر فطری سادگی اور قدرتی مناظر کے سوا کچھ نہیں، اوپر صاف شفاف آسمان، نیچے لہلہاتے ہرے سبزہ زار اور سامنے ٹھاٹھیں مارتا سمندر، اسی لیے ہمیں ان کی نظموں میں کہسار، ندی نالے، چاند، سورج، ستارے، ساحل، سمندر، باغ، پھول، بھونرے، جھاڑیاں، جگنو اور ان سے ملتے جلتے دیگر متعدد قدرتی جلووں کی جگہ جگہ عکاسی ملتی ہے۔ مل، دفتر، پکی سڑکیں اور شہر کی ہماہمی ان کو نہیں بھاتی، وہ شہر پہنچ کر اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔

غزلوں میں بھی ان کی یہ فطری سادگی قدم قدم پر کارفرما ہے، گاؤں ان کا محبوب ہے اور گاؤں کے پیڑ، پنگھٹ اور دیے ان کے جذبات کو آسودہ رکھتے ہیں۔ دراصل ان کی پوری شاعری، ان کے صاف ستھرے، سادہ اور فطرت پسند دل کی آواز ہے، جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں بھی گونج اٹھتی ہے۔

ابتدا میں حروف شناسی کے نام سے یونس اگاسکر کا بارہ صفحات کا ایک مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ خاور کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے، اور ان کے فن کے بنیادی محاسن پر روشنی ڈالی ہے، ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ "حروف" نئی شاعری کا ایک نمایندہ مجموعہ ہے، اور ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(حامد اللہ ندوی)

شاعر

سالنامہ ۷۲ ، مرتب: اعجاز صدیقی،
صفحات: ۳۸۲ ، قیمت: پانچ روپے،
ملنے کا پتا: ماہنامہ شاعر، مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۷، بمبئی ۔ ۸، بی۔ سی۔

ہندوستان کے اردو رسایل میں صرف شاعر ہی ایک ایسا رسالہ ہے جو عام گروہ بندیوں سے الگ اپنا ایک منفرد ادبی معیار رکھتا ہے اور اپنے وقیع و ضخیم نمبروں اور سالناموں کے لیے مشہور ہے، ہر سال اس کا ایک نہ ایک اہم نمبر یا سالنامہ منظر عام پر آتا ہے اور اپنی شاندار روایات کا عکس ہمیشہ کے لیے دلوں پر چھوڑ جاتا ہے۔ اب تک کرشن چندر نمبر، غالب نمبر، افسانہ و ڈراما نمبر، ناولٹ نمبر کے نام سے اس کے متعدد خاص نمبر اور سالنامے شایع ہو چکے ہیں۔ یہ سالنامہ بھی اسی شاندار روایت کا ایک عکسِ جدید ہے۔

اس سالنامے میں اردو کے اکثر مشہور و ممتاز قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ ان میں مقالات بھی ہیں، نظمیں بھی ہیں، کہانیاں بھی ہیں، غزلیں بھی ہیں، طنز و مزاح، ڈرامے اور ناول کے ابواب بھی ہیں، ہر حصہ کا ایک علمی، ادبی، فنی اور فکری معیار ہے اور اس کے سارے قلم کار اپنی نمایندہ تخلیق کے ساتھ اس میں شامل ہوئے ہیں۔

فاضل مرتب ادب میں نئے، پرانے، ترقی پسند، تعمیر پسند کسی بھی پسند و ناپسند کے قایل نہیں ہیں، تخلیق کار چاہے جس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ ادب کی خدمت کرتا ہے تو اس کو وہ قلم کار سمجھتے ہیں اور سب کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمیں شاعر میں

ہر قسم کا بہترین ادب ملتا ہے اور ہر اہم تخلیق کار کی تخلیق سے اس کا دامن مالا مال ہوتا ہے۔ حسب معمول اس سالنامہ میں بھی ہر مکتبِ فکر و خیال کی نمایندگی کرنے والی اہم تخلیقات شامل ہیں۔

جرعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مرتب کو اس سالنامہ کی تیاری میں آغازِ کار سے اس کی تکمیل تک بے حد دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اردو دنیا شعر و ادب کے اس حسین تحفہ کو دل و جان سے خوش آمدید کہے اور انھیں ان کی محنت کا بھرپور صلہ دے۔

(حامد اللہ ندوی)

شگوفہ زار : خواجہ عبد الغفور

قیمت : دس روپے

پچھلے دنوں لطائف پر مشتمل ایک کتاب کا کافی چرچا رہا ہے۔ مختلف رسایل و جراید میں اس کتاب کے لطیفے اور دلچسپ ٹکڑے گردش کرتے رہے ہیں۔ جن لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ اب تک اس کے چٹخارے کو یادوں کی طرح دہرا رہے ہوں گے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے میں خواجہ عبد الغفور کی اوّلین کتاب "قہقہہ زار" کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ تو پرانی بات ہوگئی۔ ذکر چل رہا ہے "یادوں کی برات" کا۔ خواجہ عبد الغفور کی تازہ کتاب اور جوش کی "یادوں کی برات" میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے طنز و مزاح کی اقسام و اصناف کا سلسلہ وار تعارف کراتے ہوئے ہر ایک کی مثالیں دے کر بات کو پُر لطف بنایا ہے جب کہ جوش نے اس قسم کے کسی التزام کو مدّنظر نہیں رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جوش نے یادوں کا سہارا لیا ہے اور خواجہ صاحب نے نوٹس کا۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کی زبان اچھی ہے اور موخّر الذکر کے لطیفے۔

انگریزی میں لطیفوں اور چٹکلوں پر مشتمل جوک بکس کا وجود اور عام چلن ہے۔ اس قسم کی کتابوں کے مرتّبین میں لیو گولڈن، آرک لنک لیٹر، بجے بلر، جیک ڈگلس اور مسز ایبی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اردو میں ادیبوں / شاعروں کے لطیفے کافی جمع کیے گئے ہیں لیکن اصنافِ مزاح کے نمونے اکٹھا کرنے کی غالباً یہ پہلی کوشش ہے۔ شاید اسی لیے یہ کتاب افراتفری کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکی ہے مثلاً طنز، ہجو، ہزل، پھبتی کے ساتھ ساتھ صنفیات، جنسیات اور اَمرد پرستی کو بھی مزاح کے اصناف میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح مراٹھی کی لاونی اور پواڑے کا بھی اس فہرست میں شامل کیا جانا محلِّ نظر ہے، لیکن مجموعی طور پر ہنسنے ہنسانے کے دلدادہ شائقین کے لیے "شگوفہ زار" اپنے اندر کئی زعفران کے کھیت چھپائے ہوئے ہے۔

ابتدا میں مُرتّب کا پیش لفظ اور کرشن چندر کا تعارف بھی شاملِ کتاب ہے۔ نیز انگریزی اصطلاتِ مزاح کے اردو مُرادفات بڑی محنت سے تلاش کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اس لطیفوں بھری کتاب میں ایک سنجیدہ حرکت یہ کی ہے کہ اغلاط نامہ بھی جوڑ دیا ہے۔ سائز ڈیمی، ۳۱۸ صفحات اور قیمت دس روپے ہے۔ ملنے کا پتا درج نہیں۔ (کسی کُتب فروش کے پاس تلاش کیجیے)۔

(بے۔ الف)

گوش برآواز

۱۳ نومبر ۱۹۸۲ء

مجلہ نقش کوکن کا مشترک عید و دیوالی نمبر آج کی ڈاک سے موصول ہوا۔ کرم فرمائی کا پُرخلوص شکریہ۔

اِس دور کی مسموم فضا میں جب کہ "فرقہ پرست" نوجوان طبقہ یک جہتی واتحاد کے شیرازے کو پارہ پارہ کرنے پر تُل گیا ہے آپ کی جد وجہد وکوشش لائق تحسین وقابل ستائش ہے۔ ایسے نازک موقع پر جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو بڑے تہوار "عید رمضان" اور "دیوالی" ایک ساتھ آئے ہیں، نقش کوکن کا مشترک عید اور دیوالی نمبر شایع کرنا قومی یک جہتی اور اتحادِ مشترکہ کے لیے فالِ نیک ہے۔

بانی مسلم یونیورسٹی سر سید احمد خان صاحب کا سبق آموز مکتوب گرامی، عوامی شاعر حضرت نظیر اکبرآبادی، حضرت شاکر ناطقی دراں احمد سرور صاحب کی عید رمضان اور دیوالی پر نظمیں موزوں اور مناسب ہیں، اور آپ کی نظرِ انتخاب، تعریف سے مستغنی ہے۔ علم الدین سالک کا تاریخی مضمون "دلّی کی خونیں عید" ایک دردناک خونچکاں داستانِ الم ہے جو قاری پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بہاراشٹر کے جانے پہچانے فن کار یونس اگاسکر کا افسانہ "سمیر بھارتی کا اکلا نارل" دل چسپ اور سبق آموز ہے۔ جاں نثار اختر پر محمد ایوب واقف صاحب کا انتقادی مضمون "فن اور شخصیت" قارئین نقش کوکن کو اختر صاحب کی فنّی خوبیاں سمجھنے کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ یے۔ الف کا ترتیب دیا ہوا پس منظر محاوروں، کہاوتوں، فقروں، اشارات، تلمیحات، تفریحات اور تشریحات کا دل چسپ مرقع ہے۔ یہ مضمون انھوں نے بڑی جستجو و تلاش بسیار کے بعد محنت و عرق ریزی سے مرتّب کیا ہے۔ جو مبتدیوں کے علاوہ عام پڑھے لکھے حضرات کے لیے بھی معلومات کا خزینہ ہے۔ مجھے یقین ہے یے۔ الف صاحب اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

سازو آہنگ کے تحت قطب شاہ کا کلام پیش کر کے دَورِ متقدمین کے شاعر سے قارئین نقش کوکن کی واقفیت کے لیے آپ نے بڑا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس باب کو جاری رکھیے اور ہر ناواقف قاری کو مستفید و مستفیض ہونے کا موقع دیجیے۔

نقد و نظر کے تحت "ترتیل القرآن و تجوید القرآن" پر مولانا ظہیر صاحب شہاب کا تبصرہ کام کی چیز ہے۔ مولانا شہاب صاحب کے تبحرِ علمی اور فنّی معلومات کا ہر دانشور معترف ہے اور دنیائے ادب میں آپ کا ایک خاص مقام ہے — غزلوں میں ظفر الاسلام ظفر، غادر اور آزاد کا کلام مجھے پسند آیا۔ غرض یہ مشترک نمبر صوری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے معیاری و معلوماتی ہے۔

نقش کوکن کے عید و دیوالی نمبر کی اس پیش کش پر مدیر اعزازی ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب، مجلسِ مشاورت اور ادارہ کے تمام ارکان کی خدمت میں خلوص دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

مخلص، بیتاب آبانی

"نقش کوکن" کا عید نمبر نظر سے گزرا۔ یہ پرچہ پہلے کے مقابلے میں کافی ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔ مُبارکباد قبول فرمائیں۔ تازہ شمارے میں ایک غزل کسی عثمان عادل صاحب کی نظر آئی۔ یہ صاحب اس سے پہلے بھی مذکورہ بالا نام سے اپنی غزلیں وغیرہ مختلف اخبارات میں چھپواتے رہے ہیں۔ نیز میرے قریبی ذرایع کی اطلاع کے مطابق یہ صاحب اچھی طرح واقف ہیں کہ عثمان غنی عادلؔ کے نام سے میں تقریباً پندرہ سال سے مضامین نظم و نثر لکھتا آیا ہوں۔ (اگر چہ اب اس کے لیے ایسے مواقع کم ہی ملتے ہیں) لیکن معلوم نہیں اس سے واقف ہونے کے بعد بھی انھیں یہ شوق کیوں ہے کہ ان کا کلام اسی نام سے شایع ہو اور غلط فہمی کا موجب بنے۔
توقع کی جانی چاہیے کہ ایک شعر تخلیق کرنے والا ذہن اپنا ایک تخلص بھی تخلیق کرنے سے قاصر نہیں رہے گا۔

راقم
عثمان غنی عادلؔ

"نقش کوکن" کا عید اور دیوالی کا مشترکہ نمبر نظر نواز ہوا۔ اس سے پہلے کے شمارے بھی برابر ملتے رہے ہیں۔ اس نوازش کے لیے زبانِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس شمارے میں گوشہ برآواز کے تحت غلام مصطفٰی صاحب کا خط نظر سے گزرا۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے ان کی تجویز کو سراہتے ہوئے انھیں کے خط سے اس سلسلہ کا آغاز فرمایا ہے۔ اس سے قارئین اور ایڈیٹر کے درمیان جو تعلق پیدا ہوگا اس سے قارئین کے مزاج اور ذوق کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ نیز پرچے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور معیاری بنانے میں آپ کو مدد ملے گی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خدشہ بھی ہے کہ کہیں یہ سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ وہ لوگ ایڈیٹر کی بے جا خوشامد کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ جو صرف چاہتے ہیں کہ
بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجیے

لیکن آپ اور آپ کی مجلس ادارت سے توقع ہے کہ آپ حضرات کبھی کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں گے اور پرچے کے معیار کو بلند کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔

جب سے آپ حضرات نے "نقش کوکن" کا بارِ گراں اٹھانے کی ذمہ داری قبول کی ہے، پرچے کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے۔ کتابت و طباعت کے ساتھ ساتھ تخلیقات کا معیار بھی کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ یونس صاحب نے تلمیحات و ضرب الامثال کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ نقش کوکن کے لیے زیادہ سے زیادہ خریدار فراہم کریں تاکہ اس کا معیار اور بھی بلند ہو سکے۔

خلوص کیش
فیضی نظام پوری

رسالہ نقش کوکن کا مطالعہ برسوں سے کرتا رہا ہوں۔ چند مہینوں سے آپ نے اسے جو نیا روپ عطا کیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہے، ساتھ ہی آپ نے جو خوشگوار اضافے کیے ہیں وہ اس کی بقا کے ضامن ہیں۔

محمد رفیع انصاری

اخبار و افکار

جامع مسجد رتناگیری میں نمازِ شبینہ

جامع مسجد رتناگیری میں ماہِ صیام کی ۲۷ اور ۲۸ ویں شب میں نفل نمازوں میں ہر رات قرآن کے پندرہ پارے مولانا حافظ حسن الہ آبادی، مولانا حافظ غلام نبی اور مولانا حافظ وقاری محمد اقبال ندوی صاحب نے تلاوت فرمائے اور دو راتوں قرآن شریف ختم کیا۔ یہ شبینہ رتناگیری شہر اور اس کے مضافات میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے پہلا موقع تھا لہٰذا اس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت فرمائی۔۔۔

ہر شبینہ کے خاتمہ پر ہوٹل میں روزہ داروں کے لیے سحری کا خاص انتظام رتناگیری کے ہردلعزیز اور فیاض تاجر جناب محمود سیٹھ نائیک صاحب کی جانب سے کیا گیا تھا۔ جامع مسجد رتناگیری کے پیش امام مولانا محمد اقبال ندوی صاحب نے یہ شبینہ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے، اور یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔۔

قلابہ ضلع رتناگیری کانگریس کمیٹی کا انتخاب

۱۱ نومبر ۷۲ء کو بمبئی ضلع قلابہ میں وزیر قانون عالی جناب عبدالرحمٰن انتولے صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں بیرسٹر انتولے صاحب نے شری جی ایل پاٹل (ایم ایل اے) کا نام ضلع کانگریس کمیٹی کی صدارت کے لیے پیش کیا۔ رکن پارلی منٹ شری شنکر راؤ ساونت نے اس کی تائید کی اور تمام حاضرین نے بالاتفاق رائے اسے منظوری دی۔ نائب صدر کے عہدہ پر ڈاکٹر کاکا پاٹل، خزانچی جناب داؤد آدم راؤت اور سکریٹریز شری بالا صاحب آریکر اور پربھاکر گنگا رام پاٹل منتخب ہوئے۔ ورکنگ کمیٹی میں حسب ذیل حضرات شامل ہیں: بیرسٹر انتولے، شنکر راؤ ساونت، بھائی شیٹے، حسین محمد وانگارے، کانتی لال بھاٹیہ، صابلے سیٹھ، چندرکانت دیشمکھ، شریمتی نلنی بائی کولی، پانڈورنگ بھوئر، ڈاکٹر تلک، رویندر راؤت اور نامدیو کھیڑے۔

بھاٹین کھاڑی (رتناگیری) پر پل کی تجویز

مورخہ ۳۰ اکتوبر ۷۲ء کو وزیر تعمیرات وذیلی بندرگاہ حکومتِ مہاراشٹر جناب بیرسٹر جناب عبدالرحمٰن انتولے صاحب جب رتناگیری کے دورے پر تھے تو گاؤں کھیڑی، فنصوپ، میریا باڑیس و دیگر قصبات کے سرپنچ، اسی طرح تعلقہ پنچایت کے سبھاپتی ساولی اور ضلع پریشد کے رکن بھائی ساونت وغیرہ نے ایک دستخطی میمورنڈم وزیر موصوف انتولے صاحب کی خدمت میں پیش کیا جس میں بھاٹین کھاڑی پر پل کی تعمیر اور "رن پار" بندرگاہ کو جہازرانی کے لیے بارہ ماہی استعمال کے قابل بنانے کی پرزور تجویزیں ہیں۔

عازمین حج کو ہدیۂ مبارکباد

تنظیم المسلمین گھاٹیوالا ضلع رتناگیری کے زیر اہتمام ناگپاڑہ نمبر ۲ ہاؤس میں منعقدہ ایک جلسۂ عام میں جناب عبدالرحیم عباس کونڈکری (متوطن گھاٹیوالا)، جناب عطاءالرحمٰن حاجی عبداللطیف عصف (متوطن ساٹولی) اور جناب قاضی حسن (متوطن شرگاؤں) کی حج بیت اللہ کے روانگی پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہوئے گلپوشی کی گئی۔ جلسہ میں کثیر تعداد میں لوگ شریک تھے۔ جناب داؤد عبدالرحمٰن پاؤسکر اور جناب عبدالرحیم نے حاضرین کا استقبال فرمایا۔

موضع دھامندیوی میں ٹیلیفون

مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء، گاندھی جینتی کے موقع پر موضع دھامندیوی، تعلقہ کھیڑ میں ٹیلیفون کا افتتاح عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب میں دھامندیوی کے سرپنچ جناب عباس میاں عبدالقادر فرے و دیگر حضرات شریک تھے۔

ٹیلی فون نمبر ۱۸۴ چپلون ایکسچینج ۔

داپھول ایجوکیشنل سوسائٹی کا عظیم الشان اور کامیاب قوالی پروگرام

۹ نومبر ۷۲ء کو صابو صدیق گراؤنڈ پر داپھول ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے یوسف آزاد (اصلی) اور حاجی بابو کی قوالی کا ایک شاندار پروگرام انجام پایا۔ مذکورہ جشن قوالی کی صدارت عالیجناب ڈاکٹر رفیق زکریا (وزیر صحت) نے انجام دی۔ جناب امین کھنڈوانی صاحب (میونسپل کارپوریشن کی کانگریس پارٹی کے لیڈر) نے جشن کا افتتاح کیا۔ ریتی بن ورکس کے جناب عباس بھائی بڑودہ والا صاحب چیف گیسٹ کی حیثیت سے شریک جشن تھے۔ علاوہ ازیں جناب اسحٰق جمخانہ والا جناب محمد علی میٹھا جناب ڈاکٹر عبدالکریم نائیک۔ جناب سی آر ڈگرودز (میونسپل کونسلر) جناب لے اے تامبے۔ جناب زین الدین موٹر والا فلم اسٹار محترمہ ناظمہ جناب احمد بٹی جے پی اور ایڈیٹر اردو ٹائمز جناب شہریار عابدی نے معزز مہمانان کی حیثیت سے حاضر رہ کر پروگرام کو رونق بخشی۔ جناب علی ایم شمسی نے اناؤنسنگ کے فرائض نہایت بہتر طور پر انجام دیے۔ داپھول ایجوکیشنل سوسائٹی ان تمام حضرات کی شکر گزار ہے جنھوں نے پروگرام کو کامیاب بنانے میں پورا پورا تعاون کیا۔

شعبان امیر پلمبے — اعزازی جنرل سکریٹری — داپھول ایجوکیشنل سوسائٹی

"ایشیا ۸۲" میلے میں شریک ہونے والے ممالک

بھارت میں ۳؍ نومبر سے تیسرے ایشیائی عالمی تجارتی میلے کا آغاز ہوا۔ اس میں پانچ برِاعظموں کے ممالک حصّہ لے رہے ہیں۔ جن برِاعظموں کے ممالک اس میں شریک ہوں گے، ان کے نام ہیں: ایشیا، افریقہ، یورپ، شمالی اور جنوبی امریکہ اور اوشینیا اس میلے میں شریک ہونے والے ممالک کے نام درج ذیل ہیں:

ایشیا : ۱۔ افغانستان۔ ۲۔ بنگلہ دیش۔ ۳۔ بھوٹان۔ ۴۔ برما۔ ۵۔ انڈونیشیا۔ ۶۔ عراق۔ ۷۔ جاپان۔ ۸۔ ری پبلک آف کوریا۔ ۹۔ کویت۔ ۱۰۔ ملائیشیا۔ ۱۱۔ نیپال۔ ۱۲۔ عوامی جمہوریہ منگولیا۔ ۱۳۔ فلپائن۔ ۱۴۔ سری لنکا۔ ۱۵۔ عمان۔ ۱۵۔ ترکی۔ ۱۷۔ تھائی لینڈ۔

افریقہ : ۱۔ الجیریا۔ ۲۔ گنی۔ ۳۔ کینیا۔ ۴۔ لیبیا۔ ۵۔ موریشس۔ ۶۔ سوڈان۔ ۷۔ تنزانیہ۔ ۸۔ زمبیا۔

یوروپ : ۱۔ آسٹریا۔ ۲۔ بلجیم۔ ۳۔ بلغاریہ۔ ۴۔ سائپرس (قبرص) ۵۔ چیکوسلواکیہ۔ ۶۔ جرمنی کی وفاقی جمہوریہ۔ ۷۔ فرانس۔ ۸۔ جرمنی ڈیموکریٹک ری پبلک۔ ۹۔ ہنگری۔ ۱۰۔ اٹلی۔ ۱۱۔ پولینڈ۔ ۱۲۔ رومانیہ۔ ۱۳۔ اسپین۔ ۱۴۔ سویڈن۔ ۱۵۔ روس۔ ۱۶۔ یوگوسلاویہ۔

شمالی اور جنوبی امریکہ : ۱۔ برازیل۔ ۲۔ کینیڈا۔ ۳۔ پیرو۔

اوشینیا : ۱۔ آسٹریلیا۔ ۲۔ فجی۔ ۳۔ نیوزی لینڈ۔

مہاراشٹر قلت امداد کمیٹی

وزیرِاعلیٰ شری وی۔ پی۔ نائیک کی زیرِصدارت ایک ۳۵ رکنی مہاراشٹر قلت امداد کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ شری رجنی پٹیل صدر بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی اس کمیٹی کے صدر نشین اور سرو شری آر۔ کے گنا ترا، میئر؛ پی۔ کے۔ ساونت، صدر ایم پی سی سی؛ اروند سفت لال؛ ڈی۔ بی۔ پاٹل (ایم۔ ایل۔ اے)؛ اے۔ ٹی۔ پاٹل (ایم۔ ایل۔ اے)؛ رام ناتھو پوار اور مادھوا پیٹے اس کے نائب صدور ہیں ـــ کمیٹی کے دیگر ممبران یہ ہیں: شری وسنت راؤ داد پاٹل (وزیر آبپاشی و پاور)۔ شری ایس۔ بی۔ چوہان (وزیر زراعت) شری ایم۔ ڈی۔ چودھری (وزیر مالیات)۔ شری این۔ ایم۔ تیڈکے (وزیر صنعت)۔ شری ایچ۔ جی۔ ورتک (وزیر محصول)۔ شری آر۔ آر انتولے (وزیر عمارات و مراسلات)۔ شری ایس۔ جی۔ پوار (وزیر ریاست برائے داخلہ)۔ شری ایس۔ آر دماتی؛ ڈاکٹر کے۔ کے دلتے؛ شری جی۔ پی سی؛ ڈاکٹر ایل۔ ایچ۔ ہیرانندنی؛ ڈاکٹر آر۔ کے مینڈا؛ شریمتی پی۔ پی۔ دالا واکلر؛ شری ایم۔ وی۔ پرانجپے؛ شری وسنت ہوشنگ شری دلیپ کمار؛ شری جسونت ٹھکر؛ شری گن ونت کاپڑیا۔ شری دیوجی رتن سی (خزانچی)۔ شری نریندر کاپڑیا۔ شری منوبھائی بھیمانی۔ شری آر۔ کے کلکرنی؛ شری ڈی۔ ڈی۔ منگرڈے شری اجیت مہتا اور شری نانا چوداساما (تمام سیکریٹریاں)ـــ

عید ملن

کوکنی مسلم یونیٹی سینٹر کرلا ممبئی ۷۰ کے زیرِ اہتمام ۱۲؍ نومبر کی شام میں کارٹیکا ہائی اسکول کے ہال میں عید ملن کا شاندار پروگرام ہوا، جس کی صدارت رئیس کرلا کاچ ابراہیم چوناوالا صاحب نے فرمائی، عید ملن کے اس دلکش پروگرام میں مشہور شاعر جناب اختر راہی کا مجموعۂ کلام "ابن آدم" کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔ کامریڈ عبدالجبار، جناب ابراہیم فطرت (مدیر قیادت) اور جناب بادل سولکر (اسسٹنٹ گورنمنٹ پلیڈر) بطور مہمان خصوصی شریک محفل تھے۔ آپ نے پروگرام کی اہمیت، افادیت اور اختر راہی کی شخصیت و شاعری پر سیر حاصل تقریریں کیں۔ "ابن آدم" کے افتتاح کے بعد ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ یونیٹی سینٹر کے جوائنٹ سکریٹری جناب علی امام شمسی صاحب، جن کی استقبالیہ اور تعارفی تقریر کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا تھا، اپنی مصروفیت کی بنا پر زیادہ دیر رک نہیں سکے لہٰذا مشاعرہ کی اناؤنسنگ جناب فقیر محمد مستری صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ کوکن کے ابھرتے ہوئے جواں فکر شاعر جناب محشر پانگولی کی

غزل سے مشاعرہ کا آغاز ہوا اور جناب محمود درّانی، مرزا عزیز جاوید، اختر راہی، کامل ہینداسے، محمود الحسن ماہر اور یعقوب راہی نے اپنے کلام سُناکر بھرپور داد حاصل کی۔ جناب پٹیل (مالک تلوجہ ہوسٹل) شعر و سخن سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور پیرانہ سالی کے باوجود شریکِ محفل تھے۔ آپ نے بھی چند اشعار سُناکر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں مشہور و مقبول فنکار سلیم ڈلیپ نے اپنے مزاحیہ اور فکری آئیٹم پیش کیے اور حاضرین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس طرح یہ رنگارنگ پروگرام شب کے ساڑھے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔ پروگرام کا حسنِ انتظام جناب عبدالرحمٰن رٹھویلکر، ایچ۔ بی۔ مقدم، اختر راہی اور عبدالوہاب دلوی کا رہینِ منّت تھا۔

بہادر شیخ ایسوسی ایشن کا تہنیتی جلسہ

بتاریخ ۱۵ نومبر ۷۲ء کی شب میں بہادر شیخ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام پروفیسر دادرکر صاحب کی صدارت میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر عبدالکریم نائیک صاحب کو جے۔ پی کا اعزاز پانے پر، ڈاکٹر نور محمد پٹیل کو ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے پر، احمد شہاب الدین وانگڑے کو بی ایس سی کے امتحان میں درجۂ اول حاصل کرنے پر، جناب شیخ احمد اسماعیل وانگڑے (سرپنچ) کے تعلقہ پنچایت کے لیے چُنے جانے پر اور جناب داؤد محمد حسین سنگے کی اترپتے کے لیے روانگی پر مبارکباد پیش کی گئی — اور نیک دعاؤں کے ساتھ گلپوشی ہوئی۔

ایسوسی ایشن کے صدر جناب عبدالقادر حسن وانگڑے نے ڈاکٹر عبدالکریم نائیک کی سماجی و تعلیمی خدمات کو سراہا اور ڈاکٹر پٹیل، جناب شیخ احمد وانگڑے اور جناب داؤد سنگے کی قومی خدمات کی تعریف کی۔ ڈاکٹر عبدالکریم نائیک کی تقریر اور پروفیسر دادرکر صاحب کے عالمانہ خطبۂ صدارت کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

★

بی پی سی سی کا انتخاب

مورخہ ۲۵ نومبر ۷۲ء کے انتخابی جلسہ میں شری رجنی پٹیل بلامقابلہ بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے جو سات نئے نائب صدر چُنے ہیں ان میں شری سانٹ، بائی عبداللہ اور (ایم پی) بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نجمہ ہبت اللہ اور سید محمد زیدی جوائنٹ سیکریٹریز کی حیثیت سے چُنے گئے۔

جو ستّر ارکنی ایگزیکیٹو کمیٹی چُنی گئی اس میں مرکزی وزیر قانون شری ایچ۔ آر۔ گوکھلے، مرکزی وزیر ریلوے ٹی۔ اے۔ پائی، وزیر نشہ بندی ڈاکٹر رپوپٹ کے ساتھ جناب احمد زکریا اور عمر قاضی بھی شامل ہیں۔

بمبئی پردیش کانگریس کو ۴۸ ڈسٹرکٹ میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ۴۴ ڈسٹرکٹ صدر خواتین چُنی گئی ہیں۔ عمر کھاڑی ڈسٹرکٹ میں ایڈوکیٹ ایم ایس ونو نائب صدر ہیں۔ اسی حلقہ سے جناب ایس ایم زیدی بی پی سی سی کے لیے بلامقابلہ منتخب ہوئے۔

ٹائیگر: ہمارا قومی جانور

وائلڈ لائف سے متعلق بھارتی بورڈ نے ٹائیگر (شیر) کو بھارت کا قومی جانور قرار دیا ہے۔ اس طرح ٹائیگر نے شیر ببر کی جگہ لے لی ہے جو ۱۹۷۷ء سے بھارت کا قومی جانور مانا جاتا رہا ہے۔

بھارت میں اس وقت ۱۷۷ شیر ببر موجود ہیں جبکہ ٹائیگروں کی تعداد دو ہزار ہے۔ ٹائیگر ملک کی تقریباً دس ریاستوں میں پایا جاتا ہے جب کہ شیر ببر صرف گجرات تک ہی محدود ہے — گذشتہ دو صدیوں کے دوران بھارتی جنگلوں میں ٹائیگر ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے قومی جانور منتخب کر لیا گیا ہے۔ ٹائیگر کو قومی جانور قرار دیے جانے کی دوسری اہم وجہ سائنسی، اقتصادی، جمالیاتی، ثقافتی نقطۂ نظر سے اس درندے کی آبادی کا خطرہ ہے — ۱۹۰۰ء میں ملک میں پچاس ہزار ٹائیگر موجود تھے جن کی تعداد اب بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ ٹائیگروں کی نسل بڑھانے کی غرض سے گذشتہ سال ان کے شکار پر پابندی عاید کر دی گئی ہے۔

پھل توڑنے والے ایک نئے اوزار کی ایجاد

رتناگیری کی ایک انجینئرنگ فرم نے پھل توڑنے والا ایک نیا اوزار تیار کیا ہے۔ "ایونیشن انٹلی جنس" ماہ نامہ کے حوالے سے پریس ایشیا کے سائنسی نامہ نگار نے خبر دی ہے کہ یہ اوزار دیہاتوں میں استعمال ہونے والے عام اوزار کی بنیاد پر ہی تیار کیا گیا ہے۔

اس اوزار میں دو تیز دھار والے چاقو لگے ہوئے ہیں جو پھلوں کو بڑی صفائی سے ڈالی سے الگ کر کے انھیں ایک جال میں جمع کرتے ہیں۔ اس نئے اوزار کی وجہ سے پھل خراب بھی نہیں ہوتے اور کم سے کم وقت میں زیادہ پھل توڑ لئے جاتے ہیں۔

مستری ہائی اسکول کے کامیابی کا شاندار ورق

امسال مدرسہ ہذا سے ہندی راشٹر بھاشا پونہ کی پہلی اور دوسری امتحان کے لیے ۵۰ اور ۴۱ طلبا شریک تھے جن میں علی الترتیب ۵۴ اور ۱۷ نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ خصوصیت سے رتناگیری سینٹر میں پہلی کے دو نظام آدم مقدم اور جاوید حبیب اللہ قاضی فرسٹ کلاس میں، اور دوسرے نمبر سے کامیاب ہوئے اور دوسری میں رؤوف اسماعیل مایم فرسٹ کلاس میں کامیاب ہونے کے باوجود سینٹر میں پہلا آیا۔ ان دونوں کلاسوں کی رہنمائی اسکول ہذا کے صدر مدرس جناب آئی۔ ڈائے سولکر کی سرکردگی میں قابل اساتذہ جناب اے ای قاضی اور جناب اے ایچ مقدم نے مشترکہ طور پر کی تھی، جو قابلِ مبارکباد ہیں۔ یہ شاندار کامیابی ہائی اسکول کی ترقی کا ایک سنہرا باب ہے اور کارپردازان سوسائٹی کے لیے باعثِ افتخار بھی ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ انگریزی ایلمنٹری اور جونیئر کے لیے بالترتیب ۵ اور ۷ طلبہ شریک امتحان تھے جو تمام کامیاب ہوئے۔ اس کامیابی کے لیے صدر مدرس کے زیر نگرانی یہاں کے دو تجربہ کار اساتذہ جناب عبدالرزاق پٹھان اور محترمہ تاج بیگم نے بڑی جانفشانی سے کام لیا۔

تصویریں کیا کہتی ہیں:

بسم اللہ:

مشہور آرٹسٹ زینب پٹھان کے آرٹ کا ایک نادر نمونہ۔

محترمہ زینب پٹھان کی پینٹنگ کی تیسری نمائش تاج آرٹ گیلری میں اگست ۷۲ء کے آخری ہفتہ میں عوام کی توجہ مرکز بنی ہوئی تھی۔ زینب صاحبہ کو لینڈ اسکیپ سے خاص رغبت ہے، پھر بھی بعض تصویروں میں عربی کتابت کو فنِ مصوری کا حسین جامہ پہنا کر آپ نے انفرادیت قائم کی ہے۔ اسی نمائش کی یہ ایک حسین تصویر جس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو گلدان بنا کر اس میں رنگ برنگی پھول کھلائے ہیں۔

یوسف ڈلیسائی بی اے (آنرز)، ایل-ایل بی

جناب یوسف ابراہیم ڈلیسائی (متوطن چپلون ضلع رتناگیری) نے اپنے وطن میں (یونائیٹڈ انگلش اسکول) ایس. ایس. سی تک تعلیم پائی اور ۱۹۵۰ء میں اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری سے بی اے (آنرز) کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران آپ کالج کے اکنامکس سوسائٹی کے جائنٹ سیکریٹری رہے۔ بی اے کے بعد گورنمنٹ لا کالج سے ایل ایل بی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۵۳ء سے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ کامیابی نے قدم چومے اور ۶۶ء میں آپ کو مہاراشٹر ریوینیو ٹریبونل میں اسسٹنٹ اسپیشل پلیڈر مقرر کیا گیا۔ یہاں بھی آپ نے قانون دانی کے وہ جوہر دکھلائے کہ ۱۹۶۹ء میں مزید ترقی پاکر اسی محکمہ میں اسپیشل گورنمنٹ پلیڈر مقرر ہوئے۔ ۷۰ء میں آپ کو آپریٹیو سوسائیٹیز بمبئی کے آفسر آن ڈیوٹی کا عہدہ ملا۔ اور بقول اقبال:

> تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں *

* ڈلیسائی صاحب اپنی ہمت، لیاقت اور خداداد ذہانت کی وجہ سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے گئے۔ اس وقت آپ کو مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن نے ایڈمنسٹریٹر جنرل و آفیشیل ٹرسٹی حکومت مہاراشٹر کے عہدہ پر منتخب کیا ہے۔ ۲۰ دسمبر ۷۲ء سے آپ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا انھیں اور ترقی عطا فرمائے اور آپ ملک و ملت کی نیز اپنے دیش اور دیش واسیوں کی بہتر خدمت انجام دیں۔

...ed at AJMAL PRESS, Bombay-3. and Published from 44, Jail Road (East), Bombay-9. by Dr. A. M. NAIK M. B. B. S.
NAQSH-E-KOKAN Publication Trust, Bombay-9. Title Cover Printed at AMIN ART PRINTING PRESS, Bomby-9.

ماہنامہ

نقشِ کوہکن

بمبئی

75 PAISE

12-(11)

نقش کوکن بمبئے

جنوری ۱۹۷۲ء
جلد ۱۲ ★ شمارہ ۱

زرسالانہ: ۸ روپے
بیرون ممالک: ۵ اشلنگ برٹش پوسٹل آرڈر
خط وکتابت اور
ترسیلِ زر کا پتہ:
منیجر ماہ نامہ نقش کوکن
۴۳ جیل روڈ ایسٹ ڈونگری
بمبئی ۹
ٹیلیفون: ۳۳۱۵۷۲
قیمت: ۷۵ پیسے

اس شمارے میں

مقام طباعت واشاعت: اجمل پریس بمبئی ۳

توجّہ طلب

لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم رفتہ رفتہ ہندؤوں اور مسلمانوں کو ایک کر دے گی لیکن علی الرغم التوقع (خلافِ توقع) چند سال سے دیکھتے ہیں کہ دونوں قوموں میں الٹی ایک طرح کی مخاصمت سی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اگر یہ مخاصمت صرف طرفین کے عوام میں ہو تو کچھ پروا کی بات نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ اور انلائٹنڈ (روشن خیال) لوگوں کے دلوں میں تکدّر آ گیا ہے۔ یہ باہمی نفاق اگر جڑ پکڑ گیا، ممکن نہیں کہ ملک کو پنپنے دے۔ اس فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے تاریخوں نے جو سرکاری مدارس کے کورس (نصاب) میں داخل ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ بعض مسلمان بادشاہوں نے ہندؤوں کے ساتھ ظالمانہ مدارات کی لیکن کس قوم کی شخصی حکومت میں ایسی مثالیں نہیں ہیں۔ اور اگر بعض مسلمان بادشاہوں نے ہندؤوں پر ظلم کیا تو بعض نے (اور یہ بعض اُن بعض ظالموں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں) ہندؤوں کے ساتھ سلوک بھی ایسے ایسے کیے ہیں کہ کسی گورنمنٹ نے غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ نہ کیے ہوں گے۔ مسلمانوں کی سلطنت میں ظلم متوارث ہوتا تو آج ہندو دوا کو بھی ڈھونڈے نہ ملتے۔ مجھ سے اور سررشتۂ تعلیم کے کسی افسر سے اگر کبھی ملاقات کا اتفاق ہوا تو میں ضرور اُس سے کہہ کر رہوں گا، کہ ایسی تاریخیں بناؤ یا بہ فرمائش بنواؤ اور مدارس میں پھیلاؤ کہ یہ دونوں قومیں پچھلی نااتفاقیوں کو بھلا کر آیندہ صلح کاری سے زندگی بسر کریں۔ مگر میری کون سنے گا اور کیوں سنے گا؟ خدا کرے گورنمنٹ کو خود ہی سوجھ پڑے۔

شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد: موعظۂ حسنہ (خطوط) ص ۲۰۲-۲۰۳

ترتیب

اداریہ

ہندوستانی زبان و ادب نے اُردو اور ہندی کے رُوپ میں ہمارے ملک کی ادبی، علمی، شعری اور تنقیدی سرمایے کو آگے بڑھاکر اس کی تہذیبی اور لسانی قدروں کو پختہ بنیادیں عطا کی ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے تا حال ہمارے ادب میں مختلف تجربے کیے گئے، نئے موضوعات سامنے آئے، زندگی میں سُرعت سے تبدیلی کے ساتھ نئے اندازِ فکر نے جگہ لی اور اس طرح نئے عصری تقاضوں کے ساتھ ایک نظریے کے بعد دوسرا نظریہ جنم لیتا رہا۔ ہماری زبان و ادب نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور زبان و ادب سے متعلق ہمارے سوچنے سمجھنے کے طریقے بدلنے لگے۔ ہمارے طرزِ فکر کی اس تبدیلی پر چند مغربی نظریوں کے اثرات بہت دُور رس ہیں۔ اُردو ادب میں تنقید اور تحقیق کو نئے نظریات سے ہم آہنگ کرنے میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی علمی بصیرت کو بڑا دخل رہا ہے۔ حالی اور شبلی کی روشن کی ہوئی تنقیدی اور تحقیقی راہ کو جدید دَور میں جنھوں نے مزید روشنی دکھائی ان میں احتشام صاحب کو امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔ انھوں نے پُرانی قدروں کے احترام کے ساتھ اور قدیم روایتوں کے پیشِ نظر بہت متوازن طریقے پر نئے نظریوں کو اپناتے ہوئے تحقیق و تنقید میں نئی راہ اختیار کی تھی۔ وہ قدیم ادب کے رسیا اور پرستار بھی تھے اور نئے رُوپ کے شیدائی بھی۔ قدیم و جدید کی اس متوازن ہم آہنگی سے احتشام صاحب نے جس ادب کی تخلیق کی، جس نظریے کو آگے بڑھایا اور زبان و ادب کے جانچنے اور سمجھنے کے لیے جو اُصول مُرتّب کیے وہ اُردو زبان کا وقیع سرمایہ ہیں۔ افسوس کہ اُردو زبان و ادب کا یہ سورج یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو غروب ہوگیا۔ احتشام صاحب محض ایک نقّاد اور مُحقّق ہی نہیں تھے۔ ان کی شخصیت پہلو دار تھی، وہ افسانہ نگار بھی تھے، شاعر بھی تھے، تحریر اور تقریر دونوں کے دھنی تھے، بہت بڑے ہمدرد تھے، رہنما تھے اور ان سب سے بڑھ کر بہت بڑے انسان تھے۔ احتشام صاحب مختلف ادبی اور تہذیبی اداروں سے بھی متعلق رہے، ترقیٔ اُردو بورڈ کے رہنما تھے، ساہتیہ اکاڈمی کے ممبر تھے اور انجمن ترقیٔ اُردو کے خدمت گذار تھے۔ وہ لوگ جو اُن کے حلقۂ اثر میں تھے ان کے پرستار تھے ہی، ان کے مخالف بھی ان کی علمیت اور بصیرت کے

قائل تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کی بے وقت موت اُردو زبان و ادب اور اُردو تحریک کا بہت بھاری نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ ہمارے ہاں ان کی دیدہ وری مُسلّم ہے۔ ان کی موت پر اُردو ادب کے ہر طالب علم کی آنکھ بھر آئی ہے اور ہر قاری کا دل تڑپا ہے اور جاننے والے نے ماتم کیا ہے ؎

افسردگی میں ڈوب سی جاتی ہے کائنات
تاباں وہ حادثہ ہے کسی دیدہ ور کی موت

خدا مرحوم کو جنّت نصیب کرے اور اُردو کا کام کرنے والوں کو حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے۔

○

احتشام صاحب کی موت کو ایک ہی دن گذرا تھا کہ ۳ دسمبر کو ہندی کے معروف ادیب، افسانہ نگار اور ڈراما نویس موہن راکیش کے سورگ باشی ہونے کی خبر آئی۔ موہن راکیش ہندی کے بہت بڑے ادیب تھے، پچھلے چند سالوں میں انھوں نے بے شمار ڈراموں اور افسانوں کے ذریعے وہ شہرت حاصل کی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ ان کے ڈرامے مختلف شہروں میں اسٹیج کیے گئے۔ انھوں نے اپنی فن کاری کے ہر گوشے سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ موہن راکیش کی ایک بہت بڑی خوبی جو اُردو اور ہندی کی خلیج کو کم کرتی ہے، ان کی زبان ہے۔ اُردو اور ہندی کی لسانی وحدت اور ایکتا کے لیے راکیش ہمارے رہنما تھے۔ ان کی موت سے ہندی ادب کا جو نقصان ہوا وہ اپنی جگہ پر، اُن کی موت سے ہندوستانی زبان کا بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ خدا مرحوم کی رُوح کو چین اور سکون نصیب کرے۔

پروفیسر سیّد احتشام مرحوم
کی یاد میں
نقش کوکن
شمارہ مارچ ۱۹۷۲ء کو

احتشام نمبر

کی صُورت میں پیش کر رہا ہے۔

قلمی مُعاونین سے گزارش ہے کہ اپنی نثری و شعری کاوشات سے جلد از جلد نوازیں۔

(ادارہ)

مجید لاہوری

انجمنِ تحسینِ باہمی

"عرض کرتا ہوں جناب"
'واہ واہ'
'پھر عطا فرمائیے'
'عرض کی تعریف ہو سکتی نہیں'
'واہ واہ — واہ واہ'
"عرض کرتا ہوں جناب"
'کوئی لا سکتا نہیں اس کا جواب'
"عرض کرتا ہوں حضور"
'واہ واہ — واہ واہ'
'خوب بلکہ خوب تر'
'پھر عطا فرمائیے'
'پھر ذرا دہرائیے'
'پڑھتے رہیے بار بار'
'عرض کی تعریف ہو سکتی نہیں'
'بالیقیں'
'واہ واہ — واہ واہ'

○

"عرض کرتا ہوں کہ چشم....."
'واہ چشم!'
'واہ چشم — واہ واہ'
'چشم کا چشمہ غضب ہے — واہ واہ'
'خوب خوب'

○

"چشمِ نرگس....."
'واہ نرگس واہ واہ'
'چشمِ نرگس ہائے ہائے'
'پھر عطا فرمائیے'
'بار بار'
'واہ واہ — واہ، واہ'

○

"چشمِ نرگس ان دنوں....."
'ان دنوں!'
'تعریف ہو سکتی نہیں'
'واقعی تعریف ہو سکتی نہیں'
'ان دنوں — کیا حال کی تصویر ہے!'
'ان دنوں، امروز کی تفسیر ہے'
'کوئی کہہ سکتا نہیں'
'آپ نے جو کہہ دیا'
'یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے'
'واہ واہ — واہ واہ'

○

"چشمِ نرگس ان دنوں بیمار ہے....."
'واہ واہ — ہائے ہائے'
'ان دنوں بیمار ہے'
'چشمِ نرگس ان دنوں بیمار ہے'
'زندگی اک مستقل آزار ہے'
'واہ وا — واہ واہ'

○

"چشمِ نرگس ان دنوں بیمار ہے تیرے بغیر"
'تیرے بغیر — واہ واہ'
'چشمِ نرگس — ان دنوں بیمار ہے — تیرے بغیر'
'واہ واہ — واہ واہ'
'تعریف ہو سکتی نہیں'
'اُف غضب!'
'ان دنوں بیمار ہے — کیا خوب ہے'
'کیا حسیں اسلوب ہے'
'اور یہ تیرے بغیر'
'واہ واہ'
'چشمِ نرگس اور پھر بیمار ہے — ہائے غضب'
'بس یہی ٹکڑا تو ہے روحِ ادب — جانِ ادب'
'پڑھتے رہیے بار بار'

○

"چشمِ نرگس ان دنوں بیمار ہے تیرے بغیر"
'واہ واہ — واہ واہ'
'خوب بلکہ خوب تر'
'بس یہی مصرع ادب کی جان ہے'
'ایک مصرع کیا عظیم الشان ہے'
'حافظ و خیام کا دیوان ہے'
'واہ — واہ'
'خوب، خوب'

رضا النقوی واہی

تحسینِ جدید

'مقطع غزل کا عرض ہے۔"
'ارشاد۔'
'واہ واہ'
'کیا خوب، کس غضب کا ہے یہ اجتہادِ فن
رسمِ کہن میں ردّ و بدل کر رہے ہیں ہم
مقطع سے ابتدائے غزل کر رہے ہیں واہ
واللہ اک انوکھی پہل کر رہے ہیں واہ
جدّت اسی کا نام ہے شاباش، شاد باش
مُردہ روایتوں کی کہاں تک اُٹھے گی لاش'

'اچھا سُنائیے'
ہمہ تن گوش، بزم ہے۔"

○

'حضرات! اک ذراسی توجہ کی ہے طلب
مقطع غزل کا عرض ہے ....'
"سورج کو چونچ میں لیے مُرغا کھڑا رہا"
'کیا خوب! — واہ واہ۔'
'مصرع ہے بے پناہ۔'
'تخلص بھی بے نظیر'
'سورج ہو یا کہ مرغ ہو یا چونچ مُرغ کی'
'ہر ایک لفظ پر ہے تخلص کا اشتباہ۔'
'ابہام کا یہ حُسن'
'یہ معنی کی رمزیت'
'اللہ کس عروج پہ پہنچی "جدیدیت"۔
واہ واہ

○

'حضرات عرض ہے ...
"سورج کو لے کے چونچ میں مُرغا کھڑا رہا۔"
'واہ'
'واللہ کیا جدید تخیّل ہے، مرحبا!
منقارِ گُل میں عارضِ بلبل ہے، مرحبا!
'اس نُدرتِ کلام کے قربان جائیے
اس فکرِ تیز گام کے قربان جائیے۔'
'واہ واہ'
'اللہ رے دیو قامتی مُرغکِ خیال
سورج کو جو سمجھ کے چُنا یا مٹر کی دال
منقار میں لیے ہوئے'
دن بھر کھڑا رہا!'

'واہ واہ'

○

حضرات، شعر عرض ہے۔'
"سورج کو لے کے چونچ میں مُرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی"
کیا خوب! واہ!
'کیسی کرامات ہو گئی
مُرغے کی چونچ قفلِ حوالات ہو گئی
سورج کے حق میں وادیٔ ظلمات ہو گئی۔'
اے واہ۔ واہ
واہ
اے واہ — زندہ باد!

●

رشید حسن خاں

اُردو اِملا کا مسئلہ

اُردو میں قواعدِ زبان کے جن اہم مسائل کی طرف کم توجّہ کی گئی ہے، اُن میں اِملا کے مسائل کو فہرست میں سب سے اوپر رکھّا جاسکتا ہے۔ جس طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس لفظ کو بول رہے ہیں، اُس کے معنی، یا اُس کا مفہوم کیا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس لفظ کو لکھنا چاہتے ہیں، اُس کی صحیح صورت کیا ہے۔ بلکہ صورت کے علم کی اہمیت زیادہ ہے۔ اور اس اہمیت کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مادری زبان کی تعلیم کے شروع ہی میں، طالب علم کی نظر، یادداشت اور قلم، پہلے لفظوں کی صورت سے شناسا ہوتے ہیں۔ ضرورت بھی ہوتی ہے، کیونکہ ابتدائی تعلیم میں شامل عام لفظوں کے معنی مطلب تو وہ جانتا ہی ہے، اس منزل پر وہ صرف صورت نویسی کو سیکھتا ہے۔ آگے چل کر خاص الفاظ کے معانی و مفاہیم کو معلوم کرنے اور ذہن نشین کرنے کی نوبت آتی ہے، تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ زبان کے عام اور بنیادی الفاظ کی صورت شناسی اور صورت نویسی کے مرحلے سے گزر چکا ہوتا ہے۔ یعنی رسمِ خط کے مطابق لفظوں کو لکھنے کا جو بنیادی یا اصل طریقہ ہے، وہ اُسے سیکھ چکا ہوتا ہے، اُس وقت وہ زیادہ تر مفہوم و معنی کو سمجھتا ہے اور کم تر کچھ الفاظ کے پیچیدہ املا کو سیکھتا ہے۔ لیکن یہ کمّل یا بنیادی املا سیکھنا نہیں ہوتا۔ کچھ لفظوں میں شامل بعض حرفوں کا ذہن نشین کرنا ہوتا ہے۔ لفظ کو لکھنا تو وہ سیکھ ہی چکا ہوتا ہے یعنی حرفوں کے جوڑ، نشست، ترتیب اور الفاظ کی مجموعی صورت، اس بنیادی کام کی تکمیل ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادری زبان کی شروع کی تعلیم میں بنیادی حیثیت اِملا کی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ معانی و مفاہیم میں کثرت کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہوسکتے ہیں۔ معانی کی تعداد سے کہیں زیادہ مفاہیم اس سے وابستہ ہوسکتے ہیں اور کسی بھی مرحلے پر ان میں، ٹھہراؤ والی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی لیکن لفظ کی صورت ایک ہی ہوتی ہے۔ شرط نہیں لگائی جاسکتی کہ بولنے والے کو لفظ کے سارے معانی و مفاہیم کا علم ہو۔ ہاں لکھنے والے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ لفظ کی صورت کا واضح علم رکھتا ہو۔

جس قدر معانی ایک لفظ سے نسبت رکھتے ہیں یہ خوبی ممکن ہے کہ کل اُن کی تعداد میں اضافہ ہوجائے۔ نئے معانی، پُرانے معانی کو بے دخل بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر لفظوں کا اِملا اس تیزی سے نہیں بدلتا۔ اکثر لفظ تو املائی تغیّرات سے محفوظ ہی رہتے ہیں۔ جن لفظوں میں کسی طرح کا اِملائی تغیّر ہوتا بھی ہے، تو اُس کی شکلیں کچھ زیادہ نہیں ہوتیں۔ ان میں سے زیادہ لفظ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو تبدیلیوں سے دو چار ہوتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں قابلِ ذکر دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ ایسے لفظوں کی آخری صورت بہر طور متعیّن ہوجاتی ہے یا ہوچکی ہوتی ہے۔ اور ابتدائی سطح پر طالب علم اسی متعیّن صورت کو سیکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اصولی طور پر ایسے لفظ جن میں

املائی تغیرات واقع ہوئے ہوں، آخر میں مستقل الفاظ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ عموماً اہم تغیرات زبان کے مختلف ابتدائی ادوار میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ پھر ایک دور ایسا آتا ہے جب زبان کے ارتقا کا کام ایک سطح پر اور ایک خاص انداز پر آجاتا ہے۔ اُس وقت املائی تغیرات کی شکلیں متعین ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس مذکورہ دور میں اکثر الفاظ کا ایک املا متعین ہو جاتا ہے۔ اور نسبتاً کم تعداد ایسے لفظوں کی ہوتی ہے جن کی دو صورتیں رائج ہوں، لیکن یہ دونوں صورتیں بھی اب متعین ہوں گی۔ انھی متعین اشکال کو مروّج املا مانا جاتا ہے۔ اور اس کا علم طالب علم کے لیے لازم ہے۔ اب رہے قدیم املائی تغیرات، وہ لغت نویس، اور تدوین کا کام کرنے والوں کے دائرۂ کار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی بحث، انھی دو عنوانوں کے ذیل میں آئے گی۔

رسم خط اور املا : ہم روزمرہ کی زندگی میں چیزوں کو خلط ملط کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے علمی موضوعات بھی محفوظ نہیں رہ پاتے۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ رسم خط اور املا کے مسائل کو گڈمڈ کر دیا گیا۔ اُسی طرح جیسے مثلاً انتقاد اور تنقید کو بعض لوگوں نے اس زمانے میں یک جان دو قالب بنا دیا ہے، جیسے یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہوں۔ رسم خط: "کسی زبان کو لکھنے کی رائج معیاری صورت" کا نام ہے۔ اور "رسم خط کے مطابق صحت سے لکھنے" کا نام املا ہے۔ اکثر بحثیں ایسی ہوئیں جو دراصل املا کے مسائل سے تعلق رکھتی تھیں، مگر وہ رسم خط کے عنوان سے شروع ہوئیں اور اس کے برعکس بھی ہوا۔ اس خلطِ مبحث نے، املا کے مسائل کی واقعی اہمیت کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اصل باتوں کے بجائے فروعی یا غیر متعلق باتوں پر توجہ مبذول رہی۔

کس لفظ کو کن حروف سے مرکب ہونا چاہیے یہ مسئلہ رسم خط کا نہیں۔ یا یہ کہ کون سے حروفِ تہجی ختم کر دیے جائیں یا کسی خاص آواز کے لیے کسی نئی علامت (یا حرف) کا اضافہ کیا جائے، اس کا تعلق بھی رسم خط سے نہیں۔ یہ املا کے مسائل ہیں۔ یہ فرض کیجیے کہ آپ نے آٹھ حروفِ تہجی نکال دیے، یا چھے نئے حروف یا پانچ نئی علامتیں بڑھا دیں، لیکن اس سے رسم خط کی صورت تو تبدیل نہیں ہوئی۔ لفظوں کے ہجّے میں یا اُن کو پڑھنے میں کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو یہ کہنے کے بجائے کہ املا میں اصلاح کی ضرورت ہے، کہا یہ گیا کہ رسم خط میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اور اس بنیادی بات کو فراموش کر دیا گیا کہ اصلاح املا میں ہو سکتی ہے، رسم خط میں نہیں۔ وہ یا تو رہے گا یا نہیں رہے گا۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسم خط میں تغیر ہو سکتا ہے، اصلاح نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں "صورت" بنیادی چیز ہے۔ جب وہ بدل جائے گی، تب یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسم خط بدل گیا۔ اُردو کی عبارت اُس کے معروف رسم خط میں لکھنے کے بجائے، رومن اسکرپٹ میں لکھ دیجیے تو کہا جائے گا کہ اُردو، ایک دوسرے رسم خط میں لکھی گئی ہے۔ ترکی میں رومن اندازِ تحریر کو اختیار کر لیا گیا ہے تو اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکی زبان کا رسم خط بدل گیا ہے۔ سندھی زبان عربی رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ اس کو ناگری لپی میں لکھیے تو کہا جائے گا کہ سندھی کا رسم خط بدل گیا ہے۔ مگر بعض معروف متعین علامتوں یا شکلوں میں کسی طرح کی اصلاح کیجیے تو وہ اُس زبان کے املا میں اصلاح مانی جائے گی، نہ کہ رسم خط میں۔ چند سال پہلے ہندی میں بعض ماتراؤں وغیرہ کا نئے انداز سے تعین کیا گیا، تو یہ ہندی کے املا میں اصلاح و ترمیم کا عمل جاری ہوا تھا۔ ہندی کا رسم خط نہیں بدلا تھا کسی نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔

اصلاح اور تغیر : ایک اور خلطِ مبحث یہ بھی ہوا کہ اصلاح اور تغیر کے الفاظ کو مترادف لفظوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔ حالانکہ ان میں بالعموم بہت فرق ہے۔ املا میں

تغیرات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ زبان کے عملِ ارتقا کے مختلف مرحلوں کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ تغیر، نافذ نہیں کیا جاتا آہستہ آہستہ بروئے کار آیا کرتا ہے۔ میں ایک دو مثالوں سے اپنے مفہوم کو واضح کرنا چاہتا ہوں:

انیسویں صدی کے آغاز میں اور اُس سے پہلے کے مخطوطوں میں لفظ ماں (بہ معنی مادر) نون کے بغیر ملتا ہے۔ یہی صورت لفظ دونوں کی ہے۔ یعنی ما اور دو تو۔ اُسی زمانے میں اور اس سے پہلے بھی نیں (بہ معنی نے) اور سیں (بمعنی سے) مستعمل تھے۔ ترپھا تو بہت بعد تک مستعمل رہا۔ اب ان لفظوں کی صورتیں بدل گئی ہیں۔ یہ تغیر ہے۔ اور یہ زبان کے ارتقا کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ تغیر اس امر کو ظاہر کر رہا ہے کہ لفظ اپنی صورتوں کو کس طرح تبدیل کیا کرتے ہیں۔

کچھ تغیرات اس سے ذرا مختلف ہیں، جیسے انیسویں صدی تک کی بعض کتابوں میں لفظ تفقص صاد سے لکھا ہوا ملتا ہے (اس سلسلے میں زمانے کا قطعی تعین نہیں کیا جا سکتا) اور اب اس کو بالاتفاق سین سے لکھا جاتا ہے۔ یا اس سے بھی کچھ خفیف تغیرات، جیسے ایک زمانے تک یہ انداز رہا کہ حرفِ مکرر میں سے ایک حرف کو حذف کر کے دوسرے حرف کو مشدد کر لیا جاتا تھا۔ جیسے اُسّے (اس سے) اُنّے (ان نے) گنّا (گننا) وغیرہ۔ یا جیسے اعرابِ بالحروف کا رواج، مثلاً اوس جس کی باقیات میں پہونچنا اور دوکان اب بھی نظر آجاتے ہیں۔ اس قسم کے تغیرات کی مدد سے زبان کے مباحث پر گفتگو کی جاتی ہے کیوں کہ ان میں سے بیشتر تبدیلیوں کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ ان تغیرات کو کسی ایک خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔

اصلاح، اس سے مختلف عمل ہے۔ مثلاً بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کی سربراہی میں انجمن ترقی اردو نے یہ طے کیا تھا کہ عربی کے وہ لفظ جن کے آخر میں الف بہ صورتِ ی لکھا جاتا ہے، اُن کو اب اُردو میں سیدھے سیدھے الف ہی سے لکھنا چاہیے۔ جیسے ادنا، اعلا، حلوا، طوبا، وغیرہ، یا یہ کہ، مرکب لفظوں کو علاحدہ علاحدہ لکھا جانا چاہیے، جیسے: اس کو، اس نے، سمجھ کر، دل فریب وغیرہ۔ انجمن نے اپنی مطبوعات میں اس پر عمل بھی کیا تھا۔ یہ اصلاح ہے۔ اصلاح کو نافذ کیا جاتا ہے، جب کہ تغیر، رونما ہوا کرتا ہے۔ دونوں کے اسباب بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ تغیر کا تعلق اصلاً ارتقائے زبان سے ہوتا ہے اگرچہ آخری درجے میں اس کا تعلق املا سے ہو جایا کرتا ہے۔ اصلاح کا تعلق مطلقاً املا سے ہوتا ہے۔

صحتِ املا اور اصلاحِ املا :

جس طرح اصلاح اور تغیر کے الفاظ کو بے امتیازی نے پریشان کن بنا دیا تھا اسی طرح اصلاح اور تغیر کے الفاظ میں بھی خلطِ مبحث ہوا۔ حالانکہ یہ دونوں عملاً بھی مختلف ہیں اور ان کے مقاصد بھی مختلف ہیں۔ میں نے متضاد نہیں، مختلف کہا ہے۔ اصلاح کا مقصد یہ ہوگا کہ کسی خامی کو دور کیا جائے۔ یا یہ کہ مزید آسانیاں فراہم کی جائیں۔ صحت سے مُراد یہ لی جائے گی کہ کوئی غلطی راہ پا گئی ہے، اُس کو دور کر کے، مسلّمہ انداز یا صورت کو واپس لایا جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی لفظ بالکل صحیح ہو، لیکن اُس میں مزید آسانی پیدا کرنے کی خاطر، یا کسی اور لحاظ سے، اصلاح کا عمل جاری کیا جائے۔ مثلاً یہی اعلا کا الف سے لکھا جانا، کہ اصل مقصد یہ تھا کہ اُردو میں ایسے الفاظ کے عام اندازِ نگارش میں ان الفاظ کو بھی شامل کیا جائے۔ یہ نہیں تھا کہ اعلیٰ یا ادنیٰ بجائے خود غلط ہوں، اور اس طرح اُن کی تصحیح کی گئی ہو۔ غلطی کی صحت ہوگی اور خامی کی (وہ کسی قسم کی ہو) اصلاح ہوگی۔ یا یہ کہ کوئی خامی نہیں، محض مزید سہولت یا یکسانیت کے نقطۂ نظر سے اضافے یا ترمیم کو تجویز کیا گیا ہو، یہ بھی اصلاح ہے۔

صحتِ املا کا دائرہ وسیع ہے جن لفظوں میں کسی طرح کی

غلط نگاری راہ پاگئی ہے۔ اُن کو صحتِ املا کے دائرے میں واپس لانا اس کا خاص مقصد ہے۔ جیسے لفظ حلوہ کو ۃ سے لکھنا، یا اسی قبیل کے بعض اور الفاظ جو محض ناواقفیت کی وجہ سے ۃ سے بھی لکھ دیے جایا کرتے ہیں، مثلاً معما، تقاضا، تماشا، وغیرہ، ان کی صحت یہ ہے کہ ان سب کو الف سے لکھا جائے۔ اژدحام، اژدہام، ازدہام؛ یہ سب غلط صورتیں ہیں، صحیح صورت ہے: ازدحام — آذر (نام)، ذکریا، ذخار؛ یہ سب لفظ ز سے صحیح ہیں۔ یعنی: آزر، زکریا، زخار۔ ان سب لفظوں میں کسی بھی زمانے میں کسی بھی سطح پر کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا ہے، محض ناواقفیت نے غلط نویسی کی کثرت کو رواج دیا ہے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض لفظوں کو بعض خاص لوگوں نے ایک خاص طرح سے صحیح مانا۔ حالانکہ اصلاً وہ اس طرح صحیح نہ تھے۔ جیسے مرزا غالب کے خیال میں چونکہ فارسی کے حروفِ تہجی میں حرف ذال شامل نہیں تھا، اسی بنا پر وہ گزشتن، پزیرفتن وغیرہ کو صحیح سمجھتے تھے۔ اور گذشتن و پذیرفتن کو غلط۔ مرزا صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ ان کی صحیح صورت پذیرفتن و گذشتن ہی ہے۔ یہ بھی غلطی تھی لیکن یہاں نوعیت میں ذرا سا اختلاف ہے — لیکن اس ذیل میں دل چسپ صورت یہ پیدا ہوئی کہ گزارش (بہ معنیِ عرضداشت) کو ذال سے لکھا جانے لگا۔ یعنی: گذارش اور گذشتہ کو ز سے لکھا جانے لگا، یعنی: گزشتہ۔ جب کہ گذشتن، ذال سے صحیح ہے اور گزاردن، ز سے۔ اس کے مشتقات کی بھی یہی صورت ہوگی، گزارش اور شکر گزار کو ز سے لکھا جائے گا۔ اور گذشتہ، گذرگاہ، رہ گذر ذ سے لکھے جائیں گے۔ اس امتیاز کو واپس لانا بھی صحتِ املا میں شامل ہے۔
یا مثلاً ایک زمانے تک یائے معروف و مجہول کو کسی امتیاز کے بغیر لکھ دیا جاتا تھا۔ کاف، گاف کے مرکزوں کی بھی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ ایسی ہی اور باتیں، جیسے نقطے نہ لگانا، ہائے ہوز و ہائے مخلوط میں امتیاز روا نہ رکھنا۔ خوش نویسی کی ضرورتوں نے حرفوں کے جوڑ بند اور نقطوں وغیرہ کے سلسلے میں اور زیادہ بے اعتدالیوں کا اضافہ کیا۔ خوبصورتی اور فنّی پابندی اصل چیز رہی، نقطے، شوشے، جوڑ، مرکز سب اس کے تابع ہو گئے۔ خطِ شکستہ کی لکھاوٹ نے ابہام کے دھندلکے کو اور بڑھا دیا۔ آج تحریر میں ان سب کا شمار غلطیوں میں کیا جائے گا اور متعین صحیح نویسی کو لازم قرار دیا جائے گا۔ یہ بھی صحتِ املا ہے۔

اقسامِ خط، رسمِ خط اور املا

اُردو میں نسخ، نستعلیق اور شکستہ کا رواج رہا ہے۔ اس فرق کے ساتھ ساتھ خطِ شکستہ عام طور سے پُرانے دفتروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی تشکیل بھی دفتری ضرورت سے ہوئی تھی۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے تک مکتبوں میں خطِ شکست کی ایک دو ابتدائی کتابیں پڑھائی بھی جاتی تھیں۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کا لکھنا سکھایا جائے اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کا پڑھنا آ جائے۔ اور خطوں کی طرح شروع میں اس خط کا انداز بھی متعین کیا گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خط، دوسرے خطوں کے برخلاف، باضابطگی سے زیادہ قریب نہیں رہ پایا۔ خاص طور سے تھانوں اور کچہریوں میں یہ کچھ سے کچھ بن گیا۔ اس کی گردش اب بھی دیکھنے میں آتی رہتی ہے۔ عوامی زبان میں اسے گھسیٹ کہنے لگے۔ بہرصورت اب اس کا چلن محدود بلکہ محدود تر ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ عام طور سے تحریریں اس طرح لکھی جاتی ہیں کہ ان میں زیادہ حصّہ نستعلیق کا ہوتا ہے، کبھی کبھی بعض کششیں شکستہ کی سی شامل ہو جاتی ہیں۔

خوش نویسی نے نستعلیق کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ اور لیتھو، آفسٹ یا بلاک کی طباعت میں اب اسی "عروس الخطوط"

چلن ہے۔ ٹائپ کے لیے خطِ نسخ مناسب تھا، اسی کو اختیار کیا گیا۔ نستعلیق میں بھی ٹائپ بنا تھا۔ ایک زمانے میں کتابیں بھی اس نستعلیق ٹائپ میں چھپتی تھیں، لیکن اس صنعت تضاد کو دیر تک نبھایا نہیں جاسکا۔ اب صورت یہ ہے کہ ٹائپ کے لیے نسخ، اور لیتھو وغیرہ کے لیے نستعلیق رائج ہے۔ بچوں کو مدرسوں، مکتبوں اور اسکولوں میں نستعلیق ہی لکھنا سکھایا جاتا ہے۔

خطّاطی ایک مستقل فن تھا، جس نے مصوّری کے انداز میں فروغ اور وسعت پائی۔ تزئینی خطوں کی مختلف قسموں نے اس کو نقّاشی کی نزاکتوں سے آشنا کیا۔ خطِ طغرا، خطِ گلزار، خطِ غبار وغیرہ اسی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ نستعلیق ہو یا نسخ اور شکستہ ہو یا طغرا، یہ سب، خط کی قسمیں ہیں۔ رسمِ خط اور خط، یہ دو چیزیں ہیں۔ آرائشی خط، رسمِ خط کے ذیل میں آنے کے بجائے، فنِ خطّاطی کے ذیل میں آتے ہیں۔ رہے نستعلیق، نسخ اور شکستہ، یہ بھی خطّاطی ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چونکہ عام تحریروں میں ان کا چلن رہا ہے، ان سے آرائش کا نہیں، تحریر کا کام لیا گیا ہے۔ اس لیے اردو کے متعارف اندازِ تحریر کے اقسام ہیں، اُس فرق کے ساتھ اُن سے نسبت رکھتا ہے۔ اس طرح ان تینوں خطوں کو رسمِ خط سے قریب کا تعلق رہا اور باقی خطوں کو دور کی نسبت حاصل رہی، یہاں تک کہ وہ ایک مستقل فن (خطّاطی) کے ایسے اجزا قرار پائے جو اپنے خود ایک الگ صنعت کی حیثیت سے متشخص ہوئے۔

نستعلیق، خطّاطی کے کمال کا گویا حسین ترشاہ کار ہے۔ لیکن تحریر میں مستقل استعمال ہونے نے اُس کی افادی حیثیت کو روشن کیا اور اب وہ اردو املا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ نمایندہ موضوع ہے۔

اس طرح کے مباحث جیسے قطب مینار کے کتبے کس کمال کی نمایندگی، جامع مسجد کے کتبے کس جمال کے عکّاس ہیں، وصلیوں میں کس شان اور حسن کی نمود ہے، یہ باتیں رسمِ خط سے متعلق نہیں۔ یہ چیزیں فنِ خطّاطی سے تعلق رکھتی ہیں، رسمِ خط کُل ہے اور یہ سب اس کی شاخیں ہیں، لیکن ان کا ارتقا ایک مستقل اور منفرد حیثیت سے اس طرح ہوا ہے کہ اب ان کے مسائل و مباحث رسمِ خط کے مسائل و مباحث سے مختلف ہیں۔ املا کے جو مسائل عام تحریر سے متعلق ہیں اور جو ہمارا موضوعِ بحث ہیں ان سے، ان خطوط کے مسائل کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہر خط کا اپنا انداز ہے، جس کے ضابطے مقرّر ہیں، مگر یہ املا نہیں، اندازِ نگارش ہے۔ جس کا مقصود ہی بالکل مختلف ہے۔ مقصود یہ ہے کہ خطّاطی کے مباحث کو رسمِ خط اور املا کے مسائل میں آمیز نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں خوش نویسی کے عام انداز کو، نستعلیق و نسخ سے جو تعلق ہے، اُس کا بیان املا کی تعریف کے ذیل میں آئے گا۔

اِن الفاظ کی واضح تعریف کے بعد، اب یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ ہم رسمِ خط بدلنا چاہتے ہیں یا کچھ لفظوں یا علامتوں میں کچھ خامیاں ہیں، کچھ دقّتیں ہیں، اُن کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ یا مزید آوازوں کے لیے بعض علامتوں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ یا املا کی طرف سے طویل بے پروائی نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھنا چاہتے ہیں اور عدمِ تعیّن یا غلط نگاری کے سبب سے لفظوں میں جو پریشان کن رنگا رنگی پیدا ہو گئی ہے، اُس کو ختم کر کے، املا کو صحت اور تعیّن کے حدود میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس میں سے بیشتر کا تعلق صحتِ املا سے ہوتا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ صحتِ املا کی بحث، ہماری خاص توجّہ کی طلب گار ہے۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے، یہ مناسب ہوگا کہ املا کی مفصّل تعریف اس طرح کی جائے کہ وہ اُردو کے متعارف، مستعمل اور مسلّمہ طریقِ تحریر پر حاوی ہو۔ تلفّظ و توقیت نگاری کو جس طرح املا میں آمیز کر دیا گیا ہے، اس کی بھی صراحت کی جاسکے۔

املا کی تعریف : لغت کی کتابوں میں املا کی تعریف عموماً ایک جملے میں کی گئی ہے : "رسمِ خط کے مطابق صحت سے لکھنا"۔ اس میں لفظ "صحت" کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اصولاً یہ تعریف بالکل درست ہے۔ مگر اُردو میں املا کے جو مسائل ہیں، اُن کی وسعت اور انتشار کے پیشِ نظر یہ تعریف بہت مختصر، بلکہ مبہم معلوم ہوتی ہے۔ سالم حروف روزمرہ کی تحریر میں جب بھی توڑ کر اور دوسرے حرفوں سے ملاکر لکھے جائیں گے، تو ان کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ اردو میں (اور اس رسمِ خط میں لکھی جانے والی سب زبانوں میں) ایک بات یہ بھی ہے کہ روزمرہ کی تحریر میں، طباعت کی غرض سے لکھی جانے والی تحریر میں، اور ٹائپ میں، حرفوں کے جوڑ بند کی یکساں صورت ہوتی ہے، صرف حرفوں کی نشست اور دائرے کا معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ جب کہ مثلاً انگریزی میں طباعت میں تحریر کے برخلاف، عموماً حروف سالم رہتے ہیں۔ یا مثلاً ہندی میں طباعت اور عام تحریر میں عموماً یکسانیت ہوتی ہے۔ اس لیے اُردو املا میں، کسی لفظ میں شامل حروف کی ترتیب، صورت اور اُن کے جوڑ کی بنیادی اہمیت ہے۔

اُردو میں سالم حروف بہت کم آتے ہیں۔ حرفوں کو توڑ کر اور ملاکر زیادہ لکھا جاتا ہے۔ ایک حرف سے جب دوسرا حرف ملاکر لکھا جاتا ہے تو مختلف حرفوں کے ساتھ ملنے اور لفظ کے شروع یا آخر یا درمیان میں آنے کے لحاظ سے اُن ٹکڑوں کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے مناسب یہ ہوگا کہ املا کی اس طرح تعریف کی جائے جو ان سب پر حاوی ہو۔ یہ تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے :

"اُردو کے مُسلّمہ رسمِ خط کے مطابق، لفظوں میں حرفوں کی ترتیب کا تعین، ترتیب اور تلفظ کے لحاظ سے اُس لفظ میں شامل حروف کی صورت اور حرفوں کے جوڑ کا متعارف طریقہ، ان سب کے مجموعے کا نام املا ہے۔"

لفظ منہدی میں نون، ہائے ہوز سے پہلے آئے گا یا اس کے بعد آئے گا، لفظ گھر میں دوچشمی ھ لکھی جائے گی یا کہنی دار، بتِودت اور تجر میں حرفِ جیم کی صورت کیا ہوگی، یہ سب املا کے مسائل ہیں اور تعریف میں شامل ہیں۔

ایک بات یہاں پر صاف ہو جانا چاہیے : املا صورت نویسی کا نام ہے۔ یعنی مُسلّمہ اور متعارف صورت نویسی۔ اُردو میں خطّاطی نے بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں، جن میں سے کئی باتیں ایسی بھی ہیں جن کا حقیقت میں املا سے تعلق نہیں، محض خطّاطی کے انداز سے ان کا تعلق ہے، لیکن اب وہ نفسِ املا سے متعلق ہو گئی ہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ نسخ، نستعلیق اور شکستہ، ان تینوں خطوں کے زیادہ رواج نے حرفوں کی شکلوں میں، اُن کے جوڑ میں اور دائروں کی کشش یا حرفوں کی نشست میں متعدد ایسی شکلیں پیدا کر دیں جو بجائے خود املا میں شامل نہیں، لیکن ان مختلف خطوں کے واسطے سے شاملِ املا ہو گئی ہیں، مثلاً ج کا جوڑ اگر لفظ کے درمیان میں ہو تو نسخ اور نستعلیق ان دونوں میں اس کی صورت مختلف ہوگی۔ لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو نستعلیق اور نسخ میں اس کی صورتیں مختلف نظر آئیں گی۔ پھر مزید دقّت یہ ہے کہ ٹائپ بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں، یہ عین ممکن ہے کہ ایک طرح کے ٹائپ میں ایک حرف کا جوڑ نستعلیق کے مطابق ہو، اور ایک میں مختلف ہو۔ "بھوننا" نستعلیق کی متعارف صورت ہے۔ نسخ یا ٹائپ میں یہ بھوننا بھی ہو سکتا ہے اور اس سے ذرا مختلف صورت میں بھی نظر آ سکتا ہے۔ عام تحریر میں نستعلیق کی روش عام طور پر برتی جاتی ہے۔ جو کتابیں لیتھو میں چھپتی ہیں، اُن میں بھی یہی روش برقرار رہتی ہے۔ ٹائپ میں چوں کہ نسخ کی حکمرانی ہوتی ہے، اس لیے وہاں بعض صورتوں کا اختلاف ناگزیر ہے۔ پھر شکستہ کی بعض روشیں بھی نستعلیق پر پرچھائیں ڈال جایا کرتی ہیں۔

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ نستعلیق خط کو اب بنیاد مان کر، حرفوں کے جوڑ بند کی حد تک اس کی پیروی کی جائے گی کیونکہ نسخ یا

شکستہ کا تعلق عام تحریر سے مطلق نہیں۔ بچے شروع میں صرف نستعلیق کی روش سیکھتا ہے۔ اور ایک مدت تک وہ اسی کو برتتا ہے۔ قلم کی تحریر میں تو آخر تک صرف یہی روش برقرار رہتی ہے۔ اس لیے ابتدائی اور بنیادی اہمیت اسی روش کی ہے۔ ٹائپ سے سابقہ ذرا بعد میں پڑتا ہے اور قلم کو اس سے سابقہ کبھی نہیں پڑتا، صرف آنکھوں تک اس کی رسائی رہتی ہے۔ شروع میں طالب علم کو جب لکھنا سکھایا جائے گا یعنی وہ صحیح اور حقیقی وقت، جب کہ وہ املا سیکھتا ہے تو اس وقت صرف نستعلیق کی روش اس کو سکھائی جائے گی، اس لیے ابتدائی اور بنیادی اہمیت اسی روش کی تسلیم کی گئی ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ نسخ اور نستعلیق میں بنیادی طور پر صورت نویسی میں کوئی اختلاف نہیں، نہ ترتیبِ حروف میں فرق ہے۔ اختلافِ روش کی وجہ سے بعض حرفوں کے جوڑ میں کچھ معمولی سا فرق نمایاں ہوتا ہے اور یہ ایسا فرق ہوتا ہے کہ نگاہیں بہت جلد متعارف ہو جاتی ہیں۔ کسی طرح کی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ قلم برابر نستعلیق کی روش پر چلتا رہتا ہے اور نظر برابر نسخ کی عبارت کو پڑھتی رہتی ہے۔

لفظ کے اجزا یعنی اُس کے حروف کا تعین اور اس سے متعلق مسائل و مباحث، فنِ لغت سے متعلق ہیں۔ اِن اجزا یعنی حروف کی صورت نویسی کا تعلق املا سے ہے۔ اس صورت نویسی میں مستعمل روشِ خط کو، صورت نویسی کی بنیاد مانا جائے گا۔ اور اس روش کے تعینات کے مطابق حرفوں کے جوڑ کی مختلف شکلوں کی معیار بندی کی جائے گی۔ چوں کہ اُردو میں تحریر کی حد تک مسلّمہ طور پر نستعلیق کی روش برتی جاتی ہے، اس لیے حرفوں کے جوڑ اور لفظوں کی مجموعی صورت نگاری کے لیے اسی روش کو بنیاد مانا جائے گا۔

لُغت میں لفظوں کے اجزا کے ساتھ ساتھ، اُن کی ترتیب کا بھی تعین کیا جاتا ہے۔ چوں کہ املا، لُغت کے انھی تعینات کی صورت نگاری کا نام ہے، اس لیے لفظ میں حرفوں کا تعین اور ترتیب بھی خود بخود املا کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے۔ لفظ صورت نویسی ان سب پر حاوی ہے۔

املا کا تعلق مفرد لفظوں سے ہے۔ اسی لحاظ سے مرکب لفظوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کو کس طرح لکھا جائے، بہ ظاہر زاید بات ہے۔ لیکن مرکبات کی کچھ صورتیں ایسی بھی ہیں جن کے لحاظ سے اس زاید بات کو کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک زمانے میں دو لفظوں کو ملا کر کسی طرح لکھا جاتا تھا۔ آج کسی اور طرح لکھا جاتا ہے۔ یہ ایسے لفظ ہیں کہ اگر ان کو پرانے طریقے کے مطابق اب لکھا جائے تو ذہن اور نظر، دونوں فوراً گواہی دیں گے کہ یہ صورت ٹھیک نہیں۔ مثلاً پہلے اُن نے اور اُس سے کو اُنّے، اُننے اور اُسّے بھی لکھا جاتا تھا۔ آج اگر کوئی شخص اس طرح لکھ دے تو محلِ نظر معلوم ہوں گے۔ اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ مرکبات کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں اجزا کی صورت نویسی صحت و عدم صحت سے لازمی تعلق رکھتی ہے۔

اسی طرح دو یا زیادہ لفظوں کو ملا کر لکھنے میں تکلف نہیں کیا جاتا تھا۔ انجمن ترقی اُردو نے اور باتوں کے علاوہ یہ قاعدہ بھی بنایا تھا کہ امکان کی حد تک لفظوں کو الگ الگ لکھا جانا چاہیے۔ صاحبِ نظر لوگوں نے اس قاعدے کو تسلیم کیا اور برتا بھی۔ اب گویا مرکب لفظوں کا الگ الگ لکھا جانا صحت سے قریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مرکبات کے طریقِ تحریر کو بھی املا کی بحث میں شامل سمجھنا چاہیے۔

اس بحث کے بعد یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ حرکات یا علامات، نفسِ املا میں شامل نہیں۔ کیونکہ حرکت یا علامت کے بغیر بھی تلفظ کو لکھا جا سکتا ہے اور پڑھا جا سکتا ہے اور وہ بالکل صحیح ہو سکتا ہے، صورت کے لحاظ سے بھی اور معنی کے لحاظ سے بھی۔

عموماً ہوتا بھی یہی ہے۔ تلفظ، اِملا سے مختلف ایک چیز ہے جس کے اپنے مسائل ہیں۔ ایک ہی لفظ کو دو یا زیادہ آدمی، تلفظ کے اختلاف کے ساتھ بولتے ہیں، مثلاً ایک شخص مَحبّت میم کے زبر کے ساتھ بولتا ہے اور دوسرا مُحبّت میم کے پیش کے ساتھ۔ لکھتے دونوں ایک ہی طرح ہیں۔ زبر یا پیش، اِملا کو نہیں، تلفظ کو ظاہر کرتا ہے۔

یا جیسے لفظ کے درمیان میں نونِ غُنّہ کی پہچان کے لیے معکوس قوس کا نشان یا واو معروف پر اُلٹا پیش، یہ سب اضافی علامتیں ہیں۔ اسی طرح رموزِ اوقاف بھی اِملا میں شامل نہیں۔ ان کے محلِ استعمال میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا۔ صحتِ عبارت کی غرض سے، یا پڑھنے کی آسانی کی غرض سے، یہ ضروری ہو سکتے ہیں، ہوتے بھی ہیں، خصوصاً نظم میں۔ لیکن لفظوں کی صورت نویسی سے ان کا لازمی تعلق نہیں۔ صحتِ کلام کے اسباب و وسائل میں ان کو شمار کرنا چاہیے اور اس لحاظ سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ دراصل تدوین کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، اور تدوین کے ذیل ہی میں ان کی بحث کی جائے گی۔

البتہ تنوین کے اعراب چوں کہ لفظ کا جُز ہوتے ہیں، اس لیے وہ شاملِ اِملا ہیں۔ یہ دراصل ایک مستقل حرف (نون) کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس وزن اور اس قبیل کے الفاظ کے قیاس پر متعدد لفظ عموماً نون سے لکھے جاتے ہیں، جیسے شبراتن۔ اور نظم میں فوراً کے قافیے میں رہ زن جیسے لفظ آتے ہیں۔

اِسی طرح الف ممدودہ کا مَد بھی شاملِ اِملا ہے۔ یہ بھی ایک حرف (الف) کی قائم مقامی کرتا ہے۔ ہائے ہوز کے نیچے جو ایک علامت لگائی جاتی ہے، یعنی نیم شوشہ (ہ)، یہ بھی جُزوِ حرف ہے۔ ان کے بغیر شوشے دار ہائے ہوز، اور الف ممدودہ کو صحیح نہیں پڑھا جا سکتا۔

مَد کی طرح تشدید بھی ایک مستقل حرف کی نمائندگی کرتی ہے اور اس اعتبار سے اس کو بھی لازمی جز ہونا چاہیے۔ مگر شروع ہی سے کچھ ایسی صورت رہی ہے کہ ایسے اکثر لفظ، جن میں حرفِ مشدّد موجود ہو، تشدید کے بغیر ہی لکھے جاتے رہے ہیں۔ اور اب تکلّف کے بغیر نظر اور ذہن، لفظ کو سمجھ اور پڑھ لیتے ہیں، اس لیے تشدید کے بغیر بھی لفظ صحیح مانا جاتا ہے۔ یوں بھی اس کا التزام برقرار نہیں رہا۔ اب صورت یہ ہے کہ اصولاً تو تشدید شاملِ املا ہے، لیکن عملاً اس کی حیثیت دوسری علامات کی سی ہے۔ ہاں اگر تشدید لکھنے کی پابندی کی جائے تو بہتر ضرور ہے۔ البتہ ابتدائی درسی و غیر درسی کتابوں میں تشدید کو لازم قرار دیا جانا چاہیے۔

صحّتِ اِملا کی اہمیّت: ہم سب اس بات کو مانتے ہیں کہ شروع میں تکرار کے ساتھ بچّے کے سامنے آتے رہتے ہیں، وہ اُس کے ذہن پر مُرتسم ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لفظوں کو ایک منزل پر ہجّے کے ذریعے سے بھی ذہن نشین کرانا پڑتا ہے۔ اِس طرح آغاز ہی میں لفظوں کے ترکیبی اجزا کا بیان گویا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اُس قاعدے یا ابتدائی درسی کتاب میں لفظوں کے اجزا کا اُن کی ترتیب کا اور اُن کی صورت کا بالکل صحیح صحیح تعین نہیں کیا گیا ہے، اس صورت میں ابتدائی مشقیں، غلط خوانی، غلط فہمی اور غلط نویسی کی مشقیں بن کر رہ جائیں گی۔

اس کے ذرا بعد ہی وہ دَور شروع ہو جاتا ہے جب نقل کرنے اور اِملا لکھانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ کتاب سے نقل کرانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں کو پڑھا جا چکا ہے، اُن کی صورت نویسی کی عادت پڑے۔ اور ان لفظوں کی تشکیلیں ذہن میں روشن ہونا شروع ہو جائیں۔ اور یہ بھی کہ

ذہن میں وہ لفظ اُسی مندرجۂ کتاب شکل و صورت، ترتیب اور جوڑ بند کے ساتھ بننے لگیں۔ پھر جب (اصطلاحی معنوں میں) املا لکھایا جاتا ہے تو اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ذہن ان لفظوں کی صورتوں کو اپنی یاد داشت کے سادہ ورق پر ثبت کرلے۔

ظاہر ہے کہ کتاب میں جو لفظ جس طرح لکھا تھا، طالب علم اُسی طرح اُس کو لکھنا سیکھے گا اور یہ ابتدائی مشقیں، لفظوں کی صورتوں کو پتھر کے نقش کی طرح اس طرح پایدار بنا دیتی ہیں کہ اگر آگے چل کر کسی منزل پر یہ علم بھی ہو کہ فلاں لفظ کی صحیح صورت یہ ہے، تب بھی اکثر و بیشتر عادت کے طور پر قلم سے وہی اوّلین صورت بنتی رہتی ہے۔ ایسا بالکل غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے۔ ایسا ہونا چاہیے یا نہیں، یہ مختلف بات ہے۔ زیادہ صورتوں میں ہوتا یہی ہے۔

جس طرح کتاب میں چھپے ہوئے لفظوں کا املا صحیح ہونا چاہیے، اُسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کتاب کو پڑھانے والا، یعنی نقل اور املا کی مشقیں کرانے والا اُستاد بھی اس صحت سے علمی و ذہنی سطح پر ہم آہنگ ہو۔ اس کے بغیر بھی افادیت ختم ہوسکتی ہے، کیونکہ جب استاد کا قلم تختی یا کاپی پر اصلاح کرتا ہے اور جس کی پابندی طالب علم کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہے، اُس وقت اُس کے قلم سے بھی وہی متعیّن صورتیں اسی طرح بننا چاہییں جس طرح درج کتاب ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ایسا کم ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں بے یقینی کی وبا پھیلتی ہے۔ مثلاً جس شخص نے کتاب مُرتّب کی ہے اُس نے، یا اُس کتاب کے کاتب نے ایک لفظ کو اس طرح لکھا جس طرح اُس کے اُستاد نے اس کو سکھایا تھا۔ طالب علم نے اُسی کے مطابق لفظ کو لکھا۔ استاد نے جب تصحیح کی یا خود بلیک بورڈ پر لکھا تو اُسی لفظ کا وہ املا لکھا جو اُس نے اپنے استاد سے سیکھا تھا۔ محض مثال کے طور پر عرض کروں کہ کتاب میں لفظ مہندی اس طرح چھپا ہوا تھا کہ پہلے میم، پھر نون، پھر ہائے ہوّز، پھر دال اور پھر یائے معروف۔ طالب علم کی آنکھوں نے اس لفظ کا یہی املا دیکھا، اُس کے ذہن نے یہی نقش قبول کیا اور اس کے قلم نے اسی نقش کو اسی ترتیب کے ساتھ بنانا سیکھا۔ استاد نے جب خود اس لفظ کو لکھا تو پہلے میم بنایا، پھر ہائے ہوّز، پھر نون اور پھر دال اور یائے معروف لکھی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اس لفظ کو اسی طرح سیکھا تھا اور اب قلم بے اختیار اسی نقش کی تکرار کیا کرتا ہے۔ وہ بچّہ تو خیر کیا کہتا۔ اُلجھ سکتا ہے، کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اگر اتفاق سے اس کی جگہ کوئی بالغ طالب علم ہوا یا کوئی غیر ملکی طالب علم ہوا جو زبان کی ابتدائی باتیں سیکھ سمجھ کر آیا ہے اور جس نے سائنٹفک طریقے سے زبانوں کا پڑھنا سیکھا ہے اور جو اسپیلنگ میں حروف کی ترتیب کی اہمیت سے واقف ہے، وہ استاد سے الجھنا شروع کردیتا ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ اُستاد کو اس اختلاف کا یا اس کی اہمیت کا یا اس کے اثرات کا نہ علم ہے نہ اندازہ۔ انجام کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

مقصودِ گفتگو یہ ہے کہ جب تک صحتِ املا کی طرف پوری توجّہ نہیں دی جائے گی، اُس وقت تک ابتدائی درسی کتابیں صحیح طریقے سے مکمّل نہیں ہوسکتیں۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

لُغت اور تدوینِ لُغت کا املا سے لازم و ملزوم کا سا تعلق ہے۔ اس سلسلے کی تفصیلات بعد میں "املا اور لغت" کے عنوان سے پیش کی جائیں گی۔ یہاں پر سلسلۂ بحث کی تکمیل کے لیے اس قدر کہنا ضروری ہے کہ آج اگر کسی لُغت کو مرتّب کیا جائے تو سب سے پہلا مسئلہ یہی سامنے آئے گا کہ لفظوں کا املا کیا ہو۔ حروف کے تعیّن کی نسبت ہی سے لُغت میں الفاظ کی فصیلیں قائم کی جاتی ہیں۔ انگریزی کے کسی لفظ میں کچھ شبہ ہو، لُغت اٹھا کر دیکھ لیجیے، فوراً قطعیت کے ساتھ

معلوم ہو جائے گا کہ وہ لفظ کن حروف سے مرکب ہے اور ان کی ترتیب کیا ہے۔ اُردو لُغات میں آپ کو یہ کرشمہ نظر آئے گا کہ الفاظ کے معانی تو لازماً صاحبِ لُغت کے مُرتّب کیے ہوں گے ، لیکن الفاظ کا اِملا کبھی تو مُرتّب کا مُعیّن کیا ہوگا اور کبھی کاتب کا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ صاحبِ لُغت نے املا کے مسئلے کو اوّلین اہمیت کا مستحق سمجھ کر، ہر لفظ کے اجزا کا تعیّن کیا ہو۔ یہاں پر وہی بات آڑے آئے گی کہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے جس لفظ کو جس طرح سیکھا تھا اُسی طرح قلم سے نکلتا ہے۔ اُردو میں لُغت نگار کی اہم ذمّے داری یہ سمجھی گئی تھی کہ وہ سارے معانی و مفاہیم اور اَسناد کو یکجا کر دے ، اِنھی کی وسعت کے لحاظ سے اُس کی اہمیّت کا درجہ متعیّن کیا جاتا تھا۔ الفاظ کے املا کو بنیادی اہمیت کا مستحق سمجھا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ لُغت واحد ذریعہ ہوتا ہے املا کے تعین کا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لفظ کے کئی کئی املا مل جائیں گے۔ جن میں حقیقی اور غیر حقیقی سبھی طرح کے اختلافات ہوں گے لیکن اس کی صراحت کہیں نہیں ہوگی کہ اب مستعمل یا مُسلّمہ املا کیا ہے۔

یہی نہیں ، عدمِ تعیّن کی وجہ سے ایک ہی لفظ دو لغات میں مختلف طرح بھی مل جائے گا۔ اب پڑھنے والا اُلجھتا ہے۔ میں دو مثالوں سے ، ان دونوں باتوں کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

نور اللغات میں لفظ مہندی کے ذیل میں صاحبِ لُغت نے صراحت کر دی ہے کہ اس لفظ میں ہائے ہوّز سے پہلے نون لکھنا چاہیے۔ لیکن فرہنگِ آصفیہ میں میم مع نون کی فصل میں بھی یہ لفظ مل جائے گا اور میم مع ہائے ہوّز کی فصل میں بھی۔ اب اگر ایک شخص نے نور اللغات کو دیکھا ہے تو وہ مہندی کو صحیح سمجھے گا۔ اور دوسرے نے اگر آصفیہ میں میم مع نون کی فصل کو پہلے دیکھا ہے تو وہ بھی منہدی کو درست مانے گا۔ لیکن اگر اس نے پہلے میم مع ہائے ہوّز کی فصل دیکھ لی ہے تو وہ مہندی کو صحیح سمجھ کر اسی طرح لکھنا شروع کر دے گا۔

لفظ پھُوار کا اِملا کیا ہوگا؟ نور اللغات میں پھُوار لکھ کر، لکھا ہے کہ بیشتر فصحا کی زبانوں پر پھوہار ہے۔ نفائس اللغات میں اس کو پھُوار لکھا گیا ہے ، نفس اللغۃ میں پھُہار چھپا ہوا ہے۔ اور فرہنگِ آصفیہ میں اس کی چار صورتیں درج ہیں : پھُوار، پھُوار، پھُہار، پھُوہار ، اور ترک و اختیار کی کوئی بھی صراحت مذکور نہیں۔ اب یہی ہوگا کہ جس شخص کو جو لُغت پہلے مل گیا وہ اسی کے مطبوعہ اندراج کے مطابق لفظ کو صحیح سمجھے گا۔ اور یہ کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ واقعی صحیح صورت یا اب مُسلّمہ صورت کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابتدائی درسی کتابوں میں اس لفظ کا کون سا املا اختیار کیا جائے گا؟ یہ معمولی سوال نہیں۔

اُردو میں اس املائی انتشار کی کئی وجہیں ہیں۔ ان میں سب سے اہم وجہ تو یہی ہے کہ املا کی حقیقی اہمیّت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا۔ غلط مبحث نے املا کے مسائل کو رسمِ خط کی بحثوں میں اُلجھا دیا اور توجّہ کا رُخ دوسری طرف پھر گیا۔ یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ ابھی تک اس کا مفصّل جائزہ نہیں لیا گیا کہ لفظوں کی صورتیں مختلف زمانوں میں کس کس طرح بدلتی رہی ہیں اور اب ان کی کون سی صورت ، مستعمل صورت کا حکم رکھتی ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں اعراب بالحروف کا رواج تھا۔ اُس کے تحت پیش کے اظہار کے لیے کچھ لفظوں میں واؤ کو لکھا جاتا تھا۔ چونکہ کوئی ضابطہ متعیّن نہیں تھا اس لیے مختلف لوگ ، مختلف مقامات پر واؤ اور یَے کو استعمال کیا کرتے تھے۔ اب یہ رواج مرحوم ہو گیا۔ لیکن متعدّد لفظوں میں ان حروف کا وجود دیکھنے میں آتا رہتا ہے، مثلاً دوکان اور پہونچنا اور پہونچا (اسم) کو بہت سے لوگ اب تک واو سے لکھتے ہیں۔ کچھ کتابوں میں چھپا ہوا بھی مل جائے گا۔

اس انتشار کی حکومت یہاں تک بڑھی ہے کہ ہم آج بھی کبھی مجکو لکھتے ہیں ، کبھی مجھکو۔ کبھی اس کو علاحدہ علاحدہ لکھتے ہیں (مجھ کو) ، کبھی ملا کر (مجھکو)۔ لیے کو کبھی یَے سے لکھتے ہیں ،

کبھی ہمزہ سے (لیئے) اور کبھی دونوں کو جمع کردیتے ہیں (لیئے)۔ پتا کو کبھی الف سے لکھتے ہیں کبھی ہ سے (پتہ)۔ پانو میں کبھی ایک درمیانی نون لکھتے ہیں (پانو) کبھی واو پر ہمزہ لگاکر، اس کے آخر میں بھی ایک نون بڑھا دیتے ہیں (پاؤں) اور کبھی پانا مصدر کے فعل کی طرح (پاڈں) لکھتے ہیں۔ گزرنا کو کبھی ذال سے لکھتے ہیں (گذرنا) اور کبھی ز سے (گزرنا)۔ یہی صورت گذشتہ اور گزارش کی ہے۔ ازدحام کو کبھی ہائے ہوز سے لکھتے ہیں (اژدہام) کبھی حائے حطی سے (ازدحام) اور کبھی اس کو اژدحام بنا دیتے ہیں۔ اضافت کی صورت میں جب کہ حرفِ آخر واو ہو، اور زیر کھینچ کر بھی نہ پڑھا جاتا ہو، تو کبھی اسی واو کے نیچے زیر لگا دیتے ہیں، جیسے زانوِ دوست (زانوِ دوست پہ سر رکھا تھا کل تک میرا) کبھی یائے مجہول کا اضافہ کردیتے ہیں، جیسے: زانوے دوست کا جس وقت خیال آتا ہے۔

زندگی جیسے لفظ جب مضاف ہوں تو کبھی ان پر ہمزہ لگاتے ہیں (زندگیٔ جاوید) اور کبھی صرف ی کے نیچے زیر لگاتے ہیں (زندگیِ جاوید)۔ اور اگر لفظ کے آخر میں یائے معروف کی جگہ یائے مجہول ہو، تب خاص طور پر ایک ہمزہ کا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں، جس کو غالب نے عقل کو گالی دینے سے تعبیر کیا تھا (مثلاً پروائے عیش)۔

اس خلفشار کی وجہ ہے کہ املا کے مسائل کو ہم نے حقیقی اہمیت کی روشنی میں دیکھا ہی نہیں ہے۔ درسی کتابیں بھی تیار کرتے رہے، لغات بھی مرتب ہوتے رہے، پرانی کتابیں بھی مرتب ہوتی رہیں، لیکن یہ طے کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ جن لفظوں پر ان سب کی بنیاد ہے، ان کی صورت نویسی کا مستند معیاری انداز کیا ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے غالب صدی منا ڈالی، غالب پر سیکڑوں مضامین اور بیسیوں کتابیں لکھوا ڈالیں، لیکن خود غالب کے کلام کے تنقیدی اڈیشن مرتب نہیں کرائے جاسکے۔ یعنی جس پر ساری بحث و تکرار کی بنیاد تھی، وہ چیز ابھی تک معرضِ اظہار میں نہیں آسکی ہے اور تحقیق و تنقید کے محل، بلکہ شیش محل تیار ہوگئے۔ ہوا میں گرہ لگانا اسی کو کہتے ہیں۔

ان سب کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ بھی ہوئی کہ خطاطی کے فن نے بھی املا کے انتشار میں اچھا خاصا اضافہ کیا۔ بہت سی مصیبتیں تو اسی فن کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ جو لوگ پرانے مخطوطات سے سر مارتے رہتے ہیں، ان کو بہت اچھی طرح اس کا اندازہ ہوگا۔

ہندوستان میں پریس سے پہلے خطاطی اصلی فن تھا۔ مکتبوں میں خوش نویسی کی باقاعدہ مشق کرائی جاتی تھی۔ اور جب طباعت کا کاروبار بڑھا تو کتابت کا آغاز ہوا۔ کاپی نویسی اس کا کمال تھی۔ مکتبوں میں اساتذہ خوش نویسی کی مشق کرایا کرتے تھے، شوقین لوگ اور باکمال اساتذہ خطاطی کیا کرتے تھے اور پریس میں کاپی نویسی ہوتی تھی۔ خطاطی نے نقاشی اور مصوری کے انداز پر ترقی کی، اس میں خوب صورتی کو اصل معیار سمجھا جاتا تھا۔ فن کے مطابق دائروں وغیرہ کی نوک پلک سنواری جاتی تھی، نقطہ کہاں پر دیا جائے، یائے معروف اور مجہول کہاں پر لکھی جائے، ہائے دوچشمی کہاں پر آئے، ان سب کا تعلق حسنِ نمود سے تھا، اس سے نہیں کہ صحیح محل کہاں ہے۔ اعلا درجے کے خطاط، حرفوں اور لفظوں میں جمالیات کا حسن سمو دیا کرتے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ فن کاری کا کمال تھا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ عام تحریر پر بھی اس حسن کاری کے اثرات مرتسم ہوتے رہے، جن کی وجہ سے اصل توجہ فنِ خطاطی کے ضابطوں کی پابندی پر مبذول رہا کرتی تھی، املا کی صحت ثانوی چیز تھی۔ خطاطی کو عام تحریر سے کم رابطہ تھا۔ اعلا درجے کے خطاط پوری پوری کتابیں لکھنے کو اپنی توہین سمجھا کرتے تھے۔ خاص خاص وجوہ کے بغیر، وہ اس طرح کی ورزش کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شاہی فرمائش

یا درباری پیش کش کے علاوہ، مشکل ہی سے وہ اس کو قبول کر سکتے تھے۔
اور پھر کیا آداب سمجھے کہ آج ان کا ذکر سن کر کہانی کا گمان گزرتا ہے۔
اس ذیل میں اس دورِ آخر کے دو واقعے ذیل میں درج کیے جاتے
ہیں ان سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
مولانا شرر نے گذشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے:
"حافظ نوراللہ سے ایک بار نواب سعادت علی خاں
نے فرمایش کی کہ مجھے گلستاں کا ایک نسخہ لکھ دیجیے
.... اور کوئی ایسی فرمایش کرتا تو حافظ نوراللہ
اپنی توہین سمجھ کے اُس کا منہ ہی نوچ لیتے۔ مگر
فرماں روائے وقت کا کہنا تھا، منظور کر لیا۔ اور
عرض کیا تو مجھے اسّی گڈّی کاغذ (اُن دنوں رم کو
گڈّی کہتے تھے)، ایک سو قلم تراش چاقو اور
خدا جانے کتنے ہزار قلموں کے تیشے منگوا دیجیے،
سعادت خاں نے حیرت سے پوچھا کہ فقط ایک
ایک گلستان کے لیے اتنا سامان درکار ہوگا؟
کہا: جی ہاں۔"
"خوش نویسوں کے عام مذاق کے مطابق میر بندہ علی
صاحب سے بھی قطعہ نویسی کے سوا کتابت غیر ممکن تھی۔
زندگی بھر کبھی کوئی چھوٹی کتاب بھی نہ لکھی گئی — حاجی
حرمین شریفین نے جب مطبع جاری کیا تو ہزار منت
و سماجت میر بندہ علی کو اس پر راضی کیا کہ ایک نفیس
ایک جلد مسودہ لکھ دیں۔ میر بندہ علی نے بڑی محنت
سے اور خدا جانے کتنے دنوں میں لکھا اور دے گئے۔
مگر حاجی صاحب کے سامنے جب اُس پر آخری نظر
ڈالی تو کچھ ایسا نا پسند ہوا کہ بجائے حاجی صاحب کے
حوالہ کرنے کے پھاڑ ڈالا اور کہا: بھئی مجھ سے نہیں
ہو سکتا۔"

شرر ہی کے الفاظ میں: "اگلے خوش نویس، کتابت کو
اپنی شان سے ادنا سمجھتے تھے۔ اور خیال کرتے تھے کہ جو شخص پوری
پوری کتابیں لکھے گا، وہ غیر ممکن ہے کہ اوّل سے آخر تک اصول و
قواعدِ خوش نویسی کو پوری طرح نباہ سکے۔" اسی لیے ان بزرگوں کی
توجہ وصلیوں اور قطعات پر مرکوز رہا کرتی تھی۔ باقی وقت میں شاگردوں
کی تربیت کیا کرتے تھے۔

صحتِ املا کا دائرہ: املا، اصلاً صورت نویسی کا نام
ہے۔ یعنی زبان میں الفاظ جس
طرح پر مستعمل ہیں، اُن کو اس زبان کے رسمِ خط میں مسلّم طریقے سے
لکھنا۔ لفظ کے اجزا کا تعین لغت نگار کا کام ہے۔ لغت میں لفظوں
کا تعین جن حروف کے ساتھ اور اُن حروف کی جس ترتیب کے
ساتھ ہو چکا ہو، ان الفاظ کو اُسی طرح صحیح جوڑ بند کے ساتھ لکھنا،
املا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں لفظ کا املا غلط ہے تو
اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لفظ جس طرح
لغت میں درج ہے، اس کے برخلاف لکھا گیا ہے۔ یعنی حروفِ تہجی کی کوئی
غلطی ہے، خواہ تعین حروف میں ہو یا ترتیب حروف میں ہو۔ دوسری صورت
یہ ہو سکتی ہے کہ حرفوں کا تعین اور ترتیب، دونوں ٹھیک ہوں، مگر
حرفوں کے جوڑ میں یا ان کی صورت نگاری میں اُس مقام پر غیر متعارف
طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ ناواقفیت کی وجہ سے ایک حرف
کی جگہ دو حرف یا ایک علامت اور ایک حرف کا مجموعہ آ گیا ہے۔
لیکن موجودہ حالات میں، صحتِ املا کے دائرے کو
وسعت دینا ہوگی اور یہ اس وجہ سے کہ عدمِ تعین نے بہت انتشار
پھیلا رکھا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۳ء میں ایک مفصل رپورٹ
اس سلسلے میں رسالۂ اردو میں چھاپی تھی۔ اس رپوٹ میں کچھ اصلاحیں،

کچھ تعینات اور کچھ تصحیحات تھیں۔ مثلاً انجمن نے طے کیا تھا کہ عربی کے وہ لفظ جن کے آخر میں الف بہ صورت ی لکھا جاتا ہے، اُن کو اب اُردو میں الف سے لکھا جائے۔ یہ اصلاح تھی۔ انجمن نے اپنی مطبوعات میں خود بھی اسی طریقہ کی پابندی کی اور یہ اصلاح اس طرح رائج ہوئی کہ قبولِ عام نے اس کو مسلّمہ طریقۂ املا میں تبدیل کر دیا۔ یا یہ کہ عربی و فارسی کے علاوہ اور زبانوں کے لفظ جن کے آخر میں الف کی آواز کے لیے فارسی الفاظ کے قیاس پر ہائے مختفی لکھ دی جاتی ہے، الف سے لکھے جائیں گے۔ جیسے: تیا، بھروسا وغیرہ۔ اصولاً یہی صحیح ہے کہ ہائے مختفی فارسی کی چیز ہے۔ انگریزی، ہندی، ترکی، وغیرہ کے الفاظ سے اس کا کیا تعلق؟ یہ دراصل غلط نگاری نے رواج پا لیا تھا۔ اس غلط نگاری کی تصحیح کی گئی ہے۔ یہ صحت ہے۔ اب یہ بھی املا کے مسلمات میں شامل ہے۔

یا یہ طے کیا گیا تھا کہ مرکبات کو الگ الگ لکھا جائے اور انگریزی کے لفظوں کو جہاں تک ممکن ہو، ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھا جائے۔ جیسے خوب صورت اور کان فرنس۔ یہ اصلاً اصلاح ہے، نہ صحت، آسانی کے نقطۂ نظر سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسے جو چاہے کہہ لیجیے۔ لیکن یہ بھی طریقِ املا کا جزو ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب صحتِ املا کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو لفظ ناواقفیت کی وجہ سے غلط لکھے جاتے رہے ہیں اور جن باتوں کو انجمن ترقی اُردو نے بہ طور اصلاح منظور کیا تھا، یہ سب اس دائرے میں شامل ہیں۔ (بہ شکریہ 'آج کل')

" اقلیتوں سے سلوک
جمہوریت کی
کسوٹی ہے۔ "
(مہاتما گاندھی)

فیضی نظامپوری

غزل

نہ کوئی یار، نہ یاور یہاں سے بھاگ چلو
یہاں سبھی ہیں ستمگر، یہاں سے بھاگ چلو

یہ شہر، شہرِ خرد دشمناں ہے، کہتے ہیں
جنوں کے سایے سے بچ کر، یہاں سے بھاگ چلو

یہاں تو خونِ محبت بھی ہے روا یارو
ہر اک نگاہ ہے خنجر، یہاں سے بھاگ چلو

قدم قدم پہ یہاں ہیں زبان پر پہرے
کمالِ نطق کے پیکر، یہاں سے بھاگ چلو

نہ راس آئے گی تم کو ہوا زمانے کی
ہر ایک موج ہے خودسر، یہاں سے بھاگ چلو

سکوں کی موت بھی مرنا یہاں نہیں ممکن
ہوائے زیست کے خوگر یہاں سے بھاگ چلو

کھڑے ہو کیس لیے آتش فشاں دہانے پر؟
تمہارے حق میں ہے بہتر، یہاں سے بھاگ چلو

یہاں تو دن میں بھی لُٹتے ہیں قافلے فیضی
لُٹیرے بنتے ہیں رہبر، یہاں سے بھاگ چلو

افتخار احمد فخر

غزل

مشکل نہیں علاجِ غمِ زندگی نہ ہو،
مایوس زندگی سے مگر آدمی نہ ہو

شکوہ طرازِ رنج کبھی آدمی نہ ہو
دل جل رہا ہو آنکھ مگر شبنمی نہ ہو

واماندگانِ راہ کی اللہ رے بے بسی
منزل ہو پاس طاقتِ منزل رسی نہ ہو

ہوتا ہے زندگی میں وہی شخص کامیاب
کوئی بھی جس کی سعی و طلب آخری نہ ہو

ہو باخبر جو آج بھی اپنے مقام سے
رُسوا کبھی جہاں میں پھر آدمی نہ ہو

مغموم داغ دار اُجالے سے ہو نہ تو
تھی جس کی آرزو وہ سحر ہی ہوئی نہ ہو

عشق و ہوس میں فخر ضروری ہے امتیاز
رُسوا جہاں میں رسم و رہِ عاشقی نہ ہو

پروفیسر رشید کوثر فاروقی

(دوسری قسط)

چند روز کرالا میں

مہاراشٹر کے تعلیمی و تہذیبی رہنما اور انجمن خیر الاسلام* کے معتمد عمومی محمد علی مٹھا صاحب نے مسلمانوں کو عزم و ہمت کی راہ دکھائی اور اُس فتنے سے خبردار کیا جسے ہندیانے [illegible] کا معصوم نام دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان اپنے وطن سے محبت رکھتے ہیں، لیکن کسی قیمت پر اپنے دینی و تہذیبی ورثے سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ مذاکرۂ اقتصادیات کی صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ یہ احساس تو عام ہو چلا ہے کہ تعلیمی انحطاط کا سبب باہمی تفرقہ اور اقتصادی بدحالی ہے، لیکن یہ احساس عام نہیں کہ ان مسائل کا حل آسان نہیں۔ اس کے لیے اصولی منصوبہ بندی ہی نہیں، کثیر تعداد میں مخلص و باعمل شخصیتوں کی فراہمی بھی درکار ہے۔ انھوں نے اسلام کی معاشی بنیادوں کی تشریح کرتے ہوئے اجتماعی طور پر زکات و فطرہ ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی، اور قوم کی اقتصادی فلاح کے لیے غیر سودی بینکنگ نظام کے قیام پر زور دیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ مہاراشٹر کی طرح اپنی اپنی ریاست میں کیریر کونسل جیسے ادارے قائم کریں جن کی سرپرستی میں طلبہ اپنے فارغ اوقات میں ٹائپ رائٹنگ اور ٹیلرنگ وغیرہ سیکھیں اور پھر انھیں آغاز پیشہ کے لیے مالی امداد دی جائے۔

کانفرنس کی پُرآہنگ سرگرمی میں ایک صدائے بے ہنگام راقم الحروف کی تقریر تھی جو تعلیمی ادارے کے مذاکرے میں ہوئی۔ کسرِ نفسی و علوئے ظرف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنی تقریر قلم انداز کر دی جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم آزادوں کو جو نہ ابلۂ مسجد ہیں اور نہ تہذیب کے فرزند، اوّل تو ایسی کانفرنس میں یاد نہیں کیا جاتا اور بھولے سے یاد کر لیا جاتا ہے تو فکر ہوتی ہے کہ ہم گونگے ورنہ دوسرے بہرے ہو جائیں۔ یہاں بھی بس نہ چلے تو یہ اہتمام بہرحال کیا جاتا ہے کہ ہماری آواز حاضرین سے آگے نہ جا سکے۔ انگریزی اور ہندی پریس تو خیر ایسے کسی مسلمان کو جو اسلام کے خلاف بولنے کا رندانہ مذاق "اور ترقی پسندانہ مزاج" نہ رکھتا ہو، منہ لگانے سے رہا، اردو پریس بھی عام طور پر حق گوئی کو حماقت اور دروغ گوئی کو مصلحت سمجھتا ہے۔ چنانچہ یہ تقریر جو کہیں نہیں چھپی، حافظے کی مدد سے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

دینی تعلیم کے موضوع سے کانفرنس کے رسمی اور سرسری تعرض پر قلق کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ کانفرنس محض سیکولر ایجوکیشنل کانفرنس ہو کر رہ جاتی ہے، اور دینی تعلیم کا عنوان افسانہ ہوا جاتا ہے۔ حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیجیے تو صاف نظر آتا ہے کہ ہندوستانی عموماً صرف عقیدہ و اعتراف کی حد تک مسلمان ہیں اور عقیدہ و اعترافِ محض نہ لیل و نہار کا رخ [illegible] سکتا ہے نہ متحرک اور حرکت انگیز بن سکتا ہے جب تک اسے علم و یقین کا اعتبار نہ حاصل ہو۔ ہمارا المیہ اس مریض کا المیہ ہے جس کی بیماری پر سب کا اتفاق ہو لیکن تشخیصیں مختلف ہوں اور جب تشخیصیں مختلف ہوں تو

* انجمن خیر الاسلام مہاراشٹر میں ۲ کالج، ۲ شفاخانے، ۱۰ ہائی اسکول اور ۳ یتیم خانے قائم کر چکی ہے۔

علاج معلوم اور شفا معدوم - ہر قوم افراد کے اجتماعی عمل سے قوم بنتی ہے اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اجتماعی عمل ہو رہا ہے یا نہیں، یا ہو رہا ہے تو کتنا ہے اور کیسا ہے۔ کوئی عقیدہ کافی نہیں بلکہ وہ بنیادی علم بھی ضروری ہے جو پہلے قدم سے آخری قدم تک چراغاں کرتا جائے۔ میری التماس ہے کہ اس کانفرنس کو ہر کام سے پہلے دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت کا ایک مفصل منصوبہ اور اس کی تکمیل کا خاکہ بنا کر برخاست ہونا چاہیے۔

کل تک عوام کی بے علمی کا رونا تھا اور اب تو یہ عالم ہے کہ ہمارے خواص بھی قرآن و سنت کے معاملے میں اتنے غیر ذمہ دار ہو گئے ہیں کہ آیات و احادیث کا برمحل استعمال نہیں کرتے اور بھول جاتے ہیں کہ بات معنوی تحریف تک جا پہنچتی ہے۔ ابھی اسی کانفرنس میں سائنس اور معیشت سے متعلق تعلیم کی اہمیت جتانے کے لیے بار بار ختمی مرتبت کا یہ ارشاد پیش کیا گیا ہے:

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ"

حالانکہ یہاں جس علم کی تحصیل کا حکم دیا گیا ہے وہ خدا اور صرف خدا کا علم ہے جسے زمین پر خاتم النبیینؐ کے ذریعے اتارا گیا۔ حضورؐ کی دعوتِ علم کیا تھی؟ یہ پوچھنا ہو تو حضورؐ کے صحابہؓ سے پوچھیے نہ کہ عباسی حکمرانوں سے، جو قرآن سے بڑھ کر بلکہ بعض اوقات قرآن کو چھوڑ کر عجمی معلومات و علوم کے مربی تھے اور جن کا نام ترنم کی جگہ فخر سے لیا جاتا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے پاس قرآن کے علمی علم کے سوا کون سا نسخۂ کیمیا تھا جس کے بل پر اٹھے اور بڑے بڑے مدعیانِ ثقافت و حضارت پر چھا گئے۔ عاد و ثمود کی زمین پر جو تہذیبیں ان کے سامنے تھیں، ساسانیوں کی یادگاریں ایران میں، یا صیابی کے کھنڈر روم میں، آشوریوں کے آثار بابل و نینوا میں، فراعنہ کے مقابر مصر میں موجود تھے۔ اسکندریہ کا کتب خانہ اور منارۃ النور دونوں ان کی مٹھی میں تھے اور روم و ایران کے دساتیر و اساطیر ان کے پاؤں تلے۔ پھر قرآن و سنت کے ان حاملین و عاملینؓ نے قبل اسلام کے تمدن کو زندہ کیا یا قرآنی تہذیب کی بنیاد رکھی؟

مسلمان کے لیے قرآنی علم، جیسے سنت نبویؐ نے قرآنی عمل بنایا، لازمی (COMPULSORY) ہے اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے گویا جامعۂ الٰہیہ کا طالب علم ہے۔ زندگی کی درس گاہ میں اور مضامین بھی ہیں لیکن وہ سب اختیاری (OPTIONAL) ہیں جنھیں ہر زمانے کے لوگ وقت کے رجحانات، بدلتے ہوئے احوال، مختلف جغرافیائی علاقوں کی ضروریات اور اپنے طبعی تقاضوں کی بنا پر حاصل کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ کوئی صناع ہوگا، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینیر، کوئی مورخ وغیرہ — لیکن اسلامی علم جو ہر بندے کے لیے خدا کا لائحہ عمل ہے ہر اُس شخص کے لیے ناگزیر ہے جو خالق کی مرضی سے کار مخلوقی انجام دینا چاہتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے بعض سوالات کا جواب پا لینا ضروری ہے کہ اس جواب کے بغیر امتِ مسلمہ امت کی طرح نہ برپا ہو سکتی ہے نہ زندہ رہ سکتی ہے اور وہ سوالات ہیں: ایک مسلمان بحیثیت مسلمان (MUSLIM QUA MUSLIM) کے نزدیک علم کیا ہے؟ ترقی کسے کہتے ہیں؟ تہذیب کے کیا معنی ہیں؟ دنیوی زندگی وسیلہ ہے یا مقصد؟ معاشی خوش حالی کیوں اور کس لیے اور کس حد تک؟ وغیرہ۔

جب ہم مسائل کی سنگینی سے متفکر ہوں اور ان کے حل کی تلاش میں سرگرداں تو سب سے پہلے یہ سوچیں کہ وہ مقاصد کون سے ہیں جن کی راہ میں یہ مسائل آئے ہیں۔ اگر ہمیں حیوانوں کی طرح کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر لینا اور تن ڈھانک لینا ہے تو یورپ اور امریکا جیسے اولیا من دون اللہ کافی ہیں لیکن یہ ہماری غایتِ وجود ہے نہ کہاں؟ تحسینِ آخرت اور نہی عن المنکر و امر بالمعروف کرتے ہوئے

جینا ہے۔ اب رہی تحصیل معاش سو وہ بھی اسی عظیم تر مقصد کے حصول کا وسیلہ ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمان کسب معیشت کے ذریعے بھی، جیسے قرآن ابتغاء فضل من اللہ کہتا ہے، اسلام ہی کے مقاصد پورے کرتا ہے یعنی مواخات، خوش معاملگی، دیانت، امانت، اعانت اور خوف خدا کی عملی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ علوم جدیدہ بھی اسی لیے حاصل کرتا ہے کہ بندگان الٰہی کو بیش از بیش فایدہ پہنچے، ایک طرف انسان اور انسان کا اور دوسری طرف انسان اور خدا کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔

علم دین کا عام ہونا پہلی شرط ہے۔ وہی ہمیں یہ بتلائے گا کہ ہم دنیا میں، اسلامی ارتقا اور اسلامی استیلا کے لیے کون کون سے علوم حاصل کریں اور مشرق و مغرب کے دامن سے کون کون سی حکمتیں چن لیں اور کون کون سی سفاہتیں، جنھیں حکمتوں کا نام دیا گیا ہے، رد کر دیں۔ سب سے بڑی ضرورت دینی تعلیم کو ترجیح و اوّلیت دینے کی ہے۔ اگر کہیں نادانی سے مسلمانوں کے زوال کا سبب علوم جدیدہ کے میدان میں ان کی پس روی سمجھ لیا گیا اور علوم الٰہی کو علوم حاضرہ کے کاروان کا امیر و امام نہ بنایا تو امتِ مسلمہ کی تقدیر کا تنزل، جو بند ہے، بند ہی رہے گا اور دنیا بھی سرگشتگی و درماندگی کے اندھیروں میں بھٹکتی رہے گی۔

آخر میں تعلیم جدید کے مخلص وکیلوں سے عرض کیا گیا کہ ہم اور آپ دراصل مدتوں سے ایک زبردست یہودی اور مسیحی سازش کا شکار ہیں جس کا جال صلیبی جنگوں کے بعد سے اگرچہ پوری دنیا میں بچھایا گیا ہے تاہم آپ صرف اپنے ملک پر نظر ڈال لیں۔ یہاں برطانوی دور میں جو بساط شاطرانہ بچھائی گئی اس پر ایک طرف تو زینت دنیا دیکھتی امر وزر کے نمایندوں ــــ جاگیر داروں کا ایک طبقہ وجود میں لایا گیا جس نے طاؤس و رباب کو لوگوں کے لیے دل پذیر بنایا اور دولت پرستی کا جذبہ معاشرے کی رگ رگ میں رچا دیا۔ امرا ہوں یا غربا دونوں

میں تونگرانہ نفسیات پیدا کی گئی یعنی امیر ہے تو زمین و زر کے نشے میں چور، غریب ہے تو گو زمین و زر سے محروم تاہم زمین و زر ہی کا حریص و متمنی۔ زردار کی عادت کہ ناداروں پر تھوکے، اور ناداروں کا تماشہ کہ زرداروں کا مال دیکھ کر رال ٹپکائے۔ عیاشی اور قلاشی کے آئین مرتب ہوئے اور ان کے سر ملنے پہ "شرافت" کی شرحی قائم کی گئی۔

دوسری طرف اگرچہ دینی مدرسے جاری رہے تاہم ان کے فارغین کے لیے مسجد کی امامت، خیرات کی روزی یا کسی مدرسے کی معلّمی کے سوا جس کی بڑی سے بڑی تنخواہ اسکولوں کی چھوٹی سے چھوٹی تنخواہ سے بھی کم ہو، کوئی امکان نہیں چھوڑا گیا۔ نتیجہ یہ کہ محلّے والوں نے چندہ کرکے کسی یتیم کو مولوی بننے کے لیے بھیج دیا، کسی مفلس نے وقت گزاری کے لیے یا بہتر حالات کے انتظار میں اپنا بچّہ داخل کر دیا، لولے، لنگڑے، ذہنی اور جسمانی مریض اور ذلّت و حقارت کے مارے ہوئے بچّے "نائبین نبیؐ" بننے کے لیے بھیجے گئے۔ اتفاقاً کوئی طالب علم ذہین نکل آیا تو اس نے ساری ذہانت دوسروں کو اُلّو بنانے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے وقف کی لیکن ایک بات میں سب مشترک رہے یعنی سماج نے ان علما کو کوئی مستقل عزّت نہیں دی بلکہ اپنا محتاج سمجھا اور کیا یہ کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ جس علم کے عالم کی عزّت نہیں، اُس علم کی عزّت بھی نہیں ہو سکتی اور پھر یہ منحوس چکر چل پڑتا ہے۔ مولوی کا اپنا احساس کمتری اور مولوی کی تضحیک یا بے وقعتی اسی فتنے کا نتیجہ ہے جسے ہم اپنے لیے دورِ حاضر کا تحفہ ارتقا سمجھے۔ انگریزی اور انگریزی تعلیم کو ایک وقتی ضرورت سمجھ کر حمیّت ملّی اور عزّتِ نفس کے ساتھ نہیں، سندِ فضیلت و افتخار جان کر، بہ ہزار مرعوبی و بصد احساسِ برتری اختیار کیا گیا۔ پھر جدید تعلیم گاہوں کے فارغین کے لیے اعلا مناصب کے دروازے کھولے گئے تاکہ ان کے ذہن مغربیت کے غلام ہوں اور وہ اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں پر آقائی کریں۔ اب چونکہ یہی لوگ

سوچ وتمول میں نمایاں ہوں گے، یہی لوگ مسلمانوں کے لیڈر بھی
ہوں گے مسلمانوں کی لیڈری کے لیے کم از کم زبان سے اسلام کا نام لینا
ضروری ہے اسی لیے انھیں "صاحب لوگوں" کو اسلام کا ایک مغربی
ایڈیشن بھی دے دیا جائے۔ اسلام کو یہ قرآن وسنت سے نہ سمجھنے
پائیں بلکہ خدا اور رسول کی باتیں ان مستشرقین سے پوچھیں جن کی زندگی
کا مشن ہی یہی ہے کہ اسلام کی جڑیں اکھاڑ دیں اور چونکہ جڑیں
اکھاڑنے کے لیے اخفا ضروری ہے اس لیے ان کی تکنیک یہ ہے
کہ تحریر کے آغاز میں اسلام کی، اسلامی قانون کی؛ قرآن کی اور حضور
کی تعریف کرتے ہیں، اتنی تعریف کہ سادہ لوح انھیں اسلام کا مخلص،
مسلمانوں کا خیر خواہ اور اسلام کا عظیم اسکالر سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن
یہ "عظیم اسکالر" تعریفوں کے بعد یا تعریفوں کے درمیان میٹھا زہر
اگلتے اور "کوتاہیوں" کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں تاکہ ان کے
فرزندان معنوی خیال کریں کہ جو یہودی اور مسیحی اسلام سے اس درجہ
متاثر [illegible] اسلام [illegible] مسیح بن گیا۔
بھی [illegible] خود اسلام [illegible] تسلیم کے خوگر تو ہیں، تردید
[illegible] ہیں [illegible] نے اسلام کا ناقدانہ مطالعہ کر لیا اور نہیں
جانتے کہ اسلام [illegible] ناقدانہ مطالعے کی نہیں، طالبانہ بلکہ سائلانہ مطالعے کی چیز ہے۔
[illegible] کے لیے علم دین کی اہمیت وعظمت کو محسوس کیجیے کہ اس پر
ہماری دنیا وعقبیٰ دونوں کا مدار ہے۔ علم دین کو تاج اور غیر دینیات کو
تخت بنائیے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس سیل الحاد سے بچائیے
جس نے طوفان نوح کی طرح تمام مسلم ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا
ہے۔ دین سے ہماری جہالت اور دنیا سے ہماری رغبت نے یہ دن
دکھائے ہیں کہ آج ہمارے نوجوان ایک ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ مجھے
ایک اصطلاح وضع کرنے کی اجازت ہو تو اس مرض کو
RELIGIOPHOBIA (خوفِ مذہب) کا نام دوں گا۔ میں پوری
ذمہ داری سے اپنے ذاتی تجربے اور اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر
کہتا ہوں کہ ان کم نگاہوں کی نظر میں جو آپ کے سیکولر اداروں سے
کھیپ کی کھیپ نکل رہے ہیں دین کی اہمیت، دین و دنیا کی بقائے
باہمی کی صورت، قوموں کے عروج وزوال کی علت حتیٰ کہ تعلیم جدید
کی غایت کچھ بھی تو نہیں ہے۔ ان کی زندگی کی کہانی چند فقروں میں
بیان کی جاسکتی ہے۔ زمانے کی ہوا، عقبائے معاش کی تلاش،
اور مستقبل قریب کی فکر جو فکر کم ہے اندیشہ زیادہ ۔۔۔ ان کی
دستگیری کیجیے۔ ان کو زندگی کا ایک ایسا مقصد دیجیے جو زندگی سے
عظیم تر، بلند تر ہو تاکہ یہ جینے کا حق ادا کرسکیں۔ اُن کو سمجھائیے کہ
اُنھیں جس مستقبل کا بھوت چمٹا ہوا ہے اُس جیسے کتنے ہی مستقبل
ماضی بن چکے ہیں لیکن ملت کی تقدیر نہیں بدلی ہے۔ اُن پر ثابت
کیجیے کہ دین لذتوں کا دشمن نہیں ہے، دین خود سب سے بڑی لذت
ہے۔ کالجوں میں عربی اور اسلامی کلچر [illegible] مسلمانوں سے چندہ لینے کے لیے
ناگزیر مصیبت [illegible] کھنے کے لیے
شا[illegible] خدا اور رسول کی [illegible] ورنہ وہ
دن دور نہیں کہ خدا اور رسول ہماری ہنسی اڑائیں گے اور دنیا تو
آج بھی اڑا رہی ہے۔ مجاہدانہ بانکپن اور مبلغانہ مزاج کے اساتذہ
لائیے اور نہ ملیں تو بنائیے۔ اگر ان مسائل پر غور کیا گیا اور عزم و
خلوص کے ساتھ فیصلے کیے گئے تو یقیناً اس کانفرنس کو آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کہلانے کا حق ہے۔

تقاریر کی اس تلخیص کے بعد جی چاہتا ہے کہ آپ کو ان
محسوسات، تاثرات اور مشاہدات میں بھی اپنا شریک کروں جن
سے اس رپورتاژ کی تحریک ہوئی اور جن سے عبرت اندوزیوں کی راہیں
کھلتی ہیں۔۔۔ بمبئی چھوڑنے سے پہلے ہی کیرالا کے کچھ اداروں کی
طرف سے بعض پرچے وصول ہوئے تھے جن میں اس کانفرنس کو
نہایت خطرناک قرار دیا گیا تھا۔ الزامات یہ تھے کہ یہ روس کے
اشارے پر منعقد ہو رہی ہے اور ہندوستانی حکومت بھی اس میں

اس لیے دلچسپی لے رہی ہے کہ سوشلسٹ نظام قائم ہونے کا ایک غرض غایت یہ بھی ہے کہ اسلام کو مسلمانوں کے ذہن سے دھو ڈالا جائے اُن میں دُنیوی تعلیم اور اقتصادی ارتقا کا عشق پیدا کیا جائے تاکہ زہر زہر شیریں بھی ہو اور موت حقیقی۔ کانفرنس سیکولر بلکہ اسلام دشمن عناصر کی ایک کوشش ہے، وغیرہ — جہاں کہیں غیبت اور اتہام کا امکان ہوتا ہے میں بہت ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں" اس لیے میں نے ان اطلاعات پر نہ یقین کیا نہ شک ہاں یہ ضرور سوچا کہ اگر یہ صحیح ہیں تو کچھ انتہا ہے اس بدنصیبی کی کتنا پُرستانی و بے کسی اور ہر اس و مایوسی کے اس عالم میں بھی ہمیں منافق مزاجوں کی ریشہ دوانی سے نجات نہیں۔ کھلے ہوئے دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے یا مفاہمت و مصالحت کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ خلعت و اَمام اور یمین و یسار کُلاہ بازوں اور نقاب پوشوں سے بھرا ہوا ہے اور ان کی نقاب نوچ پھینکنے کی کوئی صورت نہیں کہ ہر کُلاہ پر ہلال و کوکب چمک رہے ہیں اور ہر نقاب پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے — اور اگر یہ الزامات غلط ہیں — اور خدا کرے غلط ہوں — تو کیا خدا کی مار ہے کہ ہمارا کوئی کام معاونت کے ساتھ یا کم از کم مزاحمت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ معلوم سے معصوم، بے ضرر سے بے ضرر، مشترک سے مشترک مفاد میں مخالفت ضرور شامل ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ یہ اختلاف ہے لیکن اختلاف اتنا جارح، اتنا تشہیر پسند، اتنا طوفانی نہیں ہوا کرتا۔ گاہ گاہ کوئی اتحاد بھی نظر آتا ہے تو اس قدر سطحی، بے رُوح، نباتی اور حُباب آسا کہ اُس کا وجود اخبار کی خبر تو بن سکتا ہے، زندگی کا عنوان نہیں۔ جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا اور پھر وہی ذات، گروہ، برادری، مسلک، جماعت، حیثیت (STATUS) وغیرہ کے نفسانی امتیازات کی بلائے بے درماں مسلّط ہو جاتی ہے۔

علی گڑھ یونی ورسٹی کا معاملہ ابھی کل کی کہانی ہے۔

کرالا پہنچ کر معلوم ہوا کہ مسلم لیگ اور مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے درمیان شدید آویزش ہے۔ مسلم لیگ والے کہتے کہ ایک کثیر تعداد سوسائٹی سے احتجاجاً مستعفی ہو چکی، سوسائٹی والے کہتے ہیں کہ چند نا قابلِ لحاظ استعفے آئے ہیں۔ مسلم لیگ کہتی ہے کہ سوسائٹی حکومت اور فرقہ پرستوں کا کھلونا ہے اور اسلام کی مخالف، سوسائٹی کہتی ہے کہ مسلم لیگ اقتدار کی بھوکی ہے اور جانتی ہے کہ اگر تعلیم پھیلی تو عوام ہوشیار ہو جائیں گے اور مسلم لیگ کی دوکان سیاست نہیں چل سکے گی۔ مسلم لیگ کا مُدعا ہے کہ یہ لوگ تعلیمی احیا کے بہانے زمام قیادت اُچک لینا چاہتے ہیں، سوسائٹی کا جواب ہے کہ ہم سیاست سے سروکار نہیں رکھنا چاہتے اور مسلم لیگ کی چراغ پائی ہی اس بنا پر ہے کہ ہم نے اس کا آلۂ کار بننے سے انکار کیا ہے۔

ہم کہ مہمان تھے اس قضیے سے بالکل الگ رہے کیونکہ مسلم لیگ کرالا کی ریاستی جماعت تھی اور ہم آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے مدعو تھے۔ لیکن غیر جانب داری کے باوجود جو پہلو خود بخود سامنے آتے گئے اُن کا تجزیہ کرنا ہی پڑا۔ صاحبانِ معاملہ کی دلیلوں کی بنا پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے پہلے اپنے ذہن کو اس فضا سے جو کانفرنس سے پہلے پیدا کر دی گئی تھی، صاف کیا، کیونکہ شبہات کی چھاؤں بھی ہو تو مطالعہ معروضی نہیں ہو سکتا، لہٰذا جو کچھ وہاں دیکھا اسی پر انحصار بہتر ہے۔

مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کا یہ موقف معقول نظر آتا ہے کہ وہ ایک عمرانی و تہذیبی کام کر رہی ہے اس لیے سیاست سے دست کش رہے گی اور اس سلسلے میں اُسے سالِ تاسیس ۱۹۶۶ء سے ہی مسلم لیگ کا تعاون حاصل تھا چنانچہ محمد علی کویا جو کرالا کابینہ کے وزیر ہیں، کانفرنس میں تقریر بھی کرنے والے تھے لیکن کانفرنس سے ذرا پہلے پردۂ راز میں کیا خبر کیا مرحلہ پیش آیا کہ دونوں میں طلاق ہو گئی

اور چپقلش کا تعلق اس عذر پر ختم ہو گیا کہ ہم غیر سیاسی رہنا چاہتے ہیں اور مسلم لیگ ہمیں سیاسی بنانا چاہتی ہے۔ ممکن ہے سوسائٹی کو، جو کل ہند پیمانے پر پھیلنے جا رہی تھی مسلم لیگ اس لیے استعمال نا چاہتی ہو کہ سوسائٹی کی توسیع سے ہند میں بھی توسیع ہو گی لیکن امکان یہ بھی ہے کہ اب تک سوسائٹی مسلم لیگ کے تعاون سے جو کیرالا میں ناگزیر تھا، بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی جب وہ مسلم لیگ کے تمام ذرائع استعمال کر کے وہ نامی و بالغ ہو گئی تو اس نے اپنے بازو پھیلائے اور کل ہند بننا چاہا لیکن چونکہ کیرالا سے باہر مسلم لیگ کا وجود یونہی سا ہے اور اس کی مدد کے بغیر کام چل سکتا ہے اس لیے اُسے سرد مہری سے نظر انداز کر دیا گیا ہو اور یہ سرد مہری مسلم لیگ کو بُری لگی ہو۔ خیر اگر نیت بُری نہ ہو تو اتنی "حکمت عملی" کی بھی تاویل کی جا سکتی ہے۔

لیکن حکمت عملی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف غیر سیاسی ہونے کا اعلان بھی ہو دوسری طرف ایک سیاسی جماعت کو حریف کا مقام بھی دیا جائے۔ سلیقہ تو جب ہوتا کہ مسلم لیگ جو پروپیگنڈا چاہتی ہو کرتی رہتی، سوسائٹی سماجی اور علمی خدمات کے لیے وقت رہتی اور مسلم لیگ کے دیرینہ رفقا کو منالیتی یا اُن کے ساتھ اپنی حد تک دوستی کا معاملہ رکھتی لیکن بدقسمتی سے ایسا ہوا نہیں۔ شہر بھر میں اتنے جھنڈے لہرائے گئے اور اتنے پھاٹک سجائے گئے کہ اُن سے طنز و نمائش کا انداز صاف جھلکتا تھا۔ پہلے دن ہمیں کہیں سیاہ جھنڈیاں نہیں دکھائی گئیں لیکن دوسرے دن ہماری راہ کے دونوں طرف سیاہ جھنڈیاں نصب تھیں، تیسرے دن سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ ہر رنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں تاکہ "سیاہ" دوسرے رنگوں میں سے ایک رنگ نظر آئے۔ یہ جواب اگرچہ ذہین ہے لیکن اس ذہانت میں شعور و بلوغ نہیں ہے۔ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ تلے ادیب کے

بھائی بہنوں میں ہو تو حرج نہیں، ایسے اداروں کو جو ملّت کی تقدیر سنوارنے اٹھے ہوں زیب نہیں دیتی۔

کانفرنس کے خاتمے پر کاروں کے جلوس کا اہتمام تھا جسے فاروق سے کالی کٹ تک کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ہم میں سے بعض کو اس عاقبت نااندیشانہ تجویز سے اختلاف تھا مگر جب ہم نے جلوس کی روانگی سے پہلے اپنے طور پر کالی کٹ جانا چاہا تو معلوم ہوا کوئی سواری نہیں مل سکتی۔ ڈرائیوروں کو حکم تھا کہ موٹر کاریں میدان میں جمع ہوں۔ سرکاری بسوں کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ نقل و حرکت کے تمام ذریعے معطل ہیں۔ چار و ناچار باراتی بن کر ہم بھی چلے۔ کم و بیش ۰۰ کاروں کا ایک زنجیرہ تھا جو گلیسیر کی سی رفتار سے جنبش کر رہا تھا۔ ہم کار کا مقصد یہ جانتے تھے کہ مسافت جلد طے ہو لیکن یہاں معاملہ دگرگوں تھا۔ فاروق کالج سے کالی کٹ تک کا راستہ دس منٹ کی جگہ پورے تین گھنٹے میں طے ہوا یعنی ۵ بجے چلے تھے، ۸ بجے پہنچے۔ قصہ یہ تھا کہ ہر کار جونک کی طرح رینگ کر قدم قدم پر قرطینہ کرتی تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟ کچھ آگے بڑھے تو کھلا کہ سڑک کے اِدھر اُدھر احتجاجی ہجوم ہے جو کالے جھنڈوں، فلک شگاف نعروں، تہمتوں اور گالیوں سے مہمان نوازی کر رہا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ میزبانوں کی ادائے میزبانی بھی خوب ہے کہ ہمیں جا بجا ٹھہراتے ہیں اور ناریل رس پلانے کی جگہ "ویدرس" سُناتے ہیں۔ غرض اس "دل بادل" کو سخت طوفان سے دوچار ہونا پڑا۔ لوگ جوش میں آ کر ملیغار کرتے اور کاروں کا راستہ روک لیتے۔ شیشے چڑھائے رکھنے کا حکم تھا اس لیے ہر شیشہ سازِ خموشاں بنا ہوا تھا۔ حبسِ بے پناہ کے سبب کہیں کوئی "قیدی" ذرا شیشہ اتارتا تو کچھ مجاہد لپک کر فوراً سیاہ جھنڈے ٹھونس دیتے۔ جب کبھی یہ سیل خراماں مد سے جزر کی طرف مائل ہوتا اور کار آگے بڑھتی کوئی فرہاد بے خطر کود پڑتا اور ڈر لگتا کہ کہیں شیریں

کو سو گوارا نہ ہونا پڑے۔ لیکن غالباً ڈرائیور آہستہ روانی کی مشق کر چکے تھے اس لیے عشق کی سعی خودکشی کہیں مشکور نہ ہو سکی۔ بہرحال شکر ہے کہ پگڑیاں اُچھلیں تو اُچھلیں سر بچ گئے۔ ورنہ اس غربت میں جان چلی جاتی تو ورثا خون کا دعوا کس پر کرتے؟ کئی بار تو سنجیدہ ہو کر شہادت کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ لیگ کا ر پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ محسوس ہوتا ضرور توڑیں گے اور ضرور ماریں گے لیکن پھر خلاف توقع ہٹ گئے اور آئی ہوئی قضا ٹل گئی۔ شاید اس مظاہرے کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا تھا اُسے جذبۂ عناد کے ساتھ ساتھ حسِ مزاح کی مقدار وافر بھی عطا ہوئی تھی اس لیے معاملہ بندر بھبکیوں تک رُکا رہا تاہم کالی کٹ تک اچھے اچھوں کا یہ عالم تھا جیسے بندر کسی بچّے کی روٹی لے بھاگے اور اس کے بعد بھی آنکھیں دکھا دکھا کر بکتا رہے۔ بندر کو تو فکر ہوتی ہے کہ ہاتھ آیا ہوا مالِ غنیمت محفوظ رہے اور غنیم میدان چھوڑ دے تاکہ یکسوئی نصیب ہو لیکن بچّہ بے چارہ سمجھتا ہے کہ بات روٹی پر ختم نہیں، حریف کے تیور کچھ اور چاہتے ہیں۔

مشاہدہ صاف کہے دیتا تھا کہ یہ جلوس محض مسلم لیگ کو چڑانے اور یہ جتانے کے لیے تھا کہ دیکھو، تمھاری مخالفت کے باوجود ہم نے ملک کے گوشے گوشے سے اتنے مہمان جمع کر کے آل انڈیا کانفرنس منعقد کر لی گویا مسلمان فتح مکّہ کے لیے جا رہے ہوں اور رہبا ریوں سے گزرتے وقت حکم ملے کہ اس طرح چلو کہ تعداد کثیر معلوم ہو، چہرے سے مسرت، رفتار سے شوکت اور جسم سے تنہ زوری جھلکے تاکہ کفارِ مکّہ کے دلوں میں ہیبت بیٹھ جائے۔ خدا جانے اس بہکی ہوئی ملّت کو کب ہوش آئے گا اور دوست دشمن کو کب پہچانے گی؟ جن لوگوں کو عوامی کاموں کا تجربہ ہے جانتے ہیں کہ ایسے مظاہرے جوابی مظاہروں کو دعوت دیتے ہیں اور ہجوم کا ردِّ عمل قطعاً پیش ناگفتنی ہوتا ہے۔ شیکسپئر کے "جولیس سیزر" میں ہجوم ایک معصوم شاعر کو، جو ایک سیاسی دشمن "سِنا" کا ہم نام ہے قتل کر دیتا ہے

اور اس کی یہ صفائی کہ "میں سِنا شاعر ہوں" قبول نہیں کرتا، ہجوم کی نفسیات مصوّر کی گئی ہے۔ ایسے مظاہرے میں حالات کا بگڑنا اور نہ بگڑنا دونوں اتفاقات ہیں۔ ایک اتفاق واقع ہوا دوسرا رہ گیا۔

یہی نہیں، دوسرے دن مدراس کے اخبار "ہندو" میں یہ خبر چھپی کہ کیرالا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر عبدالغفور صاحب نے کیرالا مسلم لیگ کو چیلنج کیا ہے کہ "ہماری اور اپنی مقبولیت کا اندازہ کرنا ہو تو عوام سے رائے لے کر دیکھ لو۔" اس خبر کے ساتھ ہی محمد علی کویا کا جواب بھی تھا کہ "ہم مجذوب کی بڑ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔"

ایک طرف سوسائٹی کا یہ دعوا کہ ہم سیاست سے گریزاں ہیں اور دوسری طرف ایک غالب سیاسی جماعت سے مبارزطلبی بھی ہے۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے؟ سیاست سے علاحدگی کا صالح مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر طبقۂ خیال کا تعاون حاصل کیا جائے، تفرقے کی فضا نہ پنپنے دی جائے، توانائیاں باہمی اختلافات میں نہ ضایع کی جائیں، شہرت و اقتدار کے جراثیم سے محفوظ رہا جائے اور اقتدار پسند حضرات تحریک کو اپنے مفاد کے لیے نہ استعمال کر سکیں۔ یہ مقاصد اس طرزِ عمل سے کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں؟ ایسی باتوں سے تو انھیں کو فایدہ ہو سکتا ہے جن کی ہنسی کو یہ انتظار ہے کہ ہمیں روتا دیکھے۔

یہاں میں اس صدی کے دوسرے عشرے کی مثال دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علی گڑھ تحریک سے متعلق آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا دعوا بعینہ یہی تھا کہ ہمیں پالٹکس سے سروکار نہیں ہے لیکن اس موقف کا فایدہ عموماً تاجِ برطانیہ کو پہنچا جب ابلیسِ اقتدار کے عرش سے کوئی وحی اُتری آمنّا و صدّقنا کہا گیا اور ابوالکلام جیسے لوگوں نے ٹوکا تو جواب ملا کہ "ہم سیاست سے کنارہ کش ہیں۔" سیاست سے کنارہ کش ہونے کے یہ معنی تو سمجھ میں آتے ہیں کہ تخت سے دست بردار ہو جاؤ، یہ نہیں آتے کہ دوسروں کا تخت اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرو۔ سیاست سے کنارہ کشی کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کے طرفدار نہیں اور

کوئی ہمیں آلۂ کار نہیں بنا سکتا۔ ہم یگانہ دبے گا نہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس لیے نہیں کہ ہم نشانہ کی سکت نہیں رکھتے بلکہ اس لیے کہ جو میدان ہم نے اپنے لیے چُنا ہے وہ جنگ کا نہیں امن کا ہے۔ ہماری ناطرف داری اس لیے ہے کہ ملّت زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھائے، اس لیے نہیں کہ ملّت کو نقصان پہنچے اور اغیار فایدہ اٹھائیں۔ چنانچہ ابھی دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ "ٹائمز آف انڈیا" اور "کرنٹ" وغیرہ نے اس افتراق پر بغلیں بجائیں۔ کیرالا مسلم لیگ کو جس سے کیرالا کے ہندو بھی متنفّر نہیں، لعنت وملامت کی گئی، اور کانفرنس کے قایدین کو اس آرزو میں سراہا گیا کہ وہ فرقہ پرستانہ سیاست کا جنازہ نکال دیں گے۔

کانفرنس کا ایک اور پہلو بھی تشنہ تھا۔ حریفانہ پروپگنڈے سے متاثر ہو کر نیّتوں پر حملہ کرنا مناسب نہیں اور نہ یہ کہنا قرینِ حُسنِ ظن کہ کانفرنس روس کے اشارے پر منعقد ہوئی تھی لیکن کہیں کہیں ماتھا ضرور ٹھنکا۔ مثلاً کانفرنس کے مدعوین میں ہندوستان کے وہ چند نام بھی تھے جن کا اسلام اُس اسلام سے مختلف ہے جیسے چودہ سو سال سے ہم یا ہماری اکثریت اسلام سمجھتی آئی ہے، جن سے اگر کوئی پوچھے کہ آپ کا عقیدہ کیا ہے تو جواب ملتا ہے کہ کسی کو کسی کا عقیدہ پوچھنے کا حق نہیں۔ یہ "پرسنل معاملہ" ہے۔ جن سے اگر سوال کیجیے کہ کیا آپ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں؟ تو صاف "ہاں" کہنے کی جگہ کوئی فلسفیانہ یا متصوفانہ بات کہیں گے کچھ اس طرح کہ شیخ بھی خوش رہے، شیطان بھی ناراض نہ ہو۔ کسی نام سے کچھ اشک شوئی ہو سکتی تھی تو وہ مولانا ابوالحسن ندوی کا نام تھا، لیکن مولانا بھی نہیں آسکے اور آتے بھی تو ان کے ذمّے کانفرنس کو کامیابی کی دعا دینے کا کام سونپا گیا تھا جو پہلے برہمنوں اور پادریوں کا منصب تھا اب علما کا بھی سمجھا جانے لگا ہے۔ نہ علی گڑھ سے نجات اللہ صدیقی بُلائے گئے نہ دیوبند سے مولانا طیّب صاحب، نہ مدرسۃ الاصلاح سے بدرالدین اصلاحی وغیرہ۔ ان میں سے کسی کو سیاست سے سروکار نہیں، سب کو مسلمانوں کے مسایل سے غایت درجے کا شغف ہے اور سب علمی اداروں سے وابستہ ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض اکابر علما کو نہ بلانے کا عذر یہ ہو کہ کانفرنس کی ساری کارروائی انگریزی میں تھی اس لیے زیادہ تر انھیں لوگوں کو بلایا گیا جو انگریزی ہی میں خواب دیکھتے ہیں، انگریزی ہی میں آنکھیں کھولتے ہیں اور انگریزی ہی میں اسلام بھی لائے ہیں۔

یہ بھی چھوڑیے۔ دینی تعلیم کے مذاکرے میں جو بے کیفی اور نیم گرمی منتظمین کی طرف سے تھی، سخت افسوسناک تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ رسمی طور پر یہ عنوان بھی رکھ دیا گیا کیونکہ کم بخت دقیانوسی عوام اب بھی چاہتے ہیں کہ دَورِ جدید کی کاک ٹیل بھی ملے تو مذہب کی چھلنی میں چھن کر ملے۔ ورنہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق مسایل زیرِ بحث آئیں لیکن نہ متانت ہو نہ دل ریشی، نہ دل مضطرب ہوں نہ آنکھیں خوفِ خدا سے پُرنم۔ تقریر کرتے وقت مقرروں کو فکر ہو کہ فوٹو گرافر ان کی تصویر ضرور لے لیں اور کنکھیوں سے فوٹو گرافروں کو دیکھتے جائیں۔ شاہ نشست پر نظم وضبط نہ ہو؛ کُرسیاں بچھی ہوئی ہیں، رضا کاروں اور منتظمین کی آمد ورفت جاری ہے، اُدھر مقالے پڑھے جا رہے ہیں یا تقریریں ہو رہی ہیں اِدھر کچھ "مہماتِ امور" پر سرگوشیاں جاری ہیں اور پلیٹ فارم گویا متحرک تصویروں کی تماشا گاہ ہے۔ وہ سیمابیت، وہ بے دلی، وہ بے نمکی کہ توبہ! غیر متعلق مشاغل اور آیندہ پروگرام کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ آج کی یہ نشست پروگرام کا جزو ہی نہیں، ہر نشست سے زیادہ اہم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سشن کہیں اور ہے یہاں "لابی انگ" ہو رہی ہے۔ آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ اگر صدارت گاہ پر یہ طوائف الملوکی ہو تو سامعین کی توجہ کدھر ہوگی؟ اور وہ سننا بھی چاہیں گے تو کیونکر سُنیں گے؟

(باقی اگلے شمارے میں پڑھیے)

سید یوسف بخاری

جنتا کے گیت

ہماری شاعری کا دستور یہ ہے کہ نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی یا رباعی وغیرہ کے ذریعے شعرا اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں، تمام اشعار علم عروض کے مطابق ایک خاص بحر، ردیف اور قافیہ کے ماتحت کہے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک ایسی شاعری بھی ہے جو ان قیود سے تقریباً آزاد ہے۔

اس موضوع میں شروع سے آخر تک تک بندی کے سوا کوئی فنی شاعری نہیں ہوتی، چند موزوں اور مقفّا فقرے یا مصرعے، آسان سے آسان الفاظ اور سہل سے سہل مثالوں کی صورت میں ڈھل کر بے اختیار ادا ہو جاتے ہیں۔ اس شاعری کے موجد اور کرتا دھرتا ہندوستان کے عام کام کاج کرنے والے وہ نر ناری ہیں جو دھوبی، تیلی، ماہی گیر، کسان، مزدور، چمار اور بھنگی کہلاتے ہیں۔ جن کے جیون کی شروع سے یہ ریت رہی ہے کہ خود اندھیرے میں رہ کر ہماری زندگی میں اُجالا کرتے ہیں اور رات دن بھوکوں مر کر ہم کو کھلاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی ہی دھن میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کے جیون کا رس میٹھے بول بن کر امرت کی صورت میں ٹپکتا ہے، قدم قدم پر اُن کی ہمت بندھاتا ہے۔ اُن کی محنت کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے، اُن کو خوشی اور شانتی کے راستے پر لگاتا ہے اور یوں اُن کی محنت سپھل ہوتی ہے۔ سورج کی کرنیں جس طرح جیون جیوتی کو اُجاگر کرتی ہیں اُسی طرح جنتا کے گیتوں کی چمک گانے اور سننے والوں کے دلوں میں ہر آن ایک نیا اُجالا لاتی ہیں۔

جنتا کے گیت اُتنے ہی پُرانے ہیں جتنی پُرانی جنتا ہے۔ لیکن آج بھی جنتا کے یہ گیت بہت سے دُکھوں کا دارو ہیں۔ ان گیتوں میں کھلے ہوئے آکاش اور دھرتی کی جھلک ہے، گاؤں کے نقشے ہیں، ہرے بھرے کھیتوں کی تصویریں ہیں، یاروں کی صدا، کولھو کی چرچراہٹ، چکّی کی گھمر گھمر کی گونجیں بھی اس میں شامل ہیں۔ کوئل کی کوک سے بیچ بیچ ان کے دلوں میں ہوک اُٹھتی ہے اور پپیہے کی پی پی سے پیا کی یاد اس طرح تڑپاتی ہے کہ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ جنتا کے ان گیتوں کو سن کر ہم بڑی بڑی بستیوں کے ڈھول ڈھمکوں سے دور اُن دیہاتوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں آس پاس خوب صورت کھلونا سے گاؤں ہزاروں نر ناریوں سے آباد ہیں۔ اُن کی دیہاتی زندگی، خانگی معاشرت اور رسم و رواج کا نقشہ ہو بہو ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ درحقیقت یہ گیت حُسن و جمال، عشق و محبت اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ کے ایسے موتی ہیں جو سچّے اور آبدار ہیں اور ہماری بے پروائی سے خاک میں ملتے جاتے ہیں۔ اگر نیچرل شاعری نام ہے محض اصل واقعات کو ہو بہو پیش کرنے کا، تو پھر کس کی مجال ہے جو ان دیہاتی گیتوں کے واقعی شاعری ہونے میں ذرا بھی شبہ کرے۔ دراصل دیہاتی شاعری جنتا کے سنگیت، شاعری کی روح اور آرٹ کی جان ہیں جو کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے اکثر شاعروں کو اس کی ہوا چھو کر بھی نہیں لگی۔

جتنا کہ گیتوں کی بہت سی قسمیں اور مختلف نام ہیں۔ یہ اپنے اپنے محل اور موقع پر مختلف طریقوں سے گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں وہ خانگی گیت بھی شامل ہیں جن کو گھریلو ڈومنیاں عورتوں کے رُوبرو ٹھاک ٹھاک کر بے تکلف گاتی ہیں۔ ہر چند کہ وہ دیہاتی زندگی کے ترجمان نہیں، لیکن یہ شہر اور دیہات میں پیدائش کے موقعے سے لے کر شادی بیاہ کی تقاریب تک یکساں طور پر گائے جاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی قدر عُریانی لیے ہوئے ہیں، اور انھیں گھر کی چار دیواری سے باہر نکالنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اِن کے علاوہ باقی گیت پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً پیدائش کے وقت گیتوں میں تو ماسے کے گیت، جچا گیریاں، چھٹی کے گیت اور لوریاں ہیں۔ شادی بیاہ کے گیتوں میں سہاگ، گھوڑیاں، سیٹھنیاں (یہ سیٹھنیاں وہی عُریاں گیت ہیں جن کا اوپر اشارہ ہو چکا ہے)۔ رت کے گیت، سہرا، مُبارک باد، منڈھا اور نیرا وغیرہ ہیں۔ متفرق گیتوں میں جو وقت اور موسم کے لحاظ سے گائے جاتے ہیں، تیج کے گیت، ساون کے گیت، چکی کے گیت، کولھو کے گیت، دھوبیوں کے کھنڈ، خیال بازوں کے خیال، سوانگ کے گیت، ٹیسو اور جھانجی کے گیت ہیں۔ ان گیتوں کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہندوستان کے مختلف صوبے اپنی آب و ہوا کے اعتبار سے بالکل جداگانہ ہیں، اُن کی بولیاں ٹھولیاں بھی الگ الگ ہیں۔ آب و ہوا کا قدرتی اور لازمی اثر لوگوں کی معاشرت اور تہذیب پر پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر صوبے کے رسم و رواج کے مطابق وہاں کے گیت بھی علاحدہ علاحدہ اپنی اپنی زبان میں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دیہاتی گیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد اُردو، ہندی بھاشا ہی میں ایک لطیف امتزاج کے ساتھ پائی جاتی ہے جن کو دیہاتی عورتیں، اور اُن کے مرد اپنے دلچسپ انداز اور گنوارو لب و لہجے میں بڑی حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

آئیے، اب ان گیتوں کی بھول بھلیاں میں چلیں جن کی دل کشی گونجیں جیون کے میلے کا رُوپ بڑھا رہی ہیں۔ ذرا کان لگا کر سُنیے، فضا میں ایک دل کش اور سُہانی صدا گونج رہی ہے، پہلے ہلکی سی ایک آواز سُنائی دیتی ہے پھر فوراً ہی وہ کئی آوازوں میں تبدیل ہو جاتی ہے:

بارہ

رام منالے رام منالے ہے پیا نے رام منالے
جَل بھی لا رے رام منالے پیارے رام منالے
دھُلوے والے رام منالے پیارے رام منالے
کھول دے بھیّا کلّی اور بھر دے سب سنسار
جائے گیا ماتا کے میں تو پر ہوں بلہار

جھولا رے جھولا
جھولا رے جھولا

سانٹا چھوا دے رام منالے پیارے رام منالے
نیر جھلا لے رام منالے پیارے رام منالے
بیلنے والے رام منالے پیارے رام منالے
بلّا چرسیا بائیا تھاری جگ میں جوڑ
ہریالی کے ہم دیوتا کون کرے ہماری ہوڑ

جھولا رے جھولا
جھولا رے جھولا

بیل والا
۱؎ لو ہے کا وہ آنکڑا جو بیلوں کے جوئے میں اٹکا دیا جاتا ہے۔
۳؎ ڈنڈا
۴؎ پانی
۵؎ بیل والا
۶؎ چرس کھینچنے والا
۷؎ پانی دینے والا
۸؎ برابری

۲

کیکلی جوتے کیلیا، بارہ موردھو لائے ہے رے
جوڑی ہلے، پھر ادھر اسامیرا بھیّا رام منائے رے
آہ کروں تو جگ جلے، جنگل بھی جل جائے رے
جوڑا پاپی نہ جلے وا میں سب کی ہلئے سمائے رے
ہے جھولا دیجو جھولا، جھولا

یہ وہ دل کش گیت اور رسیلے بول ہیں جو غریب لاؤ کھینچنے والے کسانوں کی محنت کے بوجھ کو ہلکا کرتے ہیں، کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں، گاؤں میں کوٹھے کے کوٹھے اناج سے بھر جاتے ہیں۔ کسان کھیت پہ ہوتا ہے گھر والی چکی پیستی ہے اور من ہی من میں اس کو یاد کرتی ہے جو اس کے جیون کا ساتھی اور قسمت کا ستارہ ہے۔

گیت

باغ[1] باگوں ہو کے مت آئیو باگوں میں بیٹھا بگوان[2] باغ والا
نیبو[3] جب تیرے بگوان کاں گئے تھے نیمو توڑی مزیدار
توڑا ہاں توڑا تیرا کیا توڑا گنوار
ڈیوڑھی[4] میری ڈِوڈی ہو کے مت آئیو ڈِوڈی میں بیٹھا ڈِوڈی وال
اوڑھنی[5] جب تیرے ڈِوڈی وان کان گئے تھے لہریا اوڑھا گندے دار
اوڑھا ہاں اوڑھا تیرا کیا اوڑھا گنوار
میری رسوئی ہو کے مت آئیو رسوئی میں بیٹھا دیور جیٹھو
جب تیرے دیور اور جیٹھ کاں گئے تھے کھائی تھی جلیبی مزیدار
کھائی ہاں کھائی تیرا کیا کھایا گنوار
سیج[6] میری سیجاں میں مت آئیو سیجاں میں بیٹھا میرا شیام[7]
خاوند جب تیرا شیام کاں گیا تھا حویلی چنائی نیچے دار
چنائی ہاں چنائی تونے کیا چنایا گنوار

کسان بھی اپنی سنتوشتی کا دم بھرتا ہے، اُسے بھی ابھی تک اپنے بیاہ کی باتیں اور رسیلی راتیں یاد ہیں، دل ارمانوں سے بھرا پڑا ہے۔

ہریانہ

اوڑھ کنواری پھرے تنے بھرتار چاہیے سے
بیکا[8] پیہر میں کیوں عمر کٹے گھر بار چاہیے سے
تیری عمر ہے تھوڑی تیرے سر پہ باندھ دوں موڑی
تیری اور بنڑے کی جوڑ ایک سار چاہیے سے
سجا سجایا کمرہ پلنگ نوارڑ چاہیے سے
کیوں[9] اے تو عرج سُنے نہ موری تو کے[9] کررہی دیری
اتر[10] توسی الل بھری[11] ٹُرت سوار چاہیے سے
ہشیار بن جا ایک نہ ڈیگی انتر[12] تیار چاہیے سے
ہنر بیاہ میں ہوتے بڑے بڑے باجے ڈھول ڈھڑے اور تماشے
ہوتے سونے سانگ تماشے یہی کار چاہیے سے
موکو بس دو پیسے کا روزگار چاہیے سے
پتی بھرتا سنگ ایک پتی کا پیار چاہیے سے
پیہر میں کیوں عمر کٹے گھر بار چاہیے سے

یوں کام کاج کرتے دن اور رات گذرتے ہیں، وقت اور موسم بدلتے ہیں۔ موسم کے ساتھ ساتھ رُت بھی بدلتی ہے۔ ساون آتا ہے، گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، بجلی کوندتی ہے، چھما چھم مینہ پڑتا ہے۔ کھیتوں، جنگلوں اور باغوں میں ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے، مور ناچتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، پپیہا پی پی کی رٹ لگاتا ہے، دل چنچل امنگوں سے مچلنے لگتا ہے۔ عورتیں، باغوں اور جنگلوں میں جاکر جھولا جھولتی ہیں، ملہار گاتی ہیں، میٹھے سلونے تیل کے پکوان چڑھتے ہیں۔ لیکن جس کے بالم پردیس میں ہوں وہ کیوں کر جھولا جھولے اور کس دل سے ملہار گائے اور کس کے لیے پکوان چڑھائے۔ وہ تو پیا کی یاد میں تڑپ رہی ہے، رو رو کر یوں کہتی ہے:

کروں کون جتن اری مورے سکھی مورے نینوں سے برسے بادریا
چھائی کالی گھٹا، بادل گرجے، چلے ٹھنڈی پون مورا جیا ترسے
تھی پیا ملن کی آس، سو پردیس گئے مورے سانوریا
بھیگوں[13] سب سکھیاں جھولے جھول رہی ہیں، میں کھڑی بھیگوں[13] پیا تورے آنگن میں
بھرتے مورے رنگیلے من موہن، موری خالی پڑی ہے گاگریا

۲

اوڑھنی — موری دھانی چنریا اتر گئی ۱ — بدھنا باری عمریا نیہر ترسے
عطر میں بسی ہوئی — سونے کی تھالی میں بھوجن پروسوں — مورا جیون والا بدیسی ترسے
گھڑولی — سونے کا گڑوا گنگا جل پانی — مورا گھونگھٹ والا بدیسی ترسے
میکہ — لونگ الائچی کا بیڑا بناؤں — مورا گھونگھٹ والا بدیسی ترسے
کھانے والا — چن چن کلیاں سیجیں بچھاؤں — مورا سونے والا بدیسی ترسے

۳

گاگریا خالی پڑی ہے اور سیج سونی ہے لیکن گاؤں کی ندی اور نالے ایسے بھرے ہیں کہ اپنے آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ سوچتی ہے کہ بالم کیوں کر پار اتریں گے۔ اس لیے ندی سے کہتی ہے

دھیرے بہو ندیا تو دھیرے بہو
خاوند — مورا کنتھ اتر جائے پار دھیرے بہو
گرج گرج کر بادل برسے بجلی کوندے ہی
رات اندھیری جیا ڈرت ہے سونا ہے گھر بار
دھیرے بہو ندیا تو دھیرے بہو
کاہے کی توری نیا کاہے کی پتوار
عورت — کون تورا نیا کھویا کے دشمن اترو پار
دھرم ہی موری نیا رہے ست کی لگی پتوار
سیاں مورا نیا کھویا موہن اترو پار
دھیرے بہو ندیا تو دھیرے بہو

اور جب پیا کے آنے کی خبر ملتی ہے تو اس کے آنے سے پہلے اپنی سکھیوں کو بلاتی ہے اور بالم کے آنے کی خبر سنتے ہوئے ان سے ایک نہایت عجیب اور پیارا سوال کرتی ہے:

تم آؤ ری سکھیو موری میں تو سے پوچھوں
برس پیچھے راجا آئے میں والے بولوں یا روٹھوں

دیہاتوں کی یہ منہ چڑھی ندیاں اور سر چڑھے نالے گاؤں کے نر ناریوں اور پتی پتنیوں کو جب ضرورت سے زیادہ پریشان کرتے ہیں تو ان کی خبر وہ دریا دل مچھیرے لیتے ہیں جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر صبح سویرے گھر سے نکلتے ہیں اور دوسرے دن کے مزے کی خاطر دریا میں اپنا جال پھینکتے ہیں۔ جال تو پانی میں ڈال دیا لیکن آنکھیں نیلے آکاش پر لگی ہوئی ہیں، اور منہ سے یہ بول نکل رہے ہیں:

گیت

آس لگا چلا میں گھر سے جا پہونچا دریا پہ واں
تڑپ رہی ہے دریا میں مچھلی جیسے دشمن تڑپے یاں
جوں پانی میں ڈالا جال، مچھلی پھنس کے کر رہی بل
دائیں سے بائیں کو نکل، جا جائے اندر گئی وہ رل
بسم اللہ کر میں نے غوطہ مارا مچھلی کو جا دیا مسل
گردن پکڑ باہر میں لایا دیکھ کے دشمن ہو گیا دنگ
گھیر لیا گھیرے ہیں، میں نے دریا کی مچھلی کو واں
چھڑا ۱ — جال ہاتھ سے دیا ڈال اور ڈگن ہاتھ میں لیے سنبھال
پہلے نام استاد کا لیا اور ڈگن کو میں نے دیا بجا
تین تین میل کی مچھلی ایکدم میں نے واں لی بلا
منڈی ۲ — مار مار کے بھوری جھڑ دی بھیجی گذری کے ہاں
تڑپ رہی دریا میں مچھلی جیسے دشمن تڑپے یاں
چھڑ ۳ — دوسرے دن پھر پہنچا دریا اور ہزارہ دیا لگا
جگ جگ لگی بوئیں اور شیشے کے گولے دیے لگا
لوہے کے وہ گولے جو جال کو پانی میں ڈبوئے رکھتے ہیں ۴ — بارہ بجے جب رات کو دریا اندر پہونچا واں
بڑے بڑے سنگھاڑے سول اور ٹلی واں سے لایا چھڑا

۱؎ ۲؎ ماخوذ از دیہاتی گیت ۳؎ ماخوذ از ساون کے گیت مطبوعہ رسالہ ادبی دنیا اکتوبر ۱۹۳۳ء

اور عبدالغنی گیانی جھنڈا نے خیال بنا کے دیا سُنا
تڑپ رہی دریا میں مچھلی جیسے دشمن تڑپے یاں

اچھے یہ چلے جال سکھی ری — خوب کٹا یہ سال سکھی ری
گچھے بُنے ڈوری منگوائی — بعد میں اُس کے چک ہوائی
ہیم بُنی سیسل منگوائی — بعد میں دو دونوں کی جالی بنوائی

(حاشیہ: سن کی ڈوری / سوت کی ڈوری)

۲

دہلی گئے اور گئے کانپور — بارہ بنکی اور گئے رامپور
باون بستی گئے سانپور — اور ڈھیر آ کے لگا دھام پور
چہروں پہ آ رہی بہار — سکھی ری خوب کٹا یہ سال

۳

کالے دوپٹے من کو بھائے — میرٹھ سے چھپوا کر لائے
کوئی اودا کوئی سبز رنگائے — کوئی دھانی کوئی نارنجی لائے
ہو گئے سب خوش حال — سکھی ری خوب کٹا یہ سال

۴

بریانی پلاؤ ڈھیر منگایا — زردہ متنجن خوب اڑایا
دال چھنال کو کس نے پکایا — دو مرغی کے انڈے لایا
مُرغے کٹے دو چار — سکھی ری خوب کٹا یہ سال

۵

سو سو روپے کا ہار بنایا — گھر والی کو جا کر پہنایا
غنی حسینی نے گا کر سنایا — مصرعہ کوئی جھوٹ لگایا
جھنڈا نے کیا تیار — سکھی ری خوب کٹا یہ سال

دریا کے کنارے دھوبیوں کے گھاٹ ہیں، ادھر اُدھر سیکڑوں دُھلے دُھلائے اُجلے کپڑے دھوپ میں پڑے سوکھ رہے ہیں، گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کمر جھکائے کپڑے دھونے میں مصروف ہیں۔

ان کا سخت کام دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ شاید اُن کے جیون میں رس کی کمی ہے، لیکن یہ ہماری بھول ہے، ان کا جیون بھی پیار کے بندھن سے بندھا ہے۔ ان کے جیون میں بھی رسیلے نین، کٹیلی چتونیں اور گوری گوری بیّاں ہیں، کپڑے دھونے کے ساتھ راگ رنگ اور چھیڑ چھاڑ میں بھی مصروف ہیں۔

۱

گوری گوری بیّاں گُدائے گُدنا — ریشم کی چولی کسائے جُبنا

۲

تو کھالے اِلائچی دانا — اور ہمیں بریلی جانا

۳

توپ خانے کی دھوبن بڑی موٹی — لہنگے میں چھُپا لائی ڈبل روٹی

۴

نئی نوکری دو گنا چاؤ — اُٹھو دھوبن کلیہ بناؤ

اور یہی چھیڑ چھاڑ کی باتیں کبھی کبھی ان کے گیتوں میں ایک پریم کہانی کا رنگ بھر دیتی ہیں:۔

نئی ہردا سے مورا من ہر لیو ری

اک دن جھنکو بھتی میں ٹھاڑی انگنواں میں (حاشیہ: کھڑی)
جب دن تھوڑے سے رہ گئے گنواں میں (حاشیہ: رخصتی)
کھلیلی پڑ گئی مورے بالے سے جوبن واں میں (حاشیہ: روئیں روئیں میں)
سیّاں کی صورت بس گئی مورے پرنواں میں

اے جی دُکھ سکھ دل سے بسر گئیو ری

پیا کی چھب ڈھب گڑ گئی موری نجریا میں
اٹھوں میں چونک چونک رات جو اندھیریا میں
ٹپ ٹپ آنسو چوئے نین سے چُندریا میں
پیت دھوکے سے کر کے ٹھگ گیا ری

کہے سوچ یونہی پڑی پڑی ہائے سونی سیجریا میں

کہو کسی کی آج موہے بھائے نہیں بتیا جی

جب سے دیکھی ہے میں نے بلم کی صورتیا جی

آوے ہے یاد اور دھڑکے ہے موری چھتیا جی

نہ جانوں گاؤں ٹھاؤں کیسے بھیجوں پتیا جی

بھینٹ تیرے عشکوں میں تن من سب تج گیو ری

کہتے چھنگا چنچل ہوئی ہے یہ ناری جی

پہلے سے سُدھ بُدھ کیوں پیتم کی بسار جی

دیا جو ابلا پہ کرتے ہیں مُراری جی

یہ سب مایا دنیا یہ ہے تمہاری جی

نئی مہروا سے مورا من ہر گیو ری

اور یوں گاتے گاتے کھیل ہی کھیل میں اپنا کام کیے جاتے ہیں، سارا دن گھاٹ پر رہتے ہیں، رات پڑے گھر جاتے ہیں، دن بھر کے کام کاج کی تھکن کھنڈوں کی محفل میں کھنڈ گا گا کر اُتار تے ہیں۔

کھنڈ

پڑا آنکھ پہ پردہ اِن آفتیوں کو کوئی شعور نہ تھا

انا الحق منصور کہے جب شرع کو یہ منظور نہ تھا

خدا نام کا پیالہ پیا کسی اور نشے میں چور نہ تھا

گھٹ میں اس کے بول رہا وہ پاس رہا کوئی دور نہ تھا

بن مرضی مُرشد کی اے جو سولی پہ چڑھا منصور نہ تھا

بن مرضی مولیٰ کی اے جو موسیٰ کو ملا کوہِ طور نہ تھا

گر لالہ موری نے کہا گیانی منصور کے پاؤں کا دھور نہ تھا

جنتا کے بہت سے گیت آپ نے گاؤں کی خاموش اور پُر سکون فضا میں سُنے، اب انہی گیتوں کی ایک آخری گونج اپنے شہر میں چل کر سُنیے۔ گاؤں کے وہ غریب جن کے پاس نہ اناج بونے کے لیے زمین ہے اور نہ کوئی دوسرا کام ہے وہ صبح ہوتے ہی پیاز کی دو تین گٹھیاں اور روٹی کے تین چار موٹے موٹے ٹکڑے کپڑے میں باندھ کر کام کی فکر میں شہر روانہ ہو جاتے ہیں، دو چار اِدھر دو چار اُدھر، دو چار کسی اور طرف۔ شہر پہنچ کر وہ پہاڑ کاٹتے ہیں، کانیں کھودتے ہیں، نہریں بہاتے ہیں، پُل تیار کرتے ہیں، سڑکیں نکالتے ہیں، قلعے کھڑے کرتے ہیں، مسجد، مندر، محل، حویلی، مکان اور سرائے بناتے ہیں، باغ باغیچے لگاتے ہیں اور یوں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بال بچّوں کا پیٹ پالتے ہیں، اور جب اُنھیں اپنا کام بہت بوجھل محسوس ہوتا ہے تو اُس کٹھن سمے میں اُنھیں کے گیت اُنھیں سہارا دیتے ہیں۔

اُدھر دیکھیے ایک راجا جی کا محل تیار ہو رہا ہے سیکڑوں من کا ایک آہنی شہتیر اوپر کی منزل پر لے جا رہے ہیں، ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگ رہا ہے، سر سے پاؤں تک پسینے میں تر اور ہیں لیکن "ہی یا ہی یا" کر کے کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ ہی جائیں گے۔

ہی یا ہی یا[1]

گاڑ لینا کیسے بھائی

ایسے بھائی ہیّا ہیّا

بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا

محل سرا کا ہاں ہاں بھائی

محل سرا کا ہاں ہاں بھائی

بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا

اونچا کر لو ہیّا ہیّا

بوجھ اٹھالو ہیّا ہیّا

بوجھ اٹھایا ہیّا ہیّا

ہاتھ بچا کے ہاں ہاں بھائی

پیر بچا کے ہاں ہاں بھائی

بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا

اونچا کر لو ہیّا ہیّا

شیر بہادر ہیّا ہیّا

بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا

کیسے بھائی ہیّا ہیّا

شیر بہادر ہیّا ہیّا

آگے سر کے ہیّا ہیّا

---

[1] ماخوذ از مضمون سید مطلبی فریدآبادی مطبوعہ چنگاری، دہلی

شیر بہادر ہیّا ہیّا
ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا
پیٹ پلیگا مہارا اتھارا

باغ بنے گا ہاں ہاں بھائی
پھول کھلیں گے ہاں ہاں بھائی
جشن اڑیں گے ہاں ہاں بھائی
پیٹ پلے گا چار مہینے
پیٹ پلے گا مہارا اتھارا
ہاں ہاں بھائی مہارا اتھارا
پیٹ پلے گا مہارا اتھارا
شیر بہادر ہیّا ہیّا
کیسے بھائی ہیّا ہیّا
پیٹ پلے گا ہیّا ہیّا

اور اٹھاؤ ہیّا ہیّا
آگے سرکے ہیّا ہیّا
آٹھ مہینے بھوک لگے گی
شیر بہادر بھوک لگے گی

بن کپڑے کے بن لتّے کے
آٹھ مہینے بن روٹی کے
زور لگاؤ ہیّا ہیّا
بھوک لگے گی بھوک لگے گی
کیسے بھائی ہیّا ہیّا
شیر بہادر ہیّا ہیّا
ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا
پیٹ بھرے گا ہیّا ہیّا
اور ابھارو ہیّا ہیّا
ہاتھ بچا کے ہیّا ہیّا
شیر بہادر ہیّا ہیّا
دام ملیں گے ہیّا ہیّا
سود بھریں گے ہیّا ہیّا
قرض ملے گا ہیّا ہیّا
شیر بہادر ہیّا ہیّا
اور ابھارو ہیّا ہیّا
پیر بچا کے ہیّا ہیّا

۲

سوکھی رے لکڑی جنگل کی
نام تو لیتی اللہ کا
اللہ ہی عالم کل جو معلوم
نام تو لیتی اللہ کا
بولو جوانو! ہئیسا

اللہ ہی والو زور لگا لو
نام تو لیتی اللہ کا
جورم جوری ناچے گوری
نام تو لیتی اللہ کا
بولو جوانو! ہئیسا
اللہ ہی اللہ بولو جوانو
نام تو لیتی اللہ کا
تم رے زور میں عدو چیلے
نام تو لیتی اللہ کا
بولو جوانو! ہئیسا
گوری کا گونا بل کر دونا
دونا ہی زور لگاؤ جوانو
جواناں جنگی مست ہے بھنگی
بھنگ کا کھانا موج اڑانا
نام تو لیتی اللہ کا
بولو جوانو،
زور سے بولو، ہئیسا

غرض راجا اپنی دھن میں ہے اور پرجا اپنی دھن میں، اپنے کھیتوں کی بھول بھلیاں میں کھوئی ہوئی اور اپنی اپنی محنت سے دوسروں کو سہارا دیتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہے، بڑھتی جا رہی ہے —

انیس فاطمہ عابدی

غزل

آہ اُن کے پلکوں پر اشک بن کے آئی ہے
میرے دل کی بے تابی کچھ تو رنگ لائی ہے

دفعتاً جو بدلا ہے واقعات نے پہلو
یاد کی چتاؤں پر زیست مسکرائی ہے

دل نے ساتھ چھوڑا ہے پھر کہیں اُمیدوں کا
پھر ارادتاً شاید کوئی چوٹ کھائی ہے

شوق لے چلا لیکن خوف ہے تو بس اتنا
اک طرف ہیں تنہا ہم، اک طرف خدائی ہے

ہم سمجھ نہیں سکتے اب انیسؔ کی حالت
اُٹھ گئی توقع بھی، یا مُراد پائی ہے

مسعود انصاری

غزل

یہی سمجھے بُلایا جب کسی نے
ہمیں آواز دی ہے زندگی نے

چلے آئے تمہاری انجمن میں
کیا کچھ اس قدر مجبور جی نے

نہ دنیا کا رکھا ہم کو نہ دیں کا
تمہارے شیوہ ہائے دلبری نے

کیا ہے درد کی لذت سے واقف
کسی کی زحمتِ چارہ گری نے

تجھیں کو حاصلِ تخلیق جانا
ہمارے ذہن کی صورت گری نے

کیا رنگِ تکلف سے گریزاں
مجھے مسعودؔ اُن کی سادگی نے

ادیب سہارنپوری

غزل

بڑھتے ہی جاتے ہیں دھندلکے
بجھ گئیں کتنی شمعیں جل کے

اندھیاروں نے آنکھیں کھودی ہیں
کیا لے گی اب دھوپ نکل کے

زندانوں کو گھر کہتے ہیں
دیواروں کا رنگ بدل کے

سچی پیاس نہیں پیاسوں میں
کس برتے پر ساغر چھلکے

میل، مروت، پیار، محبت
آج یہ افسانے ہیں کل کے

کاش ادیبؔ ان کو بھی دیکھیں
دیکھنے والے میری غزل کے

سحر اعظمی

غزل

دیکھ کے تیور عزمِ عمل کے — کانپ اُٹھے ہیں پاؤں اجل کے
ڈوب گیا ساحل پہ سفینہ — طوفانی موجوں سے نکل کے
ہم نے کھلائے ہیں گُل کیا کیا — راہِ وفا میں خار پہ چل کے
یاد کی صہبا بن گئی نشتر — شیشے میں احساس کے ڈھل کے
پرچم اُٹھائے ہیں تعمیری — نام کے بھاری کام کے ہلکے
سوزِ دل اربابِ جنوں سے — پانی ہو گئی بیڑی گل کے
ہو گئے دشمن بھی گرویدہ — دیکھا جب انداز بدل کے

پا کے سحرؔ نے وقت کا ایما
بدلے ہیں انداز غزل کے

مغموم کلکتوی

غزل

اے گردشِ حیات نہ ٹھوکر لگا ہمیں
ہم تاجِ اوجِ بخت ہیں سر پر لگا ہمیں

پل پل یہ دل حضور بدلتا رہا صفت
شیشہ لگا ہمیں کبھی پتھر لگا ہمیں

ہالہ تھا رنگ و نور کا چہرے کے گرد و پیش
اب کیا بتائیں کیسا وہ دلبر لگا ہمیں

جیسے حیات نام مسلسل سفر کا ہے
یوں وادیٔ جنوں سے گذر کر لگا ہمیں

تنہا ہوا تو آ گئی مغمومؔ اس کی یاد
ظلمات میں وہ نور کا پیکر لگا ہمیں

محمد رفیع انصاری

سمجھوتا

۵ جنوری ۱۹۷۱ء

آج اُس نے پھر مُسکرا کر دیکھا۔ جواب میں میں نے بھی مُسکرا دیا تھا۔ لیکن میری مُسکراہٹ کتنی کڑوی تھی۔ جی میں آیا اُس سے صاف صاف کہہ دوں کہ تمھاری مُسکراہٹ، تمھاری ادائیں، تمھارا بانکپن، تمھاری شربتی آنکھیں، میرے لیے نہیں۔ وہ تو میں صرف تمھاری لاج رکھنے کے لیے مُسکرا دیتا ہوں ــــ لیکن اس میں میرا بھی قصور ہے۔ میرا قصور یہ کہ میں نے آج تک اُسے دھوکے دھوکے میں رکھا ہے۔ اور آج میں نے اُس کی مُسکراہٹ کا جواب دے کر اُسے ایک اور دھوکا دے دیا ہے۔ ایک بہت بڑا دھوکا۔

وہ دولت مند ہے، دنیا کی ساری آسائشیں اُسے میسّر ہیں اور میرے نصیب میں بہت تھوڑی سی چیزیں ہیں۔ میرا وجود اُسے دُور سے ضرور چمک دار نظر آیا ہوگا، لیکن میرا حقیقی روپ وہ دیکھ لے تو شاید مجھ سے منہ پھیر لے۔ میں بہت بد قسمت ہوں، مفلس اور بد حال، جیسے اکثر و بیشتر فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں، بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ضبط کی انتہا ہو جاتی ہے۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا ہوں، جو ہمیشہ کوڑا کرکٹ اور بد بو سے پٹا رہتا ہے۔ دُنیا میرے لیے جہنّم ہے لیکن میں پھر بھی جی رہا ہوں۔ کتنا سخت جان ہوں۔ بھلا ایسے میں کون جی سکتا ہے۔ کم از کم ایک خوب صورت پیکر کے لیے تو یہاں آنا خود کُشی کے مترادف ہوگا، اور پھر میرے ہلکے پھلکے جسم پر، جس پر بہت سارا بوجھ پہلے سے لدا ہے، ایک اور بوجھ کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسی لیے میں اندر ہی اندر اُس سے نفرت کرتا ہوں۔

میں بھی اپنے سینے میں دل رکھتا ہوں۔ میری بھی بہت سی تمنّائیں اور اُمیدیں ہیں۔ میرے سینے میں بھی محبّت کی خلش ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں کئی مُہلک بیماریوں کا شکار ہوں، مُفلسی، بیکاری، بدحالی اور بے روزگاری جن کے نام ہیں۔ یہی میری تمنّاؤں اور خواہشوں کا قبرستان ہیں۔ لیکن پھر بھی میں مُسکراتا ہوں، قہقہے لگاتا ہوں اور یہی کبھی کبھی مغالطے کا باعث بن جاتا ہے۔ شبانہ کے ساتھ بھی یہی ہوا، وہ مجھے کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھی اور میں اُسے مسلسل دھوکا دیتا رہا۔ آج میں نے اُسے ایک بار پھر دھوکا دیا ہے۔

---

۱۰ جنوری ۷۱ء

آج میں ایک جگہ انٹرویو کے لیے گیا تھا۔ انٹرویو کے لیے مجھے ایک ہفتہ قبل اطلاع مل چکی تھی۔ میں نے اس ہفتے بڑے سُہانے سپنے دیکھے، خیالوں میں بڑے بڑے معرکے سَر کیے، دبے دبے اپنے آپ پر ناز بھی کیا، مجھے اپنے آپ پر رشک بھی ہوا۔ اور آج صبح ہی صبح میں آشاؤں کی ایک دنیا لیے انٹرویو کے لیے روانہ ہو گیا ــــ وہاں بڑا ہجوم تھا، نوجوانوں کا ایک جمِ غفیر میرے سامنے تھا۔ لمبی لمبی قطاروں میں بیٹھے ہوئے مجھ جیسے سینکڑوں نوجوان

جن کے مستقبل کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا۔ کہیں اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں سے دھیمی دھیمی ہنسی بھی اُبھرتی اور کہیں سے اِکّا دُکّا قہقہے بھی بلند ہوتے۔ میں سوچنے لگا یہ لوگ کیسے کیسے خواب دیکھتے ہوں گے۔ آخر عمر بھی تو خواب دیکھنے کی ہے۔ میں خیالوں میں کھو گیا۔ اگر میری قسمت چمک گئی تو کل میں اس بینک کا کلرک ہوں گا۔ مجھے چپراسی سلام کریں گے۔ مجھ سے لوگ ہمدردی کا اظہار کریں گے۔ میری عزت کریں گے اور میری ماں مجھے بہت سی دُعائیں دے گی۔ میں اس کا اچھا سا علاج کرانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ لیکن جوں ہی میں خیالوں سے جاگا، مجھے مایوسی ہوئی۔ یہاں مجھ جیسے پانچ سو نوجوان ہیں، جن میں صرف پانچ کا انتخاب ہوگا۔ پانچ کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو دلاسا دیا کہ میں بھی گریجویٹ ہوں۔ میں نے یہ ڈگری بڑی عرق ریزی سے حاصل کی ہے۔ اپنی آنکھوں کو پھوڑا ہے، اپنی پیاری پیاری نیندوں کا گلا گھونٹا ہے، بھوکا رہا ہوں، آنسو پیے ہیں۔ کیا اسی دن کے لیے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک چونک گیا۔ چپراسی میرا نام پکار رہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کمرۂ انٹرویو میں داخل ہو گیا۔

میں اُن کے تمام سوالات کا جواب دے چکا تھا۔ مجھے اپنی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی اور دل ہی دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلکنے کو تھے۔ میری برسوں کی تمنّائیں پوری ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن یکایک جیسے کسی نے مجھے آسمان پر سے زمین پر دے مارا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں حواس باختہ منیجر کے چہرے کو تکنے لگا جس نے مجھ سے سفارش کا مطالبہ کر کے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ میں کمرۂ انٹرویو سے اپنی ناکام حسرتوں کی ارتھی لیے گھر کی طرف چل دیا۔ میرے کانوں میں اُس وقت منیجر کے یہ جملے گونج رہے تھے:

’’سفارش، یہ پانچ حرفی لفظ ہی تمہاری تقدیر بدل سکتا ہے، اس کے بغیر تمہاری یہ ڈگری تمھیں منہ چڑائے گی۔ تم زندگی کے کسی میدان میں سفارش کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتے۔‘‘

---

۲۵ جنوری سنہ ۷۱ء

ماں کی بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ ٹی بی آخری اسٹیج پر ہے۔ آج انھیں بہت کھانسی آئی تھی۔ اب تو منہ سے خون بھی آنے لگا ہے۔ میں کتنا بدبخت ہوں کہ اپنی ماں کی بیماری کا خاطر خواہ علاج کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ میری مفلسی نے مجھ سے یہ حق بھی چھین کر مجھے کتنا بڑا گنہگار بنا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی ماں کو مجھ سے کوئی گلا نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں۔ گلا اور شکوہ تو اپنی تقدیر اور کاتبِ تقدیر سے ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ جی میں آتا ہے دیواروں سے سر ٹکراؤں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دوں اور ہمیشہ کے لیے اپنا خاتمہ کر لوں، میں اکثر یہی سوچا کرتا ہوں۔ میری مفلسی نے مجھے بڑا نڈر بنا دیا ہے۔ مجھ میں مرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ جینے کا حوصلہ ختم ہوتا جا رہا ہے، مرنے کی تمنا جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ دیکھنا ہے جیت کس کی ہوتی ہے۔

---

۲۰ فروری سنہ ۷۱ء

آج میں نے بہت بڑے بڑے جھوٹ بولے ہیں۔ سفید جھوٹ، جن کو اگر ایک سچا آدمی سُن لے تو شاید اس کا دم نکل جائے۔ دراصل مجھ سے یہ جھوٹ بلوائے گئے ہیں۔ میری غربت اور بدحالی نے مجھ سے یہ کام بھی کروا لیا۔ ابھی ابھی میں سیٹھ کالیداس کی حمایت میں تقریر کر کے آیا ہوں۔ سیٹھ کالیداس نے حالیہ الکشن میں حصّہ لیا ہے، اور وہ ایک سیاسی پارٹی کے امیدوار ہیں۔ سیٹھ نے عوام سے وہ وہ وعدے کیے ہیں کہ اگر ان کی صداقت کی مجھے امید بھی ہو جائے تو

شاید خوشی کے مارے میرا انتقال پر ملال ہو جائے — ان دنوں سیٹھ جی کتنے بدل گئے ہیں۔ آج کل تو وہ روز میرے گھر کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ مجھ سے روز ہی ملتے ہیں، حال چال دریافت کرتے ہیں۔ مجھے میری خانگی زندگی کے متعلق مشورے دیتے ہیں۔ کچھ نصیحتیں کرتے ہیں، جیسے وہ میرے قریبی بزرگ ہوں۔ میں ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ لیکن پھر بھی میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ ان کی باتوں پر عمل کرنے کا یقین دلاتا ہوں اور ان کے جلسے میں تقریر کرنے کا اقرار کر لیتا ہوں۔ سوچتا ہوں ڈیڑھ سو مل جائیں گے۔ چار دن کی چاندنی ہو جائے گی۔ گھر میں کچھ ہنس بول لیں گے۔ تھوڑے سے خواب دیکھ لیں گے۔ کچھ پچھلے خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں گے۔ مفلسی کو منہ چڑائیں گے اور پھر دیکھیں گے۔ میں نے اپنے ضمیر کے خلاف ان سے معاہدہ کر لیا تھا اور آج ان کے جلسے میں آخری تقریر تھی۔ شاید کل سے سیٹھ صاحب مجھے بھول جائیں گے۔

یکم مارچ ۱۹۷۱ء

وقت بہت تیزی کے ساتھ گذر رہا ہے، وقت کی برق رفتاری میری بدحالی میں بھی روز بروز اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ مایوسیوں کے سائے دُور دُور تک پھیلتے جا رہے ہیں۔ اُمید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں آتی۔ دُور تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میں نے سوچا تھا، شاید آنے والا کل میرے لیے خوشیوں کا پیغام لائے گا اور اگر نہیں تو کم از کم مجھ میں خواب دیکھنے کی تو طاقت باقی رہے گی۔ لیکن نہیں۔ مجھے کچھ نہیں ملا۔ خشک ہچکیاں، گرم آنسو، فکرِ فردا، وقت نے مجھے یہی دیا۔ اب تو مُسکرانے ہنسنے اور قہقہے لگانے کو بھی جی ڈرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وقت مجھ سے ایک بہت بڑا انتقام لے رہا ہے۔ میری بے جان مُسکراہٹوں کا انتقام، میری پھیکی ہنسی کا انتقام، میرے کھوکھلے قہقہوں کا انتقام۔ وقت کے اس انتقام کا سلسلہ کب تک چلے گا کچھ نہیں معلوم۔ مجھے یہی فکر روز بروز کھائے جا رہی ہے۔

---

۵ مارچ ۱۹۷۱ء

میں ملازمت کے چکر میں بمبئی آ گیا ہوں۔ کئی روز سے میں نے وہ وہ ٹھوکریں کھائی ہیں کہ توبہ! آوارہ شہر کی جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا ہوں۔ ناشاد و ناکارہ گلیاں گلیاں گھومتا رہا ہوں۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر کو اپنے چھوٹے بھائی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔ ماں کو جیسے تیسے سینی ٹوریم میں داخل کر چکا ہوں، اور اب تنہا اپنے بے جان جسم کو لیے کوچے کوچے میں اس کی بقا کا سامان ڈھونڈھ رہا ہوں۔ لیکن ناشاد و نامراد۔ یہ شور و غُل، یہ تیسیج بے ہنگام، یہ بلند و بالا عمارتیں منہ پھاڑے ہوئے مجھے نگل جانا چاہتی ہیں۔ سڑکوں پر دوڑتی ہوئی موٹریں اور بسیں مجھے کچل دینے کے درپے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میں بھی تو انسان ہوں۔ یہی تو مصیبت ہے کہ میں انسان ہوں۔ کاش! میں انسان نہ ہوتا۔

---

۶ مارچ ۱۹۷۱ء

میں اب زندگی سے قطعی مایوس ہو چکا ہوں۔ جینا اپنے لیے حرام سمجھتا ہوں۔ میں اس زمین پر ایک بہت بڑا بوجھ بن گیا ہوں۔ اس لیے میں اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج میری ڈائری کا یہ ورق میری زندگی کی کتاب کا آخری ورق ہو گا۔ کل صبح میری لاش اسی چوپاٹی کے کسی کنارے پر پڑی ہوئی ملے گی، اور میں دنیا کے سارے دھندوں سے گزر چکا ہوں گا۔ زندگی کے قید خانے کی تمام زنجیریں میرے لیے بے معنی ہو چکی ہوں گی۔ یہ زندگی جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ جس نے مجھے دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ آج میں ہی اُس کے منہ پر لات مار دوں گا اور موت کو اپنے گلے کا ہار بنا لوں گا۔ کل نہ میری یہ زندگی ہو گی اور نہ اس کی پیدا کردہ یہ ساری دردانگیز کہانیاں۔ میری موت کے ساتھ ان کی بھی موت ہو جائے گی۔ زندگی کے خاتمے کے ساتھ ان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

۷ مارچ ۱۹۷۱ء

میں یہ سوچتا ہوں کہ میری دُکھ بھری کہانیاں مجھ سے جُدا ہو کر کسی اور کے گلے نہ لگ جائیں۔ کسی اور کی معصوم زندگی سے نہ کھیلیں، کسی اور کی تمنّاؤں اور آرزوؤں کا خون نہ کریں۔ پھر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اس دھرتی پر رہنے والا میں واحد نوجوان ہوں، نہیں۔ اس دیش میں ہزاروں مجھ جیسے ہیں جن کی زندگی نے اُنھیں موت کی راہ دکھائی ہوگی، جن کی زندگی نے انھیں مفلسی، بدحالی اور بے روزگاری سے نوازا ہوگا۔ تو پھر مجھے مرنا نہیں چاہیے۔ مجھے خودکشی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ میں اپنی اس لاچاری سے چھٹکارا پاکر اسے کسی اور کو سونپنا نہیں چاہتا۔ اس لیے میری رُوح کو اس سے تسکین نہ ملے گی، مجھے کچھ اور جینا چاہیے، میں کچھ اور خواب دیکھوں گا۔ اب تو میں راجوؔ کا ساتھ دے کر ہی جی سکتا ہوں۔ راجوؔ جو میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اس کے کھوٹے دھندے کی وجہ سے اُس سے دوستی منقطع کرلی تھی کل وہ مجھ سے ملا تھا۔ اُس نے مجھے بے روزگاری سے چھٹکارا پانے کا گُر بتلایا تھا، لیکن نے اُس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ میں ابھی جاکر اُس سے معافی مانگوں گا۔ ابھی ہی اُس سے کام کا مطالبہ کروں گا۔ میں اُس کا مکمل ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے جیب کترے راجوؔ سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا ــــ!

ابراهیم دلوی
مترجم: عبدالباری مومن

تحریکِ امدادِ باہمی ـ معاشی ترقی کا زینہ

وطنِ عزیز نے جس وقت انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے آزادی حاصل کی اس کا معاشی نظام سرمایہ دارانہ اصولوں پر چل رہا تھا۔ برطانوی حکّام نے ہندوستان کو ایک ایسی کالونی بنا دیا تھا جو ان کی مصنوعات کے لیے بہترین مارکیٹ تھی۔ ہندوستانی معیشت کی تکمیل برطانوی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھی۔ چند مقامی سرمایہ داروں کے اشتراک سے اُنھوں نے اشیائے صارفین کی پیداوار کے لیے کچھ صنعتیں ضرور قائم کی تھیں لیکن اُن کا انحصار بھی مکمل طور پر برطانوی صنعت پر تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے لیے دفاعی اور بھاری مشینوں کی پیداوار یا درآمد کا مکمل انحصار بھی برطانوی صنعتوں پر تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی قومی معیشت ایک نظریاتی انقلاب سے دوچار ہوئی اور اس کی بنیاد جمہوری سوشلزم پر رکھی گئی۔ جس کے نتیجے میں اہم صنعتوں جیسے دفاع، ہیوی انجینئرنگ، ریلوے، لوہا اور فولاد وغیرہ کو ریاستی کنٹرول میں لے لیا گیا۔ اس طرح ہماری معیشت دو بڑے حصّوں میں تقسیم ہوگئی، پبلک سیکٹر جس میں وہ صنعتیں شامل ہیں جو حکومت خود چلاتی ہے اور پرائیویٹ (نجی) سیکٹر جن میں سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگاتے ہیں۔

اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی طور پر کمزور طبقے نے کہیں جگہ نہ پائی۔ اس طبقے کے لوگوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ اپنی بچت کو بڑھا دے کر اس کی سرمایہ کاری کریں۔ یہ دیکھ کر نجی سرمایہ داروں نے ان کا استحصال شروع کر دیا جس کا سب سے زیادہ اثر کسانوں اور صارفین پر ہوا۔ غریب کسانوں کو اپنی گردنوں پر کئی پشتوں تک قرض کا جُوا رکھنا پڑتا تھا۔ اُنھیں اپنی ضروریات کے لیے ان ساہوکاروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جو اُن کی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ بطور سُود اور قرض کی قسطوں کے ہضم کر جایا کرتے تھے۔ وہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے دن رات محنت کرتے لیکن انھیں روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرنا پڑتا۔ عام صارفین اور اپنی محدود آمدنی میں اپنی روزمرّہ کی ضروریات کا پورا کرنا ناممکن تھا۔ قیمتیں دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھیں۔ روپے کی قیمت ہر آن کم ہو رہی تھی اور آمدنی اپنی جگہ پر قائم۔

شہروں اور قصبوں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے رہائش کے مسئلہ کو جنم دیا، نہ صرف مکانوں کے کرایوں میں بے انتہا اضافہ ہوا بلکہ مکان کی خاطر پگڑی اور ڈپازٹ بھی ادا کرنی پڑی جس سے عام آدمی کی کمر ٹوٹ گئی اور لوگوں نے محسوس کیا کہ تنہا ان مسائل سے نبرد آزما ہونا غیر ممکن ہے۔ اس وقت انھیں اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے جس کے ذریعے اجتماعی طور پر ان مسائل سے نپٹا جائے۔ اُنھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ یہ انجمنیں کم سرمایہ سے تشکیل دی جانی چاہئیں، نیز ان کا طریقۂ تشکیل غیر پیچیدہ اور عام فہم ہونا چاہیے، اور یہ کہ ان کا نظام جمہوری ہونا چاہیے۔ اس خواب کی تعبیر انھیں "امدادِ باہمی کی انجمنوں" میں

نظر آئی جن کی مدد سے وہ متحد ہو کر سرمایہ دارانہ استحصال کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

تحریکِ امدادِ باہمی کا آغاز ایک معاشی تحریک کے طور پر برطانیہ میں ہوا۔ چند غریب جولاہوں نے ایک کوآپریٹیو اسٹور کھولا تاکہ روزمرّہ کی ضروریات مناسب داموں پر مہیّا کر سکیں۔ یہ ایک "صارفین کی انجمن امدادِ باہمی" کی ابتدا تھی۔ انھوں نے اپنی اس انجمن کو چلانے کے لیے چند اصول وضع کیے جو آگے چل کر اس تحریک کے بنیادی اصول بن گئے۔ اس تحریک کا سب سے پہلا مقصد تھا "عام آدمی کی روزانہ ضروریات سستے داموں مہیّا کرنا"۔ اس کے علاوہ اس میں دینا اور لینا، اشیائے صارفین کا حصول، زراعتی اور صنعتی پیداوار کی فروختگی، رہایشی مکانات کی تعمیر یا اور کوئی کم سرمایہ کی چھوٹی صنعت قائم کرنا، جیسے اصول بھی شامل تھے۔ اس تحریک کی عمارت جن بنیادوں پر کھڑی کی گئی تھی وہ یہ ہیں:

(۱) منافع کو اپنا مقصد بنانا۔ (۲) حاصل شدہ منافع کو ارکان کی بہبودی کے لیے خرچ کرنا۔ (۳) ارکان کی کم سے کم ممکنہ معاوضے پر خدمت کرنا۔ (۴) جمہوری نظم یعنی ایک فرد ایک ووٹ کے طریقے پر عمل کرنا۔

ہندوستان میں تحریکِ امدادِ باہمی کا باقاعدہ آغاز سنہ ۱۹۱۴ء میں ہوا، اور سب سے پہلے کسانوں کی امداد کے لیے کریڈٹ کوآپریٹیوز شروع کی گئیں۔ فی الوقت کوآپریٹیوز کا دائرہ کار بینکنگ، پروسیسنگ، ڈیری فارمنگ، ہاؤسنگ، شکر اور چاول کی ملوں، کپڑے کی ملوں، ماہی گیری، انشورنس، کنزیومرس اسٹور اور کم سرمایہ کی دیگر صنعتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح قریب قریب معیشت کے ہر شعبے میں اس تحریک نے اپنی جگہ بنا لی ہے، اور کوآپریٹیو تنظیموں کی مدد سے عوام اور خصوصاً نچلے طبقے کے عوام اپنی معاشی حالت کو سدھارنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح "امدادِ باہمی" ہماری معیشت کا ایک تیسرا اسیکٹر بن چکی ہے۔ خود حکومت کو بھی اس کا احساس ہو چکا ہے، چنانچہ امدادِ باہمی کی انجمنوں کے لیے باقاعدہ منص[وبے] تیار کیے جاتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں عملی شکل دی جائے۔ اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں جو ان انجمنوں کی معاشی بنیادوں کو مضبوط بنا[ئیں]۔ مختلف طریقوں سے حکومت ان کی مدد کرتی ہے، جن میں ان [کے] حصص خریدنا، انھیں بطور قرض اور امداد رقمیں دینا، انھیں ان[...] گرانٹ عطا کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ دوسروں سے قرض حاصل کر[نے] کے لیے حکومت چند مخصوص حالات میں اُن کی طرف سے ضما[نت] بھی دیتی ہے، ان کی ٹکنیکل رہنمائی بھی کرتی ہے۔ اس طرح [...] حد تک حکومت اُن کے نظم و نسق پر قابو حاصل کر لیتی ہے۔

اگر امدادِ باہمی کی انجمنوں کا انتظام حسن و خوبی اور دیان[ت] سے کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ناکام ہوں۔ اس کے ارکان اپنی [...] سے جو ذرائع انجمن کی بقا اور ارتقا کے لیے پیدا کرتے ہیں حکومت ا[ن] اضافے کی کوشش کرتی ہے۔ گویا حکومت ایک خاموش تماشا[...] بلکہ ایک فعّال (ACTIVE) مددگار کا رول ادا کرتی ہے۔

امدادِ باہمی کی انجمنوں پر بہت کچھ تنقید بھی کی جا چکی ہے۔ اس کے ناقدوں میں اکثر سرمایہ دار ہوتے ہیں جو حکومت کی مدد کو ا[...] نظروں سے نہیں دیکھتے کیونکہ حکومت کی مدد سے یہ سوسائٹیاں [...] کے سامنے ایک مضبوط مقابل کی شکل میں آ کھڑی ہوتی ہیں۔ نیز نا[...] میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو آج تک صارفین اور کسانوں کا استح[صال] کرتے آئے ہیں اور اب انھیں اس کے مواقع کم ملتے ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ایسی سوسائٹیاں عموماً ناتجربہ[...] کے ہاتھوں میں پڑ کر ناکامیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ذریعے نچلے اور درمیانی طبقے کی معاشی حالت ضرور سدھر جاتی ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر ان کمزور طبقات کے لوگ سماجی نابرا[بری] اور سرمایہ دارانہ استحصال کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

مرتب: پیلے الف

پس منظر

ارہ خانوادے :

صوفیوں کے مختلف گروہوں کے سلسلے الگ الگ
اماموں سے منسوب ہیں، جو شخص ان میں سے کسی ایک سلسلے میں
یت کرتا ہے وہ اپنے نام کے ساتھ اسے بطور نسبت استعمال
تا ہے مثلاً چشتی، قادری، نقشبندی وغیرہ ۔ ایسے مشہور
ارہ خانوادے حسب ذیل ہیں :

1. قادریہ : منسوب بہ شیخ عبد القادر جیلانی
2. نقشبندیہ : " " خواجہ نقشبند
3. قلندریہ : " " محمد قلندر
4. چشتیہ : " " خواجہ معین الدین چشتی
5. صفویہ : " " شیخ صفی الدین
6. یوسفیہ : " " شیخ احمد یوسفی
7. انصاریہ : " " عبد اللہ انصاری
8. زاہدیہ : " " خواجہ بدر الدین زاہد
9. نوریہ : " " ابوالحسن نوری
10. خضرویہ : " " احمد خضروی
11. شطاریہ : " " شیخ عبد اللہ شطاری
12. حسینیہ : " " امام حسین علیہ السلام

(نوٹ : یہ اصطلاح گذشتہ شمارے میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی)

بپت پڑی تب بھینٹ مانی
ٹمکر گیا جب دینی آنی / آئی :

ایک دیہاتی ایک مرتبہ کھجور کے درخت پہ پکی پکی
کھجوریں کھانے کے لالچ میں چڑھ گیا۔ چڑھنے کو تو چڑھ گیا لیکن
کھجوریں کھانے کے بعد اُترنے میں دِقت معلوم ہوئی اور گرنے کا خوف
لاحق ہوا۔ ڈر کے مارے اُس نے منت مانی کہ اے اللہ اگر میں صحیح سلامت
اُس پیڑ سے اُتر جاؤں گا تو تیرے نام کا ایک اونٹ قربان کروں گا ۔ وہ
آدھی دُور بخیر و خوبی اُتر آیا تو اُس کی نیت میں بھی فتور آگیا۔ اب اُس نے
کہا "اے خدا اونٹ بہت مہنگا ہوتا ہے، میں بھیڑ کی قربانی دوں گا۔"
جب اور نیچے اُتر آیا تو کہنے لگا "اے اللہ تیرے نام پر
ایک مُرغی ذبح کروں گا۔" جب صحیح سلامت نیچے اُتر آیا تو دھم سے
کود پڑا۔ اُس کے پاؤں تلے ایک چیونٹی دب کر مرگئی ۔ یہ دیکھ کر وہ
بولا "جیو کے بدلے جیو ۔ واہ رے خدا تو بڑا کارساز ہے، تجھے ایک
جان بھینٹ چاہیے تھی ۔ تو نے ہی اُس کا انتظام کر لیا۔" گاؤں والوں
کو جب قصّہ معلوم ہوا تو کسی نے اُوپر کی مثل کہی جو مشہور ہوگئی۔

تشریح : جب آدمی پر مصیبت آتی ہے تو ہر طرف سے مدد
طلب کرتا ہے اور زر و مال خرچ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے لیکن مصیبت
ٹلتے ہی وعدوں اور منتوں کو بھلا بیٹھتا ہے ۔ یہ کہاوت ایسے
ہی موقعے پر استعمال کرتے ہیں۔

بڑے شہر کا بڑا چاند:

ایک شہری اتفاقاً کسی دیہاتی کا مہمان ہوا۔ وقت کی بات اُس دن چاند کی پہلی رات تھی۔ جب شام ہوئی تو پہلی رات کا چاند دکھائی دیا۔ اُس شہری کو اپنے سیدھے سادے دیہاتی میزبان سے دل لگی کی سوجھی۔ بولا "بھائی تمھارے گاؤں میں بہت چھوٹا چاند ہوتا ہے مگر ہمارے شہر میں تو بہت بڑا چاند ہوتا ہے۔" دیہاتی کو یقین نہ آیا۔ اُس نے اپنے شہری مہمان سے کہا "میاں چاند تو ہر جگہ یکساں ہوتا ہے" مگر شہری اپنی بات پر اصرار کرتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ ایک دن دیہاتی شہر جا کر وہاں کا چاند دیکھے۔ چنانچہ ہفتہ عشرہ بعد وہ بھولا دیہاتی شہر پہنچا اور اپنے شہری دوست کا مہمان ہوا۔ جب رات کو چاند نکلا تو شہری دوست نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ ہمارے شہر کا چاند بڑا ہوتا ہے۔" تب دیہاتی بولا "ہاں بھائی بڑے شہر کا بڑا چاند۔"

مطلب: (۱) بڑے آدمیوں کی ہر بات بڑی یا نرالی ہوتی ہے۔
(۲) عالی خاندان کے لوگوں کے حوصلے بھی بڑے ہوتے ہیں۔

مزید: اردو میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے "بڑوں کی بڑی باتیں" کا فقرہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

(نوٹ: اوپر کی دونوں کہاوتیں گزشتہ شمارے میں شامل نہ ہو سکی تھیں)

بندر کی دوستی جی کا زیاں / جنجال

ایک شخص نے بندر پال رکھا تھا۔ ایک دن وہ سو رہا تھا اور بندر پاس بیٹھا مکھیاں اڑا رہا تھا۔ جب مکھیاں اُس کے منہ پر آ بیٹھتیں تو بندر انھیں ہاتھ سے اڑا دیتا لیکن مکھیاں پھر اڑ اڑ کر آ جاتیں۔ بندر نے تنگ آکر سوچا کہ مکھیوں کو جان سے مار ڈالوں گا تو پھر نہ آئیں گی۔ چنانچہ اُس نے ایک پتھر ہاتھ میں تولا اور جیسے ہی مکھیاں آ بیٹھیں، دَن سے دے مارا۔ مکھیاں تو اڑ گئیں لیکن اُس شخص کا سر پھٹ گیا اور چہرہ لہولہان ہو گیا، اس نے حقیقتِ حال جان کر یہی فقرہ کہا۔

مطلب: نادان اور کم سمجھ دوستوں سے اکثر نقصان پہنچ جاتا ہے چاہے اُن کی نیت فائدہ پہنچانے کی ہو۔

مزید: یہی مثل اس طرح بھی مشہور ہے "نادان کی دوستی جی کا زیاں / جنجال۔" فارسی کی ایک مثل کا اُردو روپ جو اس سے ملتا جلتا ہے، زبان زدِ خاص و عام ہے "نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔"

بوجھ بجھکڑ:

ایک کم عقل شخص ہر بات کو سمجھ لینے کا دعوٰی رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ہاتھی گاؤں سے گزرا تو جگہ جگہ اُس کے پاؤں کے نشانات بن گئے۔ کسی نے اُس عقل کے دشمن سے مذاقاً پوچھا کہ یہ کیا نشان ہے۔ اُس نے بہت غور و فکر کے بعد جواب دیا "ہرن چکی کا پاٹ پاؤں میں باندھ کر اِدھر سے گیا ہے، اُسی کا نشان ہے۔" یہ بات سارے گاؤں میں مشہور ہو گئی اور لوگوں نے اُس کا نام بوجھ بجھکڑ رکھ دیا۔

تشریح: یہ لفظ ایسے شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جو نادان ہو کر بھی عقلمند بنے۔ بعض جگہ لال بجھکڑ بھی کہتے ہیں۔

بوجھ کیا، چکی کا پاٹ:

کسی بادشاہ کے دربار میں فارسی کے اس مقولے "یک مَن علم را دہ مَن عقل باید" پر بحث چھڑ گئی۔ بادشاہ نے کہا "اِسے ثابت کرو۔" ایک وزیر نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اپنے ذہین بیٹے اور ایک احمق شہزادے کو بلا کر دربار کے ماہر منجم کے سپرد کیا اور کہا "ان دونوں کو علمِ نجوم و قیافہ پڑھاؤ۔" استاد نے بڑی محنت سے وزیر زادے اور شاہزادے کو تعلیم دینا شروع کیا۔ جب دونوں پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی اور دونوں لڑکوں کا امتحان لینے کی سفارش وزیر نے کی۔ بادشاہ نے ایک دن امتحان کا

مقرر کیا۔ شاہ زادہ اور اس کے ہم سبق وزیر زادہ دونوں دربار
میں بلائے گئے۔ بادشاہ نے اپنی مٹھی میں انگوٹھی لے کر اپنے
بیٹے سے پوچھا "بتاؤ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟" شہزادے نے
قرعہ ڈال کر نجوم و رمل کے قاعدوں سے خوب جانچ کر معلوم کر لیا کہ
کوئی گول گول چیز ہے۔ بیچ میں سے خالی اور معدنیات سے ہے۔
وہ جھٹ بول اٹھا "چکی کا پاٹ"۔ یہ جواب سن کر سارے درباری
حیران رہ گئے۔ اب وزیر زادے کا نمبر آیا۔ اُس سے بھی دریافت کیا گیا
کہ "تم بتاؤ مٹھی میں کیا ہے؟"۔ اس نے بتا دیا کہ انگوٹھی ہے۔
بادشاہ نے استاد پر برہم ہو کر کہا "یہ کیا بات ہے؟ کہ وزیر زادے کو
کامل کر دیا اور میرے بیٹے کو ناقص رکھا۔" استاد نے کہا "جہاں پناہ
میرا جتنا علم تھا وہ دونوں کو برابر سکھایا بلکہ شاہ زادے کو کچھ زیادہ
ہی بتلایا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے اُس نے صحیح
رہنمائی کی، آگے عقل کو میں کیا کروں یہ پڑھانے سے نہیں آتی جب
تک عقل نہ ہو علم کی زیادتی کس کام کی؟"

مطلب: بعض لوگ علم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن عملی باتوں
کا شعور نہیں رکھتے۔ معاملات میں جاہل ہی رہتے
ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے۔

بُور کے لڈو:

ایک قسم کی بھوسی کو بور کہتے ہیں۔ اس کے لڈو بنا کر
اُس پر نہایت عمدہ شکر کی تہہ چڑھا کر بیچتے ہیں۔ سستے ہونے
کے سبب غریب غربا دھوکے سے لے کر کھا لیتے ہیں لیکن پچھتانا
پڑتا ہے۔ مزا یہ کہ بیچنے والوں کی صدا بھی یہی ہوتی ہے کہ "بور کے لڈو
کھائے تو پچھتائے نہ کھائے تو پچھتائے۔"

تشریح: (۱) دھوکے کی ٹٹی۔ وہ چیز یا کام جو ظاہر میں اچھا لیکن
باطن میں بُرا اور بے فائدہ ہو۔

(۲) ایسی بات جس کے کرنے اور نہ کرنے دونوں صورتوں
میں پچھتاوا ہاتھ آئے جیسے شادی۔

(۳) گناہ بے لذت۔

بُوند کا چوکا گھڑے ڈھلکائے /
بوند سے گئی سو حوض سے نہیں آتی:

ایک بار شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے مردانے
محل میں بیٹھے تھے۔ افغانستان کا سفیر بھی وہاں موجود تھا۔ اتنے میں
ایک عطر فروش سیوا میں حاضر ہوا۔ سب شیشیاں کھول کر عطر
دکھانے لگا تو اتفاق سے ایک بوند فرش پر گر پڑی۔ مہاراجہ نے
بے خیالی میں اُس بوند کو انگلی سے اٹھا کر داڑھی سے مل لیا۔ وزیر اعظم
دھیان سنگھ کو اس برتاؤ سے بڑی پریشانی ہوئی۔ جب عطر فروش
چلا گیا تو اُس نے مہاراج سے کہا "اَن داتا! افغانستان کے سفیر کے
سامنے آپ نے گرے ہوئے عطر کو اپنی داڑھی سے مَلا۔ آپ کے
دربار میں اشرفیاں کوڑیوں کی طرح لٹائی جاتی ہیں لیکن آج سفیر یہی
سمجھا ہوگا کہ پنجاب کا شیر بڑا کنجوس اور لالچی ہے۔"

مہاراج نے فکر مند ہو کر کہا "اب کیا کریں؟ اُس کے
دل سے یہ غلط خیال نکالنے کے لیے کوئی ترکیب کرنی چاہیے۔"
آخر بہت سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ 'مکنا' فاتی ہاتھی کو شراب پلا کر
مست کیا جائے۔ پھر راج دوت (سفیر) کو لے کر مہاراج
ہاتھی کو دیکھنے جائیں۔ اُس وقت مہاوت یہ کہے کہ ہاتھی کی بدمستی
عطر سے نہلانے پر جا سکتی ہے۔ تب ہزاروں روپے کا عطر خرید کر
ہاتھی کو نہلایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مہاوت کے دوا بتانے
پر مہاراج نے عطر فروش کو بلوا کر سارا عطر خرید لیا اور گھڑے کے
گھڑے بھروا کر ہاتھی کو نہلایا گیا۔ (حکایت یوں بھی ہے کہ حوض
بھر کر ہاتھی کو نہلایا گیا)۔

اس پر کابل کا سفیر جو اب تک چپ چاپ یہ تماشا
دیکھ رہا تھا، مسکرا کر سردار دھیان سنگھ سے بولا "یہ سب

ٹھیک ہے مگر "آں بوند ولایت رفت" یعنی اُس بوند کی رپورٹ تو افغانستان پہنچ چکی، اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ اسی قصّے پر اوپر کی دو کہاوتیں بن گئی ہیں۔

تشریح : جو کام ذراسی بات سے بگڑ جائے وہ موقع نکل جانے پر لاکھ کوششوں کے باوجود نہیں بنتا۔ یا بنتا بھی ہے تو بڑی زحمت اُٹھانے کے بعد۔ فارسی میں "آں بوند ولایت رفت" کی کہاوت اسی مفہوم کی حامل ہے۔ پہلے افغانستان کو ولایت کہا جاتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ ہندوستانی کہاوت ہے۔

بھیگی بلی بتانا :

کسی شخص کا نوکر بہت سست اور کام چور تھا، ایک رات ابر چھایا ہوا تھا، جب ٹھنڈک بڑھی تو آقا نے نوکر سے پوچھا "کیا مینہ برس رہا ہے؟" نوکر نے بستر پر پڑے ہی پڑے جواب دیا "جی ہاں برس رہا ہے۔" آقا نے کہا "تجھے کیوں کر معلوم ہوا؟ تو تو اپنی ہی جگہ پڑا اینڈ رہا ہے۔" نوکر جلدی سے بولا "سرکار! ابھی بلّی اندر آئی تو میں نے اسے چھو کر دیکھا، تو وہ بھیگی ہوئی ہے۔ اس سے میں نے جانا کہ ضرور مینہ برس رہا ہے۔ یقین نہ آئے تو آپ خود دیکھ لیجیے۔"

مطلب : ٹال مٹول کرنا۔ بے جا بہانے بتانا۔

مثال : وصل کی حامی وہ نہیں بھرتا بھیگی بلی بتائے جاتا ہے

بی بی کی صحنک :

مغل حکمراں جہانگیر کی بیگمات میں جودھا بائی بھی تھی جو راجپوت نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نورجہاں اُسے مارواڑن کہہ کر چھیڑا کرتی تھی۔ جودھا بائی نے اُسے نیچا دکھانے کے لیے یہ ترکیب کی کہ ایک روز کسی تقریب سے حضرت فاطمہ کی فاتحہ دلا کر تمام بیگمات سے کہا "اس نیاز کو وہی عورت کھائے جس نے دوسرا خاوند نہ کیا ہو۔" نورجہاں جو پہلے شیر افگن خاں کی بیوی تھی، پھر جہانگیر کے نکاح میں آگئی تھی، یہ سُن کر شرمندہ ہوگئی۔ کہتے ہیں اُسی زمانے سے یہ نیاز دلانے کا رواج پڑ گیا۔

تشریح : صحنک : چھوٹا طباق۔ رکابی۔ عوام مٹی کی رکابی کو بھی صحنک کہتے ہیں۔

بیٹھک (دینا یا ماننا) :

لفظی معنی نشست یا بیٹھنے کا انداز لیکن اصطلاح میں ایک قسم کی نذر و نیاز۔ بعض نذر و نیاز کی شوقین جاہل عورتیں جمعرات کی شب میں نہا دھو کر سُرخ کپڑے پہن، عطر لگا، پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر سفید چاندنی پر بیٹھتی اور بال کھول کر سر کو بار بار جھٹکتی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر کوئی جن یا پری آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نفسیاتی بیماری کے سبب وہ ایسا محسوس بھی کرتی ہوں۔ کم سمجھ گنوار عورتیں اس تماشے میں شریک ہو کر اُس سے غیب کی باتیں دریافت کرتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں جو خرافات رواج پا گئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ رنگینؔ کے ایک شعر میں اسی رسم کی طرف اشارہ ہے،

سُرخ جوڑا تو رنگا لینے دو لوگو مجھ کو
یوں بھی ہوتی ہے کہیں لال پری کی بیٹھک

بیڑا اُٹھانا :

راجپوتوں میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی مشکل کام یا اہم درپیش ہوتی تھی تو راجا یا سردار اپنے درباریوں اور ماتحتوں کو بلا کر اُس کام کی حقیقت اور کیفیت سُنا تا پھر چیلنج کے طور پر تھا صدان میں ایک گلوری رکھ کر ہر ایک کے آگے پیش کرتے کہ جو اُٹھا کر کھالے اُسے یہ مہم سونپی جائے۔ جو اس گلوری کو اُٹھا کر کھا لیتا اُس پر وہ کام فرض ہو جاتا تھا۔ اسی سے بیڑا اُٹھانے کا محاورہ بن گیا۔

مطلب : کسی کام پر کمر کسنا۔ ذمّہ لینا۔

مزید : بعض لوگ بیڑا (بی ڑا) کی جگہ بیڑا (بے ڑا) بولتے ہیں جو غلط ہے۔
بیڑا : پان کی گلوری

بیت

گلوری پان کی غیروں کو تم کھلاتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا مگر اُٹھاتے ہو (ذوقؔ)

سُلطان علی عادل شاہ (ثانی) شاہی

ساز و آہنگ

علی عادل شاہ ثانی متخلص بہ شاہی، ۲ اگست ۱۶۳۸ء / ۱۰۴۸ھ کو پیدا ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں سلطان علی عادل شاہ ثانی کے لقب سے سلطنت کا کاروبار سنبھالا۔ یہ انصاف پسند، رعیت پرور اور علم نواز بادشاہ تھا، نہ صرف یہ کہ خود شاعر تھا بلکہ شاعروں اور عالموں کا قدردان بھی تھا۔ خطاطی اور مصوری سے بطور خاص دلچسپی تھی۔ ملک الشعرا بیجاپور نصرتی اسکے دربار سے منسلک تھا۔ علی عادل شاہ ثانی نے فالج گرنے سے ۱۶۷۲ء / ۱۰۸۳ھ میں بیجاپور میں انتقال کیا • • •

غزلیں

پیو سات رنج رہنا لذت اِسے کہتے ہیں
آپ رنج پھر رجھانا صنعت اِسے کہتے ہیں

تج نین کے نگر میں لالن وطن کیے ہیں
تب انجمن کے لوگاں خلوت اِسے کہتے ہیں

میں چھاؤں ہوں پیا سنگ لاگی رہی ہوں دائم
یک پل جُدا نہ ہونا وصلت اِسے کہتے ہیں

گل ہور گلاب میانے نہیں کچھ فرق ازل تے
یو پیو سوں مل رہی ہوں الفت اِسے کہتے ہیں

سوتن میں پیو مجھ کوں جب سیج میں ایس کے
مجھ مان دے بلاوے عزت اِسے کہتے ہیں

چاروں پہر پیا سنگ کئی بھانت کر مدن کے
سنجوگ ہو رہی ہوں عشرت اِسے کہتے ہیں

رُوں رُوں رسن کری میں شاہی کا ناؤں لینے
پھر پھر دو ناؤں لینا راحت اِسے کہتے ہیں

★

ساری رَین تیرا مدن مج طبع میں بھرپور ہے
تج صبح مکھ کے سامنے دیپک سدا مخمور ہے

تج نین کی ترُی کنے منگتے ہیں موتی آبرو
یا روپ کی نوکھا ہے یا حسن کا سمدور ہے

تج بال کالے دیک کر بادل پھریں حیران ہو
تج بھال ہو ریتلک کنے کیا چاند ہور کیا سور ہے

تج گال کی تعریف سُن پنکج چھپے جا نیر میں
تج رنگ کے پرتاب سوں کیچن کا مکھ رنجور ہے

شاہی کہ دل سب ہات لے منگتی منانے نیہ سوں
پس چھوڑ دے ہٹ تٹ جتے بھی کیتی مغرور ہے

متاعِ ہُنر

کتاب : سنگریزے
شاعر : حیرت کوکنی
ناشر : اُردو ادبی کمیٹی ، پانگاری

ہندوستان میں برٹش راج کی چند برکتوں میں سے ایک ڈاک کا منظّم طریقہ بھی ہے جس کی بدولت سارا ملک آپسی تعلقات کی ایسی ڈوری میں بندھ گیا کہ تہذیبی لین دین کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی استفادے کی راہیں بھی آسان ہو گئیں۔ اگر ڈاک کا نیا تیز رفتار طریقہ وجود میں نہ آتا تو اُردو زبان و ادب کی توسیع و ترویج غالباً اس تیزی سے عمل میں نہ آپاتی۔ نہ تو خطوطِ غالب کا ایسا ضخیم سرمایہ وجود میں آتا اور نہ ہی رسایل و جراید کے ذریعے ترویج و اشاعت کا سلسلہ ملک کے گوشے گوشے تک دراز ہوتا۔ ایسے میں کوکن کے ایک دُور اُفتادہ گاؤں پانگاری میں پیدا ہونے والے حمزہ علی دلوی کو حیرت کوکنی کا ادبی روپ دھارنے کا موقع میسّر آنا تو اور بھی دشوار تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے ڈاک کے ذریعے سلسلۂ تلمّذ و اصلاح کو رواج دینے والے اساتذہ اور ان کے خانوادوں کا کہ انھوں نے اُردو شعر و ادب کی چاٹ لگا کر ہندوستان کے دُور دراز علاقوں میں ہزاروں شاعر اور سخن فہم پیدا کر دیے جو آج بھی اس سخت جان زبان کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ مہاراشٹر اور کوکن کے پس ماندہ علاقوں میں اُردو شاعری کا سکّہ رواں کرنے میں جن اساتذہ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اُن میں سیماب اور ان کے خانوادے سے متعلق افراد کا نام سرِ فہرست ہے۔ حیرت کوکنی مرحوم اسی ادبی خانوادے کے ایک مستند استاد مولانا قمر نعمانی سہسرامی سے اصلاح لیتے رہے چنانچہ اس 'فیضِ تربیت' کا ذکر اُن کے کلام میں جابجا پایا جاتا ہے۔

میسّر گر نہ آجاتا قمر کا فیضِ تربیّت
تو کیا آتا مجھے حیرت کا یہ اندازِ بیاں برسوں

سنگریزے میں حیرت کوکنی کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ غزلوں کا انداز کلاسیکی ہے اور بزرگ شاعروں کے کلام میں پائی جانے والی ادبی روایات کا عکس اُن میں جھلکتا ہے۔ پہلی نظر میں جو خوبی متاثر کرتی ہے وہ الفاظ کا برمحل اور موسیقانہ استعمال ہے۔ کانوں پر ناگوار اور ذوق پر گراں گذرنے والے الفاظ اور ترکیبوں سے حیرت کے اشعار پاک ہیں۔ بحریں بھی رواں اور مترنّم ہیں۔ تعقیدِ لفظی کو بھی کہیں در آنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اشعار سہلِ ممتنع کی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔

اُن کا ہر کام ہے ارادے سے — میرا ہر فعل اضطراری ہے
ہمارا قصۂ غم سُن کے حیرت — کسی کی آنکھ پُر نم ہو گئی ہے
مدّعی خود شناسی کا تو ہی نہیں — حیرت خود نگر کیا کوئی اور ہے

ملا نہ منزلِ مقصود کا نشاں پھر بھی   ہزار عزم نئے لے کے قافلے آئے

جن کے نصیب میں نہ تھی موتی کی آب و تاب
وہ اشک میرے دامنِ مژگاں میں رہ گئے

جنون و ہوش کا جھگڑا، دلیل تنگ طرفی تھا
میں آخر کیوں رہا اس کشمکش میں سرگراں برسوں

نظموں میں 'عزم و یقین'، 'تحریکِ انقلاب' اور 'دل' یہ کہنا ہے، خاصے کی چیزیں ہیں۔ قطعات میں حیرت مرحوم کے مشاہدات و تاثرات کو منعکس ہونے کا زیادہ موقع ملا ہے۔ جذبے اور فکر کا حسین امتزاج حیرت کے قطعات ہیں۔ کاش وہ اس صنف میں مزید طبع آزمائی کرتے۔

وہ کام جو مرغوب ہے کرتا ہوں میں
رعنائی تخئیل پہ مرتا ہوں میں
ہے شعر میں تحلیل مرا خونِ جگر
وہ گل ہوں کہ مرجھا کے نکھرتا ہوں میں

ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اپنے پُرمغز پیش لفظ میں حیرت کی شاعری کا مناسب و کامیاب تعارف پیش کیا ہے۔ خصوصًا ان کے یہ الفاظ حیرت کی شعری شخصیت کا خوب صورت اور جامع تصور ہمارے سامنے لاتے ہیں "لبِ لعلیں سے جلوۂ طور تک ہر موضوع کو نکھار سکتا ہے۔ حیرت نے ان تمام موضوعات کو کمال فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غزل کی شاعری کیف و انبساط کی شاعری رہی ہے۔ یہ خیال و خواب کے ساتھ حقیقتوں کی تعبیریں اور تشریحیں بھی کرتی ہے۔ حیرت کی شاعری میں کیف و انبساط کے رموز، خیال و خواب کی تعبیریں اور حقائق سے دبیز پردے اُٹھانے کی ساری کوششیں کمال آگہی کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہیں۔"

اس 'پیش لفظ' کے علاوہ شرف کمالی کا تعارف اور ڈاکٹر عبدالکریم نائیک کا پیغام بھی شامل ہے۔ اشاعتی کمیٹی نے ابتدائی صفحات میں اپنی کوششوں کا پُرخلوص ذکر کیا ہے۔ یہ تبصرہ نگار اُن لوگوں کو مبارک باد پیش کرتا ہے جنھوں نے اس کام کا بیڑا اٹھا کر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور کوکن کے ایک پرانے خادمِ ادب کی کاوشات کو گردِ کارواں بننے سے بچایا۔

کتابت و طباعت اچھی اور اغلاط سے پاک ہے۔ شکیل پُرپاڑی کا ساحل پر بکھرے سنگریزوں کی عکسی تصویر اور اپنے برش کی رنگ آمیزی سے بنایا ہوا سرورق کافی حسین اور جاذبِ نظر ہے۔

۱۳۲ صفحات کے اس مجموعے کی قیمت ۳ روپے، ۵۰ پیسے نہایت مناسب ہے۔

ملنے کا پتا: سکریٹری اردو ادبی کمیٹی، ۲۱ ٹینک اسٹریٹ بمبئی ۸

یونس اگاسکر

اخبار و اذکار

مہاراشٹر ہائی اسکول کی نئی عمارت

یہ خبر تعلیمی حلقوں میں نہایت ہی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ مہاراشٹر اردو ہائی اسکول، اکرڈی کی نئی عمارت کی رسم سنگِ بنیاد محترم جناب امین یادا صاحب قاضی کے دستِ مبارک سے انجام پائی۔ تعمیر کا کام جلد ہی شروع ہوگا۔

کرچی کے علم دوست حضرات

آدرش ہائی اسکول، کرچی کی فلاح و بہبود و ترقی میں موضع کرچی کے علم دوست حضرات کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس کی مثالیں ہیں: رحمت محلہ کرچی کی دو ہستیاں (۱) جناب عبداللہ داؤد بیرکار مقیم افریقہ جنھوں نے اس اسکول میں زیرِ تعلیم غریب طلبا و طالبات کی امداد کی خاطر مبلغ ۲۸۷ روپے ارسال کیے ہیں۔ (۲) جناب حسین محمد بیرکار مقیم افریقہ، فی الحال کرچی، جنھوں نے ایس ایس سی امتحان میں اس اسکول سے کامیاب شدہ اوّل، دوم اور سوم نمبر سے طالب علموں کے لیے بالترتیب ۵۰، ۲۵ اور ۱۵ روپوں کے انعامات کا اعلان کیا ہے۔ مندرجہ بالا اعلان کردہ انعامات اس اسکول کی سالانہ گیدرنگ کے موقع پر دیے جائیں گے۔ اسکول کے صدر مدرس جناب ایچ ڈی مہاڈک نیز معاون اساتذہ جناب عبداللہ بیرکار و جناب حسین محمد بیرکار کے بے حد ممنون ہیں۔

کاندیولی فزیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے نام میں تبدیلی

حکومت مہاراشٹر نے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فار فزیکل ایجوکیشن، کاندیولی کا نام اس تعلیمی سال سے تبدیل کر کے گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن، کاندیولی کر دیا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کو جون ۱۹۷۳ء سے یونی ورسٹی آف بمبئی سے ملحق کر دیا گیا ہے تاکہ اس میں پہلے جو فزیکل ایجوکیشن میں ڈپلوما کا کورس چلایا جاتا تھا اس کے بجائے بی۔ ایڈ کا ڈگری کورس چلایا جا سکے۔ اسی لیے یہ تبدیلی کی گئی ہے۔

ضلع تھانہ میں قحط سالی
گرام پنچایتوں کو مالی امداد

ضلع تھانہ کے متعدد دیہاتوں میں قحط سالی سے مقابلہ کرنے کے لیے ضلع پریشد تھانہ نے متعدد منصوبے تیار کیے ہیں۔ امسال ناکافی برسات ہونے کی بنا پر خریف کی فصل کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے موجودہ پانی کے ذخیرہ کو کام میں لاکر ربیع کی فصل تیار کرنے کی خاطر ضلع تھانہ کے کل ۹۲ گرام پنچایتوں کو تیل پمپ فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان گرام پنچایتوں کو دیگر اخراجات کے لیے ۵۰ فی صد مالی امداد بھی دی گئی ہے۔ ضلع پریشد تھانہ نے پانچ تعلقوں میں تقریباً ۲ لاکھ ۹۲ ہزار روپے مالیت کے ۷۰ تیل پمپ دیے گئے۔ مالی امداد کی صورت میں متاثرہ دیہاتوں کو ۸۴ ہزار روپے بطور امداد تقسیم کرنا منظور ہوا ہے۔

جشن صد سالہ ہاشمیہ ہائی اسکول بمبئی

ہاشمیہ ہائی اسکول بمبئی جنوری ۱۹۷۳ء میں اپنی تعلیمی خدمات کی ایک سو سالہ مدت پوری کر رہا ہے۔ اتنی طویل مدت تک کسی تعلیمی ادارے کا حسن و خوبی جاری رہنا ہی بڑی بات تھی اس میں ہاشمیہ ہائی اسکول نے اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں جو امتیاز اور معیاری شان حاصل کی ہے وہ یقیناً قابلِ صد افتخار ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ ادارہ اور بھی ترقی کرے اور طالبانِ علم و ادب کی سیرابی ہو۔

منجانب ادارہ نقش کوکن

چاند پر چوہے

والٹ ڈزنی کا مشہور و معروف مکّی نام کا چوہا تو خیر جس وقت بھی چاہتا چاند پہ پہنچ سکتا تھا۔ لیکن یہ صرف کارٹونسٹ ڈزنی کے تصوّری طلسماتی دُنیا میں ہی ممکن تھا ـــــ لیکن اب شاید ڈزنی لینڈ کے طلسماتی چوہوں کی مہم وریوں سے تحریک پاکر ہی پانچ چھوٹے چوہوں نے خلا کی راہ لی ہے۔ وہ اس وقت اپالو ـ ۱۷ خلائی جہاز میں چاند کے گرد چکّر لگا رہے ہیں ـــــ یہ پانچوں چوہے جو جیبی چوہے کہلانے والی ایک قسم سے تعلق رکھتے ہیں، کیلی فورنیا کے ریگستان میں پائے جاتے ہیں، وہ چاند پر نہیں اُتریں گے، بلکہ اپالو کے کمانڈ ماڈیول میں ہی رہیں گے، اور خلا باز رونلڈ ایوانز کے ساتھ چاند کے گرد چکّر لگاتے رہیں گے۔

یہ چوہے چاند کے قریب جانے اور وہاں سے لوٹنے میں کوئی ۸ لاکھ کلومیٹر کا خلائی سفر کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بایوکور نام کے ایک نئے سائنسی تجربے کے سلسلے میں چاند کے گرد مدار میں جو چھ دن گزاریں گے اس میں وہ مزید لاکھوں کلومیٹر کا خلائی سفر کریں گے۔

ہر چوہے کے جسم میں کائناتی شعاعوں کا پتہ لگانے والا ایک آلہ جڑا ہوا ہے۔ چوہوں کے زمین پر واپس آنے کے بعد سائنس داں ان کا معائنہ کریں گے تاکہ یہ پتہ لگائیں کہ خلائی ماحول میں ان بھاری کائناتی شعاعوں کا اُن پر کیا اثر پڑا ہے۔ اس کے جو نتیجے حاصل ہوں گے ان سے خلائی مشنوں کے دوران انسانی جسم اور خصوصاً دماغ اور آنکھوں پر کائناتی شعاعوں کے اثر کا تعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ساری پرواز کے دوران ان چوہوں کو ۱۲ انچ (۳۰۶۵ سینٹی میٹر) لمبے اور سات انچ (۱۷۶۸ سینٹی میٹر) قطر کے ایک المونیم کے کنستر میں بند رکھا جائے گا اور مشن کے دوران خلا بازوں کو ان پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہوگی ـــــ اس سفر کے لیے ان جیبی چوہوں کا چناؤ اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ وہ وزن میں بہت کم ہیں (ہر چوہا ایک تہائی اونس یعنی ۱۰ گرام سے بھی کم ہے)۔ چنانچہ انھیں بے وزنی کی حالت میں رکھنا کافی آسان ہے۔ اُن کی پانی کی ضرورت اُن کے کھانے کے بیجوں سے پوری ہو جاتی ہے، اور کنستر میں ان کے لیے بیجوں کی مناسب سپلائی رہے گی ـــــ یہ چوہے بے وزنی کی حالت میں کنستر کے اندر ادھر اُدھر اُڑتے نہ پھریں اس لیے ہر ایک کو ایک سوراخوں والی ٹیوب کے اندر رکھا گیا ہے اور ان کے سانس لینے کے لیے آکسیجن کا انتظام پوٹاشیم سپر آکسائڈ کی سپلائی سے کیا گیا ہے جو چوہے کی باہر کی سانس کے کاربن ڈائی آکسائڈ اور نمی کے اثر سے آکسیجن پیدا کرتی ہے۔

"ایم وی سلیم"

مورخہ ۱۰ر دسمبر ۷۲ء کو جدید سہولتوں سے آراستہ و آرام دہ مسافر بردار لانچ ایم وی سلیم کا عزت مآب بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے وزیر تعمیرات حکومتِ مہاراشٹر کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا۔ ایم وی سلیم ایوولوینیں موٹر لانچ سروس کے زیرِ نگرانی اپنی خدمات انجام دے گی اور اس کے اجرا کا اہتمام الیفنٹا ٹراولز اینڈ ٹورز نے کیا ہے۔

پونا کالج میں

پونا ہمیشہ علم و ادب کا گہوارا رہا ہے۔ اس وقت بھی انجمن خیر الاسلام کے زیرِ اہتمام قائم کردہ پونا کالج میں نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے بلکہ کالج کے پروفیسران اور دیگر باشعور حضرات کی کوششوں سے اسلامی اسٹڈیز سرکل کے نام سے ایک ادارہ ادارہ سرگرمِ عمل ہے جو قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کامیاب کوشش کر رہا ہے۔

مورخہ ۱۰ر دسمبر ۷۲ء کو سرکل کی ایک نشست میں ڈاکٹر عبدالکریم نائیک صاحب صدر نشین تھے اور محترمہ روشن آرا، نائیک اور جناب فقیر محمد مستری بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ پروفیسر رشید کوثر فاروقی صاحب نے نوجوان مقرر طلبا و طالبات کے خیالات کی اصلاح فرمائی اور درسِ حدیث اور تفسیر بیان کی۔ اس سے پہلے آپ نے معزز مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔

رتناگیری ضلع میں پاورلوم پروجیکٹ

ناگپور میں ۱۲ دسمبر کو وزیر محنت شری این ایم ٹڈکے نے جن سنگھ کے شری مہالگی کو بتایا کہ رتناگیری ضلع میں پاورلوم پروجیکٹ کے لیے ریاست کے ۷۲-۷۳ء کے منصوبہ میں ۵۵ لاکھ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔ مرکزی حکومت سے منظور شدہ ایک لاکھ روپیہ کی رقم پروجیکٹ کے لئے کوکن ترقیاتی کارپوریشن کو دی گئی ہے۔ وزیر محنت نے بتایا کہ کارپوریشن، کلابہ، رتناگیری اور تھانہ میں بھی اسی طرح کے پروجیکٹ شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

خاکساری سے نہیں برتر جہاں میں کوئی چیز
مل گئی جس کو یہ دولت کیمیا گر ہو گیا

امیر

آپ اپنا کاروبار شروع کیجیے
کوکن ڈیولامینٹ کارپوریشن سرمایہ فراہم کرے گی

کوکن کی اقتصادی ترقی کے لیے کوکن وکاس مہا منڈل (کوکن ڈیولامینٹ کارپوریشن) کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یہ ادارہ چھوٹی صنعتوں کا نجی کاروبار کرنے والے لوگوں کی مالی امداد کرتا ہے۔

★ امداد حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں۔ S.S.C. یا اس سے کم پڑھے لوگ بھی، دحاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ انجینئرنگ میں ڈگری یا ڈپلوما حاصل کردہ، اسی طرح آئی ٹی آئی کے سند یافتہ اپنا کاروبار شروع کرنا چاہیں تو ان کے لیے خاص منصوبے ہیں۔

★ کھیتی باڑی کے اوزار، بجلی کا سامان، اسکول کی بیاضیں، برف کا کارخانہ، لکڑی کا فرنیچر، چھاپہ خانے، پتھر توڑنے کا کام، پھلوں کے مختلف اشیا بنانے کا کام، مویشیوں کی خوراک، بیکری یا مٹھائیاں وغیرہ کسی بھی کام میں یا چھوٹی صنعتوں میں اپنا کاروبار شروع کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔

یا

سلائی، ہیر کٹنگ سیلون، ہوٹل، ریپئرنگ ورک شاپ، ٹرانسپورٹ کا کاروبار، کتب خانہ، سائیکل شاپ، موٹر ڈرائیونگ اسکول، ایڈورٹائزنگ وغیرہ کسی قسم کا دوکان لگانا ہو تو اضلاع کوکن (تھانہ، قلابہ اور رتناگیری) میں کسی بھی مقام پر کوکن وکاس منڈل آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔

مزید معلومات اور رہنمائی مندرجہ ذیل پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

وکاس ادھیکاری
کوکن وکاس منڈل
بومبے لائف بلڈنگ پانچواں منزلہ
۴۵ ویر نریمان روڈ۔ ممبئی ۱
فون: ـــ 256977

عازمینِ حج کے اعزاز میں

مورخہ ۲۰ دسمبر ۷۲ء کی شب میں داؤد بھائی فاضل بھائی کھرکلک بمبئی ۹ کے آراستہ ہال میں جناب حاجی عباس حاجی محمد ٹھاکور (صدر جماعت المسلمین گھاٹیوالا بمبئی) ، جناب عبداللطیف علی احمد صاحب نوڈکر اور جناب سراج حاجی محمد ٹھاکور کے عزم سفرِ حج بیت اللہ کے سلسلہ میں ایک اعزازی جلسہ جماعت المسلمین گھاٹیوالا نے منعقد کیا ، جس کی صدارت جناب احمد زکریا (چیرمین حج کمیٹی بمبئی) نے انجام دی۔ جلسہ میں عازمینِ حج کے دوستوں اور چاہنے والوں کی کثیر تعداد موجود تھی ، جنھوں نے ہدیۂ تبریک پیش کیا اور دعائیہ کلمات سے نوازا۔

بمبئی کے نئے شریف

شری جنارد ھن گنپت راؤ پودھے جو ایک مشہور آرکیٹکٹ ہیں ـ شریف آف بمبئی مقرر ہوئے ہیں ــــــ ۲۰ دسمبر ۷۲ء کو آپ نے راج بھون میں شری علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر کے ذریعے حلف اٹھایا۔

ایس ایس امتحان کے نمبروں کی تصدیق

اکتوبر ۷۲ء میں منعقدہ ایس ایس سی امتحان میں حاصل شدہ نمبروں کی تصدیق کے لیے درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء ـ منظور شدہ اسکولوں کے سربراہوں سے مقررہ فارم حاصل ہو سکتے ہیں۔

پنجاب اسمبلی میں لینڈ ریفارمز بل پاس

۱۵ دسمبر ۷۲ء کو پنجاب اسمبلی نے پنجاب لینڈ ریفارمز بل پاس کر دیا۔ اس کے مطابق صوبہ میں کوئی شخص سال میں دو فصلیں دینے والی یقینی سیرابی زمین ۱۷½ ایکڑ ایک فصل والی یقینی سیرابی زمین گیارہ ایکڑ اور بارانی زمین ۲۰½ ایکڑ سے زائد نہیں رکھ سکے گا۔

ایک کنبہ پتی پتنی اور تین بچوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ بل ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء سے نافذ سمجھا جائے گا۔

اپوزیشن لیڈر سردار بادل نے کہا کہ یہ بل عوام دشمن اور کسان دشمن ہے۔ اس سے پیداوار میں کمی ہو جائے گی۔

اردو ہندی
خطِ امتیاز کہاں پر ؟

اترپردیش (یوپی) کے ممبران پر پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ وہ ہندی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں اسمبلی میں تقریر نہ کریں ــــــ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے اردو میں بولنے پر زور دیا مگر کونسل کے چیرمین نے اس کی اجازت نہیں دی۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب نے چیرمین سے پوچھا: اب تک میں کس زبان میں بولتا رہا ہوں ؟ چیرمین نے کہا: یقیناً ہندی میں۔ ڈاکٹر فریدی نے کہا: نہیں، اب تک اردو میں بولتا رہا ہوں۔

اور ممبران حیرت زدہ رہے کہ خطِ امتیاز کہاں پر کھینچیں ــــ ! ؟

تصویریں کیا کہتی ہیں

اے. ایم. شیخ

جناب احمد محمد شیخ متوطن جھرپ تعلقہ ساونت واڑی (ضلع رتناگیری) فرٹلائزر کارپوریشن آف انڈیا میں ڈپٹی چیف انجینئر ہیں۔

۳۷ سالہ شیخ صاحب زمانۂ طالب علمی ہی سے نہایت ذہین واقع ہوئے ہیں۔ آپ نے سینٹ زیویئرس ہائی اسکول ممبئی سے S.S.C. اور اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری سے انٹر سائنس پاس کرنے کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا اور امتیازی شان کے ساتھ امتحان پاس کیا۔ انجینئرنگ میں گریجویشن کرتے ہی TELCO میں اپرنٹس شپ منظور ہوئی اور وہاں چار سال عملی تجربہ حاصل کرنے کے بعد فرٹلائزر کارپوریشن میں اسسٹنٹ پلانٹ انجینئر کے عہدہ پر آپ کا تقرر ہوا۔ آج وہیں اپنی دس سالہ سروس میں مختلف شعبوں میں کام کرتے ہوئے ترقی پائی اور مندرجہ بالا عہدہ پر فائز ہیں۔

نومبر ۷۲ء کے آخری ہفتہ میں آپ کارپوریشن کی طرف سے یورپ کے دورہ پر روانہ ہوئے جہاں جرمنی، فرانس، ہالینڈ، فن لینڈ، اٹلی، روم وغیرہ ممالک میں فرٹلائزر پلانٹ کے جدید طریقۂ کار کا مطالعہ کیا اور ہندوستانی کارپوریشن کی ٹرامبے فیکٹری کے فروغ کے سلسلہ میں ورلڈ بنک سے مالی اعانت پر بات چیت کی۔

موصوف متعدد تعلیمی اور سماجی اداروں سے منسلک ہیں۔ اپنے وطن کی فلاحی تنظیم جھرپ مسلم ایسوسی ایشن کے صدر ہیں اور بڑی نیک نفسی کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

★

ڈاکٹر اکبر اوبارے

ڈاکٹر اکبر اوبارے ڈونگری (ممبئی ۹) حلقہ کے مشہور سماجی کارکن ڈاکٹر حسن عبدالقادر اوبارے کے فرزند اور موضع انبیت تعلقہ مہسلہ ضلع قلابہ کے باشندہ ہیں۔ سینٹ جوزف ہائی اسکول ممبئی ۹ سے S.S.C. امتحان درجۂ اول میں پاس کرنے کے بعد عمر کے بائیسویں سال میں آپ نے گرانٹ میڈیکل کالج ممبئی سے M.B.B.S. کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مگر چونکہ علم کی طلب باقی تھی اس لیے سلسلۂ تعلیم جاری رکھا اور امسال ممبئی یونیورسٹی سے بار اول M.D. کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران آپ نے جے جے ہسپتال میں ہاؤس فزیشن اور گوکلداس ہسپتال میں رجسٹرار کے طور پر خدمات انجام دی ہیں۔ فی الحال آپ G.T. ہسپتال میں انٹینسیو کیئر یونٹ کے رجسٹرار انچارج ہیں۔

مسلم پرسنل لا کنونشن

مسلم پرسنل لا کے متعلق اور اس میں تبدیلی کرنے یا نہ کرنے نیز مسلمانوں کے لیے اس کی افادیت اور اہمیت کے متعلق اظہار خیال کے لیے ۲۷، ۲۸ دسمبر کو ممبئی میں ایک کنونشن ہوا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی تمام جماعتوں، فرقوں اور مختلف مکاتیب خیال کے علماء، اکابرین اور شریعت اسلامیہ کے ماہرین نے شرکت کی۔ دو روز دن کے وقت مہاراشٹر کالج کے ہال میں مندوبین کے اجلاس ہوئے اور شب میں وائی ایم سی اے گراؤنڈ پر جلسۂ عام منعقد ہوئے جلسوں میں تقریباً پچاس ہزار تک لوگ شریک تھے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہندوستان کے تمام مکاتیب فکر کے لوگ ایک مقصد کے لیے جمع ہوئے اور انھوں نے متفقہ طور پر ایک فیصلہ کیا جلسہ میں پرسنل لا میں تبدیلی یا ترمیم کے خلاف لوگوں نے اپنی رائے ظاہر کی۔ مسلمانوں کے اس دینی اجتماع کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے مسٹر حمید دلوائی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ۲۸ دسمبر کو ایک مورچہ لے کر نکلے تھے لیکن مسلمانوں کے غم و غصہ اور پولیس کی بر وقت مداخلت سے انھیں واپس لوٹنا پڑا۔

انتقال پُر ملال

★ جناب یونس عبدالکریم مُلّا (متوطن گھا ٹیولاٹ ضلع رتناگری) کا ۳۰ نومبر ۷۲ء کو سینٹ جارج ہسپتال بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصّہ درس و تدریس میں گزارا۔ جیوشی دیل میں آپ ۱۵ سال تک معلم رہے اور آخری عمر میں بمبئی آکر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ایک پاؤں میں لنگ تھا۔ اور ۷۲ سال کا سن پھر بھی جوش خدمت میں کمی نہیں آئی۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

★ راجے واڑی تعلقہ مہاڈ ضلع قلابہ کے جناب عثمان اسمٰعیل بھوتیل کا ۱۵ دسمبر ۷۲ء بروز جمعہ حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم نہایت ہر دلعزیز اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔

★ پروفیسر شمس الدین پرکار بی ایس سی ایم ایڈ کی رفیقہ حیات محترمہ اُمّیہ کلثوم بی اے بی ایڈ (متوطن فردوس تعلقہ کھیڈ) جو سراج الاسلام ہائی اسکول فردوس میں ٹیچر ہیں ۱۳ دسمبر ۷۲ء کی صبح مختصر سی علالت کے بعد راہئ عالم ہوگئیں۔ مرحومہ تعلیم النسواں کی زبردست حامی تھیں اور اپنے علاقہ میں خواتین میں زبردست بیداری پیدا کی۔

★ ۲۴ دسمبر ۷۲ء کو ہندوستان کے معمر سیاستداں اور آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل شری راج گوپال اچاری کا انتقال ہوگیا۔

★ ۲۶ دسمبر ۷۲ء کو امریکہ کے ۳۳ ویں صدر مسٹر ٹرومین انتقال کرگئے۔ مرحوم قوم کے سخت بحرانی دور میں امریکہ کے صدر بنے تھے اور پوری دو میعادوں تک کامیابی کے ساتھ اپنے عہدہ پر فائز رہے۔

★ ۲۶ دسمبر ۷۲ء کو اڑیسہ کے سابق گورنر ڈاکٹر شوکت انصاری کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم آزادئ ہند سے قبل پیرس (فرانس) میں پریکٹس کیا کرتے تھے مگر آزادی کے فوراً بعد انھوں نے پیشہ ترک کردیا اور ملک کی خدمت میں مصروف ہوگئے تھے۔

★

انجینئر گریجویٹوں کی عملی تربیت

ملک میں انجینئرنگ گریجویٹوں کو عملی تربیت دینے کے لیے سرکار نے ایک منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ انجینئرنگ گریجویٹوں اور ڈپلوما کے حامل انجینئروں کو ایسا عملی تجربہ بہم پہنچانے کے لیے جو ان کے لیے نفع بخش روزگار کا ذریعہ بن سکے، صنعتوں میں عملی تربیت کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

ہر سال صنعتی کارخانوں، سرکار کے تکنیکی شعبوں اور دیگر اداروں میں دس ہزار سے زیادہ افراد کی تربیت کے لیے گنجائش نکالی جاتی ہے اور نو آموزوں کی تربیت سے متعلق علاقائی بورڈ نئے انجینئرنگ گریجویٹوں اور ڈپلوما حاصل کرنے والوں کو ان نشستوں کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ اس طرح کے بورڈ بمبئی، کلکتہ، کانپور اور مدراس میں واقع ہیں۔

یہ تربیت ۱۲ ماہ کی ہوتی ہے اور تربیت پانے والے ہر گریجویٹ کو ۲۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ کا دیا جاتا ہے جب کہ ڈپلوما کے حامل افراد کے لیے وظیفے کی رقم ۱۵۰ روپے ماہانہ ہوتی ہے۔

ان بورڈوں کے افسروں نے صنعتی اداروں کے شروع سے تربیتی پروگرام مرتب کیے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ افسر گاہے بگاہے تربیتی اداروں میں جاکر یہ دیکھتے ہیں کہ ان تربیتی پروگراموں پر صحیح انداز میں عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔

★

[N]AQSH-E-KOKAN (BOMBAY) JANUARY [illegible] Regd. No. MH-[illegible]
Licensed to post without prepayment under Licence No. 203, Bombay.

NPS.LIC-8 URD

یقیناً انہوں نے ایل۔آئی۔سی کی

"FIXED TERM (MARRIAGE) ENDOWMENT POLICY"

مقررہ مدتی شادی کی میعادی بیمہ پالیسی لے رکھی ہے!
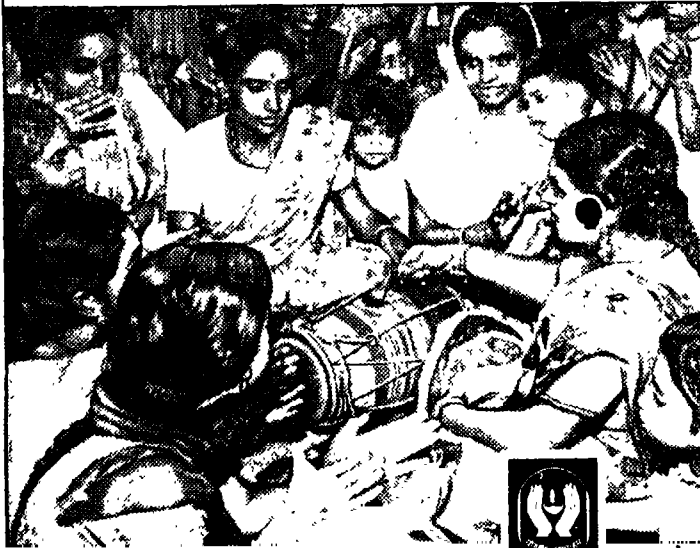
شادی کی میعادی بیمہ پالیسی کے تحت آپ اپنی لڑکی کی شادی کے اخراجات کا انتظام شادی سے 5 - 10 یا 15 سال پہلے سے شروع کرسکتے ہیں تاکہ وقت پر آپ کو یکمشت رقم مل جائے۔ اس طرح بچت کرنے میں یہ سہولت ہے کہ آپ آسان اور چھوٹی چھوٹی قسطوں کے ذریعہ رقم جمع کرتے ہیں جو لڑکی کی شادی کے وقت مل جاتی ہے۔

مکمل تفصیلات کے لئے اپنے جانے پہچانے ایجنٹ یا نزدیکی بیمہ دفتر سے رابطہ پیدا کیجئے۔

بیمہ زندگی - سلامتی کیسے بمثال ہے

لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

[Printed] at AJMAL PRESS, Bombay-3, and Published from 44, Jail Road (East), Bombay-9, by Dr. A. M. NAIK [illegible]

75 PAISE

ماہنامہ نقشِ کوکن بمبئی

12(11)

APRIL 1973

ماہ نامہ

نقش کوکن

بمبئی

اپریل سنہ ۷۳ء

جلد ۱۲ شمارہ ۴

طابع وناشر: ڈاکٹر عبدالکریم نائیک
ملکیت : نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ

زرِ سالانہ: ۸ روپے
بیرونِ ممالک: ۱۵ شلنگ برٹش پوسٹل آرڈر
خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
منیجر ماہ نامہ نقش کوکن
۴۴ جیل روڈ ایسٹ ۔ ڈونگری ۔ بمبئی ۹
ٹیلیفون: ۳۳۱۵۷۲

قیمت: ۷۵ پیسے

مقام طباعت واشاعت: اجمل پریس بمبئی ۳
تاریخ اشاعت: یکم اپریل سنہ ۱۹۷۳ء

اس شمارے میں

توجّہ طلب

ہمارے ادیب جس عمر میں لکھنا شروع اور ختم کرتے ہیں، وہ زمانہ وفورِ جذبات کا ہوتا ہے۔ دراصل وہ خود نہیں لکھتے بلکہ جذبات اُن سے لکھواتے ہیں۔ اُن کے پاس عموماً کوئی اسلوب بھی نہیں ہوتا۔ جذبات جس طرح کہتے ہیں، وہ اسی طرح لکھتے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے جذبات مدّھم ہوتے جاتے ہیں، اُن کا لکھنا بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ عام انسانوں کی طرح ہمارے ادیبوں (اور شاعروں) کو بھی جوانی میں اپنا ہر جذبہ انوکھا نظر آتا ہے اور وہ اوروں کو اپنے اس تجربے میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب وہ آہستہ آہستہ ان جذبات کے عادی ہوجاتے ہیں، تو پھر اُن میں کوئی نُدرت باقی نہیں رہتی اور ادیبوں کا تخلیقی جوش بھی ٹھنڈا ہو کے رہ جاتا ہے۔ مغرب کے ادیب عمر بھر لکھتے رہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے جذبات ہمیشہ متلاطم رہتے ہیں یا وہ روز اپنے اندر ایک نیا جذبہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اصل میں سوال جذبات کے جوش اور زور کا نہیں۔ نہ ادیبوں کی قدر و قیمت اس طرح متعیّن ہوتی ہے کہ فلاں صاحب کے پاس تین جذبے ہیں، فلاں صاحب کے پاس پانچ۔ انسان کے جذبات تو وہی گنے چنے ہوتے ہیں اور مزے دار سے مزے دار جذبات سے بھی آدمی ایک نہ ایک دن اُکتا ہی جاتا ہے۔ البتہ جو چیز تر و تازہ رہ سکتی ہے اور جس میں نشو و نما ہونی چاہیے، وہ ہے جذبات کے متعلق آدمی کا رویّہ۔ جذباتی ارتقا کے معنی یہ نہیں کہ آدمی نے اپنے اندر ایک چڑیا گھر کھول رکھا ہے اور روز ایک نہ ایک جذبے کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے جذبات اُس کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں پر اثر ڈالتے ہیں اور اس دو گونہ عمل کے ذریعے اُس کی شخصیت میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ ہمہ گیری اور زیادہ سے زیادہ ارتکاز پیدا ہوتا جاتا ہے۔ جذبات بذاتِ خود کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے، آدمی کا اندرونی رویّہ انھیں قابلِ قدر بناتا ہے۔ خصوصاً ادب میں۔

حسن عسکری : ستارہ یا بادبان صفحہ ۱۰

ترتیب

صفحہ

اداریہ

ساہتیہ اکیڈمی ہندوستان کا ایک معروف ادبی ادارہ ہے۔ اس
کا کام ہندوستانی ادبیات کی ترقی کا جائزہ لینا اور اس کے لیے
سمت و رفتار متعین کرنا ہے۔ ابھی حال ہی میں اس اکیڈمی کا ایک آفس
بمبئی میں بھی قایم کیا گیا تھا جس نے اپنے کام کا آغاز "آزاد ہندوستان میں ادبی
میلانات" پر ایک دو روزہ سمی نار منعقد کر کے شروع کیا۔ اس
سمی نار کا اہتمام ہندوستان کی آزادی کا پچیس سالہ جشن منانے کے سلسلے
میں کیا گیا تھا۔ افتتاحی تقریر مشہور عالم پروفیسر ایس۔ آر۔ سری نواس آینگر
(نائب صدر ساہتیہ اکیڈمی) کی تھی۔ اور سمینار شاعری، افسانے، ڈرامے
اور تنقید کے جدید میلانات پر تھا جس میں ملک کی مختلف زبانوں کے ادیبوں،
شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناقدین نے حصہ لیا۔ سمینار ہر لحاظ سے
کامیاب رہا اور مختلف زبانوں کے نمائندوں نے اپنی اپنی زبانوں کی خوب
نمائندگی کی سوائے اردو زبان کے۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور
افسانہ نگاروں کو بھی اس سمینار میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر صد افسوس
کہ ہم جو اردو کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کی شکایت دوسروں سے کرنے کے
عادی ہو گئے ہیں اردو کے واسطے سے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا کر بڑی آسانی سے

اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ سیمینار میں حصّہ لینے والوں کی فہرست میں اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک طویل فہرست تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ ان ادیبوں اور شاعروں میں سے کوئی بھی سیمینار میں شریک نہیں تھا اور قطع نظر اعجاز صدیقی صاحب کے مقالے کے جو جناب یونس اگاسکر نے ان کی غیر موجودگی میں پڑھ کر سنایا اُردو کی نمائندگی دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے کمزور رہی۔ سامعین میں سوائے ایک دو کے ساری تعداد مراٹھی یا دوسری زبانوں والوں ہی کی تھی۔ مزید یہ کہ مضامین انگریزی میں پڑھنے کی دعوت تھی اور ظاہر ہے ایسے ملے جلے جلسے میں کسی مشترک زبان ہی کو ذریعۂ اظہار بنانا چاہیے تھا، مگر اردو شاعری پر جو مقالہ پیش کیا گیا وہ بہت ہی مشکل اُردو میں تھا۔ مشہور ہندی شاعر پیکھ نے بھی اپنی تقریر ہندی ہی میں کی مگر وہ ایسی ملی جلی زبان میں تھی کہ لوگ سمجھ گئے، مگر اُردو تقریر سمجھ نہ پائے اور یہ گذارش کی گئی کہ اسے انگریزی میں سمجھایا جائے۔ افسانے سے متعلق دوسرے سیشن کی صدارت اردو کے نامور افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی نے فرمائی جو اُردو والوں کے لیے وجہِ تسلّی بنے۔ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس قسم کے جلسوں میں اُردو کی پوری پوری نمائندگی ہو، اس سے علمی اور عوامی سطح پر اردو کے لیے فضا بننے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس جلسہ کی ابتدا میں ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے شریمتی گوداوری پر دیکر کی خدمت میں ان کی کتاب "جیوھاں مانوس نا گا ہوتو" پر انعام پیش کیا گیا۔ انعام دینے کی رسم مشہور عالم اور ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ادا کی۔ ہم شریمتی گوداوری پر دیکر کو ساہتیہ اکیڈمی کے اعزاز پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

۱۲ ربیع الاول

کوثر چکد از لبم بہ این تشنہ لبی
خاور دمد از شبم باین تیرہ شبی
اے دوست ادب! کہ در حریم دل ماست
شاہنشہ انبیا، رسولِ عربی

حسن کے ذوقِ نمود نے انگڑائی لی۔ حظیرۂ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموّج ہوا۔ ملائے اعلا کے حریم ناز کے حریری پردوں میں غیر محسوس سی جنبش نظر آئی۔ بربطِ عالم کے خاموش تاروں میں نورانی ارتعاش سا محسوس ہوا۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں اوپر کو اٹھیں۔ "سبّوحٌ قدّوسٌ" کی بے صوت صدائیں، نور و نکہت کے رنگین ترشح کی صورت میں زمزمہ ریز و نغمہ بار ہوئیں۔ دُور جانبِ عرشِ عظیم سے کُن کی جبروتی آواز نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا۔ عدم کے پردے اٹھنے لگے اور اُفق سے اُس پار، عالمِ تصوّر سے نگار خانۂ کائنات نے خاموشی سے اُبھرنا شروع کیا۔ سائنس دان نے اسے حرکت و حرارت سے تعبیر کیا، فلاسفر نے حلقۂ دامِ خیال قرار دیا، عشق نے جلوۂ یکتائے محبوب کہا، اربابِ قضا و قدر نے ایک معین پروگرام کا نقطۂ اولین بتایا، مذہب نے امرِ تکوین کا کرشمۂ حیرت زا نام رکھا اور قلبِ سلیم نے مشیّتِ ایزدی سمجھ کر سر جھکا دیا۔

ہیولائے کائنات اُبھرنے کو تو اُبھرا لیکن بڑا بے کیف اور بے رنگ۔ آہستہ آہستہ اس کے بکھرے ہوئے ذرّوں میں ربط و ضبط پیدا ہونا شروع ہوا۔ ربط و ضبط سے اس خاکے میں کچھ رنگینیوں کے آثار محسوس ہونے لگے۔ منتشر رنگینیوں نے آہستہ آہستہ متشکّل ہونا شروع کیا۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بننے لگیں۔ جنت کی حوروں نے کنکھیوں سے باہم اشارے کیے۔ نوامیسِ فطرت کی نگاہوں میں ہلکا سا تبسّم پیدا ہوا۔ حریمِ قدس کے رازداروں نے کانوں ہی کانوں میں کچھ کہا سنا۔ زمین کانپی، آسمان تھرّایا، چاند کا ساغرِ زرّیں چھلک گیا، ستاروں کے ننھے ننھے دل دہل گئے، فضا میں ایک شور اٹھا اور

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد

حوروں نے نغمۂ تبریک گایا۔ فرشتوں نے سر جھکایا۔ ارض و سماوات نے اپنی باج گزاری کا خریطہ پیش کیا۔ ابلیس نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اور یوں یہ عالمِ بے کیف، دنیائے رنگ و بو اور جہانِ سوز و ساز بن گیا۔

ابلیسانہ سرکشی اور ملکوتی تسلیم و رضا کی یہی کشمکش تھی جو اس کی خودی کے استحکام اور اس کے جوہرِ انسانیت کے ارتقا کا موجب بنی، اب درحقیقت اس پروگرام کا پہلا دور شروع ہوا جس کے پیشِ نظر یہ تمام ابتدائی مراحل یوں طے ہوئے تھے۔ ابلیسانہ قوت کی تائید میں کشش و جاذبیت وہ تمام

نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھے جو اس نگارخانہ طلسم و حیرت کے دامن میں بکھر کر رکھ دیے گئے تھے اور اس کے خلاف اس پیکرِ خودی کے رشد و ہدایت کے لیے وہ پیغامِ ازلی جو مبدأ فیض کی کرم گستری سے وقتاً فوقتاً اس کے پاس پہنچ رہا۔ اس پیغام کی لَم ایک تھی، حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم خانۂ فسوں و فریب کی جاذبیتیں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں، ان کے مقابلے کے لیے اس اصول کی فروعات میں مناسب رد و بدل اور ضروری اضافہ ہوتا جاتا تھا کہ اس کے ارتقا کے ساتھ ساتھ جوہرِ انسانیت کا ارتقا ہوتا رہے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ قافلہ سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان کا ہر قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک نقطۂ آخریں کی طرف اشارہ کرتا تھا، چنانچہ ان آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتا نشان بتا کر جاتا تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ فوراً اس کے پیچھے ہو لے اور راہ گم کردہ مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ آج سے قریب ساڑھے تین ہزار برس اُدھر، جب سینا کے مقدس میدانوں سے ایک عظیم المرتبت پیغامبرؑ اپنا منصبِ جلیلہ ادا کر کے جانے لگا تو اہلِ قافلہ کو اس کی زبان سے سنا دیا گیا کہ

"تیرا خدا، تیرے لیے، تیرے بھائیوں میں سے، تیرے مانند ایک نبی بھیجے گا۔ تو اس کو ماننیو۔ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" (توریت کتاب پنجم۔ باب اٹھارہ)

شام و فلسطین کی وادیوں میں کوئی تین ہزار سال پیشتر حضرت داؤدؑ کے نغماتِ لاہوتی میں یہ صدائے ملکوتی بلند ہوئی کہ

"تیرا برگزیدہ بندہ، جس کی طرف میرا جی راضی ہے پورب کی طرف سے اُٹھے گا۔" (زبور)

اور ان کے پُرشکوہ و صاحبِ سطوت جانشینؑ نے اس آنے والے کے نشانات بتا کر کہا

"اے یروشلم کی بیٹیو! یہ ہے میرا دوست یہ ہے میرا محبوب" (غزل الغزلات باب ۵)

پھر اسی یروشلم میں آج سے قریب دو ہزار سال اُدھر ایک "خدائی گڈریئے" نے اپنے گلّے کی منتشر بھیڑوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ میں اب جا رہا ہوں۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اب میرا جانا ہی اچھا ہے اس لیے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو (دنیا کو) تسلّی دینے والا تمھارے پاس نہیں آئے گا...... جب وہ صداقت کی روح تمھارے پاس آئے گی تو وہ تمھیں سچائی کی طرف رہنمائی کرے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ وہ سنے گا وہی کچھ کہے گا۔ اور وہ تمھیں آنے والی باتوں کی خبر دے گا۔" (یوحنا۔ باب ۱۶)

اور انجیل برنباس (فصل ۴۴) میں اس آنے والے کے متعلق ہے:

"وہ کیسا مبارک زمانہ ہے جس میں یہ رسول دنیا میں آئے گا۔ تم مجھے سچا مانو۔ ہر آئینہ میں نے اسے دیکھا اور اس کے سامنے عزّت و حرمت کو پیش کیا۔ جیسا کہ اس کو ہر ایک نبی نے دیکھا ہے کیونکہ اللہ ان (نبیوں) اور اُس (رسولؐ) کی روح بطورِ پیشین گوئی کے عطا کرتا ہے اور جب کہ میں نے اُسے دیکھا میں تسلّی سے بھر کر کہنے لگا اے محمدؐ اللہ تیرے ساتھ ہو اور مجھ کو اس قابل بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھولوں۔ کیونکہ اگر میں شرف حاصل کر لوں تو بڑا نبی اور اللہ کا قدوس ہو جاؤں گا۔"

سرزمینِ ایران میں اسی طرح ایک جانے والے جناب (زرتشت)

نے اپنے جانشین (جاماسپ) سے کہا کہ سن رکھو کہ

"اولاد ہاشم میں ایک بزرگ پیدا ہوگا۔ دعوئے نبوت
کرے گا۔ اس کا مذہب سات ولایتوں میں جائے گا۔
اولاد نرینہ نہ رہے گی۔ البتہ لڑکی سے نام چلے گا۔ تاج
کی جگہ سر پر عمامہ رکھے گا۔ آتشکدے اس کے حکم سے
بند کر دیے جائیں گے۔"

ہندوستان کی سرزمین میں گوتم بدھ نے اپنے چیلے آنند سے جاتے وقت کہا کہ غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میرے بعد کئی بدھ آئیں گے۔ آخری بدھ کا نام میتریا (محمدؐ) اور لقب میّا (رحمت) ہوگا۔ گنگا کی وادیوں میں بسنے والوں کے نام بھی ان کی کتاب کلکی پوران میں ایک پیغام موجود ہے کہ

کلجگ میں سانبل دیپ میں جگت گرو پیدا ہوں گے۔
باپ کا نام وشنو بھاگت (عبداللہ) اور ماں کا نام
سومتی (آمنہ) ہوگا۔ تاریخ پیدائش ۱۲ بیساکھ،
پیر کا دن، دو گھڑی دن چڑھے۔ پہلے باپ کا انتقال
ہوگا پھر ماں کا۔ جگت گرو سانبل دیپ کی رانی سے
شادی کریں گے۔ ایک پہاڑ کی کھوہ میں تپسیا کریں گے۔
پرشرام (روح اللہ) سے تعلیم پائیں گے۔ بستی میں آکر
تبلیغ کریں گے تو لوگ تکلیف دیں گے اور جگت گرو
شمالی پہاڑوں کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔ وہاں سے
تلوار لے کر پھر اسی بستی کو آئیں گے۔ ملک فتح ہو جائے گا۔
گرو کا ایک گھوڑا برق سے زیادہ تیز چلے گا۔ اس پر
سوار ہو کر آپ کل زمین اور سات آسمانوں کی سیر کریں گے"

یہ وہ نشانات راہ ہیں جو ان بچے کچھے آثار قدیمہ میں ملتے ہیں جو آج کھنڈرات کی شکل میں وہاں پائے جاتے ہیں اور جن میں حوادث زمانہ نے نہ معلوم کیا کیا تغیرات پیدا کر دیے ہیں۔ اگر یہ یادگاریں آج کہیں اپنی اصلی شکل میں موجود ہوتیں تو خدا جانے ان میں اس جلیل المرتبت آنے والے کے متعلق کن کن درخشندہ اور نکھرے ہوئے الفاظ میں کتبے آویزاں نظر آتے۔ اس لیے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی سلسلے کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتاب فطرت کے مختلف اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب کتاب کے آخری باب کی گویا تمہید تھی۔ یہ سب ایک ہی شجر طیّب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گل سرسبد کے لیے نوید بہار تھیں۔ پھر جب مشیت ایزدی کی یہ محکم تدبیر جس کے لیے زمین اور آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے۔ اپنی پختگی تک پہنچی جب انسانیت، جس کے لیے کائنات کے ایک ایک ذرہ کو جکڑ دیے گئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے نکل کر حریم شباب میں پہنچی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں کوثر و سلسبیل سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے، جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی آگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درون پردہ کے معدن لعل و گہر کو سمو لے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنّت کی پھول پتّی سے بطحا کی وادیوں کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آئی چاروں طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے، آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم آنکھوں میں اِنّی اَعْلَمُ مَا لَا تَعلَمُوْن کی تفسیر ایک پیکر محبوبیت بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لیے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدے سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے چمکے، بلدِ امین کی

والتّین والزّیتون وطور سینین و
ھٰذا البلد الامین ......

گلیوں کا نصیبا جاگا کہ آج اُس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کے لیے
جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور جسے کوہِ زیتون پر جناب
مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکین خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی خبریں
وادیٔ طورِ سینین میں اسرائیلیوں کو دی گئیں اور جس کے لیے دشتِ عرب
میں حضرت خلیل اکبر اور ذبیح اعظم (علیہما السلام) نے اپنے خدا کے
حضور میں دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے
لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے
آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے
زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے
جھولا جھلایا۔ ملائے اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات
کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوات کی فردوس گوش
صداؤں سے گونج اٹھی۔ اور شجر و حجر پکار اُٹھے کہ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

یہ آنے والا (صلعم) رسول کافّۃ للنّاس اور رحمۃ اللعالمین
بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جس نے بنی نوعِ
انسان کی تمام زنجیروں کو کاٹ کر اس رشتہ بر پا طائر لاہوتی کو آسمان کی
فضائے بسیط میں اڑان بال کشائی عطا کر دیا۔ لیکن افسوس کہ انسانوں نے
اپنے اس محسنِ اعظمؐ کی صحیح منزلت کو نہ پہچانا۔ ان شوریدہ بخت
شپرہ چشموں کو چھوڑیے جنھوں نے نورِ مبین کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔
انھیں لیجیے جنھوں نے دنیا کے سامنے حضورؐ کی عظمت کا اعتراف
کیا تو اس انداز کا کہ کسی نے "عرب کا ہیرو" قرار دیا۔ کوئی آگے بڑھا تو
اس نے اس آفتاب جہاں تاب، اس سراجاً منیرا کو صرف مسلمانوں
کی قوم کے صحنِ خانہ کا چراغ سمجھا۔ کسی نے یہ نہ جانا کہ سورج کسی
خاص چار دیواری میں بسنے والوں کے لیے وجہِ روشنی نہیں ہوتا بلکہ
ہر اس شخص کے لیے چشمۂ نور ہوتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر اس سے
مستنیر ہونا چاہے۔ چھوٹے چھوٹے دیے اپنے اپنے گھروں کے دیے
ہوتے ہیں لیکن مہرِ عالم تاب ساری دنیا کا مشترکہ سورج ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ کے ماننے والوں اور جناب بدھ اور کرشن
کے بھگتوں کو (حضور سرورِ کائنات) محمد رسول اللہؐ کی ضیا پاشیوں سے
آنکھیں نہیں بند کر لینی چاہیے تھیں کہ محمدؐ کا لایا ہوا پیغام کوئی انوکھا پیغام
اور ان کی دی ہوئی تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی،
وہ اس کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا
کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی تنزیل آسمانی کی کوئی نہ
کوئی کرن تھی جو قلب محمدؐ میں اتاری گئی۔ مشام جاں نواز نے جہاں کہیں
بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی، وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کے تصدق
تھی جن کے مجموعے کا گلدستہ حضور خاتم النبیینؐ کے دستِ اقدس سے
محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغام محمدی کیا ہے؟ انہی مقدس اوراق کی شیرازہ
بندی ہے جنھیں آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر
بکھیر دیا تھا۔ ان کی از سرِ نو شیرازہ بندی اور قیامت تک کے لیے اقتضاآتِ
زمانہ کے مطابق تکمیل۔ پھر کہ اس سے انکار کی کیا وجہ اور اعتراض کا کیا
باعث؟ لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ جب جناب گوتم کا دل ایک اپاہج کو
دیکھ کر تڑپ رہا تھا اور حضرت مسیحؑ کوڑھیوں کی تکلیف کے احساس سے
نم چشم تھے تو وہ بھی درحقیقت مقام محمدی ہی کے آئینۂ جمال کا پرتو
تھا اور جب حضرت موسیٰ اپنی غلام قوم کو فرعون کے استبداد سے نجات
دلانے کے لیے مصروفِ پیکار تھے اور حضرت یوسفؑ اپنے قید خانہ
کے رفیقوں کو متعدد آقاؤں کی غلامی سے نکل کر ایک خدائے قہار کی
محکومیت کا وعظ ارشاد فرما رہے تھے تو اس وقت بھی مقام محمدیؐ
ہی کے آفتاب جلال کی جلوہ افگنی تھی۔ جب زرتشت اپنے جانشین
جاماسپ کو بقائے دوام حاصل کرنے کے لیے سوزِ نفس کے رازوں
سے آگاہ کر رہے تھے اور حضرت خلیل اکبرؑ عشق کی راہ میں اپنے بیٹے
کے گلے پر چھری رکھ رہے تھے تو وہ بھی اسی مقام محمود کی ضیا پاشیاں
تھیں۔ غرضیکہ جہاں جہاں کوئی آسمانی حقیقت تھی تو وہ قرآن ہی کے

کسی نہ کسی صفحہ کی کوئی سطر تھی، اور جہاں جہاں اس حقیقت کے علمبردار حضرات کے اعمالِ زندگی تھے وہ حاملِ قرآن کی سیرتِ مقدسہ کے کسی نہ کسی پہلو کے آئینہ دار تھے۔

هرکجا بینی جهانِ رنگ و بو — آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرع میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا اور جو مصرعۂ ثانیہ کا محتاج نہ تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھا۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھا۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست!

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت ابھی ان بلندیوں تک پہنچی نہیں جہاں وہ مقامِ محمدیؐ کی ماہیت سے آگاہ ہو سکے۔ ایک طرف اس ذاتِ اقدس و اعظم (فداہ ابی و امی) کی عظمت و حضورؐ کی وساطت سے ملے ہوئے پیغام کی رفعت کو دیکھیے تو تصوّر سر بگریباں ہو جائے۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ مصوّرِ کائنات نے بلندیوں اور پستیوں کو کتنے چکر دیے کہ یہ حسین و جمیل شاہکار وجود میں آیا۔ مصنفِ صحیفۂ فطرت نے کس قدر نادر مضامین کی تسوید و تبلیض کی کہ یہ جو آخری پیغام متشکل ہوا۔ دوسری طرف اس پیغامِ حیات پرور کی عالمگیر وسعتوں پر نگاہ ڈالیے تو تخیل انگشت بدنداں رہ جائے۔ کسی ایک خطے، ایک ملک، ایک براعظم، ایک فرقے، ایک جماعت، ایک قوم کی راہ نمائی کے لیے نہیں بلکہ تمام کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لیے ضابطۂ حیات اور پھر کسی خاص وقت، خاص ماحول، خاص زمانہ کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے نصابِ زندگی۔ کیسا ناپیدا کنار ظرف تھا اُس قلبِ منورؐ کا جو ایسے زمان و مکان کی حدود سے بلند و بالا پیغام کا مہبط قرار پایا، اور علمِ صحیح کے کس افقِ اعلیٰ پر مقام تھا اُس معلم الحکماء ذاتِ گرامیؐ کا جس کا ادراک، آئینۂ حقائقِ کائنات ٹھہرا۔

انسانوں نے اس کتابِ علم و حقیقت سے اعراض برت کر دیکھ لیا۔ یہ جہنم اور اس کے آسماں رس شعلے سب اسی انکار و جحود کا نتیجہ ہیں۔ ان مصائب و نوائب اور اس کرب و الم سے نجات کا طریق اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان مقامِ محمدیؐ سے آگہی پیدا کرے اور پیامِ محمدؐ کو زندگی کا نصب العین بنائے اور اس یادگارِ عالیہ پر جا کر جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے قلب سے اعتراف کرے کہ

نہ جہاں میں، تجھ کو اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی!
مرے جرمِ ہائے سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

(بشکریہ "طلوعِ اسلام"
اپریل مئی ۱۹۴۳ء)

کسی کو
مجبور، معذور
اور عیوب میں مبتلا دیکھ کر
اُس پر آوازے نہ کسو۔
نہ اس حالت کو اس کے افعال کا نتیجہ کہو۔

بلکہ

خدا کا شکر ادا کرو
کہ تم ویسے نہیں ہو۔

عالی جعفری

غزلیں

زندگی حاملِ ہر لطف و کرم ہے کہ نہیں
آنکھ پھر حوصلۂ درد سے نم ہے کہ نہیں

سانس بن کر مرے سینے میں اترنے والے
درد تیرا مرے ماتھے پہ رقم ہے کہ نہیں

میں نہ کہتا تھا کہ تم میری تمنّا نہ کرو
خود تمھیں آج بہت رنج والم ہے کہ نہیں

بس بڑھے آؤ، رُکو مت، نہ پلٹ کر دیکھو
زندگی اپنی طرح تیز قدم ہے کہ نہیں

مجھ کو ہر موڑ پہ آتا رہا رہ رہ کے خیال
زلفِ خم دار میں اک اور بھی خم ہے کہ نہیں

اپنی منزل سے بہت دور سہی ہم لیکن
فاصلہ روزِ گذشتہ سے بھی کم ہے کہ نہیں

شعر کہتے ہوئے عالی یہی رہتا ہے خیال
میرا ہر قطرۂ خوں نذرِ قلم ہے کہ نہیں

فروری سنہ ۱۹۶۹ء

●

یہ نہ پوچھو کیا نہ پایا، یہ سنو کیا مل گیا
خون میں ڈوبا ہوا آج اپنا چہرا مل گیا

پھیلے تو اس طرح پھیلے راستہ گم ہو گیا
جب سمٹ پائے تو ہر جانب سے رستا مل گیا

کل سرابوں میں بھی ممکن ہے ملے ہم کو مراد
آج تو دھرتی کی تہہ میں ایک دریا مل گیا

پہلے ہر صفحے پہ تھا پھیلا ہوا جادو کوئی
آج ہر کاغذ ہمیں کورے کا کورا مل گیا

ہائے کیسی دوستی ہے مل کے بھی ملتے نہیں
صاف کیوں کہتے نہیں کیا کھو دیا کیا مل گیا

ہم تو مر جانے کو بھی اچّھا سمجھتے تھے مگر
ساتھ تم نے کیا دیا جینے کا موقع مل گیا

مدّتوں پر آج عالی خود سے یوں باتیں ہوئیں
جیسے ہم کو گم شدہ سا اک شناسا مل گیا

مارچ سنہ ۱۹۷۱ء

نصر قریشی

"زبان"

زباں کی فصلیں جلانے والو! زباں مٹی ہے، نہ مٹ سکے گی
زباں امرت ہے، زباں امر ہے، زباں کی کھیتی ہری رہے گی
زباں اندھیروں کی موت بن کر بہ شکلِ شمع یولدی جلے گی
زباں شہیدوں کا خون بن کر جبینِ عالم کو نور دے گی
شعاعِ شمس و قمر رُکی ہے، نہ روکنے سے کبھی رُکے گی
زبان فطرت کی روشنی ہے، زباں تو ہر حال میں بڑھے گی

زبان حسن کا روپ جیسے، زبان بچّے کی مسکراہٹ
زبان بچپن، زباں جوانی، زبان پیری کی سرد آہٹ
زباں ہنڈولا، زبان پنگھٹ، زبان آنچل کی سرسراہٹ
زباں پرندوں کی میٹھی بولی، زبان جھرنوں کی گنگناہٹ
زبان ٹیگور میں پلی تو جہاں کو گیتانجلی ملی ہے
زبان اقبال میں ڈھلی تو بشر کو خود آگہی ملی ہے

زبان وارث کی ہیر بن کر دلوں میں شمعیں جلا گئی ہے
زبان پدماوتی کے پیکر کا حسن سب کو دکھا گئی ہے
زبان ابھری ہے نجد میں تو رواجِ محمل اٹھا گئی ہے
زبان بنسی کی تان بن کر سہانی لیلا رچا گئی ہے
زبان سور اور تلسی بن کر زمیں کو اک آسمان دے گی
زبان گوتم کا راگ بن کر پیامِ امن و امان دے گی

زبان قوموں کی ترجماں ہے، زبان ہم رنگ کہکشاں ہے
زبان اک گلبدن حسینہ، زبان الفت کی رازداں ہے

زبان رانجھا ، زبان وامق ، زبان مجنوں کی داستاں ہے
زباں کہیں سوہنی کا قصّہ ، پنجاب پر اک گھڑا رواں ہے

زباں کہیں کوہکن کا تیشہ ، زباں کہیں تاج کا تبسّم
زباں کہیں شعلہ اور شبنم ، زباں کہیں پیار کا ترنّم

زبان مصلوب ہونے پر بھی حیات کی نغمہ خواں بنی ہے
زبان ناقوس کی صدا ، تو کہیں صدائے اذاں بنی ہے
زبان رہبر ، زبان مصلح ، زبان مذہب کی جاں بنی ہے
زبان گیتا ، زبان قرآں ، حرارتِ دوجہاں بنی ہے

زباں نہ ہندی ، زباں نہ ہندو ، زباں نہ مسلم ، زباں نہ اُردو
زباں کی قومیت ہے عالم ، زباں ہے گُل ، زبان خوشبو

زبان کو جو مٹائے سُن لو ، وہ آدمی ، آدمی نہیں ہے
اندھیرا جس سے نہ دور بھاگے وہ روشنی ، روشنی نہیں ہے
جو پھول کا بانکپن اُجاڑے ، وہ موسمِ گُل کبھی نہیں ہے
جو نورِ حق کا گلا دبائے ، وہ بندگی ، بندگی نہیں ہے

صنم کدوں کو اُجاڑ دے جو ، وہ صنم کا قاتل ، حرم کا قاتل
مٹائے توقیرِ علم و فن جو ، وقارِ اہلِ قلم کا قاتل

زباں مٹی ہے نہ مٹ سکے گی ، زباں بٹی ہے نہ بٹ سکے گی
زبان تلواروں میں پلی ہے ، زباں کسی سے نہ کٹ سکے گی
زبان ٹیپو کا نعرہ بن کر عدو سے پیچھے نہ ہٹ سکے گی
زبان شعلوں پہ رقص فرما رہے گی اور نہ پلٹ سکے گی

زباں پہ یلغار کر کے دیکھو ، زبان تم کو جواب دے گی
جو ایک نسل مٹ بھی جائے تو دوسری پھر حساب لے گی

یوسف ناظم

مرض بڑھتا گیا......

بعض اوقات، اتفاق سے بڑے دلچسپ لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ کل ہی کا قصہ ہے کہ ٹرین میں ایک صاحب مل گئے۔ پورے ڈبے میں وہ اکیلے آدمی تھے جو مسلسل بولے چلے جا رہے تھے (ایسا بہت کم ہوتا ہے ورنہ عام طور پر ٹرین کے ڈبے میں سفر کرنے والے سبھی لوگ بولتے ہیں، سننے والوں کو ٹرین میں جگہ ہی کون دیتا ہے)۔ ان صاحب کی باتوں کی اور ٹرین کی رفتار میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ ٹرین ان کی زبان کے مقابلے میں ذرا دھیمی رفتار سے چل رہی تھی اور کوئی اسٹیشن آتا تو رک جاتی تھی۔ ان کی گفتگو میں کوئی اسٹاپ نہ تھا اور اگلے جملے کے لیے کسی سگنل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ فرما رہے تھے کہ موصوف ڈاکٹر ہیں اور انھوں نے اعلا سے اعلا قسم کی بیماری کا علاج فرمایا ہے۔ خطرناک سے خطرناک مریض کو قابو میں کیا ہے۔ وہ چٹکی بجاتے ہیں اور مرض بھاگ جاتا ہے۔ (کسی نے کھسر پھسر کی مرض یا مریض؟ —— یہ کھسر پھسر اُن تک پہنچی نہیں اور ان کا سلسلۂ کلام یوں جاری رہا کہ) ان کے دواخانے میں کیٹو بلکہ اے ٹو زیڈ لگی رہتی ہے اور وہ ہنگامہ رہتا ہے کہ ہلنے جلنے بلکہ بعض وقت تو ہوا چلنے کی جگہ بھی نہیں رہتی اور کبھی کبھی تو مجمع کو قابو میں رکھنے کے لیے محلّہ والوں کو بلانا پڑتا ہے۔ اور ایک مرتبہ تو یہ ہوا کہ وہ صبح کے وقت ذرا دیر سے دواخانے پہنچے تو اتنی بھیڑ تھی کہ دوپہر ہو گئی اور وہ اپنے کمرے تک نہیں پہنچ پائے —— ٹرین کے سارے مسافر خاموشی سے ان کی باتیں سُنتے —— بلکہ سہے جا رہے تھے۔ کچھ تو اس لیے سُن رہے تھے کہ چلو یہ بھی راستہ تو کٹ رہا ہے اور کچھ اس لیے برداشت کر رہے تھے کہ کون بحث میں اُلجھے لیکن ایک نوجوان سے چُپ نہ رہا گیا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: ڈاکٹر صاحب، کہیں آپ جانوروں کے ڈاکٹر تو نہیں ہیں —— ڈاکٹر نے جواب دیا: جی ہاں، میں جانوروں ہی کا ڈاکٹر ہوں، فرمائیے آپ کو کیا شکایت ہے؟!

کہا جاتا ہے کہ سب سے اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس سے آپ علاج نہ کروائیں۔ صرف اس کی شہرت سے فیض حاصل کیا کریں۔ اس ڈاکٹر سے آپ کو جتنا فائدہ پہنچتا ہے اتنا کسی اور شخص سے نہیں پہنچ سکتا۔

بعض ڈاکٹر تو اتنی ہمدردی جتاتے ہیں کہ مریض سانس لینا بھول جاتا ہے۔ ایک مریض کا آپریشن ہونے والا تھا اور ڈاکٹر کچھ اس طرح تسلّی دے رہا تھا کہ گھبراؤ مت۔ یہ تو بہت معمولی آپریشن ہے اور تمھارا آپریشن تو سب سے سینئر طالب کرنے والا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگیں گے۔ یہی آپریشن کل ایک اور مریض کا ہوا تھا۔ آپریشن بالکل کامیاب رہا اور مریض اب آرام کی نیند سو رہا ہے۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ تمھاری تو انشورنس پالیسی بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر نے مزید ہمدردی جتلائی اور یہ شعر پڑھا ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے　　　آج وہ کل تمھاری باری ہے

مگر وہ مریض اس ہمدردی کی بالکل تاب نہ لا سکا۔ اُسے فوراً آکسیجن پہنچانی پڑی۔ اس ہمدردی کا ایک فائدہ تو ہوا کہ آپریشن ٹل گیا۔ اور وہ بعد میں بغیر آپریشن ہی کے اچھا بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر کی کچھ نہ چلی۔ سچ ہے جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

ڈاکٹروں کو آرٹیکل ۱۳ کے تحت، غلط تشخیص کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا آرٹیکل ۱۵ کے تحت نجومیوں کو غلط پیشین گوئی کرنے کا۔ نجومی جتنے یقین سے آپ کے گزرے ہوئے حالات بتا سکتا ہے ایک ڈاکٹر بھی آپ پر سے گزری ہوئی بیماریوں کے بارے میں اتنے ہی وثوق سے اظہارِ خیال کر سکتا ہے بلکہ عمدہ نسخے بھی تجویز کر سکتا ہے۔ جس نجومی کو حیرت ہوتی ہے کہ ہاتھ دکھانے والا شخص ایک حادثے میں مرتے مرتے کیسے بچ گیا ڈاکٹر کو بھی حیرت ہوتی ہے کہ مریض اپنی پچھلی بیماری ڈاکٹر کا علاج کروائے بغیر بھی کیسے محفوظ رہ گیا۔ اللہ کی شان اسے کہتے ہیں۔

وہ ڈاکٹر جنھیں علاج کرنے کی تو اجازت ہوتی ہے لیکن مریض سے فیس لینے کی اجازت نہیں ہوتی، یعنی تنخواہ پانے والے ڈاکٹر اس لحاظ سے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ وہ مریضوں سے فیس نہ سہی انتقام تو لے سکتے ہیں۔ مریض کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ نبض چل رہی ہے تو وہ اسی طرح خوش ہوتے ہیں جیسے شکاری، شکار کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ (فرق یہ ہوتا ہے کہ شکاری کا نشانہ خطا ہو سکتا ہے)۔ یہ ڈاکٹر اپنے گلے میں ٹنگے ہوئے اسٹیتھسکوپ کو اپنے کانوں میں لگائے بغیر مریض کے سینے پر رکھ دیتے ہیں۔ تنخواہ پانے والے ڈاکٹروں کو نسخہ لکھنے کے لیے کانوں سے اسٹیتھسکوپ لگانا ضروری بھی کب ہے۔ ایک ڈاکٹر کی تو یہ رائے ہے کہ اسٹیتھسکوپ والا طریقہ بدلا جانا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر اور ٹیلی فون آپریٹر میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ یہ ڈاکٹر صاحب مریض کے سینے سے اپنا کان لگا دیتے ہیں۔ ان کے ساتھیوں نے انھیں گوش بر آواز ڈاکٹر کا نام دے رکھا ہے۔ یہ طریقہ ان ڈاکٹر صاحب نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر ایجاد فرمایا تھا لیکن ان کے پاس سب مریض ہی جاتے ہیں مریضہ کوئی نہیں جاتی۔ آدمی کچھ سوچتا ہے قدرت کچھ اور سوچتی ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں جب لوگ اپنی صحت کی طرف سے غافل رہتے تھے ان کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی رہتی تھی۔ مثال کے طور پر بادشاہوں کا حال پڑھ لیجیے۔ بہت کم بادشاہ ہوں گے جو بیماری سے مرے ہوں گے۔ ان میں سے بہتوں کو تو قتل کرنا پڑا۔ ایک بادشاہ۔ غالباً قطب الدین ایبک اپنی صحت کی وجہ سے اچھا خاصا اسپورٹسمین تھا۔ وہ گولف کھیلتے کھیلتے مرا۔ (گولف اور چوگان میں پندرہ بیس کا فرق ہے)۔ بادشاہ لوگ اصل میں مطلق العنان ہوا کرتے تھے۔ کس ڈاکٹر کی مجال تھی کہ بادشاہ کو مار سکتا۔ رائل فزیشین اس زمانے میں بھی ہوا کرتے تھے لیکن اتنے فن داں نہیں تھے۔ رہا عوام کا معاملہ تو عوام اول تو تعداد میں بادشاہوں سے کم ہی تھے اور وہ بھی بیماریوں سے مرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مرنا تو ایک طرف رہا لوگ بلا کسی وجود کے پیدا ہو جاتے تھے یعنی صحت کا یہ عالم تھا کہ آدمی پیدا ہوئے بغیر بھی زندہ اور خوش و خرم رہ سکتا تھا۔ مُلّا دو پیازہ اسی طرح زندہ رہے۔ (معلوم نہیں ملّا دو پیازہ کی وفات کا سہرا کس طبیبت کے سر ہے)۔ اور آج آدمی کی صحت کا یہ عالم ہے کہ اس کے ایک ایک عضو کی نگرانی کے لیے علاحدہ علاحدہ اسپیشلسٹ درکار ہیں۔ کوئی کان کی دیکھ بھال کر رہا ہے تو کوئی فقط اس کی بصارت کا درپے ہے۔ ڈاکٹروں نے بھی سیاستدانوں کے نقشِ قدم پر چل کر، مریض کے جسم کے حصے بخرے کر لیے ہیں اور اپنی اپنی پسند کے مطابق مقبوضات بنا لیے ہیں۔ ایک صاحب تو کہتے ہیں کہ مجھے کمان کی سیدھی آنکھ میں تکلیف ہوئی تو وہ ایک آنکھ کے ڈاکٹر یعنی آنکھوں کے ایک ڈاکٹر کے

باقی صفحہ ۲۱ پر دیکھئے

سلطان احمد اصلاحی

مدرسۃ الاصلاح کی علمی اور سماجی خدمات

ہر قوم کی تاریخ میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جو اس کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ یہی کچھ حالات تھے جن سے آج سے تقریباً ساٹھ پینسٹھ برس پہلے ہماری قوم دوچار تھی۔ اس میں اس کے دانشوروں نے اپنی اپنی فہم کے مطابق ملت کی اصلاح اور اس کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے اپنے اپنے انداز میں مختلف کوششیں کیں ——
مدرسۃ الاصلاح بھی ان حالات میں اسی طرز کی ایک کوشش تھی، مگر ایک ممتاز کوشش، کہ اس کی فکری بنیادیں قرآن و سنت کے دیے ہوئے اصولوں پر استوار تھیں۔ چونکہ کسی بھی تحریک یا ادارے کی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے اس کے قیام کی غرض و غایت سے ازبس واقفیت ضروری ہے اس لیے پہلے ہم مدرسۃ الاصلاح کے قیام کے مقاصد اور اس کی فکری بنیادوں کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس کے بعد انشاء اللہ اس کی علمی اور سماجی خدمات کا بھی جائزہ لیں گے۔

حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی رح جو مدرسے کے فکری بانیوں میں سے ہیں، مدرسۃ الاصلاح کے متعلق جو تصور رکھتے تھے اسے علامہ فراہی رح کے نام ایک خط میں یوں واضح فرماتے ہیں: "کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسے میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کے نظم و نسق کو درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی، قناعت اور مذہبی خدمت اس کا مطمح نظر ہو۔" (مکاتیب شبلی جلد ۲ ص ۳۳)۔ اپنے اس تصور کو علامہ فراہی رح کے نام ایک دوسرے مکتوب میں اس طور سے پیش کرتے ہیں: "اس کو (یعنی مدرسۂ سرائے میر) دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام الدین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلا تعلیم بھی دلائی جائے گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، پرنسپلی اور بخشش قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔" (مکاتیب شبلی جلد ۲ ص ۴۷)۔ علامہ حمید الدین فراہی رح، جنھوں نے علامہ شبلی نعمانی رح کے اشارے پر دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کو خیرباد کہہ دیا اور آخر دم تک مدرسۃ الاصلاح کی بحیثیت ناظم خدمت انجام دیتے رہے، نے علامہ شبلی رح کے خیالات کو اور وسعت دی چنانچہ وہ مدرسے کے قیام کی غرض و غایت اس طور سے واضح فرماتے ہیں:
"اصل مقصد اس مدرسے کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔" اس کی مزید تفصیل وہ اس طور سے کرتے ہیں: الف: قرآن و حدیث و فقہ و ادب عربی کی طرف شدت اعتنا۔ ب: اصل علم اور قابلیت کو مطمح نظر رکھنا کسی محدود نصاب کتب کو، بالخصوص قرآن مجید و متون حدیث۔" اس کے علاوہ اس مدرسہ کے متعلق فکری حیثیت سے جو باتیں ان کے پیش نظر تھیں وہ یہ تھیں: قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا بنیادی نصب العین ہو، اس کے بعد حدیث اور فقہ پر زور دیا جائے۔ منطق، فلسفہ، علم کلام کی غیر ضروری کتابیں نصاب سے نکال دی جائیں اور ان کی جگہ ادب عربی کی تعلیم دی جائے، حدیث کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو،

فقہ میں فقہ اسلامی پڑھایا جائے تاکہ طلبا میں وسعتِ نظر اور رواداری پیدا ہو۔ تکفیر و تفسیق اور فضول مذہبی مناقشات کا کوئی ولولہ ان کے اندر نہ ابھرے، صرف و نحو کی تعلیم عملی ہو، فنون کی تعلیم میں اُمّہاتِ فن پیشِ نظر رہیں۔

۲۔ یہ مدرسہ اہلِ سنت والجماعت کے مختلف مذاہب کا سنگم ہو، یہاں حنفی و اہلِ حدیث دونوں رہیں، ندوی اور دیوبندی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریقے پر شیر و شکر ہو کر رہیں، اور مسلمانوں کے فضول اختلافات کو مٹا دیں۔

یہ ہیں وہ بنیادی مقاصد جن کو بروئے کار لانے کے لیے مدرسۃ الاصلاح وجود میں آیا تھا۔ آئیے اس کے انقلابی تصور کے آئینے میں، اس کی علمی اور سماجی خدمات کا جائزہ لیں۔ مدرسۃ الاصلاح کی علمی خدمات کو ہم مندرجہ ذیل عنوانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف: دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں ایک ہمہ گیر انقلاب۔

ب: الاصلاح کا اجرا اور ہندوستان میں اس کے اثرات۔

ج: دائرہ حمیدیہ اور اس کی خدمات۔

الف: دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں ایک ہمہ گیر انقلاب: مدرسۃ الاصلاح کی سب سے پہلی خدمت دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں ایک ہمہ گیر انقلاب ہے لیکن اس انقلاب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کا جائزہ لینا ضروری ہے جس میں یہ انقلاب نمودار ہوا۔

انقلاب اور اس کا پس منظر: مدرسۃ الاصلاح جس وقت وجود میں آیا اس وقت دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کا حال حد درجہ عبرتناک تھا۔ نصاب کی جدولیں منطق و فلسفہ اور علم کلام کی لایعنی کتابوں سے اٹی ہوئی تھیں اور انھیں کی باریکیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کو دینی تعلیم کا مقصدِ وحید سمجھا جاتا تھا، اس کے برخلاف قرآن مجید جسے ہماری تمام تر توجہات کا مرکز ہونا چاہیے تھا، وہ تقریباً متروک و مہجور سمجھا جاتا تھا۔ اس کے سمجھنے کے لیے صرف تبرک کے طور پر تفاسیر جلالین و بیضاوی کے چند پاروں کی سرسری تلاوت کافی سمجھی جاتی تھی اور استدلال یہ تھا کہ ہمارے اسلاف کرام نے قرآن کی تمام باریکیوں اور گتھیوں کو سلجھا کر اپنی تفسیروں اور فقہ و حدیث کی کتابوں کی شکل میں ہم تک منتقل کر دیا ہے، اب ہمارے لیے انھیں کے چلائے ہوئے راستے کا اتباع لازمی ہے۔ اگر ہم اب اپنے تئیں قرآن مجید میں غور و فکر کریں گے اور نعوذ باللہ اپنے فکر و تدبر کے نتیجے میں کسی ایسی رائے تک پہنچیں گے (خواہ یہ رائے سیاق و سباق، نظم و کلام اور روح قرآن سے حد درجہ ہم آہنگ کیوں نہ ہو) جسے بدقسمتی سے سلف صالح نے اپنی کتابوں میں پیش نہیں کیا ہے تو ہم تفسیر بالرائے کے ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کریں گے اور دین میں ایک بدعتِ سیئہ کا اضافہ کریں گے۔ پس اب ہمارے لیے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی لکھی ہوئی چند مخصوص تفسیروں کا برائے نام مطالعہ کریں، اور یہ بھی محض ثواب و برکت کے لیے کہ اب قرآن میں غور و فکر سے بے نیاز ہیں۔ ہمارے اسلاف نے قرآن میں تدبر کر کے اس کے جملہ علوم کو حدیث، فقہ اور تفسیر کی کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے اور اب ہمارے لیے بس انھیں کا مطالعہ کافی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا نصابِ تعلیم کی جدولیں منطق و فلسفہ کی لایعنی کتابوں سے بھری پڑی تھیں لیکن ادبِ عربی خصوصاً ادبِ جاہلی کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ جب کہ ادبِ عربی خصوصاً ادبِ جاہلی قرآن فہمی کی کلید ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی دور کی تصنیف کو اس وقت تک کما حقہٗ نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ اس کے دورِ تصنیف کے ادبیات کا گہرا مطالعہ نہ ہو، اس لیے کہ ہر دور کا اسلوبِ کلام اور طرزِ بیان مختلف ہوا کرتا ہے اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بھی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر کسی بھی مسلمہ کتاب کا مطالعہ اس کے دورِ تصنیف کے گہرے مطالعے کے بغیر کیا جائے گا تو یہ تو ممکن ہے کہ سادہ طور پر اس کا ترجمہ کر لیا جائے ایک حد تک اس کے مفہوم سے آشنائی حاصل کر لی جائے لیکن اس کے بغیر اس کی باریکیوں تک پہنچنا اور اس سے کما حقہٗ استفادہ کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح زینے کے بغیر کسی بلند و بالا چھت پر پہنچنے کا تصور کرنا۔ اور خصوصاً ایک ایسی

کتاب کا مطالعہ جو نہ صرف اپنے مضامین و احکام کے اعتبار سے اپنا کوئی
نظیر نہیں رکھتی بلکہ فصاحت و بلاغت، جدّت اسلوب اور طرزِ ادا کی
ندرت کے لحاظ سے بھی اس مقام پر فائز ہے جس سے بلند مقام کا تصور
نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے اس چیلنج کا، کہ اگر یہ کتاب (قرآن مجید) غیر اللہ
کی طرف سے ہے تو اس جیسی ایک سورہ بھی پیش کر دی جائے، دنیائے
انسانیت اب تک جواب نہیں دے سکی۔ اور آج کی دنیا کو چھوڑیے
اس چیلنج کا جواب اس کے دَورِ نزول کے وہ فصحا و بلغا بھی نہ دے سکے
جن کی طلاقتِ لسانی اور جن کی ادبی برتری کے شاہکار معلقات
کی اہلِ عرب پرستش کرتے تھے، وہ قرآن کی شدّتِ تاثیر، بے پناہ
مقبولیت اور ناقابلِ تردید اثر انگیزی کو دیکھ کر اسے جادو کا نام دینے
پر مجبور ہو گئے تھے۔

حدیثِ نبوی اس بات کی مستحق تھی کہ اس کا مطالعہ قرآن
کی روشنی میں غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کیا جائے
اور ہر طرح کی جماعتی عصبیت سے آزاد ہو کر اس سے احکام مستنبط
کیے جائیں لیکن دوسرے علوم کی طرح اس علم شریف کا حال کچھ بہتر
نہ تھا۔ ہر جگہ ان کی تعلیم قرآن سے آزاد ہو کر جماعتی عصبیت کے تحت
دی جاتی تھی۔ ہر مقلد احادیثِ نبوی کے مجموعے کو اپنے امام مجتہد کی
تخریجات کی صدائے بازگشت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا
زور صرف کر دیتا تھا اور آزادئ ضمیر، حقیقت پسندی اور غیر جانبداری
جیسی شریف قدروں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مزعومہ خیالات کی
وکالت میں پورے مجموعۂ احادیث پر ہلّا بول دیتا تھا۔ اور اپنے اس
طرزِ عمل سے وہ امّت کے اختلافات کو ختم کرنے کے بجائے ان کی
خلیج کو اور وسیع کر دیتا تھا۔ اور یہ فریب خوردہ شاہین اپنی خودفریبی
کو عزیمت کا نام دینے کے لیے اس طور سے تسکین حاصل کر لیتا تھا کہ
اس امّت کا اختلاف رحمت ہے اور اس اختلاف سے بنائے لعنت
کی بنیادیں متزلزل ہونے کے بجائے اور زیادہ پائیدار ہو رہی ہیں۔

فقہ اسلامی کے سلسلے میں صرف ایک ہی مکتبۂ فکر کی تعلیم دی
جاتی تھی اور وہ بھی جماعتی عصبیت کے تحت۔ اور دوسرے مکاتب
کی فقہوں پر وہی لے دے اور وہی دھینگا مشتی ہوتی تھی جس کا ذکر
ابھی ابھی حدیثِ نبوی کے سلسلے میں ہو چکا ہے اور جس سے قوم کے
علما کے درمیان یگانگت اور رواداری کے بجائے بیگانگی اور جماعتی
عصبیت جنم لے رہی تھی اور جس سے اسلام کے کاز کو زبردست
نقصان پہنچ رہا تھا۔

صرف و نحو کی تعلیم کا حال اس سے بھی ابتر تھا۔ ابتدا ہی سے
طالب علم کو صرف و نحو کی متعدد کتابیں رٹائی جاتی تھیں اور کتابیں بھی وہ
جو عموماً غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے اجنبی اور نامانوس ہوتی تھیں۔
اور ابھی وہ اس وادئ پُرخار سے نکلنے بھی نہ پاتا تھا کہ اس پر منطق و فلسفہ
کا سنگِ گراں لاد دیا جاتا تھا حالانکہ جس طالب علم کے اندر ابھی عبارت فہمی کی
صلاحیت بھی نہ پیدا ہو سکی تھی اُسے صغرا و کبرا کی بھول بھلیوں میں پھنسا
دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے طالب علم صرف و نحو کی عملی مشق سے محروم رہ
جاتا تھا اور نتیجتاً یہ ہوتا تھا کہ فن کی مشکل اور زبان کی غرابت دونوں
ایک ساتھ مل کر طالب علم کو اصل فائدے سے محروم کر دیتی تھیں اور
وہ آخر تک عربی پڑھنے، لکھنے اور بولنے میں خام رہ جاتا تھا۔ نصابِ
تعلیم کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں مدرسۃ الاصلاح نے مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

۱۔ قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اور عملاً
اس کی مرکزی حیثیت کو سامنے لانے کی کوشش:

مدرسۃ الاصلاح نے کہا کہ چونکہ قرآن ہمارے جملہ دینی علوم کی
اصل ہے اور اسے فطری طور پر آج بھی پوری امّت تسلیم کرتی ہے لہٰذا اس کی
محققانہ تعلیم ہونا چاہیے۔ صرف سرسری طور پر اس کے ترجمے پر اکتفا نہ کیا جائے
بلکہ اس کے حرف حرف پر غور کیا جائے۔ اس کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے
کسی خاص تفسیر ہی کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے بلکہ اس کے لیے سلف صالح
کے جملہ ذخیرۂ تفسیر سے استفادہ کیا جائے، اور وہ بھی اس طور سے نہیں کہ

قرآن کی کوئی مشکل سامنے آئی نہیں کہ تفسیروں کو چھاننا شروع کر دیا بلکہ اس کے لیے پہلے خود متعلقہ مسئلے میں قرآن پر اس کے سیاق وسباق کی روشنی میں غور کیا جائے اور اس سلسلے میں قرآن فہمی کے جملہ وسائل نحو بلاغت ادب خصوصاً ادب جاہلی وغیرہ سے بھرپور استفادہ کیا جائے اور خصوصیت کے ساتھ نظم کلام کے رشتے کو ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا جائے اس لیے کہ یہی ایک چیز ہے جو ہمیں غلطیوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے، یہی ایک سر رشتہ ہے جو بعید از امکان اور دُور کی تاویلوں سے بچا سکتا ہے اس لیے کہ جب بھی ایک آیت یا آیتوں کے کسی مجموعے پر سورہ کے مرکزی مضمون (عمود)، نظم کلام اور سیاق وسباق کی روشنی میں اہلِ عرب کے اسلوب کلام اور ان کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے غور کیا جائے گا تو عموماً موقع کلام خود بخود اس آیت یا آیت کے اس مجموعے کے مفہوم کی تعیین کردے گا، اس لیے کہ غلطی عموماً اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ لوگ ایک آیت کو اس کے ماحول سے بالکل الگ کر لیتے ہیں اور پھر اس کے مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نظم کلام اور سیاق وسیاق کے سر رشتے کو چھوڑنے کے لازمی نتیجے کے طور پر غلط تاویلیں کر جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی کلام کو اس کے ماحول اور سیاق وسباق سے جدا کر لیا جائے گا تو لازماً اس کے مفہوم کی تعیین مشکل ہو جائے گی اور ہر آن یہ احتمال باقی رہے گا کہ کہیں مفہوم کچھ سے کچھ نہ ہو جائے۔ چنانچہ سلف صالح میں سے جن لوگوں نے اس کا لحاظ نہیں کیا ہے انھوں نے ان مواقع پر بھی جب کہ کلام صرف ایک ہی تاویل کا احتمال رکھتا ہے کس طرح دُور کے احتمالات پیدا کیے ہیں۔ مثال کے طور پر امام رازیؒ اپنی تفسیر میں محکم و متشابہ پر بحث کرتے ہوئے " اذا جاء نصر اللہ والفتح " کے متعلق لکھتے ہیں "یہاں "فتح" سے مراد فتح مکہ، فتح طائف، فتح خیبر، فتح عام، فتح علوم یا فتح معقولات ہے۔" (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر بحوالہ التکمیل فی اصول التاویل الامام الفراہیؒ ص ۲۰) جب کہ ایک متوسط درجے کے ذہن کا آدمی موقع و محل کو پیش نظر رکھ کر "فتح" کے معنی کی تعیین کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مدرستہ الاصلاح نے سلف صالح کی طرح "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کے اصول کو دانتوں سے پکڑ لیا کہ پہلے قرآن کی مشکلات قرآن ہی سے حل کی جائیں کیوں کہ قرآن میں ایک حکم ایک جگہ مجملاً بیان ہوا ہے، دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے، ایک بات ایک جگہ ابہام کے روپ میں کہی گئی ہے، دوسری جگہ اس نے تفسیر کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی سورہ قیامہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "ان علینا جمعہ وقرانہ ۰ فاذا قرأنٰہ فاتبع قرانہ ۰ ثم ان علینا بیانہ۔" اور عقلی طور سے بھی یہی بات قرین قیاس ہے جب کہنے والا خود اپنے اجمال کی تفصیل اور اپنے ابہام کی وضاحت کر رہا ہو تو پھر اس میں کسی دوسرے کے قال و قول کی کیا ضرورت؟ البتہ اس تلاش و جستجو کے بعد بھی اس کا کوئی اشارہ مخفی رہ جائے اور الجھن دور نہ ہو رہی ہو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی طرف رجوع کیا جائے کہ آپؐ کی زندگی قرآن کی چلتی پھرتی تفسیر ہے۔ اگر یہاں بھی تشفی نہ ہو رہی ہو تو صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ کے اقوال و اعمال کی طرف رجوع کیا جائے کہ یہ آپؐ کی سیرتِ پاک کے مقدس حاملین ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہ ہونے پائے کہ قرآن اصل ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے فرع ہے اس لیے اگر کہیں بظاہر اصل و فرع میں تضاد نظر آ رہا ہو تو صحتِ روایت پر اطمینان کر لینے کی صورت میں اسے اصل کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے، اور سچ تو یہ ہے کہ آپؐ کے ثابت شدہ اقوال و اعمال پر اگر قرآن کی روشنی میں غور کیا جائے تو عموماً ان کا ظاہری تضاد رفع ہو جاتا ہے، لیکن اگر خدانخواستہ تطبیق نہ ہو تو قرآن کے بیان کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی جائے گی اس لیے کہ قرآن اصل ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے فرع ہے۔

اور اس طویل فکری مجاہدے کے بعد غیر جانبدارانہ طور پر مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق اپنے تئیں آیت کے مفہوم کی تعیین کی جائے اور

پھر اطمینانِ قلب کے لیے تفاسیر سے رجوع کیا جائے۔ اگر اپنی رائے کی تقویت تفسیروں سے ہو جاتی ہو تو اس پر خدا کا شکر ادا کیا جائے اور اگر نہیں ہوتی تو مزید غور و فکر کا سلسلہ برابر جاری رکھا جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کسی صحیح تاویل تک رہنمائی فرما دے۔ چنانچہ فراہی اسکول نے قرآنی سلسلے کی جو تصنیفات کی ہیں ان سب میں ان اصولوں کی جھلک ملتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مولانا فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ان دنوں ان اصولوں کے مطابق جو تفسیر "تدبر قرآن" کے نام سے تیار کر رہے ہیں وہ اس سلسلے میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی تفسیری ذخیرے میں نظیر ملنی مشکل ہے۔ مولانا صدر الدین اصلاحی نے بھی "تیسیر القرآن" کے نام سے تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بعض اسباب کی بنا پر سورہ بقرہ کے آگے نہ بڑھ سکا اور چونکہ اس کے مخاطب عوام تھے اس لیے وہ بہت زیادہ محققانہ بھی نہ ہو سکا تھا تاہم مولانا نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھ دیا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ فہرست نامکمل رہ جائے گی اگر اس میں مولانا فراہیؒ کے دوسرے اہم ترین شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کا نام نہ لیا جائے جو اگرچہ اپنی بعض فطری کمزوریوں کی وجہ سے کوئی تصنیفی شاہکار نہ چھوڑ سکے تاہم انھوں نے اپنی درویشانہ زندگی میں خدمتِ قرآن کے لیے جو تلامذہ تیار کیے (مثال کے طور پر مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی، مولانا بدر الدین صاحب اصلاحی، مولانا جلیل احسن صاحب ندوی، مولانا داؤد اکبر صاحب اصلاحی، مولانا محمد یوسف صاحب اصلاحی، مولانا شہباز صاحب اصلاحی، مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی وغیرہ) ان کی بدولت انؒ کا نام ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

۲۔ حدیثِ نبوی کی غیر جانبدارانہ تعلیم : حدیثِ نبوی کی تعلیم کا جو عالم تھا اس کا ذکر اوپر گزر چکا۔ مدرسۃ الاصلاح کے نزدیک یہ چیز امت کے لیے حد درجہ ہلاکت خیز تھی اس لیے اس نے عملاً اس بات کی کوشش کی کہ حدیث نبوی کو قرآن کریم کی روشنی میں جماعتی عصبیت سے آزاد ہو کر پڑھایا جائے، اس لیے کہ جب ابتدا ہی میں ایک آدمی طے کر لیتا ہے کہ اسے ایک خاص مکتبۂ فکر کے خیال کی وکالت کرنی ہے تو غیر شعوری طور پر وہ فریق ثانی کی بہت سی ایسی باتوں کو جنھیں عام حالات میں وہ بلا چوں و چرا تسلیم کر لیتا محض اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اس کے مزعومہ خیال کے مطابق نہیں ہیں۔ اور پھر وہ اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ فریق ثانی کے استدلالوں میں بھی، جس کے متعلق یہ بہت ممکن ہے کہ اس کا ضمیر اس کی صحت کی شہادت دے رہا ہو، طرح طرح کے احتمالات پیدا کرتا ہے، اور احتمالات بھی ایسے جو عام حالات میں شاید اس کے خیال میں بھی نہ گزرتے۔ اور اس طرح وہ اپنے تنہا مجتہد کی لاج رکھنے کے لیے حدیث نبوی کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح نے کہا کہ یہ چیز حدیث نبوی کے ساتھ صریح ظلم ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں پڑھا جائے۔ اور جو بات عقل و فطرت، دیگر احادیث، روحِ اسلام اور مزاجِ شریعت سے قریب تر نظر آئے اور جس پر اس کا دل و ضمیر پوری طرح مطمئن ہو جائے اسے بلا چوں و چرا تسلیم کر لے قطع نظر اس سے کہ یہ کس امام کے موافق ہے اور کس کے خلاف۔ اس سے حدیثِ نبوی کے احترام کے ساتھ ساتھ علما کے درمیان جماعتی عصبیت کی جگہ یگانگت اور رواداری پیدا ہو گی جو ملت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

۳۔ کسی متعین فقہ کی جگہ فقہ اسلامی پر زور :

حدیثِ نبوی کی طرح فقہ اسلامی کے متعلق بھی مدرسۃ الاصلاح نے یہ کہا کہ اسے تقلیدِ اعمیٰ کی بندشوں سے آزاد ہونا چاہیے اور اس کے لیے طریقۂ کار کے طور پر اس نے یہ کہا کہ محض کسی ایک امام کی فقہ کو نہ پڑھایا جائے اس لیے کہ اس سے بھی علما کے درمیان گروہ بندی اور جماعتی عصبیت جنم لیتی ہے، بلکہ فقہ اسلامی پر زور دیا جائے۔ ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کی کتابیں پڑھائی جائیں تاکہ آپس کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو اور

امت کے درمیان اتحاد اور رواداری کی فضا پیدا ہو سکے ۔

۴ ۔ منطق کی غیر ضروری کتابوں کی جگہ ادب عربی خصوصاً ادب جاہلی پر زور :

نصاب تعلیم کے سلسلے میں مدرستہ الاصلاح کی چوتھی خدمت یہ ہے کہ اس نے منطق و فلسفہ کی غیر ضروری کتابوں کی جگہ ادب عربی خصوصاً ادب جاہلی پر زور دیا۔ اس لیے کہ قرآن مجید کو صحیح طور سے سمجھنے اور روح تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دوسرے کلیدی ذرائع کے ساتھ ساتھ ادب عربی خصوصاً ادب جاہلی سے بھرپور واقفیت ضروری ہے اس لیے کہ قرآن جن لوگوں میں نازل ہوا وہ اپنی دوسری امتیازی خصوصیات کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت میں بھی ایک نمایاں مقام کے مالک تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر جو کتاب نازل فرمائی وہ بھی اپنی دوسری خصوصیات کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی یہاں تک کہ اس دور میں بھی اسے، اس کی دوسری خصوصیات سے قطع نظر، فصاحت و بلاغت کا اعلاترین معیار سمجھا جاتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر مدرستہ الاصلاح نے منطق و فلسفہ کی غیر ضروری کتابوں کی جگہ، جو در اصل روح اسلام سے میل نہیں کھاتی تھیں، ادب عربی خصوصاً ادب جاہلی پر زور دیا جو قرآن کے اسالیب، اس کے طرز بیان اور اس کی روح تک پہنچنے کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا ہے ۔

۵ ۔ نحو و صرف کی تسہیل :

اس سلسلے میں نحو و صرف کی تسہیل مدرستہ الاصلاح کی اہم ترین خدمت ہے۔ کسی بھی اجنبی زبان کو سیکھنے کے لیے قواعد گرامر کی جو اہمیت ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ہندوستان کے اندر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، عربی قواعد کا حال افسوسناک حد تک غیر مفید تھا اس لیے کہ اس میں نحو و صرف کی متعدد نامانوس کتابیں، جن کی نامانوسیت عموماً اجنبی زبان میں ہونے کی وجہ سے اور بڑھ جاتی تھی، پڑھائی جاتی تھیں۔ اور عملی مشق سے گریز کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے طالب علم کے اندر آخر وقت تک لکھنے پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی تھی۔ مدرستہ الاصلاح نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے مولانا فراہی کی دو کتابیں اسباق النحو اوّل (مع تحفۃ الادب جو علامہ فراہی کی نادر تصنیف ہے جس میں انھوں نے نحو کے قواعد کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظوم کر دیا ہے اور جسے حفظ کر کے آدمی فن کی بڑی بڑی مطولات سے بے نیاز ہو سکتا ہے) ۲: اسباق النحو حصہ دوم، جو مادری زبان (اردو) میں لکھی گئی تھیں اور جدید طرز پر مرتب کی گئی تھیں، اپنے نصاب میں جاری کیں اور نحو و صرف کے قواعد کو ذہن نشین کرنے کے لیے عملی مشق کا راستہ اپنایا جس سے طلبہ کے اندر حیرت انگیز طور پر لکھنے پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ دوسرے حلقوں نے بھی اس فطری اور سہل ترین طرز کی افادیت محسوس کی اور ہندوستان کے بہت سے مدارس نے ان کتابوں کو داخل نصاب کر لیا اور مدرستہ الاصلاح کے تعلیم نحو کے طرز کو اپنا لیا، اور ان دنوں مدرستہ الاصلاح کے تعلیم نحو کے اسی طرز کے مطابق اسباق النحو حصہ اول کی روشنی میں مولانا محمد ایوب اصلاحی نحو کی ایک کتاب "تعلیم النحو" کے نام سے مرتب فرما رہے ہیں جس کے اب تک دو حصے منظر عام پر آچکے ہیں اور جس نے ہندوستان کے تمام ہی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور اس کی افادیت کو محسوس کیا ہے۔

ب : الاصلاح کا اجراء اور ہندوستان میں اس کے اثرات :

مدرستہ الاصلاح چونکہ فہم قرآن کے مرکز کے طور پر قائم کیا گیا تھا اس لیے اس نے اپنے فکر کی اشاعت اور اہل قلم کے اندر قرآن فہمی کے ذوق کو ابھارنے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے ۱۹۳۶ء میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی ادارت میں ماہ نامہ "الاصلاح" جاری کیا، جو اگرچہ اپنی مالی مشکلات کے باعث صرف چار سال (۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک) تک جاری رہ سکا، پھر بھی اس نے اپنے بیش بہا مقالات اور نادر مضامین کی بدولت پورے ہندوستان میں ہلچل مچا دی الاصلاح کے سیاسی مسلک سے اختلاف کی بہت کچھ گنجائش ہے تاہم

اس سے قطع نظر اس نے اہلِ علم کے اندر جو روح پھونکی اس کے نتیجے میں ملک کے گوشے گوشے سے فہم قرآن کے پروانے جوق در جوق مدرسۃ الاصلاح آنے لگے جس کا سلسلہ کم و بیش اب بھی جاری ہے۔ اور بہت سے اہلِ علم نے صرف الاصلاح کی بدولت اپنے ذہن کو فہم قرآن کی طرف موڑا اور اس سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ عبدالحق انصاری، اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی خدمات سے اہلِ نظر ناواقف نہیں ہیں۔

ج : دائرۂ حمیدیہ اور اس کی خدمات :

مدرسۃ الاصلاح چوں کہ ایک فکری ادارہ تھا جس کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو عموماً اور علما کو اور اہلِ علم طبقے کو خصوصاً قرآن کی صحیح دعوت سے آشنا کیا جائے، قرآن ہی کو محور بنا کر سارے علوم کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی جائے، قرآن ہی کی روشنی میں علوم قدیمہ کی تجدید کی جائے اور علوم جدیدہ کو اس کی آلائشوں سے پاک کیا جائے اس لیے اس نے اپنی دعوت کو عام کرنے اور اپنے فکر کو پھیلانے کے لیے "دایرۂ حمیدیہ" کے نام سے قرآنی تحقیقات کا ایک ادارہ قائم کیا جس نے اب تک بڑی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس نے ابتدا میں مولانا فراہیؒ کے اجزائے تفسیر عربی و اردو دونوں ہی زبانوں میں، اور فہم قرآن اور قرآن کے بعض اہم مسائل سے متعلق استاذ امامؒ کی بیش بہا تصانیف مثلاً "امعان فی اقسام القرآن" مع اردو ترجمہ "اقسام القرآن" "الرائ الصحیح فیمن ھو الذبیح" مع اردو ترجمہ "ذبیح کون ہے؟"، "فاتحہ نظام القرآن" مع اردو ترجمہ "مقدمہ تفسیر نظام القرآن"، "مفردات القرآن" وغیرہ شایع کیں۔ اور ان دنوں دایرے کے ڈائرکٹر مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی کی قیادت میں قرآن فہمی کے سلسلے کی بعض اہم تصنیفات مثلاً "دلائل النظام"، "التکمیل فی اصول التاویل"، "اسالیب القرآن" شایع کی ہیں۔ اور اب بھی پیہم کوشش کر رہا ہے کہ استاذ امامؒ کی دوسری غیر مطبوعہ تصنیفات جو مدرسے کے پاس مسودات کی شکل میں محفوظ ہیں جلد سے جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ علم کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں۔

فہم قرآن کے سلسلے کے علاوہ اس نے دوسرے موضوعات پر بھی بعض کتابیں شایع کیں جن میں مولانا فراہیؒ کے عربی و فارسی کے دیوان شامل ہیں۔

یہ ہے مدرسۃ الاصلاح کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ۔ آئیے اب ذرا اس کی سماجی خدمات کو جاننے کی کوشش کریں۔ مدرسۃ الاصلاح جن بنیادوں پر قائم ہوا تھا ان کا فطری تقاضا تھا کہ وہ صرف ایک علمی درس گاہ بن کر نہ جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی درس گاہ ہو جو اپنی ٹھوس علمی خدمات کے ساتھ ساتھ سماج کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی حد تک پوری جدوجہد کرے اس لیے کہ اس کے فکر کا لازمی تقاضا تھا کہ قرآن کی صحیح دعوت اور اس کے فہم کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ قرآن کی دی ہوئی بنیادوں پر عہدِ حاضر کے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ عصرِ حاضر کے فتنوں کا مقابلہ کیا جائے اور امت کے باہمی اختلافات کو قرآن و سنت کی صحیح بنیادوں پر ختم کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ جب یہاں کے فرزندوں نے اجتماعی زندگی میں حصّہ لیا تو وہ نچلے نہیں بیٹھے بلکہ اپنے فکر کے لازمی تقاضے کے طور پر تجدید و اصلاح کے مذکورہ بالا میدانوں میں بیش بہا خدمات انجام دیں جنھیں ہم غایت درجہ اختصار کے ساتھ مندرجۂ ذیل عنوانوں پر تقسیم کر سکتے ہیں :

۱۔ قرآن و سنت کی صحیح بنیادوں پر اسلام کی دعوت اور اجتماعی مسائل میں اس کی نمائندگی :

دین کے احیا اور سماج کی تعمیر کے سلسلے میں مدرسۃ الاصلاح کے نونہالوں نے سب سے پہلے قرآن کی صحیح دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ لاالٰہ الا اللہ کے کیا معنی ہیں اور شرک و توحید کی حقیقت کیا ہے، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے انھیں اپنی دو کتابوں "حقیقت شرک" اور "حقیقت توحید" میں بہ تمام و کمال واضح کیا۔ تقوا کسے کہتے ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں، اسلامی تصوف کیا ہے اور قرآن کی معروف اصطلاح "تزکیہ نفس" کی حقیقت کیا ہے اور

اس کے حصول کے وسائل کیا ہیں۔ مولانا اصلاحی نے ان حقائق کو بڑی اچھی طرح اپنی دو کتابوں "حقیقت تقویٰ" اور "تزکیۂ نفس" میں بیان فرمایا۔ نفاق کی کیا حقیقت ہے اور تحریک اسلامی کے لیے وہ کس درجہ خطرناک ہے اسے بڑی جامعیت کے ساتھ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی نے اپنی کتاب "حقیقت نفاق" میں واضح فرمایا۔ دین کی عمارت کن بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس کی وضاحت کے لیے انھوں نے اپنی شاہکار تصنیف "اساس دین کی تعمیر" مرتب کی۔ اجتماعیت کیا ہے اور اسلام میں اس کا کیا مقام ہے اس کا مدلل جواب انھوں نے اپنی کتاب "اسلام اور اجتماعیت" میں دیا۔ اس کے علاوہ معرکۂ اسلام و جاہلیت، دین کا قرآنی تصور، اسلام ایک نظریہ، فریضۂ اقامت، قرآن کا تعارف وغیرہ مولانا موصوف کی شاہکار تصنیفات ہیں۔

۲۔ عہدِ حاضر کے پیش آمدہ مسائل کا قرآنی حل تلاش کرنے کی کوشش :

سماجی خدمت کے سلسلے میں مدرسۃ الاصلاح کا دوسرا بڑا کارنامہ عہدِ حاضر کے پیش آمدہ مسائل کا قرآنی حل تلاش کرنا ہے۔ اس سلسلے میں بھی اس کے لائق فرزندوں نے بڑی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔ معاشی مسئلے نے اس زمانے میں جو اہمیت اختیار کرلی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی نے اس گتھی کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی کتاب "اسلامی نظام معیشت" میں سلجھایا ہے۔ انتخابات کی شرعی حیثیت کیا ہے اور مسلمانوں کے لیے اس میں شرکت کیسی ہے مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی نے اس کی بھرپور وضاحت "مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند کا لائحہ عمل" میں فرمائی۔ اسلامی ریاست کا شرعی ڈھانچہ کیسا ہوگا اور اس میں پیش آنے والے مسائل کا حل کیا ہے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنی بیش بہا تصنیف "اسلامی ریاست" میں کی۔ منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کے جو فوائد بیان کیے جاتے ہیں ان کی پردہ کشائی مولانا اصلاحی نے اپنی لاجواب تصنیف "عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ" میں کی۔ نیز اسلامی قانون و سیاسیات کے سلسلے میں مولانا موصوف نے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے۔

۳۔ عہدِ حاضر کے فتنوں کا مقابلہ :

عہدِ حاضر کے فتنوں کا مقابلہ مدرسۃ الاصلاح کی بڑی اہم سماجی خدمت ہے۔ ان میں سب سے سنگین فتنہ جو دراصل اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کردینے والا تھا انکارِ حدیث کا فتنہ تھا۔ اسلام کے نام نہاد نام لیوا جو دراصل اس کے ازلی دشمن تھے اپنے نفاق اور اسلام دشمنی کو قرآن کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کررہے تھے مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی نے بتایا کہ ان کی ہرزہ سرائیوں میں کتنا وزن ہے۔ آپ نے بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ کس طرح سنت نبوی دین کا لازمی جز ہے اور کس طرح اس کا انکار اسلام کے انکار کے مترادف ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مبارک تصنیف "دلائل السنن والآثار" ہر اسلام دشمن کا مسکت جواب ہے۔ انھیں فتنوں میں پردے کے انکار کا فتنہ بڑا زبردست فتنہ تھا جو دراصل اسلامی معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کردینے والا تھا۔ اہلِ مغرب اور مغربیت زدہ نام نہاد مسلمان اسے بڑے شد و مد کے ساتھ اصل دین کے بجائے دینِ ملّا کی ایجاد ثابت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بڑی خوبی کے ساتھ ان کی مغربیت زدگی کے پردے کو چاک کیا اور قرآن کے محکم دلائل سے ثابت کیا کہ پردہ دینِ اسلام کا اہم ترین جز ہے اور کس طرح اس کا انکار دین کی بنیاد کو ڈھا دینے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی بے مثال تصنیف "پاکستانی عورت دوراہے پر" شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش:

مسلمانوں کے باہمی اختلافات خصوصاً ان کے فقہی اختلافات کو ختم کرنا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، مدرستہ الاصلاح کے بنیادی مقاصد میں تھا۔ اس سلسلے میں مدرستہ الاصلاح کے فرزندوں نے کوئی دعندلی رہنمائی نہیں کی بلکہ پوری وضاحت کے ساتھ ایسے اصول پیش کیے جن کو سامنے رکھ کر بڑی آسانی کے ساتھ فقہی اختلافات کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی شاہکار تصنیف "اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل" اور مولانا صدرالدین اصلاحی کی کتاب "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ" (جو دراصل شاہ ولی اللہؒ کے گراں قدر رسالے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کا عکس ثانی ہے) بڑے کام کی چیزیں ہیں۔

سماج کی ان گوناگوں خدمات کے ساتھ ساتھ مدرستہ الاصلاح کے فرزندان باصفا جس طور سے برِاعظم ہند و پاک میں تحریک اسلامی کی پشتی بانی کر رہے ہیں وہ کسی بھی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں۔

یہ ہیں مختصراً مدرستہ الاصلاح کی علمی اور سماجی خدمات جن کے پیشِ نظر ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آنے والا مؤرخ مدرستہ الاصلاح کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس فکری درسگاہ کو ہمیشہ زندہ و پائندہ رکھے اور اسے اپنے مطلوبہ مشن تک پہنچنے کے لیے مزید وسائل مہیا فرمائے۔ اللھم آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بُری عادت ترک کرنے کے
ارادے کے ہمراہ
کسی اچھی عادت کی تعمیر میں منہمک ہو جاؤ۔ —
اعجاز دانش

واحد پردیسی

غزل

حیات پاتے ہیں ہم حادثات میں کھوکر
مثالِ صبح اُبھرتے ہیں رات میں کھوکر

ناآشنائے چمن زارِ دہر ہیں وہ لوگ
جو رہ گئے ہیں بیابانِ ذات میں کھوکر

ہم اپنے آپ کو اکثر تلاش کرتے ہیں
وفورِ شوق، ہجومِ حیات میں کھوکر

حصارِ یاس و اَلم میں گھرے ہیں ہم اکثر
غبارِ آرزو و خواہشات میں کھوکر

غموں کا دشت ملا ہے ہمیں بھٹکنے کو
رہِ خلوص، رہِ التفات میں کھوکر

اُنھیں کو کیفِ نشاطِ حیات حاصل ہے
جو جی رہے ہیں غمِ کائنات میں کھوکر

ہم اپنی طرزِ سخن ڈھونڈ لائے ہیں واحد
اساتذہ کے کئی کلیات میں کھوکر

آزاد گلاٹی

غزل

ہم نہ یوں پھرتے دربدر بابا
اپنی ملتی اگر خبر بابا

شہر کا شہر آج سُونا ہے
ایسے اُجڑا ہے ایک گھر بابا

ساتھ جس میں کسی کا چھوٹا تھا
ساتھ ہے اپنے وہ سفر بابا

راستوں پر بھٹک رہے ہیں بشر
اور ترستے ہیں بند گھر بابا

پاس اُس کے ہی رہ گئے ہیں ہم
جس کو آئے ہیں چھوڑ کر بابا

جوگیا جب بہن لیا ہے تو پھر
کیسا گھر، کیسی رہگزر بابا

کوئی سایا ہی ڈھونڈ لے پل بھر
سر پہ آئی ہے دوپہر بابا

جسم پر راکھ مل کے پھرتے ہو
راکھ دل کا ہوا نگر بابا

تیری کٹیا میں دیپ جلتا ہے
اپنے دل کی بھی ہے خبر بابا؟

اس کو کہتے ہیں زندگی، آزاد
یہ تو صحرا کا ہے سفر بابا

یوسف جمالؔ

غزلیں

(۱)

فردا کا ہاتھ تھام کے کہتی ہیں دھڑکنیں
امروز کی پھٹ جائیں نہ دکھتی ہوئی رگیں

سجتی ہیں دل کے شہر میں یوں حسرتوں کی ڈھیر[1]
جیسے کسی کی قبر پہ چڑھتی ہیں چادریں

ان نامرادلوگوں میں اپنا بھی ہے شمار
جو گردِ غم سے پا سکے اب تک نہ منزلیں

یوں سانس تیرے شہر میں لیتے ہیں آدمی
جیسے قفس میں روگی پرندوں کی صحبتیں

خوابوں کی دھول غول کی صورت میں اڑ گئی
یک لخت خشک کی گئیں ساری ملاحتیں

سارا لہو تو ذہن کا شکروں نے پی لیا
باقی ہے کیا جمالؔ جو ہم شاعری کریں

(۲)

اک جان ایک جسم ہے پھر بھی خیال دو
ہے اس سے اختلاف تو کوئی مثال دو

کرنی ہے جب خلوص کی بنیاد کھوکھلی
شیشے میں یغریت کا بس اک بال ڈال دو

رقاصہ ناچتی ہے بظاہر خوشی کے ساتھ
جو روپ اصل دیکھنا ہو غم کی تال دو

کرپائے یہ ادا نہ خوشی کا بیاض جب
مقروض غم کو دل کے مکاں سے نکال دو

ذہنوں کے مقبروں میں ہیں لاشیں ملال کی
پڑھ کر درود ان پہ بھی کچھ مٹی ڈال دو

ہے مصلحت فصیل روایت کی توڑ کر
تم بھی جمالؔ ادب کو شگفتہ جمال دو

[1] معیاری اُردو میں 'ڈھیر' بتلفظ طور پر مذکر ہے۔
(ادارہ)

۱۹ / اپریل ۱۹۳۸ء

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظامِ تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لیے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکرِ انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے گویا انسان نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گزار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست، نئی وضع کی معاشرت، معیشت کے طور طریق نرالے، تعلیم کے ڈھب انوکھے۔ تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھڑی جا چکی ہیں اور نئے نقشوں کے مطابق، بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیبِ نو کے قصرِ فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار، آئینہ بندی، حریر و اطلس کے نگاہ فریب پردے، بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالم تاب روشنی میں ایک رنگین دنیا، ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے، کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیئیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوش ربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیبِ نو کے اس جہانِ رنگ و بو میں کھویا کھویا اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو تجسسانہ نظر سے پرکھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے تو پہروں کسی فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اس کمالِ ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس جنون کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوشمندوں سے یکسر الگ کیے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنون کے اس نرالے امتزاج سے تہذیبِ جدید کے اس طلسم کدے کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جب کہ ساری فضا اس نظامِ تمدن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے، اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی موج کے ہلکورے نظر آ رہے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر لوٹتا ہے اور لبِ ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے کہ:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور یاد رکھو کہ:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سُننے والوں نے سُنا اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کہو بھائی! حیرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی، وہاں تہذیبِ نو کے "پری محل" کو بھی دیکھا! کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اٹھایا اور کہا کہ ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے لیکن

> حیرت خانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
> سُست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ شیشہ گرانِ فرنگ... اپنے کاخِ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا اسے بدستور حسرت کی نظر سے دیکھتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ تا آنکہ سنہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالم گیر دھماکا ہوا۔ دھماکا زلزلے کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں کی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستان بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور اس قصرِ جاہلیہ کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح بین نگاہوں نے اس ہوشمند دیوانے سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی پیشین گوئی تو غلط ثابت ہوئی۔ اس مردِ دانا کی آنکھوں میں تبسم کی لہر دوڑی۔ اور اب کے پہلے سے بھی نمایاں ہو کر دوڑی۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، حرف حرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنذیر ملی تھی، وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

> فتنہ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود
> دخترے ہست کہ در مہدِ فرنگ است ہنوز

سُننے والوں نے سُنا اور سُن کر اَن سُنی کر دی۔ مغرب کے قمقموں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقالی تھی۔ اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس مجذوبِ زیرک سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصرِ بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلابِ تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

> نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
> کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی بُراقی

> الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
> حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہو گئی۔ اور وہ مردِ زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغرب نے زمین پر جال بچھا لیا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پا لیا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلّط جما لیا، اس نے خشکی اور تری کو مسخر کر لیا۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیّا کر لیے۔ اُدھر یہ ہوتا گیا اور ادھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ وہ بیٹھا بیٹھا اس طرح چونک اٹھتا جیسے ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریتِ خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلابِ بلا بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر دُور افق سے اُس پار کچھ دیکھتا، اور بے ساختہ چلا اٹھتا کہ:

> شفق نہیں مغربی اُفق پر، یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے!
> طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

> وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو!
> اُسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ!

وہ دیکھو! :-

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا۔ وہ عالمِ پیر مر رہا ہے!
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

وہ راتوں کی تنہائیوں میں دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے باتیں کرتا، کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محوِ تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے، دُور شہر کی اس محفلِ شعر و شراب کی چکاچوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعثِ گرمیٔ کائنات سمجھ رکھا تھا تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار اٹھتا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے۔
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!

گیا دورِ سرمایہ داری گیا۔
تماشا دکھا کر مداری گیا!

ایک حجازی قافلہ پاس سے گزر رہا تھا۔ سالارِ کارواں نے اس تماشے کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ تمھیں دکھائیں کہ اس تہذیب نے ہمارے عروقِ مُردہ میں کس طرح ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے۔ اس نے اس سادہ لوح میرِ کارواں کی بات سُنی اور ہنس کر کہا کہ ارے نادان!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اُس نے پوچھا کہ پھر ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

آنچہ بود ست و نباید زمیاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کے لیے پھر کیا کرنا چاہیے؟ جواب ملا کہ

اگر در دلِ جہانِ تازۂ داری بروں آور
کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتادہ است

اُس نے سمجھا کہ شاید دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے۔ لیکن اس مردِ دانا نے کہا کہ نہیں:

من از ہلال و چلیپا دگر نمی اندیشم
کہ فتنۂ دگرے در ضمیرِ ایام است

اُس نے کہا مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قاہری گرفت میں لیے بیٹھے ہیں۔ اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے؟ مردِ قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست لیکن

پانی بھی مسخّر ہے ہوا بھی ہے مسخّر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مغرب جو اس قدر بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ وہ شوکت و سطوت، غلبہ و تسلط، استیلا و قہرمانی کے اس بحرِ متلاطم کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کر لیتا کہ کہنے والا سچ کہتا ہے لیکن کہنے والا کچھ ایسے جزم و یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے ایک فلم چل رہا ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت، تیرا استعجاب درست! لیکن جو میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیٔ تدبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سُننے والے نے سننے کو تو سنا ان باتوں میں لذت وجاذبیت بہت تھی
لیکن اسے محض "شاعری" ہی سمجھا، اور داد سخن دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے
جاتے جاتے بھی اس مرد قلندر نے اسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو
شاعری نہ سمجھو۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑکر دیکھے بغیر آگے
بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا:

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دِگر انگیزی

دنیا اپنی روش پر بدستور چلتی رہی۔ تہذیب مغرب اپنے پورے
شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا
تھا۔ لیکن یہ فقیر کج کلاہ برابر اپنی بات کو دہرائے جا رہا تھا کہ

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کبھی کبھی سمجھ میں یہ معمّا نہیں آتا تھا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی
بنا پر اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے۔ لیکن کسی کی سمجھ
میں آئے یا نہ آئے یہ مغنی آتش نفس خلوت و جلوت اور بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ
اپنے پیغام کو پہنچائے جا رہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا
حدیثِ دل بزبانِ نگاہ می گویم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم
سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں!
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور وہ زیادہ کاوش سے بات کرنے
کی کوشش کرتے تو یہ خم کدۂ حجاز کا متوالا یاران میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کم تر گو
ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

متجسس طلوب ہے تو وہ اس شانِ دلربائی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد
اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا
کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جو فروش
از تو شیخ و برہمن اندر خروش
حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد
با تو غیر از فکرِ چنگیزی نداد
مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست
باش! تا بینی کہ انجامِ تو چیست

وہ اس قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ
ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔
لوگ قریب تر ہوتے تو وہ ذرا اور دُور ہو جاتا کہ اپنا محرم راز کسی کو نہ
پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا۔ لیکن غیر سے
کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسمِ
پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور
دعائیں مانگتا کہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں!!

وہ زمانہ کی بے کیف گردشِ دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالقِ فطرت سے اپنے عجیب مجذوبانہ انداز میں کہتا کہ

طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نواز کی نوا میں تلخی اور لَے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا۔ وہ اب حقایق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں پہلے اس کے عالمِ تصوّر میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں۔ اب وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا کہ ؎

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ۔ ارمغانِ حجاز ۔ آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے :

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحبِ خرد و جنوں اس تہذیب کے مآل سے دنیا بھر کو آگاہ کیے جا رہا ہے لیکن دنیا کی وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سنا اور پھر اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئی۔ زمانہ یوں ہی گذرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں اِدھر اُدھر اڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا بابا! خیر تو ہے؟ آج یہ بے کلی اور بے چینی کیوں ہے؟ کہا کہ تمھیں کیا بتاؤں! اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ ورنہ یاد رکھو کہ طوفانِ بلا انگیز میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاؤ گے ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سنا اور حسبِ دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً محفلِ رقص و سرود میں محوِ کیف و سرور رہے۔ آخرِ شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا گویا زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں اِدھر اُدھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ مشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصوّر میں بھی نہ آتا تھا کہ یہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان، زلزلے کے جھٹکے، یہ مکان گرا، وہ دیوار ٹوٹی، باہر تیز و تند بارش، اندر تباہی و بربادی، سامنے ڈزنگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب امنڈا چلا آ رہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لیے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ مردِ دانا کیا کہتا تھا۔ اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیر کی کٹیا کی طرف لپکے کہ اسی دانائے راز سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی کوئی بھی صورت ہے۔ بھاگے بھاگے کٹیا پر پہنچے لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مردِ درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشقِ محمدی کی شرابِ کوثر چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے پروں سے لکھا تھا کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید!
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(بشکریہ طلوعِ اسلام ۔ اپریل مئی ۱۹۴۳ء)

خوشخبری

لاری اور ٹیکسی ڈرائیوروں کے لیے

ہم نہایت فخر و انبساط کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ
ہمارے یہاں ہر قسم کے ڈیزل انجن
اور ان کے نوزل
نہایت واجبی داموں پر
تسلّی بخش طریقہ پر مرمّت کیے جاتے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی ہر قسم کی بیٹریوں کی فری سروس بھی مہیّا ہے۔

علاوہ ازیں ایکسائڈ بیٹری ہر وقت تیار ملے گی۔

آرک بریزز
پرائیویٹ لمیٹڈ

قائم شدہ: ۱۹۴۴ء

آفس:-
۸۴ فارس روڈ - روبرو میونسپل ورکشاپ
بمبئی نمبر ۸
۳۷۸۸۹۸ — فون — ۳۷۴۴۴۳
نمبرس

ورکس اور شوروم
۲۰ زکریا بندر روڈ
کاٹن گرین ریلوے اسٹیشن - بمبئی ۳۳
۳۷۸۴۴۱ — فون — ۳۷۲۲۳۲
نمبرس

گرامس: "آرک بریزز"

شری اجات شترو
ترجمہ : امین تابش

(ہندی طنزیہ)

کون سا امین سایانی ؟

جو بھی اسٹیشن لگاتا ہوں وہیں ایک امین سایانی بیٹھا ہے۔ کبھی کبھار بی۔ بی سی لندن لگاتا ہوں لیکن وہاں بھی جو اناؤنسر انگریزی بولتا ہے وہ مجھے امین سایانی لگتا ہے۔ اس دوران ریڈیو پر اتنے امین سایانیوں کو سن چکا ہوں کہ اگر ریڈیو بند بھی ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ امین سایانی بول رہا ہے۔

اکثر نیند میں چونک پڑتا ہوں۔ بیوی پوچھتی ہے "کیا ہوا ؟" میں کہتا ہوں امین سایانی نے آواز دی۔ بیوی کچھ نہیں کہتی۔ نظر اتارتی ہے "چمک دیا اتارتی ہے" اور سو جاتی ہے۔

سوچتا ہوں اب جو پرماتما کا اوتار ہوگا اس کی شکل و صورت چاہے جیسی ہو آواز ضرور امین سایانی کی ہوگی۔

پرماتما شنکھ، چکر، گدہ اور تخت سمیت دلّی میں نمودار ہوں گے اور پارلیمنٹ کے سامنے کہیں گے "...... حکم ہے ...... پرتھا پارلیمینٹریں جمہوریت کو نیست و نابود کر دیں گے۔"

اُس وقت ہمارے Ministers کیا کریں گے ؟ کیا اپنے ہی ہاتھوں مرنا پسند کریں گے ؟ ہاں یہ ضرور پسند کریں گے۔ امین سایانی کی آواز انھیں بھی پیاری ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی بناکا پروگرام سنتے رہے ہیں۔

مجھے ایک طرح کا شبہ بھی ہے، وہ یہ کہ اگر ایشور نے جنم لیا اور آواز امین سایانی کی نہیں لی تو حفاظت یا بچاؤ کا کام اد ۔ دل رہ جائے گا۔ میں اب یہ ماننے لگا ہوں کہ امین سایانی نام کا آدمی پرماتما سے بھی بڑا ہے۔ تین چار امین سایانیوں کو تو میں روزانہ سنتا ہوں ...... "یہ آکاش وانی کا بیچ رنگی پروگرام وودھ بھارتی ہے"۔ اس میں جو اشتہاروں کا پروگرام ہے، اس میں ایک نقلی امین سایانی ہے۔ ویسے تو اُس کی آواز بھی کافی اچھی ہے مگر وہ پرائے امین سایانی کی آواز لادے پھرتے ہے۔ مجھے ہنسی بھی آرہی ہے کیونکہ یہ غریب نہ خاص امین سایانی بنا نہ عام سایانی بلکہ صفر سایانی بن کر ایک اچھے بھلے اناؤنسر امین سایانی میں کھپ گیا۔

ایک امین سایانی اور ہے۔ اُس کا نام ہے منوہر مہاجن۔ یہ ریڈیو سیلون سے بولتا ہے۔ طنز نگار نے ادھر ریڈیو لگایا اور اُدھر سے بناکا کی لہجے میں آواز آئی "منوہر مہاجن کا سبھی سننے والوں کو...... نمسکار" اور ہم نقلی امین سایانی کو سننے لگتے ہیں۔ میں ان تمام امین سایانیوں سے تنگ آچکا ہوں۔ میں صبح ہی صبح اُن کی اپنی آواز سننا چاہتا ہوں مگر اُن کی اپنی آواز کہاں ہے، جو کچھ بھی تھی وہ امین سایانیات ہو گئی ہے۔

یہ بات کھٹکتی ہے کہ اس ملک میں بناکا پروگرام دینے والے سے لے کر ملک کے رہبروں تک کی نقل ہوتی ہے۔ گاندھی جی کے Pattern پر کتنے گاندھی پیدا ہو گئے، دلدل میں دھنسا گیا ہے۔ لوہیا کے Pattern پر بھی کتنے ہاتھ سکول سکنڈ ...

لوہیا بن گئے ہیں۔ دُنیا جانتی ہے اس این سایانی نام کی مادّی بنیاد پر کتنی بھلی چیزیں این سایانی بن گئیں۔ حیرت ہے۔

ایک لفظ ہے Fanaticism (تعصّب) جو اپنے یہاں پایا جاتا ہے۔ وطن پرستی کے نام پر یہ لفظ بہت چلتا ہے، علاقائیت کے نام پر بھی یہ لفظ بہت چلا۔ فرقہ واریت کے روپ میں تو یونیورسٹیوں میں گھس گیا ہے اور جم کر بیٹھ گیا ہے۔ یہی تعصّب اب آکاش وانیوں پر اُتر آیا ہے۔ ہر اناؤنسر این سایانی بن گیا ہے۔

بے چارا اصلی این سایانی صرف بناکا اور ایک دو پروگراموں میں آتا ہے مگر اس کے سستے ایڈیشن ہر پروگرام، ہر اسٹیشن سے آرہے ہیں۔

اپنے پاس دودھ بھارتی این سایانی ہے، سیلونی این سایانی ہے، مراٹھا این سایانی ہے، سوشیل گیدرنگ این سایانی ہے اور گھوڑا چھاپ بیڑی این سایانی ہے۔

اور تو اور ایک پروفیسر صاحب بھی این سایانی کے انداز میں پڑھتے ہیں اور ان کے طلبہ بھی این سایانی کے لہجے میں سوال پوچھتے ہیں۔ کتنا اچھا منظر ہے۔

اور ..... مستقبل کے این سایانیوں کے موضوع پر تو میں ابھی سے کہہ سکتا ہوں کہ اب جو بچّہ پیدا ہوگا وہ پہلے این سایانی کی آواز میں بولے گا اور پھر روئے گا۔ اِدھر جب میں اپنے گھر کا دروازہ کھولتا ہوں تو وہ بھی این سایانی کی اسٹائل میں چرّا چوں کرتا ہوا کھُلتا ہے۔

> فنونِ لطیفہ کو مذہب، اخلاق، سائنس اور تصوّف کے ترازو میں تولنا الفعان ہے
>
> ۔ ادراک ۔
>
> (احسان دانش)

شاغل ادیب (ایم۔اے)

تضمین

بر غزلِ سالکؔ مرحوم

عطائے درد و غمِ دوستاں نہیں نہ سہی
نصیبِ دشمنیِ این و آں نہیں نہ سہی،
سکونِ زندگیٔ جاوداں نہیں نہ سہی
"مری مراد پہ دَورِ زماں نہیں نہ سہی
مری زمیں پہ فلک مہرباں نہیں نہ سہی"

کمالِ راحتِ جاں تک، جنوں کے حاصل تک
مآلِ شوق و فرازِ تجسسِ دل تک
نقوشِ پائے حسین و سراغِ محمل تک
"یہ میری خاک کو پہنچا ہی دے گا منزل تک
غبارِ راہ تو ہے کارواں نہیں نہ سہی"

نئے رباب، نئی لے، نئے ہیں ساز و چنگ
نئے ترانے، نئی دھن نئے ہیں راگ اور رنگ
نئی طلب ہے نئے جام دے نئی ہے اُمنگ
"زمانِ نَو میں غنیمت ہیں ساقیانِ فرنگ
وہ آستانۂ پیرِ مغاں نہیں نہ سہی"

یہ ذکرِ شوق و جنوں اور روایتِ غمِ دل
یہ حسنِ فیضِ محبت، شکایتِ غمِ دل
یہ شرح و بسطِ کرم اور عنایتِ غمِ دل
"میں اپنے دل سے کہوں گا حکایتِ غمِ دل
جہاں میں کوئی مرا رازداں نہیں نہ سہی"

متاعِ دیدۂ تر کو دوام ہے سالکؔ
فرازِ حسن و نظر کو دوام ہے سالکؔ
پیامِ دردِ جگر کو دوام ہے سالکؔ
"حیاتِ نوعِ بشر کو دوام ہے سالکؔ
حیاتِ فردِ بشر جاوداں نہیں نہ سہی"

اسعد بدایونی

غزل

جب کسی ہم نفس کی یاد آئی
بڑھ گئی دل کی ناشکیبائی

اُس نے چہرے پہ زلف بکھرائی
دن کے پہلو میں رات شرمائی

ایک اک نوکِ خار سے پائی
عشق نے دادِ آبلہ پائی

یوں ہر اک اجنبی سے ملتے ہیں
جیسے برسوں کی ہو شناسائی

زندگی پر غلط ہیں یہ الزام
زندگی بے وفا نہ ہرجائی

جگمگاتا ہے چاند یادوں کا
اُفقِ دل پہ شامِ تنہائی

خاص نظروں کے خاص پیمانے
ناپ لیتے ہیں دل کی گہرائی

شدّتِ غم کے باوجود اسعد
لب پہ بے ساختہ ہنسی آئی

ذکی انصاری

غزل

باغ کا ہر ذرّہ تھا جس پر فدا جاتا رہا
جانِ تھا گلشن کی جو وہ خوش ادا جاتا رہا

تم تھے جب تک ساتھ میرے زندگی تھی پُر بہار
تم گئے تو زندگی ہی کا مزا جاتا رہا

دل کو سمجھایا بہت لیکن وہ مانا ہی نہیں
عشق میں اک بے وفا کے با وفا جاتا رہا

جانے کیا باد صبا نے کہہ دیا بلبل سے آج
گل سے رشتہ توڑ کر وہ خوش نوا جاتا رہا

تھا کبھی اک دلربا کا فرادا ہمدم مرا
وائے قسمت ہو گیا مجھ سے جدا جاتا رہا

میں نے اس کو بزم میں کہتے سنا ہے یہ ذکی
تھا تو دیوانہ، دھنی تھا بات کا جاتا رہا

ضیا ھانی

"یہ منھ اور مسور کی دال"

(پے۔ الف کا شروع کیا ہوا "پس منظر" کا سلسلہ قارئین میں خاصا مقبول ہو گیا ہے۔ ہر مہینے ہمارے پڑھنے والوں کو نئی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض قلم کاروں کو خود بھی مختلف کہاوتوں، محاوروں اور فقروں سے متعلق پس منظر یاد آنے لگے ہیں۔
ضیا ہانی صاحب کا مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو وقت سے پہلے ہمارے سامنے آ رہی ہے اگرچہ حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق "مسور کی دال" کا نمبر نہ تھا۔ اس مرتبہ اس مضمون کو "پس منظر" کی قسط کا نعم البدل سمجھ لیجیے۔ اگلے ماہ انشاء اللہ اگلی قسط شایع ہوگی۔ ادارہ)

جب اودھ کے شاہی خاندان پر زوال آیا اور واجد علی شاہ "مٹیا برج" کلکتہ میں نظر بند کر دیے گئے تو محلات کے ہزارہا ملازمین تتر بتر ہو گئے، جس جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا۔ ان ہی میں ایک شاہی باورچی "منو میاں" بھی تھا جس کے متعلق صرف یہ خدمت تھی کہ وہ صرف مسور کی دال پکایا کرے۔ اور بس۔ اس خدمت کا معاوضہ اسے سو روپے ماہوار ملتا تھا۔ خیر بے چارہ باورچی تلاش معاش میں پھرتا پھرا۔ اور پھرتا پھراتا بٹالہ پہنچا جو پنجاب کے ضلع گورداسپور کا مشہور قصبہ ہے، یہاں ایک سیٹھ صاحب سردار بھاگ سنگھ رہتے تھے جن کی امارت کے سارے قرب و جوار میں چرچے تھے۔ باورچی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور نوکری کی درخواست کی ــ سیٹھ صاحب نے کہا، بھئی بیٹھ جاؤ اور بتاؤ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟ باورچی نے ساری داستان الم بیان کی اور کہا حضور کا نام سن کر در دولت پہ حاضر ہوا ہوں کہ روٹی کا ٹھکانا حضور کی بدولت ہو جائے اور زندگی کے باقی دن اطمینان سے حضور کے زیر سایہ کٹ جائیں۔"

اگرچہ منو میاں تلاش معاش میں لکھنؤ سے نکلے تھے مگر اس شان سے کہ ایک اچھے خاصے رئیس معلوم ہوتے تھے اور کیوں نہ معلوم ہوتے آخر شاہی باورچی تھے۔ جسم پر ایک نہایت سفید اچکن، پاؤں میں کامدار جوتا، ایک دوپٹا کندھے پر پڑا ہوا، ہاتھ میں ایک چھڑی۔ سیٹھ صاحب نے ان کی یہ نوابی شان دیکھی اور مسکرا کر کہا: "اچھا تو آپ شاہی باورچی ہیں"... منو میاں نے جواب دیا ہاں حضور، برسوں اس سرکار کا نمک کھایا اور عیش اڑایا ہے۔ اب جس وقت وہ زمانہ یاد آتا ہے تو کلیجے پہ سانپ لوٹ جاتا ہے۔"
سیٹھ صاحب نے کہا "شاہی مطبخ میں تمھارے سپرد کیا خدمت تھی؟"
منو میاں نے جواب دیا "حضور، میں صرف مسور کی دال تیار کرنے پہ ملازم تھا اور کوئی خدمت میرے سپرد نہ تھی۔"
سیٹھ صاحب نے کہا: "تب تو تم مسور کی دال نہایت اعلا درجے کی پکاتے ہو گے۔" منو میاں نے جواب دیا: "حضور ارشاد فرمائیں تو نمونتاً ذرا سی بنا کر کھاؤں۔" سیٹھ صاحب نے کہا: "بیشک" اور یہ کہہ کر ملازم کو آواز دی اور اسے حکم دیا کہ

"دیکھو منو میاں کو جس چیز کی ضرورت ہو وہ ان کو لا دو اور باورچی خانہ ان کو بتا دو، یہ مسور کی دال تیار کریں گے۔" اتنا کہہ کر سیٹھ صاحب اپنے کام میں مصروف ہو گئے، اور منو میاں اپنے کام میں۔

کھانے کا وقت آیا اور دستر خوان پر منجملہ اور چیزوں کے ایک چھوٹی سی طشتری میں ذرا سی مسور کی دال بھی موجود تھی۔ مگر اتنی خوشبودار کہ سارا دستر خوان مہک رہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے تو ایسی خوشبو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ بہت ہی شوق کے ساتھ سب سے پہلے اسے ہی کھانا شروع کیا۔ روٹی کا پہلا ہی نوالہ منھ میں گیا تھا کہ حلق تک معطر ہو گیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ دال بھی اس قدر نفیس اور لذیذ ہو سکتی ہے۔ منو میاں کی بے حد تعریف کی۔ سارے کھانوں کو چھوڑ دیا اور نہایت مزے لے لے کر دال کھانی شروع کر دی، اور ساتھ ہی ساتھ منو میاں کی تعریف بھی ہر نوالے پر کرتے جاتے تھے جو اس وقت سامنے ہی کھڑے تھے۔ کھاتے کھاتے کچھ خیال آیا اور کہنے لگے: "منو میاں، دال تو تم نے ایسی کھلائی ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں کھائی تھی مگر یہ تو بتاؤ کہ اس پیالی پر لاگت کیا آئی ہے؟" منو میاں نے بڑی ہی لاپروائی سے جواب دیا کہ "حضور! زیادہ لاگت نہیں آئی۔ ایک پاؤ کی دال تھی اور اس پر صرف چونتیس ۳۴ روپے خرچ آئے ہیں۔"

چونتیس ۳۴ روپے کا نام سنتے ہی سردار بھاگ سنگھ کا منھ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا اور انھوں نے بہت ہی گھبرا کر کہا: "ہیں کیا کہا؟ چونتیس ۳۴ روپیا! اس قدر خرچ اور صرف ایک پاؤ کی دال پر! تم نے بھی غضب کر دیا!!"

چونتیس ۳۴ روپے کا لفظ منو میاں کے لیے تو نہایت ہی معمولی تھا کیونکہ انھوں نے تو وہ سرکار دیکھی تھی جہاں ہزاروں روپے کی بھی کچھ قیمت نہیں تھی اور سینکڑوں روپیا خرچ کرنے کے بعد بھی کسی نے نہیں پوچھا کہ کتنا خرچ ہوا۔ انھیں کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ چونتیس روپے کے لفظ نے بے چارے بھاگ سنگھ کے ساتھ کس قدر روح فرسا برتاؤ کیا۔ اور صرف دال کی ایک طشتری پر چونتیس ۳۴ روپے کا نام سن کر اس کی حالت کیا ہوئی۔ اندازہ ہوتا تو درکنار وہ ان الفاظ کو بھی برداشت نہیں کر سکے جو سردار صاحب جھنجھلاہٹ میں کہے تھے۔ انھیں اس وقت اپنے آپ پر بڑا غصہ آ رہا تھا کہ ایک بخیل اور کنجوس کے یہاں آ کر ناحق ذلیل ہوا۔ نہ اس کو چیز کی قدر ہے اور نہ اس نے کبھی آنکھ کھول کر شاہی کھانوں کی خوشبو کو بھی سونگھا ہے۔ "بندر کیا جانے ادرک کا سواد" اور "شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ"۔ یہ خیال آنا تھا کہ منو میاں کو یارائے ضبط باقی نہ رہا اور غصہ سے بے تاب ہو کر انھوں نے فوراً جیب سے چونتیس ۳۴ روپے نکال سیٹھ صاحب کے آگے پھینک دیے اور کہنے لگے: "لو انھیں پر تمھارا کلیجہ پھٹا پڑتا تھا، اب تو ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی۔ تمھاری حیثیت مسور کی دال کھانے کی ہرگز نہیں ہے۔ "یہ منھ اور مسور کی دال"..." یہ کہہ کر بغیر جواب کا انتظار کیے ہوئے منو میاں سیٹھ صاحب کے مکان سے فوراً باہر نکل آئے اور پھر کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ . . . . .

بقیہ: مرض بڑھتا گیا.....

ہاں علاج کے لیے گئے لیکن اس ڈاکٹر نے انھیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ صرف بائیں آنکھ کے امراض کے ماہر ہیں سیدھی آنکھ میں دخل نہیں دے سکتے ــــ لیکن یہ بات یقین کرنے کی نہیں ہے۔ یہ صاحب یقیناً گپ اڑا رہے ہوں گے۔ ابھی اسپیشلسٹوں کی اتنی کڑی درجہ بندی کہاں ہوئی ہے۔ ہاں تو فزیشین اور سرجن کی درجہ بندی البتہ ہو چکی ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک قلم کا دھنی ہوتا ہے اور ایک اوزار کا ماہر۔ فزیشین اگر قیمتی قلم سے نسخے لکھے تو یہ نسخہ کافی مہنگا ہوتا ہے۔ سرجن کے ہاں یہ مادہ پیچ نہیں ہوا کرتی۔ عام طور پر سرجن، اپنے سبھی مریضوں پر ایک ہی قسم کے اوزار سے وار کرتے ہیں۔ لیکن ایک سرجن نے اپنے وقار کو بلند کرنے کے لیے، فزیشین کے قیمتی قلم کے مقابلے میں اسٹیل کے اوزار کی جگہ چاندی کے اوزار بنوالیے اور اب وہ ان مریضوں کی، اپنی چاندی کے اوزار سے مرمت کرتے ہیں۔ فیس بھی ظاہر ہے ان کی بڑھ گئی ہے۔ یوں سمجھیے چاندی ہی چاندی ہے۔

ڈاکٹروں کی تین قسمیں عام طور پر رائج ہیں۔ ایک وہ جو دماغ سے علاج کرتے ہیں (لیکن دماغ کا علاج الگ چیز ہے) ایک وہ جو زبان سے علاج کرتے ہیں اور ایک وہ جو مسکراہٹ سے علاج کرتے ہیں۔ دماغ سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کو لکھنے سے زیادہ پڑھنا پڑتا ہے (کیوں کہ وہ ڈاکٹر ہوتا ہے ادیب نہیں)۔ زبان سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کو گھنٹوں بولنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں محنت اور صلاحیت کے کام ہیں۔ لیکن تیسرے طریقۂ علاج میں صرف اپنے دانت صاف رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کی بھی عمدہ فیس ملتی ہے اور مریض کو کم سے کم نقصان پہنچتا ہے۔ یعنی کم سے کم صحت کو مزید نقصان نہیں پہنچتا ــــ صرف ڈاکٹر ہی نہیں نرسیں بھی اس طریقۂ علاج سے واقف ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ ہوا ہے کہ ان کے مسکرانے سے ڈاکٹر بیمار ہو گئے ہیں۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اُجّو کا پور سیٹّی

ترجمہ: مہر دردلوی

ایک زہریلا مشغلہ۔ یا۔ پیشہ

نہایت ہی زہریلے سانپ سے کارآمد دوائیں تیار کرنے کا ایک عجیب و غریب، خطرناک زہریلا فن اب روزگار یا مشغلہ بن گیا ہے۔ ایک عام انسان جس جرأت و ہمت کے کام کو ایک بار بھی انجام دینے سے کتراتا ہے وہی خطرناک کام بڑی جرأت سے ولیم ہاسٹ نامی شخص ہفتے میں کئی بار انجام دے کر اپنی گزر اوقات کرتا ہے۔ اور وہ خطرناک کام ہے زندہ اور زہریلے سانپوں کو پکڑنا۔

ولیم ہاسٹ امریکا کے شہر فلوریڈا میں میامی سے تیرہ (۱۳) میل کے فاصلہ پر جنوب کی طرف اپنے "سانپ گھر" یا سانپوں کے پارک میں مشغول رہتا ہے۔ اس کے سانپ گھر میں بارہ معاون ہیں۔ سالانہ تقریباً ستر ہزار تحقیق کرنے والے اُس کے بارہ سو سے زاید ... ناگ، اژدھے، کالے سانپ (بلیک ممبا) پیت آڈو اور دیگر بھیانک زہریلے سانپ ناگ دیکھنے آتے ہیں۔ ولیم کے جاری کردہ سانپ کے زہر کے تحقیقی ادارے نے لاتعداد ماہرین حیوانات کو متاثر کیا ہے۔ ولیم کا کاروبار روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ وہ سانپوں کا زہر فروخت کر کے سالانہ ایک ایک لاکھ ڈالر کما لیتا ہے۔ وسطی اور مشرقی افریقہ اور دیگر ممالک سے وہ سانپ منگواتا ہے، جو اس قدر زہریلے ناگ ہوتے ہیں کہ اگر کسی انسان کو سونگھ لیں تو وہ موت کی نیند سو جائے۔ ولیم کا کہنا ہے کہ انسان کے جسم پر سانپ کے ڈسنے سے ہونے والا اثر کسی مخصوص یا محدود زہر پر منحصر ہے۔ ایک قسم کے زہر سے انسان کے خون کے سرخ ذرات ختم ہو جاتے ہیں اور مسامات سے خون بہہ کر انسان مر جاتا ہے۔ دوسری قسم کے زہر سے انسان کے جسم پر فالج یا لقوہ جیسا اثر ہوتا ہے، اور اس کا جسم بے جان سا ہو جاتا ہے۔

سانپوں سے ادویات تیار کرنے کے دو خاص مقصد ہیں۔ ہر قسم کے سانپ کے زہر پر اثر انداز ہونے والی دوا تیار کرنا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ سانپوں کے پارک یا سانپ گھر کے مختلف قسم کے سانپوں کے زہر سے ایک طبّی مادہ تیار کرنا، جس پر تحقیق کا کام جاری ہے۔ پچھلے دس سالوں سے سانپ کے زہر سے مفید و کارآمد ادویات تیار کرنے کے لیے ماہرین غور و خوض اور کوشش کر رہے ہیں۔ جن مریضوں کو خون جانے کی شکایت ہے ان کے لیے سانپ کے زہر سے مجرب اور مفید دوا تیار کی گئی ہے۔ زخموں کی تکلیف، درد، جلن وغیرہ کو رفع کرنے کے لیے بھی سانپ کے زہر سے دوا کا کام لیا جاتا ہے۔ خون کا کینسر (لوکیمیا) کے علاج کے لیے ناگ کا زہر مفید ثابت ہونے کا امکان ہے۔ ولیم ہاسٹ کے سانپ گھر کے سانپ ایک لمبے چوڑے کانچ کے صندوق میں رکھے جاتے ہیں۔ ایک موٹا سا دستانہ چڑھا کر ولیم ہاسٹ روزانہ دو سو سانپوں کا زہر نکال لیتا ہے۔ باہر نکال کر اسے پشت کی طرف سے سر کے پاس بڑے احتیاط سے پکڑ لیتا ہے۔ اس خطرناک، دلیرانہ کام کے وقت اس کا دایاں ہاتھ پوری طرح کھلا رہتا ہے۔ کانچ کے ایک [illegible]

اسی برتن پر سانپ کو رکھ کر ربر پر ڈسنے لگاتا ہے۔ ربر میں سانپ کے دانت گڑ جاتے ہیں اور سانپ کا زہر نکل کر برتن میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس جمع شدہ زہر کا سفوف تیار کیا جاتا ہے۔ امریکا، جرمنی اور انگلینڈ کے طبی کارخانوں، تحقیقی اداروں اور میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ہاسٹ یہ پاؤڈر سپلائی کرتا ہے۔ گذشتہ سال حکومت امریکا نے ہاسٹ کو سو گرام زہر سپلائی کرنے کے لیے پچاس ہزار ڈالر کا ٹھیکا دیا تھا۔ اڑتالیس ہزار ناگوں کا زہر نکال کر اس نے اس زہریلے ٹھیکے کی تکمیل بخوبی کی۔ خود ہاسٹ کو بھی ٹھیک یاد نہیں کہ وہ اس خطرناک زہریلے کاروبار میں کس طرح پھنس گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ عمر کے پانچویں سال سے اُسے سانپ سے دلچسپی ہے، اسی وقت سے ناگ پکڑ کر جمع کرنے کا شوق اسے رہا ہے۔ بیس سال قبل اس نے یہ سانپ گھر شروع کیا۔ اس وقت زہریلے سانپ پکڑنا اس کا شوقیہ مشغلہ تھا۔ کسی نے اس سے دریافت کیا تھا کہ "تمھیں یہ زہریلے سانپ ڈستے نہیں؟" اُس نے جواب دیا کہ "اب تک ایک سو چار دفعہ زہریلے سانپوں نے مجھے ڈس لیا ہے۔ ابتدا میں تو یہ حادثات میری موت کا باعث بننے والے تھے، اس لیے ۱۹۴۱ء سے میں نے خود ناگ کے زہر کا ٹیکا لگوانا شروع کیا۔ پانی میں تحلیل کیے ہوئے زہر کے انجکشن میں نے لگوائے ہیں۔ اس طرح میں نے کل ستر انجکشن لگوائے ہیں۔ میرے بہی خواہوں نے مجھے کئی بار جتایا کہ "تم خود اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔" اس کے بعد بھی مجھے ۳۳ بار سانپوں نے ڈسنے کے باوجود میں سلامت ہوں۔ سنہ ۱۹۶۵ء اور سنہ ۱۹۶۷ء میں مجھے ناگ راجا (کنگ کوبرا) نے ڈس لیا۔ ناگ راجا کے زہر میں تو ہاتھی کو ہلاک کرنے کی طاقت اور اثر ہوتا ہے۔ نہایت ظالم، خطرناک اور مہلک زہر ناگ راجا کا زہر ہوتا ہے۔ اس زہر کے اثر سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور نبض رکنے لگی تھی لیکن میری دانست میں ناگ راجا کے خطرناک زہر سے بچنے والا خوش قسمت صرف میں ہوں۔"

ڈیم ہر قسم کے سانپ کے زہر کا علاج اپنے پاس تیار رکھتا ہے۔ گھوڑے کے خون کی ملاوٹ سے یہ دوا تیار کر لی جاتی ہے، اسی طرح اس کے اپنے خون سے تیار کی ہوئی دوا بھی اس کے پاس موجود ہے۔ ایک دفعہ وینز ولا کے ایک لڑکے کو زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا، اور ہاسٹ نے اس کا بہتر علاج کر کے اس معصوم کو موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ سانپ کے زہر کو ایک مفید دوا سمجھ کر ہی ہاسٹ نے ایک تجرباتی اسکول کھول رکھا ہے۔ ہاسٹ کا قول ہے کہ اس دنیا میں زہریلے، خطرناک اور ظالم سانپ جمع کرنا اور انھیں کارآمد بیش قیمت اور محافظ جان سانپ بنانا ہی ہمارے اس زہریلے مشغلہ کا عین مقصد ہے۔

(ڈونیٹ مراٹھی ڈائجسٹ سے)

متاعِ ہُنر

۱۔ دوسرے کنارے تک : عزیز قیسی
۲۔ پا بہ جولاں : صغرا مہدی
ناشر : ناولستان ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

آج کل جس رفتار اور تعداد میں ناولیں چھپتی اور پڑھی جاتی ہیں اُن کے پیشِ نظر اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اردو میں "ناولوں کا یُگ" پھر آ رہا ہے۔ پُرانے لکھنے والے تو خیر لکھتے ہی رہتے ہیں، نئے ناول نگار بھی اس میدان میں قدم رکھ رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کسی حد تک نئی ہوا کی آمد کا احساس ہوتا ہے۔
عزیز قیسی کا مختصر سا ناول "دوسرے کنارے تک" بات کو نئے ڈھنگ سے کہنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اردو میں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی "چھوئی موئی" لڑکی کی نفسیات کو گٹھری کی طرح کھولنے کی روایت نئی نہیں ہے۔ عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" تو خیر اور بھی آگے کی چیز ہے جس میں کسی شہزادے کے انتظار میں گھلنے والی کنواری بر مانگنے کی حد سے بھی آگے جا کر "سوئمبر" رچانے کی منزل تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے ہاں وہ لڑکی ملتی رہتی ہے جو عزیز قیسی کے الفاظ میں "گھر کے اندھیرے میں بند، ماں باپ سے کھنچی کھنچی، اپنے آپ سے گھبرائی ہوئی، گھنٹوں چھپ چھپ کر آئینہ دیکھنے والی" شنکری ہے۔ شنکری اپنے بچپن کے ساتھی ہرکرشن سے محبت کرتی ہے لیکن قسمت اُسے ہرکرشن کے بڑے بھائی بلرام کا جیون ساتھی بنا دیتی ہے (ہمارے ہاں قسمت کے کھیل ایسے ہی ستم ظریفانہ ہوا کرتے ہیں)۔ نتیجے میں سینت سینت کر رکھی ہوئی شنکری کی یادوں اور مستقبل کے سپنوں کا رنگ محل مسمار ہو جاتا ہے اور آگے راستہ بند ہو جانے پر اُس کے لیے ایک ہی سیفٹی والو بچ رہتا ہے، "خودکشی"۔ وہ اپنے آپ کو سمندر کے حوالے کر دیتی ہے اور اس طرح "پرلوگ" سے شروع ہو کر یہ ناول "ایپی لوگ" پر ختم ہو جاتی ہے۔
عزیز قیسی نے شنکری کی سوچ کو بنیاد بنا کر نفسیاتی ڈھنگ سے یہ ساری کہانی سنائی ہے اور شروع سے اخیر تک ایک غمناک فضا کو برقرار رکھا ہے جیسے مسلسل شہنائی بج رہی ہو۔ اُتار چڑھاؤ سے خالی ایک مستقل اور دھیما دھیما سا بہاؤ اس ناول کا خاصّہ ہے۔ شاید یہی اس ناول کی واحد خوبی بھی ہے۔

قیمت تین روپے پچاس پیسے ہے۔

صغرا مہدی کی "پا بہ جولاں" بظاہر روایتی انداز کی "نسوانی" ناول ہے، جس میں گھریلو ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ چند لڑکیوں کی نفسیاتی کشمکش کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ابتدا میں ناول کی رفتار سست اور اندازِ بیان خاصا غیر دلچسپ ہے لیکن ایک تہائی حصّہ ختم ہو جانے کے بعد صغرا مہدی کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنے چست جملوں اور برجستہ مکالموں سے قصّے کو آگے بڑھائیں۔

شروع میں کہانی بڑے غیر یقینی انداز میں آگے بڑھتی (بلکہ گھٹتی) ہے، واقعات بھی ناقابلِ قبول انداز میں سامنے آتے ہیں مثلاً ناول کے پچاس صفحے پورے ہوتے ہوتے ناہید عرف نندو احمد کی محبت میں گرفتار ہوکر ناکام رہنے کے بعد دق میں مبتلا ہوکر چل بستی ہے۔ محبت بھی انتہائی غیر حقیقی انداز میں مستحکم ہوتی ہے۔ احمد چند روز کے لیے مہمان بن کر آتا ہے، میٹھی میٹھی دل خوش کن باتیں کرتا ہے اور مہمان نوازی کا لطف اٹھاکر چل دیتا ہے لیکن بی نندو اس کی جدائی میں گھُل گھُل کر جان دے دیتی ہے۔

لیکن حمیدہ عرف حمّی کی شادی کے واقعے کے ساتھ پلاٹ دل چسپ اور انداز بیان زندہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جذباتیت اور نفسیاتی کشمکش ناول کے تاثر کو بڑھا دیتی ہے بلکہ یہی حیثیت اور نکیلے ہوتے جاتے ہیں گویا صغرا مہدی اپنے اصلی رنگ میں سامنے آتی ہیں اور ان کے ساتھ کہانی کی ہیروئن صہبا عرف چھوٹو بھی۔ یہ دراصل صہبا ہی کی کہانی ہے۔ تیز و طرار لیکن حسّاس و تفکر پسند لڑکی جو حق گوئی کو اپنا ہنر سمجھتی ہے لیکن تجربات اسے سکھا دیتے ہیں کہ کبھی کبھی حق گوئی پر بھی روک لگانی پڑتی ہے۔ جب زنجیریں بڑھ جاتی ہیں تو اُس کی سہیلی مدھو کا بھائی مہندر عرف مہن بڑھ کر اس کی بھٹکتی ہوئی رُوح کو تسکین دیتا ہے۔ لیکن بے چاری نہیں جانتی کہ اس سہارے میں ایک بڑی بھاری زنجیر پوشیدہ ہے۔ مہندر عرف مہن بھیّا نہیں ہے — ایک عاشق ہے — اور مسلمان لڑکی سے ہندو لڑکے کی محبت کے خطرناک نتائج سے واقف ہے اس لیے ابتدا میں اپنا دل کھول نہیں پاتا لیکن جب کھُل کر اظہار محبت کرتا ہے تو یہ حقیقت ایک بم بن کر صہبا پر گرتی ہے۔ "پورا ایک ہفتہ اسے کانٹوں کی سیج پر لوٹتے گزر گیا تھا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایسا کٹھن مقام، ایسی کٹھن گھڑی بھی آسکتی ہے۔ اُف یہ کشمکش، یہ جان لیوا اضطراب! اس سے وہ کیسے نجات پائے؟

نجات اسی میں ہے کہ ذہنی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے لیکن عمل کرنے سے پہلے سازگار حالات کا انتظار کیا جائے۔

"صہبا تمھارے فیض کا وہ کون سا شعر ہے؟ یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں —"

"ٹرین میں بیٹھ جائیے۔" صہبا نے کہا۔

گاڑی رینگنے لگی — وہ ساتھ چلتی رہی۔" گاڑی تیز ہوگئی — وہ ساتھ دوڑتی رہی۔ گاڑی چلی گئی، ہاتھ چھوٹ گیا —!! لیکن ساتھ نہیں چھوٹا — انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی —!

———— (بے۔ الف)

کتاب : "میرا وطن ہندوستان"

شاعر : بدیع الزماں خاور

ناشر : بی۔ کے۔ پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی ۶

بدیع الزماں خاور کے ایک مجموعۂ کلام "حروف" پہ تبصرہ نقش کوکن کے پچھلے کسی شمارے میں گزر چکا ہے۔ "میرا وطن ہندوستان" ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو تازہ یہ تازہ منظر عام پر آیا ہے اور اپنے ساتھ خاور کی شاعری کے کچھ اور روشن پہلوؤں کو لایا ہے۔ ۱۰۴ صفحات کے اس خوب صورت اور مختصر سے مجموعے میں ان کی وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو انھوں نے ہندوستان اور اس کے لائق فرزندوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً موزوں کی ہیں۔

ابتدا میں پریم گوپال متل کا چار صفحوں کا ایک پیش لفظ ہے، جس میں انھوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا مختصراً ذکر کیا ہے، اور یہ بتانے کے بعد کہ یہاں کی سیاسی بیداری میں اردو شعرا کا کس قدر حصّہ ہے خاور کی شاعری کی قومی اور وطنی خصوصیات

بیان کی ہیں اور انھیں نئی نسل کا ایک ایسا فرد قرار دیا ہے جن کے احساسات ایک نوزاد ملک کے سچے شہری کے احساسات ہیں۔" انھیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ اس زبان کو اکثر شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا اور اسی زبان پر بے وفائی کا الزام بھی ہے۔

خاور اسی بدنصیب زبان کے ایک شاعر ہیں، لیکن انھیں اس کی پروا نہیں کہ کون ان کے والہانہ جذبے کی قدر کرتا ہے اور کون ان کی وفاداری کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انھیں اپنے وطن سے محبت ہے اور اس محبت کا اظہار وہ بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی سبھی نظمیں ان کے اس پرخلوص جذبۂ وطن دوستی کا مظہر ہیں۔ لیکن بعض نظمیں تاثر اور تاثیر کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں چنانچہ "ہمیں وطن عزیز ہے"، "اپنا وطن"، "اے مقدس وطن"، "میرا ہندوستان"، "اے وطن میرے وطن" نہ صرف اظہارِ جذبات کے اعتبار سے بلکہ فن اور تکنیک کے اعتبار سے بھی کافی اہم ہیں تقریباً یہی کچھ حال ان کی ان نظموں کا بھی ہے جو انھوں نے پنڈت نہرو اور لال بہادر شاستری وغیرہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے "رہنما کے بعد" اور "لال بہادر" کے عنوان سے لکھی ہیں۔ علاوہ بریں ان کی نظم بھی بڑی اثر انگیز ہے۔ اس کے آخری دو شعر ہیں:

سرزمینِ ہند کا میری زباں سنگار ہے

اس کے چہرہ زیبا میں ایک چندن ہار ہے

بحیثیت مجموعی "میرا وطن ہندوستان" ایک ایسا ساز ہے جس کے ہر پردے میں حبِ وطن کا ایک پاکیزہ نغمہ پوشیدہ ہے، جو بھی اس کا مطالعہ کرے گا وہ ان نغموں کی مدھر لہروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قیمت چار روپے ہے۔

(حامد اللہ ندوی)

گوش بر آواز

نقش کوکن کا جمہوریت نمبر نظر نواز ہوا۔ میں اس عنایت غیر متوقع کے لیے ادارے کا ممنون ہوں۔ جمہوریت نمبر کے مضامین نظم و نثر مجھے بھی پسند آئے۔ شروع سے آخر تک رسالہ ایسا ہے، جس سے ہر معقول آدمی اپنے ذوق کے مطابق دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس کے تمام مضامین کا حوالہ دینا تو تحریر کی طوالت ہوگی، تاہم رشید کوثر صاحب کا سفر نامہ میرے لیے بڑی دلچسپی اور معلومات کا باعث ہے۔ پس منظر کو میں اردو ادب میں نئی چیز سمجھتا ہوں، اسی طرح انتخاب زاد کار کا سلسلہ بھی عام پسند اور ضروری معلوم ہوا۔

جن شعرائے کرام کی تخلیقات زینت رسالہ ہیں وہ سب کے سب مستند ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ کوکن کے اس نقش ادب کی تجلیاں پورے ملک کی فضا کے لیے زندگی کی رعنائیوں اور ذہن و فکر کی کیف انگیزیوں کا سبب ہوں گی۔

ادیب مالیگانوی

نقش کوکن کا جمہوریت نمبر مل گیا ہے، عنایت کے لیے شکریہ۔ پورے پرچے کو بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ منقولات میں "کتنے شیریں ہیں تیرے لب" اچھا مضمون ہے اور غالب کی شخصیت کے مطالعے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ غالب پرستی کے اس دور میں جب ہر شخص پرستائشی بخار چڑھا ہوا ہے ڈاکٹر نوری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالب کی بشری کمزوریوں پر روشنی ڈالی۔ یونس اگاسکر

کا مقالہ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کوکن کے جغرافیائی، تاریخی حالات سے جانکاری کے لیے بھی یہ مضمون بہت مفید ہے۔ "پس منظر" کا سلسلہ بھی معلوماتی اور دلچسپ ہے اسے آئندہ بھی جاری رکھیے۔ پروفیسر رشید کوثر فاروقی کے لکھے ہوئے رپورتاژ "چند روز کیرالا میں" (جس کی تیسری قسط میرے سامنے ہے) سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے اس جلسے میں محض سیر و تفریح کے لیے شرکت نہیں کی بلکہ ایک ہمدرد اور محب قوم کا دل لے کر کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کا خلوص ایک ایک جملے سے جھلک رہا ہے۔ ان کی نثر بھی بہت رواں دواں ہے۔ شروع سے آخر تک اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی جو ایک نثار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ افسوس ہے پہلی قسطیں نہ پڑھ سکا۔

ریاض خیرآبادی سے متعلق مضمون سرسری انداز کا ہے۔ حصۂ نظم میں واحد پریمی کے علاوہ غزلوں کا معیار اطمینان بخش نہیں۔ غزل کا کارواں اب بہت آگے جا چکا ہے۔ اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس شمارے میں افسانے شامل نہیں۔ اس کی وجہ؟ — چند باتیں برسبیل خلوص لکھ دی ہیں، ورنہ مجھے اپنی قابلیت کا ہیضہ نہیں۔

ظہور الاسلام جعفری۔ بھوپال

فروری ۸۳ء کا نقش کوکن نظر نواز ہوا۔ ہر اعتبار سے پہلے کے بمقابلہ بہتر ہے۔ حمد و نعت تو خیر تبرک کی چیزیں ہیں اس لیے ان پر کوئی رائے دینے سے احتراز کرتا ہوں۔ دیگر منظومات میں عزیز قیسی کی نظم

پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ غالباً عقیدۂ تناسخ مسلمانوں میں جڑ پکڑ رہا ہے۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح غزل کے صوفیانہ مضامین بہت سے شعراء نے روایت پرستی کے طور پر نظم کیے ہیں اُسی طرح جدید دور کے نظم گو فن کار بھی اس عقیدے کو موضوع بنا کر برتنے لگے ہوں۔ غزلوں میں جاندار اشعار بہت کم ہیں تاہم ذیل کے اشعار بہت خوب ہیں:

دل کے جذبات بکے، ذہن کے افکار بکے
سچ تو یہ ہے کہ ہر اک عہد میں فن کار بکے
— واحد پریمی

غم کی صدیاں سمٹی ہوئی ہیں
مجبوری کے ایک نفس میں
— محشر بدایونی

کیا قیامت ہے سلیمانِ زمانہ ٹھہریں
وہ جنھیں رسم و رہِ شہر سبا یاد نہیں
— نازاں

بزم جہاں میں جب بھی کہیں تیرگی ہوئی
دل اپنا کام آیا، جلا، روشنی ہوئی
— رہبر

واضح رہے کہ منظومات پر میری یہ ناچیز رائے جگر کے اعلانِ جمہوریت اور ساز و آہنگ کا احاطہ نہیں کرتی۔ رہا شاعروں کا فٹ بال تو اس سلسلے میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ نقش کوکن کا نکھرتا ہوا معیار ایسی لغویات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر نوراللہ نوری کا "کتنے شیریں ہیں تیرے لب" غالبیات کے اُس شعبے میں ایک دلچسپ اضافہ ہے جس میں غالب کے کان گرم کیے گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس پر شاید ہی کوئی غالب زدہ کان دھرے۔ لوگوں نے غالب کو اتنا قد آور اور توانا بنا دیا ہے کہ اب اُسے کوئی بھی آنکھ دکھانے کو تیار نہ ہوگا۔ غالب کے کردار کی ہر کمزوری پر کوئی نہ کوئی دبیز پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بھی یہی ہوگا۔ اُردو کو ایک ایسے شاعر کی سخت ضرورت تھی جس کی شہرت کو عالم گیر بنایا جا سکے۔ وہ کام اہلِ غالب نے کر دکھایا۔ حالاں کہ اس عظمت کے حق دار صرف اقبال ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ سیالکوٹ اور لاہور کے ساتھ ہم نے اقبال کو بھی پاکستان کے حوالے کر دیا۔ خدا کے واسطے سے کہتا ہوں کہ خواہ کشمیر کا نصف حصہ پاکستان کو دے دیا جائے لیکن اصل کے اس سومناتی کو پاکستان سے واپس لے لیا جائے۔

گزارشِ احوالِ واقعی کے تحت نقش کوکن کی محدودیت اور لامحدودیت کا کریہہ مسئلہ سامنے آیا۔ اس سلسلے میں آپ کو غوغائے رقیباں سے اندیشہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ نقش کوکن بہرحال نقش کوکن ہی رہنا چاہیے — خدا کرے احتشام نمبر مرحوم کے شایانِ شان ہو اور نقش کوکن کا ایک یادگار نمبر!

نیازمند ظفر الاسلام ظفر

نقش کوکن کا تازہ شمارہ آپ کی عنایتوں سے نظر سے گزرا۔ ایک عرصہ کے بعد۔ اب تو ایک انقلابِ عظیم اس کے معیار میں پیدا ہو چکا ہے اور ادبی لحاظ سے یہ "شاعر" اور "کتاب" کے ہمدوش نظر آیا۔ یہ سب کرشمہ ہے آپ کی دل نواز اور ادبی شخصیت کا جس نے ملک کے اچھے فن کاروں کا تعاون جلد ہی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ کسی ایک طبقہ کا نہیں بلکہ علاقائی حدود سے بالاتر ہو کر اُردو کے منفرد جرائد میں شمار ہونے لگے گا۔ میری جانب سے مبارکباد لیجیے، اور اسے اور بھی خوب سے خوب تر بنانے کی سعی میں لگے رہیے۔ شاندار مستقبل انتظار میں ہے۔

جمہوریت نمبر کے بعد احتشام نمبر کی تیاریاں آپ کے عزم بلند کی غماز ہیں۔ امید ہے یہ نمبر ملک کے مایۂ ناز نقاد اور مخلص استاد کے شایانِ شان ہوگا۔ وقت بہت کم ہے ورنہ راقم الحروف بھی کوئی مختصر سا مضمون حوالۂ قلم کر کے روانہ کر دیتا اور لہو لگا کے شہیدوں میں نام کر لیتا۔ ڈاکٹر عبدالکریم نائیک اور میمونہ دلوی کی رفاقت اور تعاون سے نقش کوکن کو ایک کاسموپالیٹن میگزین بنانے میں یقیناً آپ کامیاب ہوں گے۔ یہ سماجی خدمات اور ادبی محرکات کا بیش بہا تحفہ ثابت ہوگا۔ میری دلی دعائیں اور حقیر خدمات آئندہ بھی نقش کوکن کے لیے وقف سمجھیے۔

مخلص فخر دھولیوی

نقشِ کوکن کا جمہوریت نمبر اور مارچ ۸۳ء کا شمارہ
نشاطِ نظر بنا، مطالعے نے ذہنی سرور بخشا۔ جن فنکاروں، ادیبوں
اور مقالہ نگاروں نے مجھے متاثر کیا ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی ظلم ہوگا۔
ڈاکٹر محمد نوراللہ صاحب کا مقالہ "کتنے شیریں ہیں تیرے لب" متنوع
اور حقیقت افروز ہے اور اندازِ تحریر پُر کشش ہے۔ یونس اگاسکر
صاحب کا مقالہ مسلم کوکنی میں عربی فارسی الفاظ "کوکن کے باشندوں
اور خصوصًا علم دوست طبقہ کے لیے اچھا خاصا معلومات کا خزینہ
ہے۔ یہ پُر مغز مقالہ موصوف نے بڑی محنت و عرق ریزی سے مرتب
فرمایا ہے جو "تاریخ کوکن کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت کا حامل
ہے۔ پروفیسر باگیر کا مضمون" پروفیسر عبدالقادر سرفراز" اور اسد جملدار
کا مقالہ "ریاض خیرآبادی کی یاد میں" بڑے اچھے اور معلومات افزا
ہیں۔ پروفیسر رشید کوثر فاروقی کا قسط دار سفرنامہ "چند روز کراچی میں"
دل چسپ اور مزے دار ہے، اندازِ بیان بھی دل کش ہے۔ مجھے یقین
ہے کہ یہ سفرنامہ علمی و ادبی دنیا میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔
اعلانِ جمہوریت، حضرت جگر مرحوم کی یادگار نظم موقع کی مناسبت
سے موزوں ہے۔

مارچ کے شمارے میں ڈاکٹر ظفرالاسلام کا مقالہ الہ آباد
کی علمی و ادبی سرگرمیاں" ناقابلِ فراموش یادوں کی برات ہے جو
معلومات سے پُر ہے۔ مولانا ابراہیم عمادی کا مقالہ "علاءالدین ابوالحسن
تاریخی و تحقیقی معلومات کا مرقع ہے۔ مہر دردلوی کا افسانہ "بکریں"
مراٹھی زبان کے افسانے کا کامیاب ترجمہ ہے۔ یونس صاحب کا
ضرب الامثال کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے۔ غرض نقشِ کوکن نے
مختصر سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے جو کوکن میں اردو زبان
کی ترویج و اشاعت کے لیے فالِ نیک ہے۔

مخلص ضیا ہانی

نقشِ کوکن کا تازہ شمارہ (مارچ ۸۳ء) بھی موصول ہوا۔
اس نوازش کا شکریہ۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام ظفر کا مقالہ الہ آباد کی
علمی و ادبی سرگرمیاں" تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے معاون ہوگا۔
مقالہ نگار نے مواد اکٹھا کرنے میں کافی محنت کی ہوگی، حالانکہ زمانۂ
حال کے مشاہیر کے بارے میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے
نثر نگاروں اور ناقدین میں جناب ڈاکٹر سید محمد عقیل اور ڈاکٹر مسیح الزماں
کے تذکرے کے بغیر یہ مقالہ تشنہ ہے کیونکہ آپ لوگوں نے بھی تنقید اور
اور ڈرامے کے محدود دائرے کو توسیع دینے میں ایک عمر کا ریاض صرف
کیا ہے اور آج بھی شب و روز ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ شعرا
میں بھی کچھ مستحکم نام رہ گئے ہیں۔ بہر حال مقالہ ہر لحاظ سے قارئین کے
علم میں اضافے کا باعث ہی ہے۔ شعری حصے میں یوسف جمال، آزاد
گلاٹی، بدیع الزماں خاور بہت پسند آئے۔ مہر دردلوی نے مراٹھی
افسانے کو اردو کا قالب عطا کرنے میں حسن سے کام لیا ہے۔

نیاز مند نصر قریشی

ہدیۂ تشکر، تازہ شمارہ موصول ہوا۔
ترتیب و تدوین میں آپ کے حُسنِ ذوق کی داد نہ دوں
تو خود پر زیادتی ہوگی۔ پرچہ بے حد صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔
خدا نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

یوسف جمال

ہٹ دھرمی
مذاقِ سلیم سے
فقدان کی
علامت ہے۔

اخبار و اذکار

صدر کانگریس کے اعزاز میں سیطوڑہ میں جلسہ

مہاراشٹر پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر شری بالا صاحب ساونت اور رتناگیری ڈسٹرکٹ کانگریس کے صدر بھائی صاحب ساونت ان دونوں کے اعزاز میں ۱۱ مارچ [illegible] کو سیطوڑہ ضلع رتناگیری میں ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ ہندوستانی بحریہ میں قابل قدر خدمات انجام دے کر اپنے گاؤں کو امتیازی خصوصیت حاصل کرنے والے ان باشندگان نے و قرب و جوار کے قصبات و دیہات سے آئے ہوئے لوگوں نے ان دونوں مہمانان خصوصی کی توجہ شکستہ سڑک اور دشوار گزار راستوں نیز شفاخانہ کی فوری ضرورت کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ عوامی مطالبہ پر غور کرتے ہوئے شری بھائی ساونت نے یہ یقین دلایا کہ زامباری کی سڑک پر جلد ہی کام شروع ہو جائے گا اور مقامی باشندے دواخانہ کے لیے اپنی عمارت تعمیر کر کے دیں تو اسٹاف و اسباب مہیا کرنے میں وہ ہر ممکن تعاون فرمائیں گے۔

پروڈکشن انجینیرنگ پوسٹ ڈپلوما کا پرانا کورس مئی میں آخری امتحان

پروڈکشن انجینیرنگ کے پوسٹ ڈپلوما کورس کے نظرثانی شدہ نصاب کے مدنظر ریاستی بورڈ برائے ٹکنیکل امتحانات نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ مئی میں پرانے نصاب کے تحت آخری بار اول و دوم سمسٹر امتحان منعقد کر کے ختم کر دیا جائے۔ ایسے تمام سابق طالب علم جو کہ پرانے کورس میں امتحان دینا چاہتے ہوں ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ پرنسپل وی۔ جے ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، ماٹونگا بمبئی سے لے کر امتحان میں شرکت کے لیے داخلہ فارم بھریں۔ درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ (مقررہ فارم پر اور امتحان فیس کے ساتھ) ۳۰ اپریل [illegible] ہے۔ درخواستیں پرنسپل وی۔ جے۔ ٹی۔ آئی کو داخل کی جائیں۔

انتخاب کتب کمیٹی

حکومت مہاراشٹر نے سیکریٹری محکمۂ تعلیم کی زیر صدارت ایک کمیٹی قائم کی ہے جو کہ ریاستی حکومت نے مختلف محکموں کی جانب سے شایع کردہ کتابوں کو مہاراشٹر کے اسکول اور کالجوں میں تقسیم کے لیے منتخب کرنے میں حکومت کو مشورے دے گی۔ کمیٹی کتابوں کی جانچ کرے گا اور اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو مناسب کتابیں بھیجے گی۔ کمیٹی کے دوسرے تین اراکین یہ ہیں: ڈائرکٹر گورنمنٹ پرنٹنگ پریس اور اسٹیشنری، بمبئی سیکریٹری، مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ برائے ادب اور ثقافت۔ ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بطور سیکریٹری (کمیٹی کے)۔ فی الحال اس کمیٹی کی مدت اختیار ایک سال کی ہے اور اس کی میٹنگ ہر تین ماہ پر منعقد ہوگی۔

اسپتالوں میں بستروں کی تعداد

اس وقت ملک بھر کے اسپتالوں میں بستروں کی مجموعی تعداد دو لاکھ ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اس تعداد میں ۷۴، ۱۹ تک مزید ۶۰ ہزار بستروں کا اضافہ کر دینے کا نشانہ ہے۔ پانچ سو یا اس سے

ڈاکٹر وی۔ ایم۔ کلکرنی

ڈاکٹر وی۔ ایم۔ کلکرنی سنسکرت پروفیسر، الفنسٹن کالج، بمبئی کا حال ہی میں بطور ڈائرکٹر آف لنگویجز، ریاست مہاراشٹر کے لیے تقرر ہوا ہے۔

کونکن ریلوے کا کام شروع

مجوزہ کونکن ریلوے کا ذیلی کام ضلع کولابہ کے مقام گوریگاؤں میں ایک سادہ سی تقریب کے دوران شری اے۔ آر۔ انتولے وزیر عمارات و مواصلات، مہاراشٹر کے ہاتھوں شروع کیا گیا۔ موقع پر تقریر کرتے ہوئے شری انتولے نے فرمایا کہ کونکن کے غریب عوام کا خواب آج حقیقت کا روپ اختیار کر رہا ہے۔ کام کے پہلے دن تقریباً ۶۰۰ مزدور موقع پر موجود تھے۔

دو ضلعوں کو جوڑنے والا مہاپرل ابنیت پل

۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء کی صبح وزیر تعمیرات و مواصلات حکومت مہاراشٹر عزت مآب بیرسٹر عبدالرحمن انتولے نے مہاپرل تعلقہ منڈنگڈ میں پل کی مجوزہ تعمیر کا معائنہ فرمایا۔ ۲۳۳ فیٹ لمبا اور ۲۵ فیٹ چوڑا یہ پل جو دریائے ساوتری میں سات کمانداروں پر تعمیر ہوگا۔ درمیان میں سطح آب سے ۳۲ فیٹ اونچا رہے گا تاکہ آبی راستوں سے نقل و حمل کے وسائل متاثر نہ ہوں۔ تعمیری کاموں کا شاندار ریکارڈ رکھنے والی مشہور کمپنی میسرز این بی جوشی اینڈ کمپنی نے اس کی تعمیر اپنے ذمہ لی ہے اور تین سالوں میں اسے مکمل کرے گی۔ اندازہ ہے کہ اس تعمیر پر ساٹھ لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ معتبر خبر ہے کہ ۱۸ اپریل کو وزیر اعلیٰ مہاراشٹر شری وسنت راؤ نائیک اس پل کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔

اس پل کے ذریعے نیز انتولے صاحب نے ریوس۔ ریڈی سڑک کا جو منصوبہ تیار کیا ہے ضلع رتناگری بمبئی سے ۵۸ میل قریب ہو جائے گا۔ مسافت میں یہ بھاری تخفیف انتولے صاحب کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور اس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں۔

راجیواڑی میں اعزازی جلسہ

راجیواڑی مہاڈ ضلع کولابہ کے بیبیک فل پرائمری اردو اسکول کی طالبات و معلماؤں نے محترمہ حبیب بی عمر جوگلے جو بلوائی (افریقہ) سے وطن واپس آئی ہیں اور نہایت ہمدرد خاتون ہیں اور سماجی بہبود میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ نورجہاں یوسف لمبارڈے نے تلاوت قرآن پاک سے جلسہ کا آغاز فرمایا اور آمنہ گنگرگے نے غرض و غایت بیان کی۔ عائشہ بی ابراہیم جافیکر نے استقبالیہ نظم پڑھی اور رضیہ بڑے، سعیدہ دھنسے و دیگر خواتین نے تقریریں کیں۔ مہمان خصوصی حبیبہ جوگلے صاحبہ نے استقبالیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تعلیمی فنڈ میں پچاس روپے عطیہ دیا۔

پروفیسر دادرکر صاحب کی حج بیت اللہ سے واپسی

عالی جناب پروفیسر احمد بہاء الدین دادرکر صاحب کی حج بیت اللہ سے واپسی پر جماعت المسلمین تیسہ نے ایک استقبالیہ جلسہ بتاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۸۳ء خوجہ سنت جماعت کے خوب صورت ہال میں منعقد کیا جس کی صدارت مدیر صبح امید جناب خان صاحب عبدالحمید بوبیرے نے فرمائی۔ تلاوت قرآن پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا اور جناب محمد طیب جھٹام نے خوش گلوئی کے ساتھ نعت پڑھی۔ جناب حسین درجیہ الدین مقدم (پرنسپل احمد سیلر ہائی اسکول) کی افتتاحی تقریر کے بعد جناب عباس دلوی، پولیس انسپکٹر جناب خلیل شیخ، اینڈ کتاب گھر کے مالک جناب سید یسین صاحب اور ڈاکٹر عبدالکریم نائیک صاحب نے موقع کی مناسبت سے بصیرت افروز تقریریں کیں۔ بوبیرے صاحب کے عالمانہ خطبۂ صدارت کے بعد معزز مہمان پروفیسر دادرکر صاحب نے اس مقدس سفر اور مناسک حج سے متعلق تفصیلی بیان دیا۔ آخر میں جناب غیاث الدین تیسکر نے شکریہ ادا کیا۔ جناب فقیر محمد مستری نے جلسہ کی اناؤنسنگ فرمائی۔

دابھول ایجوکیشنل سوسائٹی کا سالانہ اجلاس

مورخہ ۴ مارچ ۱۹۷۳ء شب ۹ بجے دابھول ایجوکیشنل سوسائٹی کا سالانہ جلسۂ عام جناب عثمان عبداللہ کی صدارت میں نزد کانن رے مجگاؤں میں انعقاد پذیر ہوا۔ جنرل سیکریٹری جناب شعبان امیر صاحب بامنے نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد انھوں نے سوسائٹی کی سالانہ کارگذاری پر روشنی ڈالی۔ ادارے کے خازن جناب شمس الدین عباس بامنے صاحب نے سوسائٹی کے آمد و خرچ کا گوشوارہ پیش کیا۔ صدر جلسہ کی تقریر کے بعد سالانہ انتخاب عمل میں آیا۔

صدر: جناب عثمان عبداللہ نیجی۔ نائب صدر: داؤد عباس صاحب بالابھائی۔ خازن جناب شمس الدین عباس صاحب بامنے۔ جنرل سیکریٹری: جناب شعبان امیر صاحب بامنے۔ جوائنٹ سیکریٹریز: جناب ابراہیم شہاب الدین قلیچ (کونڈھا)۔ جناب سید نصر الدین عثمان سید۔ جناب حسن میاں ناخوا (نوشہ)۔

اراکین مجلسِ منتظمہ: جناب اسماعیل ابراہیم بامنے۔ جناب مجو الدین محمود مجاور۔ جناب نصر الدین رحیم الدین درویش۔ جناب قادر عبدالرحمان نیجی۔ جناب نور الدین محمد برنگ۔ جناب کمال الدین عبداللہ نیجی۔ جناب علاء الدین نصر الدین بلینا کلک۔ جناب اسماعیل محمد علی آنگے۔ جناب حسین میاں علاء الدین دانڈیکر۔ جناب ابراہیم علی خان پربھولکر۔ جناب عبدالغفور فضل الدین گونڈیکر۔

آخر میں مہمانِ خصوصی جناب عباس صاحب دلوی کی تقریر ہوئی جس میں انھوں نے سوسائٹی ہٰذا کی کارگذاری کو کافی سراہا۔ موصوف کی گلپوشی کے بعد حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

بزمِ روشن (کرلا) کا سالانہ جلسہ

بزمِ روشن کرلا کا سالانہ جلسۂ عام مورخہ ۱۵ فروری ۷۳ء زیر صدارت جناب عبدالشکور شیخ صاحب منعقد ہوا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن سے کیا گیا۔ بعد ازاں بزم کے سابق سیکریٹری جناب سراج الدین مومن صاحب نے بزم کے گذشتہ سال کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ نیز آمدنی واخراجات کا گوشوارہ پیش کیا۔ جناب حسن علی دھلنے صاحب نے بزم کی اجرا و نوعیت کی وضاحت کی کہ بزم نے نہ صرف لوگوں میں باہمی ربط واشتراک و تعاون کی خوشگوار فضا پیدا کی بلکہ آٹھ سال سے مقامی طور پر مذہبی، تعلیمی اور سماجی فلاح و بہبودی کے امور میں سرگرم عمل ہے۔ مدرسۂ تعلیم القرآن کو قائم کرکے بزم نے مقامی لوگوں کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ نیز بزمِ روشن سالِ رواں میں سلائی و دست کاری کی کلاسیس اور لائبریری کے اجرا کے لیے عازم و کوشاں ہے۔ جناب احمد عثمان ٹھاکور اور سابق صدر جناب حسین داؤد مومن نے بھی تقریریں کیں۔ جناب حسن علی دھلنے صاحب نے مجلس منتظمہ کا تیار کردہ دستور العمل حاضرین کے سامنے پیش کیا جس میں ترمیم و تنسیخ کے بعد اسے منظور کیا گیا۔ اس کے بعد سالِ رواں کے لیے مجلسِ منتظمہ کا براہِ راست انتخاب ہوا۔

خشک سالی امدادی فنڈ میں بچوں کا عطیہ

راجیواڑی ضلع قلابہ میں یوم جمہوریہ کے موقع پر جن بچوں کو تقاریر، نظمیں، مکالمے وغیرہ مقابلوں میں انعامات ملے تھے۔ وہ رقم ۲۵ روپے انعامات یافتہ بچوں نے اپنے صدر مدرس کے ذریعہ خشک سالی امدادی فنڈ میں عطیتاً جمع کردائے۔ چھوٹے بچوں کا یہ جذبہ مبارک اور ان تربیت کرنے والے اساتذہ قابلِ ستائش ہیں۔

شرف کمالی

رودادکی اشاعت میں تاخیر ہوگئی ہے جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے
(مرتب)

ایک رُوداد سفر

انجمن اسلام جنجیرہ اور شری وردھن

انجمن اسلام جنجیرہ (ضلع قلابہ) کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ اسی انجمن کی بدولت علاقۂ کوکن کے اس فردوسِ نظر خطّہ میں ایک علمی شعور جاگ اُٹھا ہے۔ اسی انجمن کے ماتحت جاری شدہ علمی اداروں سے فیضیاب ہوکر متعدد صاحبانِ علم وفن علاقۂ کوکن کے لیے اُن کی علمی وادبی خدمات کی وجہ باعثِ صد افتخار ہیں۔ بیرسٹر عبدالرحمان انتولے صاحب وزیر حکومتِ مہاراشٹر جیسی نامور شخصیت بھی تعلیمی کاوشوں کے ابتدائی دَور میں اسی ماحول سے فیضیاب ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ہر شعبۂ زندگی میں اَن گنت فرزندانِ جنجیرہ پیش پیش ہیں۔ جنجیرہ کی علمی فضا نے تعلیمی امداد وتعاون چاہنے والے ہر طالب علم کے شوقِ علم کی پذیرائی کا سامان مہیا کیا ہے۔

انجمن اسلام جنجیرہ کا ایک خیر سگالی وفد اپریل ۷۲ء کے آخری ہفتہ میں شری وردھن گیا تھا جس کی قیادت انجمن اسلام جنجیرہ حلقۂ بمبئی کے صدر محترم ڈاکٹر ضمیر الدین صاحب خطیب فرما رہے تھے۔ اراکین انجمن کے اصرار پر راقم الحروف بھی عازم شری وردھن تھا۔ بھاؤ کے دھکے پر دھکے کھانے سے بچے۔ چوگلے کینی کے جہاز پر سوار ہونے کے بعد وفد کے محترم ممبران سے تعارف ہوا۔ چند حضرات سے مَیں پہلے ہی متعارف تھا۔ میں نے زندہ دلانِ انجمن کی ہم سفری پر واقعی اپنے آپ کو خوش قسمت متصوّر کیا۔ بحیرۂ عرب کی ہلکی ہلکی موجیں جہاز سے ہم آغوش ہو رہی تھیں اور جہاز موجوں کو چیرتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وفد کے اراکین کے جذبۂ خلوص اور شوقِ خدمتِ علم کو دیکھ کر مَیں بہت مسرور ہوا۔ ڈاکٹر ضمیر الدین خطیب صاحب نے دورانِ گفتگو میں انجمن کے اغراض ومقاصد سمجھائے۔ شری وردھن کے سفر کی وجوہات پر روشنی ڈالی۔ وہاں منعقد ہونے والے علمی وادبی اجتماع کا تفصیلی پروگرام بیان فرمایا۔ سب حالات سُن کر میں نے یہی اندازہ لگایا کہ اراکینِ انجمن کی عقابی روح بیدار ہوچکی ہے اور وہ یہی پیغامِ بیداری یارانِ شری وردھن کو دینے کے لیے اپنے مشاغل کو بالائے طاق رکھ کر اپنا قیمتی وقت اس قومی خدمت پر صرف کر رہے ہیں۔ شام کے تقریباً تین بجے جہاز شری وردھن کی تاریخی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ دیسی کشتی نے صحیح وسالم کنارے تک پہنچایا۔ جناب عبدالستار بروڈ صاحب (ایڈوکیٹ) کا بستی سے باہر ہی حسین ناریل کی باڑی میں دلکش نو تعمیر شدہ بنگلہ ہماری قیام گاہ تھی۔ بنگلے کی تعمیر میں ایڈوکیٹ موصوف نے پیسے کے ساتھ عقل بھی یقیناً استعمال فرمائی ہے۔ کسی بھی کمرے میں آپ رہیے باہر نکلنے کے لیے ہر کمرے کا اپنا الگ دروازہ ہے۔ غسل خانے جائیے تو کسی کو دوسرا کمرہ بند کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ صحن میں وضو کے لیے نل لگے ہوئے ہیں۔ اکثریت نمازیوں کی دیکھی مجھے مسقط کا ماحول یاد آیا۔ نماز کا وقت ہوا اور صف آرائی ہوئی اور پھر وہی دلکش نمونہ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

یہی خصوصیت ہے اردو ذریعۂ تعلیم سے فارغ التحصیل طلبہ کی کہ دنیا کے

ساتھ دین بھی سیکھ جاتے ہیں اور انجمن کے وفد میں شریک فرزندانِ
انجمن کو انجمن اسلام جنجیرہ نے یہ توفیق بخشی ہے کہ اپنے دنیاوی مشاغل
میں بھی وہ بر وقت اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے سربسجود ہو جاتے
ہیں۔ یہ اندازِ زندگی یقیناً دین ہے اردو ذریعۂ تعلیم کی !
شام کے ۵ بجے وفد کے اراکین کے ساتھ شری وردھن کی
سیر کے لیے نکلے۔ اہلِ کوکن کی بے مثال مہمان نوازی کے کیا کہنے !
یہاں ہر جگہ شالو (ادھ پکا ناریل) پھوڑ کر پانی ضرور پیا جاتا۔ جام پہ
جام لنڈھاتے جا رہے تھے۔ شالو پانی بھی مزیدار ہوتا ہے۔ اردو
شاعری میں رندی و سرمستی کے اشعار بہترین ہیں، یاد آتے رہے۔
شری وردھن کے متولیوں سے وفد کے اراکین کی بحث
بھی شروع ہو جاتی، محفل گرم ہو جاتی۔ وفد کے اراکین بیچارے
انھیں یقین دلاتے کہ حضرت جذبۂ خیر سگالی لے کر ہم حاضرِ خدمت
ہوئے ہیں اور آپ کی سرزمین کی تاریخی اہمیت کے باوجود مقامی
حضرات کی تعلیم کی خاطر خواہ سہولت نہیں ہے لہٰذا اردو ذریعۂ تعلیم
کے ہائی اسکولوں کے اجرا میں آپ سے تعاون درکار ہے اور
متولیان مہاراشٹر میں مراٹھی کی افادیت و اہمیت پر بصیرت افروز خطبہ
پڑھ دیتے۔ میں دونوں کی بحث بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ مطالعہ بھی تو
ضروری ہے۔ یہیں میں نے اپنی رات کی تقریر کے لیے مواد اکٹھا کیا
میں چپ سادھے ہوا تھا، اور ایک مہمان کی خیر و عافیت بھی اسی میں
ہوا کرتی ہے لیکن رات جب بحث نے اپنا رنگ جمایا تو مجھ سے
بھی کچھ کہے بغیر رہا گیا۔ دل نے کہا ؎

"نالۂ بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں"

میں دیکھ رہا تھا کہ اراکینِ انجمن اپنی نیک نیتی کا یقین دلا رہے تھے اور
اردو ذریعۂ تعلیم کے ثانوی مدرسے کے اجرا میں متولیان کا تعاون چاہتے
تھے۔ اکثریت اراکینِ وفد کے خلوص کی قائل تھی اور ایک درس گاہ
انجمن اسلام جنجیرہ کے زیرِ انتظام چلانے کے حق میں تھی۔ وہ حضرات اراکینِ
انجمن کا مقصد سمجھ چکے تھے کہ اس طرح جنجیرہ حلقے کے بھائیوں میں ایک
باہمی ربط قائم ہوگا اور یہ ایک اچھی بات ہوگی کہ اسی ذریعہ سے اس حلقے کے
لوگ باہم مل کر کام کریں، اور یہ ربطِ ملت ایک خوش آیند مستقبل کا ضامن
ہوگا۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

لیکن اب سرکردہ حضرات میں دو تین حضرات مطمئن نہیں تھے۔ ان کی مخالفت
برقرار رہی تھی۔ وہ اس ربط کو شاید اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ اس سے
اُن کی متولیت گھٹ جانے کا انھیں خدشہ تھا۔ وہ برابر مراٹھی ذریعۂ تعلیم
کی موافقت پر زور دے رہے تھے۔ جلسہ نو تعمیر شدہ اسکول کے
صحن میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ضمیر الدین خطیب صاحب صدر انجمن اسلام
وضاحت سے اپنا مقصد سمجھا چکے۔ مختلف اراکینِ انجمن کی بصیرت افروز
تقاریر روح کو گرما چکی تھیں۔ جلسہ کا آغاز مدرسہ حسینیہ عربیہ شری وردھن
کے ایک طالبِ علم کی خوش الحان قرآن خوانی سے ہوا تھا۔ قرأت کا سُرور
آخر وقت تک دماغوں کو مسحور کیے ہوئے تھا۔ مدرسہ حسینیہ عربیہ شری وردھن
کی بدولت علاقۂ کوکن کے ایک چھوٹے سے بچے نے اپنے فن سے ساری
محفل کو مست کر دیا تھا۔ مدرسۂ حسینیہ شری وردھن کے طلبہ، اساتذہ و
منتظمین بھی جلسے میں شریک تھے اور بڑے ہی انہماک سے تمام گوش بر آواز
تھے۔ جلسے میں حاضرین کے اصرار پر میں نے موقع کی موزونیت سے چند
اشعار سنائے۔ سخن سنجوں کی محفل میں شعر پڑھنے میں بھی لطف آتا ہے۔
آخر میں مجھ سے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کہا گیا۔ میں نے بتایا کہ
زبانِ اردو کا حصولِ آزادی میں کس قدر بڑا حصہ ہے۔ قومی یک جہتی کے
لیے اس زبان میں کتنا مواد ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے اداروں نے
علاقۂ کوکن میں جو علمی انقلاب برپا کیا اُس کی صحیح تصویر پیش کی اور روزمرّہ
ضروریات میں ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ورثہ قرار دیا گئی ہوئی اس زبان سے

ہماری زندگیوں سے کس حد تک ہم آہنگی ہے اس کو مثالیں دے کر واضح کیا۔ تقریر طویل ہوتی جا رہی تھی لیکن ادب نواز سامعین سننے پر مُصر تھے، اور اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ مخالفت کرنے والے حضرات بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ آپ کی تقریر اور خیالات بہت اچھے تھے لیکن ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ جلسہ بخیر و خوبی برخاست ہوا۔ میں نے پر جوش ساتھیوں سے کہا: "انقلاب آئے گا، آئے گا ضرور آئے گا۔"

رات کے دو بجے وفد کے ارکین اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ جناب عبدالستار بروڈ (ایڈوکیٹ) صاحب نے اپنی ناریل کی باڑی سے خوب "شالو" نکال کر رکھے تھے۔ جیسا پُر خلوص میزبان میسر تھا ویسے ہی بے تکلّف مہمان بھی تھے، اور واقعی ایسے بے تکلّف مہمان پاکر جناب عبدالستار صاحب بھی حد درجہ مسرور تھے، رات بھر خوش گپّیاں ہوتی رہیں۔ عبدالجبار خاں صاحب بار بار محفل کو قہقہہ زار بنا رہے تھے۔ حضرت ڈاکٹر خطیب[1] صاحب تماموں سے الگ ایک دوسرے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ اُن کی خدمات اور صدارت کے پیشِ نظر انجمن اسلام جنجیرہ حلقۂ بمبئی کے اراکین کی عقل و فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ایسی شخصیت کو صدارت کے لیے منتخب کیا ہے جسے سبھی چاہتے بھی ہیں، ان کا لحاظ بھی کرتے ہیں اور وہ حسبِ ضرورت شریکِ مجلس بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن خوش گپّیوں کی محفل جیسے کلائمکس کو پہنچ جاتی ہے تو غائب نظر آتے ہیں۔ اسے واقعی صدارتی وقار کہتے ہیں۔ شری وردھن پہنچنے پر بھی ڈاکٹر صاحب مریضوں کا معائنہ فرماکر نسخوں پر نسخے لکھے جا رہے تھے۔ شری وردھن کے احباب کا اصرار کھانے پر زیادہ ہوتا، اور سب دل کھول کر کھائے جا رہے تھے۔ شاید تمام یہی سوچ رہے ہوں "بھئی! اگر کچھ خرابی پیدا ہوگی تو دو دو ڈاکٹر ہمارے ساتھ ہیں۔" کوئی اور سوچے نہ سوچے میں تو یہی سوچ رہا تھا۔ صبح ہوئی۔ واقعی خدا کا فضل ہوا۔ ناشتہ میں بمبئی کا سا لطف تھا۔ جناب عبدالستار بروڈ صاحب کے برادرِ بزرگوار جناب علی میاں بروڈ صاحب اور چھوٹے بھائی ابراہیم عرف باوا بروڈ صاحب مہمانوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ وفد کے اراکین ہی معلوم ہو رہے تھے، اور ان کی خوش دلی دیکھ کر یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ہماری آمد پر اس قدر مسرور ہیں کہ یہ کہہ رہے ہیں "جیتم ما روشن دل ما شاد" بہرکیف اہالیانِ شری وردھن کا خلوص ہمیشہ یاد رہے گا۔ اُن کی مہمان نوازیاں تا دیر یاد رہیں گی۔

دوسری صبح یہ پورا قافلہ جسولی پہنچا۔ جناب احمد صاحب سونڈے، جناب فوپولونکر صاحب و دیگر عمائدینِ جسولی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہی خلوص وہی خاطر داریاں یہاں کے لوگوں میں بھی پائیں۔ زیرِ بحث مسئلہ تھا جسولی ہائی اسکول کا۔ جوش اور ولولے کے ساتھ ہائی اسکول کا اجرا چند سال پیشتر ہوا تھا۔ خوب صورت عمارت، ہر طرح کی سہولت لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے یہ ثانوی مدرسہ گویا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ فی درجہ بیس سے بھی کم اوسط طلبہ کی تعداد! اب کیا کیا جائے۔ مسئلہ صرف جسولی مدرسہ کے بند ہو جانے کا نہیں تھا۔ بات یہیں تک نہیں ختم ہوتی۔ ایک تعلیمی مشن کا منہدم ہونا قصرِ قوم کے لیے بے حد ضرر رساں ہے۔ منتظمین اپنی کاوشیں برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے حوصلے بلند ہیں۔ اُن کے سینوں میں عزائم بیدار ہیں۔ انجمن اسلام جنجیرہ کے اراکین سے پُر خلوص گفتگو کا ماحصل یہی تھا کہ "قدم ملا کے چلو" کا نعرہ ہی خوش آیند مستقبل کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہ قصۂ درد صرف جسولی ہائی اسکول تک محدود نہیں ہے۔ علاقۂ کوکن میں اس قسم کے نمونے اور بھی دیکھنے کو ملیں گے لیکن راستے کی یہی مشکلات اس قوم کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھا رہی ہیں۔ ایک دعوتِ عام کسی عقیقہ کے سلسلے میں تھی۔ پہلی مرتبہ "کھرجی" اور "پرجی" اصطلاحات سنیں۔ چھوٹے کے گوشت کو یہاں پرجی کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ہندی سے بگڑ کر یہ شکل اختیار کر گیا ہو۔ دوپہر بعد واپسی ہوئی۔ مدرسہ حسینیہ عربیہ شری وردھن میں مدرسے

---

[1] ڈاکٹر ضمیر الدین خطیب اور ڈاکٹر [illegible] اور [illegible]

کے منتظمین اور اساتذہ کرام نے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ جناب عبدالرحیم بروڈ صاحب اس کے بانیوں میں سے ہیں خود بھی موجود تھے۔ مجسم خلق و انکسار۔ اساتذہ کرام میں جناب عبدالمنعم صاحب اور سبھی اچھے عالم و فاضل حضرات درسِ قرآن سے قوم کے بچوں میں ایک نئی امنگ پھونک رہے ہیں۔ [illegible] حسینیہ عربیہ سے متعلق ایک علاحدہ تفصیلی مضمون انشاء اللہ جلد ہی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے اس لیے یہاں مفصل روداد اس ادارے کی نہیں لکھتا۔

رات کے ایک بجے کے قریب بحری جہاز پر سوار ہوئے، صبح آنکھ کھلی تو وہی ممبئی ہے جسے مولانا عبدالماجد دریابادی نے "یاجوجی شہر" کہا ہے پیش نظر تھا۔ وہی ہنگامہ، وہی دوڑ دھوپ، وہی لوگوں کی ریل پیل، اور میں محسوس کر رہا تھا کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" اور واقعی اس خواب کی حسین تعبیر ہے کہ شری وردھن میں اردو ہائی اسکول کا اجرا عمل میں آگیا ہے!
یقیناً محترم ڈاکٹر ضمیر الدین خطیب، ڈاکٹر عبدالرشید ڈھاکم، جناب عبدالستار بروڈ، جناب عبداللہ فقیہ اور ان کے تمام ہم نوا بیک آواز یہی کہہ رہے ہوں گے ؎

نظر آنے لگیں اپنے حسین خوابوں کی تعبیریں

ناقابلِ حصول خواہشات کی پرورش میں
دماغی مشین کی حرکت
بالکل ایسی ہے
جیسے پھول کترنے والی قینچی سے
پرانے چمڑے کے
ٹکڑے کاٹے جائیں۔

ابراہیم بابا ٹھاکور ہائی اسکول ترلوٹ

ترلوٹ ضلع رتناگیری میں مورخہ ۶ مارچ ۱۹۸۳ء بروز اتوار اسکول کے نئے بورڈ کی نقاب کشائی اور اسکول کی نئی تعمیر شدہ بلڈنگ کا رسمِ افتتاح شری بھائی صاحب ساونت (صدر ضلع پریشد رتناگیری) کے ہاتھوں سے ہوا۔ چند سال پہلے سابق وزیر زراعت شری پی۔ کے ساونت کے ہاتھوں اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا اور اس وقت وہ ترلوٹ ہائی اسکول کے نام سے موسوم تھا، مگر اب اسے ابراہیم بابا ٹھاکور ہائی اسکول ترلوٹ نام دیا گیا ہے۔

اسکول کی عمارت میں سائنس لیبوریٹری کے کلاسوں کا افتتاح ترلوٹ کے ہر دلعزیز نوجوان اور ترلوٹ ہائی اسکول کے بلڈنگ فنڈ میں ۵۱ ہزار کا عطیہ دینے والے مخیر مخلص جناب عبدالغفور ابراہیم ٹھاکور نے فرمایا اور ٹیلرنگ کلاس کا افتتاح شری امرت راؤ رانے سبھاپتی تعلقہ دیوگڑھ پنچایت سمیتی نے کیا۔ جغرافیہ اور اسکاؤٹنگ کلاس کا افتتاح جناب زین الدین بغدادی صاحب اُپ سبھاپتی تعلقہ دیوگڑھ پنچایت سمیتی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

افتتاحی تقریب کے بعد ایک جلسۂ عام اسکول کے بالاخانہ پر تعمیر کردہ ہال میں ہوا جس کی صدارت دیوگڑھ تعلقہ کے M. L. A. شری راجہ بھاؤ میراشی نے فرمائی۔ جناب اسماعیل دادو صاحب نے تلاوتِ قرآن سے آغاز کیا، اور طلبہ و طالبات نے حمد و نعت پڑھی۔ بعد میں جناب عبدالغفور ٹھاکور چیرمین ترلوٹ ہائی اسکول کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ مقررین میں بھائی ساونت صاحب، امرت راؤ رانے، زین الدین بغدادی، شری وائیکل (صدر تعمیرات ضلع پریشد رتناگیری)، راجہ پور شہر کے میونسپلٹی کے صدر جناب قاضی صاحب۔ نوجیون ہائی اسکول راجہ پور کے پرنسپل جناب فیض احمد، آئیڈیل ایجوکیشن سوسائٹی کے نائب صدر ڈاکٹر محمود دیشمکھ، راجہ پور کے جناب شمس الدین چھاپڑکر، جناب عبدالغفور ابراہیم ٹھاکور، ترلوٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مشتاق [illegible] صاحب، یونیٹی ایجوکیشن سوسائٹی [illegible]

کے جنرل سکریٹری جناب عبدالقادر ٹھاکور اور جناب حاجی عثمان عبداللطیف ٹھاکور نے اپنے اپنے انداز میں اسکول کی ترقی کو سراہا اور اسکول کی نمائش کو پسند کرتے ہوئے اپنے اچھے خیالات پیش کئے۔ اس تعمیری کام کے لیے ترلوٹ کے چند نوجوانوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک فنڈ قائم کیا تھا جس میں سب سے پہلے ترلوٹ کے نوجوان جناب عبدالغفور ابراہیم ٹھاکور نے اپنے طور پر اکیاون ہزار روپے /5100 نقد عطیہ فنڈ میں دیا۔ اور پھر رتناگیری ضلع کے مخیر حضرات اور ترلوٹ کے نوجوانوں نے اپنے اپنے عطیات کو فراخدلی سے دے کر اس چھوٹے سے قصبہ میں یہ شاندار عمارت جس کی لاگت پر تقریباً دو لاکھ روپیہ خرچ آیا ہے تعمیر کی ہے۔ خدا کرے یہ شمع علم جو روشن ہوئی ہے اس کی روشنی دور دور تک پھیلے۔ بالخصوص راجہ پور، دیوگڑھ، وجے درگ، ساکھرے، رزامباری، کاکھل، واگوٹن، میچے، گوریاں، آنبور، نوانگر، شرلوٹ ودیگر گاؤں وقصبات کے باشندے اس سے فیضیاب ہوں۔

مدرسہ محمدیہ ینگاری کا افتتاح

تعلیمی کمیٹی ینگاری (بمبئی) مقرر کردہ جماعت المسلمین ینگاری تعلقہ داپولی ضلع رتناگیری کے زیر اہتمام مدرسہ محمدیہ کا شاندار جلسۂ افتتاح مورخہ ۳ فروری ۷۳ء کو قصبہ ینگاری میں انعقاد پذیر ہوا۔ مدرسہ کا افتتاح سرپنچ گرام پنچایت جناب عباس لالہ میاں انعامدار نے کیا اور جلسہ کی صدارت کے فرائض جناب شوکت علی ابراہیم نے انجام دیئے۔ اس افتتاح کے موقع پر باشندگان ینگاری کے علاوہ پڑوسی گاؤں کے حضرات بھی حاضر تھے۔ مذکورہ بالا جماعت نے تعلیمی اور تعمیری فنڈ کی خاطر مارچ ۶۸ء میں ایک پروگرام منعقد کیا تھا۔ فی الحال مدرسہ ہذا میں تقریباً ساٹھ بچے عربی و اردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

انتقال پُر ملال

★ معروف سوشل ورکر جناب ابراہیم چوگلے متوطن گولکوٹ کے والد ماجد جناب عبدالغفور چوگلے صاحب یرقان میں دو مہینے کی علالت کے بعد ۸ مارچ ۷۳ء کو انتقال کر گئے۔ مرحوم بہت ہی خلیق، ملنسار اور صلح پسند آدمی تھے۔

★ بمبئی کے مشہور قاضی حسن مرگھے صاحب طویل علالت کے بعد اسماعیلیہ ہاسپٹل بمبئی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال تھی اور بمبئی کے سماجی حلقوں میں کافی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

★ ماہ نامہ نقش کوکن کے سابق مدیر اور روزنامہ اجمل کے ایڈیٹر جناب عثمان حسین خان صاحب کے بھائی یوسف خان کا ۱۸ مارچ ۷۳ء کو انتقال ہوگیا۔

★ مہاراشٹر کالج بمبئی کے فارسی کے لکچرار اور اردو کے ممتاز مقرر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ۲۵ مارچ ۷۳ء کو رحلت فرما گئے۔ مرحوم کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ مرحوم کا تعلق روزنامہ خلافت سے بھی رہا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۵۲ سال تھی۔

★ جناب عبدالرحمان قادر شیخ (ساکن ساکھرطی ضلع رتناگیری) کے نوجوان فرزند ابراہیم شیخ کا ۲۳ / ۲۴ جنوری کو ایک حادثہ میں پانی میں گر کر انتقال ہوگیا۔ جوان عمری میں بھی مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

★ جناب جمال الدین عبدالعزیز سارنگ (متوطن راجہ پور ضلع رتناگیری) کے والد بزرگوار جناب عبدالعزیز فخرالدین سارنگ کا بمبئی میں مورخہ ۱۵ جنوری بروز پیر انتقال ہوا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مرحومین کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

★

AQSH-E-KOKAN (BOMBAY) APRIL 1973 Regd. No. MH-723
Licensed to post without prepayment under Licence No. 203, Bombay. Regd. No. 11564/11/62.

...ed at AJMAL PRESS, Bombay-3. and Published from 44, Jail Road (East), Bombay-9. by Dr. A. M. NAIK ... NAQSH-E-KOKAN Publication Trust. Bombay-9. Title Cover Printed at AMIN ART PRINTING PRESS, Bombay

75 PAISE

EID
&
DIWALI NUMBER

قارئینِ نقشِ کوکن کی خدمت میں عید اور دیوالی کی دوبالا خوشیاں مبارک ہوں۔

ماہنامہ نقش کوکن بمبئے

نومبر ۱۹۷۳ء

جلد نمبر ۱۳ شمارہ نمبر ۱۱

عید نمبر

اعزازی ایڈیٹر :- ڈاکٹر عبدالستار دلوی
ایم اے، پی ایچ ڈی

اعزازی معاون ایڈیٹر :- پروفیسر یونس اگاسکر
ایم اے

مجلس مشاورت :- ڈاکٹر میمونہ دلوی ایم اے، پی ایچ ڈی
یوسف ناظم ایم اے
پروفیسر اے بی دادرکر ایم اے
بدیع الزماں خاور

طابع و ناشر :- ڈاکٹر عبدالکریم نائیک ایم بی بی ایس، ایف سی جی پی، ڈی پی ایم

ملکیت :- نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ

رجسٹرڈ نمبر :- E 3006

زر سالانہ :- ۸ روپئے

بیرونِ ممالک :- ۱۵ شلنگ برٹش پوسٹل آرڈر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ نقش کوکن ۴۳ چیل روڈ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹

ٹیلیفون نمبر ۳۳۱۵۷۲

رکن انڈین لینگویجز نیوز پیپر ایسوسی ایشن بمبئی

تمام تنازعات صرف سماعت عدالت ہائے بمبئی کو ہوگا۔

قیمت :- ۷۵ پیسے

مقام طباعت :- ایجو پریس بمبئی ۳

تاریخ اشاعت یکم نومبر ۱۹۷۳ء

اس شمارے میں

ن ع ص صاد

توجّہ طلب

تاریخ عالم کے ملاحظے سے واضح ہوگا کہ جو مسلمان شمالی مغربی دروں کے راستے سے ہندوستان میں آئے وہ خواہ کسی ملک یا خطّے کے رہنے والے ہوں، ایران کی تہذیب اور کلچر میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کا تخیّل اور ان کی زندگی اُس کلچر سے متاثر تھی جس کا ابتدائی خاکہ شاہنامہ میں پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایرانی کلچر اور لٹریچر کا رنگ ان کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا تھا اور چوں کہ ایرانی اور اندو آرین یعنی ہندوستان میں آنے والے آرین ایک ہی تنے کے دو ٹہنے تھے جس کی تشریح غیر ضروری ہے، اس وجہ سے ان مسلمانوں کے کلچر اور ہندوستانیوں کے کلچر میں بہت ہم آہنگی اور اپنائیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو، ہندو رہ کر اور مسلمان، مسلمان رہ کر اس خوش اسلوبی سے شیر و شکر ہوگئے کہ رواداری اور سبھیتا کے اوتار بن گئے۔ یہ جملے جھگڑے اور فتنے اُٹھانے کے ہیں کہ مفتوح اپنے فاتحوں پر غالب آگئے یا یہ کہ فاتح اپنی فاتحانہ خود اعتمادی اور انفرادیت سے محروم ہوگئے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں کلچروں کے مزاج کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ ان کا رد عمل ہونا ہی اور ارتباط کا قایم ہونا تھا۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی : ہندو مسلم کلچر

ترتیب

اداریہ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

پچھلے دو سالوں میں اُردو کی کئی معتبر ہستیاں ہم سے جُدا ہو گئیں، ان ہستیوں کا ہم سے جُدا ہو جانا اس دَورِ ابتلا میں اُردو اور اُردو والوں کے حق میں بہت ہی نقصان دہ رہا۔ چند ایسی شخصیت ہم سے جُدا ہو گئیں کہ جو اپنے جذبۂ اخوت محبت اور علم کی بنا پر ہمارے لیے بہت بڑا ذہنی اور اخلاقی سہارا تھیں۔ ایسی ہی شخصیتوں میں سجّاد ظہیر اور ڈاکٹر تارا چند بھی تھے۔ سجّاد ظہیر اردو کے ایک بلند قامت ادیب اور ناول نگار تھے۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک انھیں کے زیرِ سایہ پھلی پھولی اور ایک تناور درخت کی صورت میں سارے اردو ادب پر چھا گئی۔ ان کی شخصیت سایہ دار درخت کی سی تھی۔ اُردو کے نئے اور پُرانے ادیب اور شاعر اسی سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے لیے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ اس تحریک نے جس کے میرِ کارواں سجّاد ظہیر تھے، ہمیں کیا کچھ نہیں دیا، اچھی شاعری، تنقید، افسانے، ناول، سبھی اصنافِ ادب میں اس تحریک کے زیرِ اثر گراں قدر اضافے ہوئے۔ خود سجّاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات"، "روشنائی"، "ذکرِ حافظ" اور "اردو ہندی ہندوستانی" جیسی اہم کتابیں لکھیں جن میں اول الذکر کا شمار اردو کے منتخب ناولوں میں ہوتا ہے اور "روشنائی" ترقی پسند تحریک کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس بلند قامت ادیب اور نقاد کا روس (الماآتا) میں ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر تارا چند ملک کے مشہور ماہرِ تعلیم، مورخ اور ادیب تھے۔ مورّخ کی حیثیت سے انھوں نے اپنے عہد پر یادگار نقش چھوڑے ہیں۔ وہ ہمیشہ تاریخ پر مثبت نقطۂ نظر سے غور و فکر کرتے تھے اور ہندو مسلم یکجائی پر زور دیتے تھے، ان کا صاف ذہن ہمیشہ اس بات میں کوشاں رہا کہ ہمارے ملک کی صحیح تاریخ کو پیش کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے شخصیات سے زیادہ سماجی تاریخ پر زور دیا۔ ان کی "اہلِ ہند کی مختصر تاریخ"، "ہندوستانی ثقافت پر اسلام کا اثر" اور "تاریخ تحریکِ آزادی" عالمانہ بصیرت اور کھلے ذہن کی بہترین مثالیں ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند نہ صرف اسلامی تہذیب و ثقافت سے بہت متاثر تھے بلکہ اپنے تاثرات کو دُور دُور تک پہنچاتے بھی رہے۔ وہ فارسی اور اردو کے بھی جیّد عالم تھے۔ زبان و ادب کے مسائل پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ ہندوستانی اکیڈمی سے عرصہ تک وابستہ رہے اور گاندھی جی کی ہندوستانی کی تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ وہ ہندوستان کے ایران میں سفیر بھی رہے اور راجیہ سبھا کے ممبر بھی۔ ڈاکٹر تارا چند نے ۱۱ اکتوبر کو الٰہ آباد میں ۸۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ خدا مرنے والوں کو جنت نصیب کرے۔

مفتون کوٹوی

ہم میں سے ہو ہر اک کو مُبارک بہارِ عید

تابانیٔ ہلال سے روشن ہوا اُفق
اہلِ معاشرہ! تمھیں میرا سلام عید
دل کی بشاشتوں سے ہیں چہرے کی تابشیں
چہرہ کی تابشوں میں نہاں ہے پیامِ عید
خوشیوں سے مست ہو گئے خورد و کلاں سبھی
سرشاریاں وہ ساتھ میں لایا ہے جامِ عید
ظاہر لباس و جسم سے ہے رنگِ انبساط
پوشیدہ کیا مسرتیں رکھتا ہے نامِ عید!
پہنچا یا ماہِ نو نے پیامِ عرب ہمیں
اوجِ فلک سے سوئے زمیں ہے خرامِ عید
پُر کیف صبحِ عید ہے مثلِ بہارِ گُل
روشن ہے چاند تاروں کی مانند شامِ عید
حکمِ خدا جو صدقِ دلی سے ادا ہوا
انعام میں یہ روزِ مُبارک عطا ہوا
فرمانِ رب پہ دل بھی جھکا سر کے ساتھ ساتھ
قلب و نگاہ دونوں نے پائیں بلندیاں
معبود و عبد کا ہوا مضبوط ربط اور
یعنی قبول حاکمِ ربِ دو جہاں
افطار ہو کہ فطرہ تراویح یا سحر
ہیں ان پہ روزہ دار کی پابندیاں عیاں
پابندیوں سے سارے رہے محو نظم و ضبط
انسان نظم و ضبط سے مسرور و شادماں

مقصود اتقا ہے جو ہے وجہِ ارتقاء
بے اتقاء یہ زیست، نہ شاداں نہ کامراں
پاکیزگیٔ فرد سے پاکیزگیٔ قوم
دونوں سے مل کے بزمِ دو عالم ہے ضو فشاں
انسان ہے خلیفۂ خلّاقِ کائنات
اس تربیت سے اس کو بنانا ہے خوش صفات
تعلیم ضبطِ نفس بھی تلقینِ زہد بھی
روزوں کی تابشوں نے دیا روح کو جمال
زردار نے زکات ادا مفلسوں کو کی
خوشیوں میں سارے ہو گئے باہم شریکِ حال
پایا وہ درسِ اُنس و رواداریٔ بہم
آپس میں ہو گیا ہے دلوں کا بھی اتصال
چھوٹے بڑے امیر و گدا مل گئے گلے
سارے سماج میں ہے مساوات کا خیال
روزوں میں پائی روح و بدن نے وہ تربیت
نظریں بھی پُر جمال ہیں دل بھی ہے پُر جمال
گزرے جو اتقا و عبادت میں زندگی
دامن کو چھوئے پھر جو کثافت یہ کیا مجال؟
ہم میں سے ہو ہر اک کو مُبارک بہارِ عید
چھایا رہے دلوں پہ ہمیشہ شعارِ عید

شفیع عقیل

مجید لاہوری

اکبر کا جانشین

اردو نظم گوئی کی تاریخ میں مزاح نویسی اور طنز نگاری کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اُردو شاعری ہے۔ مزاحیہ اور طنزیہ اشعار کا وجود اردو شاعری کے بہت ابتدائی دَور میں بھی ملتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شروع شروع میں مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں جو کہی اور لکھی جاتی تھیں ان کی کوئی سماجی یا تعمیری حیثیت نہیں تھی۔ کیوں کہ ان مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں لکھنے والوں کے پیشِ نظر کوئی سماجی نقطۂ نگاہ نہیں ہوتا تھا۔ نہ وہ اِس سے کوئی تعمیری کام لینا چاہتے تھے اور نہ اس سے معاشرے کی کسی بُرائی کو ظاہر کرتے تھے۔ اُس وقت اس قسم کی شاعری کے صرف دو ہی مقصد ہوا کرتے تھے: ایک تو یہ کہ وہ صرف محدود محفلوں اور یار دوستوں کی مجلسوں میں ہنسنے ہنسانے کے کام آتی تھی۔ لکھنے والوں کا مقصد صرف تفریحِ طبع ہوتا تھا۔ وہ ایسی نظمیں کہتے تو صرف شعوری طور پر تھے لیکن وطنز و مزاح کو بحیثیت موضوع شعوری طور پر نہیں اپناتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس قسم کی نظموں میں جو یار دوستوں کی تفریحِ طبع کے لیے لکھی جاتی تھیں فحاشی کے وہ وہ جوہر دکھائے جاتے تھے کہ تہذیب و شرافت کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کلام کی نہ اشاعت ہوتی تھی اور نہ یہ لوگوں میں پھیلتا تھا۔ صرف سینہ بہ سینہ بزرگوں کا ورثہ بنا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار کی نہ ہم کوئی سماجی حیثیت متعین کر سکتے تھے اور نہ فنی۔ دوسرا مقصد اس قسم کی نظموں کا ہجو گوئی تھا۔ ہجو گوئی میں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کے لیے طنز و مزاح کو استعمال کیا جاتا تھا۔ سودا، انشا اور مصحفی کے نام اس سلسلے میں آسانی سے لیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک اُردو نظم میں طنز و مزاح سے یہی کام لیا جاتا رہا ہے۔ اگر کسی شاعر نے انفرادی طور پر چند اشعار کہہ بھی دیے تو ان کی حیثیت ایسی نہ بن سکتی تھی کہ ان پر شاعری کی کوئی روایت قائم ہو سکتی اور انھیں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا۔

اُردو شاعری میں اکبر الٰہ آبادی وہ پہلا شاعر ہے جس نے مزاحیہ اور طنزیہ شاعری سے شعوری اور باقاعدہ طور پر کوئی تعمیری کام لینے کی کوشش کی اور اس کا ایک صحت مند پہلو اُجاگر کیا۔ اور اس کے بعد کئی ایک شاعروں نے اس طرف توجّہ دی۔ جن میں اقبال اور ظفر علی خاں بھی شامل ہیں۔ مگر یہ لوگ اس میدان کے شاہ سوار نہ تھے۔ اس لیے ان کی یہ حیثیت دوسری حیثیتوں کے پیچھے چھُپ گئی۔

موجودہ دَور کے شاعروں نے طنز و مزاح کو اپنا ہے۔ ان میں مجید کے علاوہ سیّد محمد جعفری، ضمیر جعفری، حاجی لق لق، ظریف جبل پوری اور مرزا محمود سرحدی شامل ہیں

سید محمد جعفری کی شاعری اچھی ہونے کے باوجود اتنی محدود شاعری ہے کہ اسے مقامی شاعری کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ جو شخص دہلی میں نہ رہا ہو اور وہاں کی سڑکوں اور گلیوں کے نام نہ جانتا ہو، وہاں کے مخصوص محاوروں سے ناآشنا ہو، اس کے لیے ان کی شاعری بیکار ہے۔ جہاں تک ظریف جبلپوری اور حاجی لق لق کا تعلق ہے تو ان دونوں کے یہاں موضوع کا فقدان ہے۔ ان کی شاعری میں نہ نئے پن کا احساس ہے اور نہ خیالات میں جدت۔ رہ گئے ضمیر جعفری اور مرزا محمود سرحدی، تو ضمیر جعفری کو اچھا لکھتے ہیں لیکن وہ بہت کم لکھتے ہیں، اور مرزا محمود سرحدی ابھی تک سرحد کے علاقے سے باہر نہیں آئے۔ ان سب ناموں میں مجید کا نام بہت نمایاں اور سرفہرست ہے۔ انھوں نے طنز و مزاح کو جس طرح اپنی شاعری میں سمویا، اس طرح اور کوئی دوسرا شاعر نہ اپنا سکا۔

اکبر کے بعد مجید وہ پہلے مزاحیہ شاعر ہیں جو اس قدر مقبول ہوئے۔ ان کے مقبول ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ان کے پاس موضوعات ہیں۔ مناسب زبان ہے۔ خیالات کا فقدان نہیں۔ وہ ایک بات کو اچھے سے اچھے انداز میں ادا کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ وہ مزاح لکھنا بھی جانتے ہیں اور انھیں کسی پر طنز کرنا بھی آتا ہے۔ وہ اپنے ماحول اور معاشرے پر جس خوب صورتی سے طنز کرتے ہیں۔ وہ جس قدر بھرپور ہوتا ہے اتنا ہی مؤثر بھی ہوتا ہے۔

مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کے سلسلہ میں مجید کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ان کی کامیاب اور اچھی نظموں میں "غنڈہ ایکٹ"، "مردم شماری کے بعد"، "آزادیوں کا دور ہے"، "دستور بن رہا ہے"، "گدھے"، "ایک پیسے میں چار دیکھو"، "دے خدا کی راہ میں"، "چنگیز خاں" کو ووٹ دو"، "یہ کیسی آزادی"، "گڈ بائی"، "بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"، "نئے بھکاری"، "ملک اپنا ہے راج اپنا ہے"، "کل بھی آزاد تھے اور آج بھی آزاد ہیں"، "تمام جہاں دار جہاں آفریں"، "عید مبارک" وغیرہ شامل ہیں ——

"منکہ ایک منسٹر ہوں" ان کی ایک کامیاب طنزیہ نظم ہے، جس میں انھوں نے ہمارے موجودہ حکمراں طبقہ کی اس ذہنیت پر طنز کیا ہے جس کے تحت وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کا مبلغ علم اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ حکمراں ہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ ہر بات میں رائے دینا اور پھر اسے حتمی تصور کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کے وزیروں پر اس نظم میں بھرپور اور کاری طنز کیا گیا ہے۔ اور پھر اسے پوری نظم میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ نبھایا گیا ہے۔ نظم دیکھیے ؎

مرغیوں پر بھی میں کرسکتا ہوں اظہارِ خیال
اور "سانڈوں" پر بھی ہوں محفل میں سرگرمِ مقال
ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کرسکتا ہوں میں
اکبر و اقبال کی تفسیر کرسکتا ہوں میں
"ہومیوپیتھک" ہو یا "دندان سازی" کا کمال
یا غبانی ہو کہ ہو رومی و رازی کا کمال
بات پھولوں کی ہو یا توپی ترانے کا بیاں
چاٹ ہو یا رہ مسالے کی کہ ہو اردو زباں
بوعلی سینا کی حکمت یات افلاطون کی
"ایگری کلچر" ہو یا شوق ہو کوئی قانون کی
داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ "ایٹم بم" کا راز
ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبطِ محمود و ایاز
مسئلہ تاریخ کا ہو یا ہو مبحث علم کا
فلسفہ "گلقند" کا ہو یا ہو قصہ قلم کا

کشتۂ فولاد ہو یا شربتِ دینار ہو
ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
شوق ہے دل میں مگر قرآن کی تفسیر کا
جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پہ ہوں میں چھایا ہوا
ہوں "فلسفر" مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ہمارے ملک کے بیشتر غلط قسم کے لیڈر اور ان کی عوام سے غداریاں اور وعدہ خلافیاں مجید کا خاص موضوع تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے سے بڑے لیڈروں کو بھی نہیں بخشا۔ انھوں نے جہاں بھی کوئی برائی دیکھی یا اسے محسوس کیا، اس پر لکھنے سے کبھی نہیں چوکے۔ غلط قسم کے لیڈروں کے فراڈ، عیاریاں اور دھوکے بازیاں، انھوں نے ان سب پر سے پردہ اٹھایا اور انھیں عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور خوب صورت نظم "آیا ہے الیکشن کا زمانا" بہت کامیاب نظم ہے۔ اپنی اس نظم میں انھوں نے غلط قسم کے لیڈروں اور رہنماؤں کی پول کھولی ہے کہ یہ لوگ الیکشن میں ووٹ لینے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ لیکن الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد برساتی مینڈکوں کی طرح آئندہ الیکشن تک ان کا اتا پتا نہیں ملتا۔ ان لوگوں کا شجرۂ نسب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے جنگِ عظیم میں انگریزوں کی مدد کی، ہزاروں لوگوں کو بھرتی کرا کے ان گنت ماؤں کو بے گود کر دیا۔ ہزاروں سہاگنوں کے سہاگ چھینے، بے شمار بچوں کو یتیم کرایا، اور پھر اس صلے میں ان لوگوں کو انگریزی کی طرف سے جاگیریں ملیں۔ اور خطابات سے نوازا گیا۔ اس نظم میں مجید کا یہی موضوع ہے ؎

اے ملتِ بیضا! ترا خادم ہوں پرانا
افسوس کہ تو نے مرے رتبے کو نہ جانا
ہر کوہ کو ناپا ہے ہر اک دشت کو چھانا
انگریز نے لوہا مری چترائی کا مانا
پھر خیر سے آیا ہے الیکشن کا زمانا
میں خان بہادر ہوں مجھے بھول نہ جانا

عہدوں کا ہمیشہ ہی طلب گار رہا ہوں
کرسی کا بہر حال پرستار رہا ہوں
سب جانتے ہیں حامیِ سرکار رہا ہوں
حاکم ہو کوئی اس کا وفادار رہا ہوں
پھر خیر سے آیا ہے الیکشن کا زمانا
میں خان بہادر ہوں مجھے بھول نہ جانا

چندہ بھی دیا اور جنگ میں بھرتی بھی کرائی
دادا نے مرے مکّے پہ گولی بھی چلائی
اور باپ نے انگریز سے جاگیر بھی پائی
ہمت نے مری جیتی تھی جرمن کی لڑائی
پھر خیر سے آیا ہے الیکشن کا زمانا
میں خان بہادر ہوں مجھے بھول نہ جانا

آج ہمارے جمہوری ملک میں جس طرح جمہوریت کا مذاق بنایا جا رہا ہے۔ جمہوریت کا نام لے لے کر جو جو دھاندلیاں کی جا رہی ہیں اور جمہوریت کے پردے میں جس طرح آمریت سے کام لیا جا رہا ہے مجید نے اسے موضوع بنا کر "جمہوریت" کے عنوان سے ایک بہت اچھی نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں جس طرح جمہوریت کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ جہاں ہمارے بعض رہنماؤں کے ہتھکنڈوں کو آشکار کرتا ہے وہاں عوام کے خفتہ ذہنوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت بھی ہے ؎

"اسّی" مل کر ایک زباں سے دن کو کہہ دیں رات
"بیس" کا ہے یہ فرض کہ جانیں اس کو سچی بات

یہ دورِ جمہور ہے بابا
یہ دورِ جمہور
ہم سب ہیں مجبور

"بچپن کی رائے میں ٹھہرے بھینس اگر بیس چین"
تو "چالیس پہ پانچ" بجائیں اس کے آگے بین

یہ دورِ جمہور ہے بابا
یہ دورِ جمہور
ہم سب ہیں مجبور

"اڑسٹھ" مل کر اک اُلّو کو گر کہہ دیں "پردھان"
"تیس پہ دو" جو ہیں وہ سمجھیں اپنے کو نادان

یہ دورِ جمہور ہے بابا
یہ دورِ جمہور
ہم سب ہیں مجبور

"نوّے پر نو" ہنستے ہیں اور ایک کبیر اُڑوے
چڑیاں چُگ گئیں کھیت تو بابا پچھتائے کیا ہوئے

یہ دورِ جمہور ہے بابا
یہ دورِ جمہور
ہم سب ہیں مجبور

یہاں پر میں مجید کے کلام کی ایک خاص شاعرانہ خوبی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجید نے اپنے مضامین نظم و نثر میں بیشتر جگہ مختلف زبانوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنے مضامین اور نظموں میں دوسری زبانوں کے الفاظ اس خوب صورتی کے ساتھ کھپا جاتے تھے کہ وہ اس زبان میں اپنے مروّجہ معنوں سے بھی زیادہ لطف دینے لگتے تھے۔ انگریزی کے الفاظ تو وہ عام طور پر استعمال کرتے ہی تھے لیکن مقامی زبانوں اور مختلف طبقوں کی زبان سے انھوں نے خصوصی فایدہ حاصل کیا ہے۔ وہ جس قسم کا کردار لاتے ہیں اسی کی زبان دیان میں اس کے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ بات بجائے خود ان کی شاعری کی ایک خوبی بن گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں "بمبئی والا گجل"، "گلشیر خاں کا غزل"، "رانجھے خاں کا غزل"، "جیک کا نظم سنڈے کے سنڈے" اور "دہلی کا تحفہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"بمبئی والا گجل" میں انھوں نے بمبئی کے سیٹھوں کی زبان استعمال کی ہے۔ "گلشیر خاں کا غزل" پٹھانی اردو میں ہے۔ "رانجھے خاں کی غزل" میں اردو کے ساتھ پنجابی کو ملایا ہے "جیک کا نظم سنڈے کا سنڈے" اس اردو میں لکھی ہے جو عام طور پر اردو نہ جاننے والے انگریز بولتے ہیں۔ اور "دہلی کا تحفہ" میں انھوں نے دہلی کے کرخنداروں کی زبان استعمال کی ہے۔ اس فن میں مجید کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اکثر و بیشتر نظموں اور مضامین میں مقامی زبانیں ملا کر بڑی اچھی تخلیقات کی ہیں۔ گو اس سے پہلے مُلّا رموزی نے گلابی اردو لکھ کر اس قسم کی کوشش کی تھی۔ بلکہ وہ تو ساری زندگی ہی گلابی اردو لکھتے رہے۔ مگر ان کا ایک ڈھرّا بن گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زبان مقبول نہ ہو سکی۔ اس میں یکسانیت اُکتا دینے کی حد تک آ گئی تھی۔ مجید نے اس سلسلے میں کسی ایک زبان یا کسی ایک انداز پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ہر مقامی اور ہر طبقے کی زبان کو اردو میں ملا کر بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ "اجنتُ کھُدا نے دیا" ان کی اسی قسم کی ایک نظم ہے۔ اس نظم میں انھوں نے خاص قسم کے سیٹھوں کی زبان استعمال کی ہے اور خوبی سے اسے نبھایا بھی ہے

جا ستی تو نہیں قریبی مو تیو جرا پانچ چھو چو پڑی تو پڑھیلا ہے ہم
پانچ چھو چوپڑی پڑھ کے کتی یں گتی بھی لاکھوں کا بیچ نس کر لیا ہے ہم
ہم کو اجنت یہ سارا کھُدا نے دیا آج موٹر کے اوپر چڑھیلا ہے ہم
ہم کو دولت یہ سارا کھدا نے دیا
ہم کو اجنت یہ سارا کھدا نے دیا

ہم کو اجنت یہ سارا "کھدا" نے دیا
ہم نے مٹی کو سونا بنا کر دیا اس میں بھی خوب پیسا "کھدا" نے دیا
"بلیک" ہم نے کیا تو یہ "موٹر" یہ "مل" یہ زمیں اور یہ "بنگلا" "کھدا" نے دیا
ہم نے پیسا لگایا "ڈبل نوٹ" میں دولت اس میں بھی "کھدا" نے دیا
ہم کو دولت یہ سارا "کھدا" نے دیا
ہم کو اجنت یہ سارا "کھدا" نے دیا

ہم کو اجنت یہ سارا "کھدا" نے دیا
وہ یہ بولا "صدارت" بڑی چیز ہے اس نے بولا "تجارت" بڑی چیز ہے
تم نے بولا "سفارت" بڑی چیز ہے اور یہ بولا "حکومت" بڑی چیز ہے
ہم نے بولا کہ دولت سبھی سے بڑی سب نے بولا کہ دولت بڑی چیز ہے
ہم کو دولت یہ سارا "کھدا" نے دیا
ہم کو اجنت یہ سارا "کھدا" نے دیا

مجید کا خاص طور پر مزاحیہ شاعری میں ایک اپنا اور مخصوص اسٹائل ہے جس کی وجہ سے وہ فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اکثر مشہور شعرا کے اشعار میں تصرف کیا ہے اور محض چند الفاظ کی تبدیلی سے انھیں جس طرح اپنے دور کی سیاست اور معاشرت پر منطبق کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ وہ اپنے اشعار میں انگریزی الفاظ کو جس خوب صورتی سے باندھتے تھے اور ان کے معنوں سے جس قدر فایدہ انھوں نے اٹھایا ہے وہ طرز ادا انھیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے دور کے سیاسی جوڑ توڑ، محلاتی سازشوں اور عوامی مسائل کو جس طرح انھوں نے پیش کیا ہے اور پھر ان مسائل و واقعات پر جس ہلکے پھلکے انداز میں اور طنزیہ مزاحیہ رنگ میں جس طرح تنقید کی ہے، یہی ان کا مخصوص اسٹائل تھا۔

ذیل میں ان کے مزاحیہ کلام کے چند اشعار دیے جا رہے ہیں۔ گو یہ چند اشعار ہیں اور کسی شاعر کی صحیح حیثیت متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بیشتر کلام سامنے رکھا جائے۔ لیکن ان چند اشعار ہی کے مطالعے سے ان کا مخصوص اسٹائل ضرور سامنے آ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے مزاح میں ایک طرح کی انفرادیت آ گئی ہے اور وہ سینکڑوں میں رہ کر بھی فوراً پہچانے جا سکتے ہیں۔

نوٹ ہاتھوں میں رشوت کے لیے پھرتے ہیں
"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے"

سو پشت سے پیشہ آبا "گداگری"
کچھ "لیڈری" ذریعۂ عزت نہیں مجھے

خدا کے واسطے مجھ کو "منسٹری" دے دو
"مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے"

سن کے بولے وہ مری روداد غم
یہ تو "مسلم لیگ" کا اعلان ہے

"سیاست بے ضیافت جلوا پیدا کر نہیں سکتی"
"ڈنر" چالو رہیں جس میں سیاست اس کو کہتے ہیں

زاہد کو سکھا دیجیے آداب مجلس کے
پیتے ہیں شراب اول کھاتے ہیں کباب آخر

رہ گیا ہے اب "ڈنر" تک ساری تقریروں کا زور
قوم ہے ہوٹل سے باہر لیڈری ہوٹل میں ہے

گدھوں پہ لاد کے ہم بوجھ "ذمہ داری" کا
یہ کہہ رہے ہیں کوئی آدمی نہیں ملتا

تم کل تھے ایک چھوٹی سی مسجد کے پیش امام
"ہم کو دعائیں دو تمھیں لیڈر بنا دیا"

ہمارے حال پر سرکار کتنی مہربانی ہے
نہ ایندھن ہے، نہ چینی ہے، نہ گھی ہے نہ پانی ہے

اُن کے وعدے اُف توبہ!
"یو این او" کی باتیں ہیں!

اس کو بزنس کی ضرورت نہ کسی سروس کی
"جس کی قسمت میں ہو اس قوم کا لیڈر ہونا"

دامنِ وضعِ کہن جب پارہ پارہ ہوگیا
اوڑھنی مفلر بنی ، برقع غرارہ ہوگیا

چمن ہوٹل میں یہ رمضان کے بعد بیٹھے ہیں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

"لیگ سازی" دن میں شب کو شاعری
بس یہی "انڈسٹری" ہے آج کل

مرغیاں، کوفتے، مچھلی، بھنے تیتر، انڈے
کس کے گھر جائے گا سیلابِ غذا میرے بعد
سینکڑوں پلاؤ بنا کر تجھے دوں گا اے دوست
جن کے پڑھنے سے ہو ہیضوں کا بھلا میرے بعد

ضیا ھانی

نورِ نگاہِ روزہ دار

تخمیس بر کلامِ علامہ اقبالؒ

اے ہلالِ صوم آیا ہے تو با صد افتخار
روزہ رکھنے کے لیے لایا ہے حکمِ کردگار
تیس۳۰ دن کے بعد اُفق پر پھر ہوا ہے جلوہ بار
غرۂ شوال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لیے مُسلم سراپا انتظار

تو زمانے کے لیے اک دولتِ جاوید ہے
تجھ سے وابستہ دلِ مایوس کی اُمید ہے
زندگی بخشِ دلِ بیمار، تیری دید ہے
تیری پیشانی پہ تحریرِ پیامِ عید ہے
شام تیری کیا ہے صبحِ عیش کی تمہید ہے

یاد آیا ہے کہ تصویرِ وفا ہوتے تھے ہم
آفتوں میں حاملِ صبر و رضا ہوتے تھے ہم
کھیل کر جانوں پہ ملّت پر فدا ہوتے تھے ہم
جس عَلَم کے سائے میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم
دشمنوں کے خون سے رنگیں قبا ہوتے تھے ہم

تیرے بس کی ہے نہ تیری ہمّت و جرأت کی ہے
یہ لطافت یہ ضیا تجھ میں جو ہے فطرت کی ہے
یہ مقدّر کی ہے خوبی، دین یہ قدرت کی ہے
تیری قسمت میں ہم آغوشی اُسی [illegible] ہے
حسنِ روز افزوں سے تیرے آبروئے ملّت کی ہے

ہے نشاط افزائے عالم منظرِ رنگیں ترا
ہے سرور و کیف آور، ساغرِ زریں ترا
یاد آتا ہے جو گزرا عہدِ پُر تمکیں ترا
آشنا پرور ہے قوم اپنی وفا آئیں ترا
ہے محبت خیز یہ پیراہنِ سیمیں ترا

ہوش کی دُنیا میں تو مُسلم کی پستی دیکھ لے
بے حسی، بے چارگی، غفلت پرستی دیکھ لے
بدلیاں ادبار کی ہر سُو برستی دیکھ لے
اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ

حسن الدین احمد

کتب خانہ سعیدیہ

چند سال قبل ڈاکٹر یوسف الدین صاحب بہ حیثیت صدر شعبۂ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ دمشق گئے تھے تو وہاں کے ناظم تعلیمات پروفیسر صلاح الدین المنجد نے وہاں کے مشہور کتب خانہ ظاہریہ کا معائنہ کروایا اور کہنے لگے "جب ہندوستان کے مسلمان ہمارے ملک کو آتے ہیں تو صرف یہاں کی قبروں کی زیارت کو جاتے ہیں، ہم سے اور ہماری کتابوں سے نہیں ملتے۔ دیکھیے اس کتب خانہ میں دس ہزار نایاب کتابیں ہیں۔" ڈاکٹر یوسف الدین نے کہا "میں صرف دس روز ٹھیر رہا ہوں اس لیے روزانہ ایک ہزار کتابوں کو دیکھنا ممکن نہیں ہے، آپ مجھے صرف نایاب کتابیں دکھلا دیجیے۔" جناب صلاح الدین المنجد نے فوراً ابن عساکر کی تاریخ دمشق منگوائی اور فرمایا "یہ ہمارے کتب خانہ کی قدیم ترین کتاب ہے لیکن یہ نامکمل ہے، میں نہیں جانتا کہ اس کے ما بقی اجزا کہاں ہیں۔" ڈاکٹر یوسف الدین نے اس کتاب کو دیکھ کر فوراً جواب دیا "حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں اس نایاب کتاب کے ما بقی اجزا موجود ہیں۔" اور واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ سعیدیہ کا شمار دنیا کے ان چند خاص کتب خانوں میں ہے جس کی کتابیں بہت نایاب اور کمیاب ہیں۔

ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ڈرامائی انداز میں یہ انکشاف اس وجہ سے کر سکے کہ کتب خانہ سعیدیہ ان کا خاندانی کتب خانہ ہے، اور انہوں نے آنکھیں کھولتے ہی اس علمی ذخیرہ کو دیکھا اور اس سے استفادہ کیا۔ یہ کتب خانہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ افسوس ہے کہ اہل ملک اس کی اہمیت سے ویسے واقف نہیں ہیں جیسے اس کا حق ہے۔ افراد کے لیے خاموش خدمت ایک مستحسن بات ہے، لیکن اداروں کے لیے یہی بات نامناسب ہے۔ اہل دکن یوں بھی منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ ان کا انکسار تو حد سے زیادہ ہے، جو افراد سے آگے بڑھ کر اداروں کو بھی اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ پھر اہل ملک کا تغافل اور بے رخی اس پر مستزاد۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ کتب خانہ جو بہ لحاظ اہمیت خدا بخش لائبریری پٹنہ سے کسی طرح کم نہیں، وہ شہرت حاصل نہیں کر سکا جو خدا بخش لائبریری یا رام پور کے شاہی کتب خانہ کو حاصل ہے۔

اس کتب خانہ کے بانی مفتی محمد سعید صاحب کا تعلق جنوبی ہند کے مشہور علمی خاندان اہل نوائط سے ہے۔ آپ ایک قاضی بدرالدولہ کے فرزند اور محمد غوث شرف الملک کے پوتے تھے۔ آپ کی ولادت ۳ جمادی الاول ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء کو بہ مقام مدراس واقع ہوئی۔ سر سالار جنگ اول نے آپ کے فضائل علوم کے لحاظ سے آپ کو حیدرآباد طلب فرمایا۔ ۱۸۷۱ء میں آپ کا تقرر بہ حیثیت رکن اول مجلس مرافعہ عمل میں آیا۔ عرصہ تک آپ عدالت دیوانی بلدہ کے ناظم بھی رہے، پھر مفتی عدالت العالیہ کے عہدہ پر فائز رہے۔ جامعہ نظامیہ اور دائرۃ المعارف کے قیام میں نواب مجاہد الملک کے ساتھ تعاون

فرمایا اور اس کی مجلسِ انتظامی اور علمی کمیٹی میں بہ حیثیت رکن شریک رہے۔ آپ کا انتقال دس شعبان ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء کو بہ مقام حیدرآباد ہوا۔ تاریخ النوائط میں ۱۳۱۴ھ درج ہوا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ سرکاری جریدہ اعلامیہ مورخہ ۲۴ شعبان ۱۳۱۲ھ میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا کہ

"مولوی صاحب ایک نہایت متدین اور بڑے فقیہ تھے۔ عہدۂ افتا، مجلس کو ان کی ذات سے اعزاز تھا اور ان کے انتقال سے مجلس میں ایک بڑا فقیہ اور فاضل کم ہو گیا۔"

کتب خانۂ سعیدیہ مفتی صاحب کے خاندانی ذخیرۂ کتب اور خود ان کی فراہم کی ہوئی نادر کتابوں پر مشتمل ہے۔ کتب خانۂ سعیدیہ مخطوطات کا ایک انمول ذخیرہ ہے جو پشت ہا پشت سے محمد سعید صاحب کے خاندان میں چلا آ رہا ہے نیز مفتی صاحب نے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ بغداد، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے علمی کتب خانوں سے نایاب علمی کتب کی نقلیں سو سال قبل کروائیں اور اپنے ذخیرہ کو اہمیت کا حامل بنایا۔ نواب عزیز جنگ ولا اپنی مشہور آفاق کتاب تاریخ النوائط میں فرماتے ہیں کہ "آپ کی آمدنی کا بیشتر حصہ جو تھا وہ ہمیشہ کتب خانہ کی تکمیل میں صرف ہوا کرتی تھی۔ بلادِ مصر و روم، شام، مکہ معظمہ، مدینہ مطہرہ اور ہندوستان کے مشہور شہروں میں آپ کے کاتب مقرر تھے۔ نایاب کتابوں کی بہت سی جلدیں نقل کے ذریعہ سے آپ کے کتب خانہ میں پہنچ جاتی تھیں۔" (تاریخ النوائط صفحہ ۲۵)

ستمبر ۱۹۳۲ء میں کتب خانہ سعیدیہ قومی اثاثہ بن کر تمام علمی دنیا کے استفادہ کے لیے عام ہو گیا اور اس کی موجودہ عمارت واقع جام باغ روڈ میں اس کتب خانہ کا افتتاح نواب سر نظامت جنگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ موجودہ عمارت مفتی صاحب کے بھانجے الحاج حافظ مولوی عبد العظیم کی زرِ خرید ہے۔ موصوف زندگی بھر کتب خانہ کے کاروبار اور انتظام میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے اور خود کو اس کتب خانہ کے لیے گویا وقف کر دیا۔ راقم الحروف کو مولوی عبد العظیم صاحب سے نیاز حاصل رہا ہے۔ ایسے پرخلوص کام کرنے والے کم نظر آتے ہیں۔ جب اس کتب خانہ سے گلستان سعدی کا قیمتی اور نایاب نسخہ چوری ہوا تو آپ کی جستجو اور کوشش سے اس کی بازیابی عمل میں آئی۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بھائی مولوی برہان الدین نے کتب خانہ کی ذمہ داری کو سنبھالا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد غوث نے معتمدی کے فرائض انجام دیے اور اب الحاج مولوی عبد الغنی بہ حیثیت معتمد اعزازی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان تمام اصحاب نے جس خلوص، انہماک، خاموشی اور انکساری کے ساتھ بے لوث خدمات انجام دیں وہ اسی خاندان کا حصہ ہے۔

کتب خانہ سعیدیہ کا ذخیرۂ کتب چار اقسام پر مشتمل ہے۔ (۱) اہلِ خاندان کی تصانیف جو انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں فنون تفسیر، حدیث، فقہ، سیر، عقائد، تاریخ، اخلاق، فلسفۂ اسلام، ہیئت، قرآن، تورات، انجیل وغیرہ پر لکھی ہیں۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے زاید ہے۔ ان میں بعض طبع ہو چکی ہیں اور اکثر ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ خود مفتی محمد سعید کی تصانیف مختلف فنون میں ۱۸ سے زاید ہیں۔

(۲) اہلِ خاندان کے ہاتھ سے نقل کی ہوئی یا کروائی گئی کتابیں۔ قدیم علما کا طریقہ یہ تھا کہ جو کتابیں ان کو حاصل ہو جاتیں ان کو نقل کر لیتے۔ خصوصاً یہ کام دور دراز کے سفر یا حج وغیرہ کے موقع پر ممکن ہوتا۔ چنانچہ تفسیر، تجوید، سیرت، فقہ، کلام، ہیئت، منطق، تاریخ وغیرہ پر ہزاروں قلمی کتابیں موجود ہیں۔ ان کی بڑی تعداد غیر مطبوعہ ہے۔

(۳) متقدمین کی خود ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں۔ نواب شرف الملک بہادر قاضی بدر الدولہ اور پھر مفتی محمد سعید خان نے متقدمین کی لکھی ہوئی نایاب قلمی کتابیں خریدیں۔ اگر وہ ناقص تھیں تو اس کو خود تحریر کر کے مکمل کر لیا۔ چند کتابیں بارھویں

صدی عیسوی کی اور متعدد تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

(۴) قلمی اور مطبوعہ عام کتب — حکومت ہند کے مجوزہ نمونہ پر انگریزی میں ایک کیٹلاگ شایع ہو چکا ہے۔ یہ کتب خانہ کے مخطوطات کی جلد اول ہے۔ اس کیٹلاگ کی رسم اجرائی فخر الدین علی احمد صاحب مرکزی وزیر حکومت ہند کے ہاتھوں جنوری ۱۹۶۳ء میں انجام پائی۔

اس کتب خانہ میں قلمی کتابیں پانچ ہزار سے زاید ہیں مطبوعہ کتابوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اس کتب خانہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا اور اپنے تاثرات یوں ظاہر کیے "یہ ذخیرہ اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اس کی حفاظت نہ صرف خاندان کے افراد کا بلکہ خود حکومت کا فرض ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے میں ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ جو کرنا ہے جلد کر لینا چاہیے کیونکہ زمانہ کے حالات بہت بدل رہے ہیں۔"

اسی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند نے ۸ مئی ۱۹۶۳ء کو اس کتب خانہ کا معائنہ فرما کر یوں رائے ظاہر فرمائی "پرانی قلمی کتابوں کا نہایت ہی گراں قدر مجموعہ یہاں ہے۔ حدیث، تفسیر اور رجال میں خصوصیت سے بے انتہا نوادر یہاں محفوظ ہیں۔ خطاطی اور جلد سازی کے بھی بہت اچھے نمونے ہیں۔ گلستان کا ایک نایاب نسخہ خط، جلد، آرائش ہر اعتبار سے بے مثل کہا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی علوم کی قلمی کتابوں کے اعتبار سے یہ کتب خانہ ہندوستان کے بہترین ذخیروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس خاندان نے اس کو ایک عالم کے لیے کارآمد بنانے کا ذمہ ا... سے رکھا ہے وہ قومی شکریے کا مستحق ہے۔"

لیکن اس خاندان کی ذمہ داری یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ وقت کا اقتضا ہے کہ اس کتب خانہ کے ساتھ علوم مشرقیہ کے ریسرچ کا ایک مرکز بھی ہو اور تمام دنیا سے آنے والے ریسرچ اسکالرز کے لیے مناسب سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور اجتماعی ریسرچ کا طریقہ رائج کیا جائے۔ چنانچہ اس کتب خانہ کی مجلس انتظامی نے ۳۱ اکتوبر کو شعبۂ ریسرچ کے لیے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ ریسرچ کرنے والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے انتظامات کیے جائیں گے۔ (میں نے اس مضمون کی تیاری میں غزنوی محمد افضل الدین اقبال کے مضمون اور تاریخ النوائط مولفہ نواب عزیز جنگ ولا سے استفادہ کیا ہے۔)

★
★ ★
★

هارون رشید انصاری

شگوفے

جب ایک مالدار آدمی کا انتقال ہوا تو اس کی بیوہ نے شوہر کی قبر پر کتبہ لگوانے کا آرڈر دیا اور ہدایت کی کہ کتبہ پر یہ الفاظ کندہ ہوں: "تم سکون اور آرام سے رہو۔"

اس کے بعد بیوہ وکیل کے پاس گئی۔ وکیل نے بیوہ کو یہ مایوس کن خبر سنائی کہ مرحوم نے اس کے لیے کچھ بھی پیسہ نہیں چھوڑا اور اپنی ساری جائیداد اپنے خاندان کے دوسرے عزیزوں کے نام کردی ہے۔ وہ غصّہ میں بھری ہوئی کتبے والے کے پاس گئی اور کہا "میں کتبے کا آرڈر منسوخ کرتی ہوں۔"

"مگر محترمہ وہ کو بن چکا ہے۔" کتبہ والے نے کہا۔

"اچھا تو پھر عبارت کے آگے یہ الفاظ بڑھا دو "میرے پہنچنے تک۔"

ایک دفعہ دو شرابی کار میں کہیں جا رہے تھے، ان میں سے ایک نے جو کار چلا رہا تھا، کہا "ہم شہر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔"

دوسرے نے پوچھا: "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

پہلے نے جواب دیا: "اب زیادہ آدمی ہماری کار کے نیچے آ رہے ہیں۔"

ایک صاحبہ نے جو شہر کی مشہور سماجی کارکن تھیں، ایک دن اپنے شوہر اور بیٹے سے کہا: "آج تو زندگی میں پہلی بار میں تمھیں اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاؤں گی، لیکن ایک شرط ہے اگر کھانا پسند نہ آئے تو مجھ سے کچھ کہنا نہیں، بس چپ چاپ ہم کسی ریسٹورنٹ میں چلے چلیں گے۔"

اس کے بعد انھوں نے بڑی محنت سے کھانا تیار کیا، جب وہ کھانا لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو شوہر اور بیٹا وہاں ریسٹورنٹ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

دو دوست اپنے رجحانِ طبع پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: "سمجھ میں نہیں آتا، میں مصوّر بنوں یا افسانہ نگار۔" دوسرے نے مشورہ دیا: "تم مصوّر بنو۔"

"کیا تم نے میری کوئی تصویر دیکھی ہے؟" پہلے نے پوچھا۔

"نہیں، مگر تمھارا ایک افسانہ پڑھا ہے۔" دوسرے نے کہا۔

قطعہ

مرے ندیم، مرے ہم نفس، مرے ہم دم
ہے عید آئی جلاتے ہوئے خوشی کے دیے
تمھارے لب پہ سدا مسکراہٹیں کھیلیں
خلوص دل سے دعا ہے یہی تمھارے لیے

محمد حسن قاضی

یعقوب راہی

(۱)
"جب کبھی تیز ہوا چلتی ہے"

جب کبھی تیز ہوا چلتی ہے
ڈوبتی آس کی مانند
کوئی بوڑھا پیڑ
لڑکھڑاتا ہے
کسی کھائی میں گر جاتا ہے۔

بھولی بسری یادوں کی طرح
پتے جھڑتے ہیں
بکھر جاتے ہیں،
اور آوارہ ہوا
وقت کی طرح دبے پاؤں گزر جاتی ہے
آنے والی کسی آندھی کا پتا دیتی ہے!!

(۲)
"پھر اکیلے ہی چلو"

ساتھیو!
پھر چلو
اس دھند سے ٹکرا کے چلو

زندگی
کش مکش و جنگ و سفر جب ٹھہرے
کش مکش سے نہ ڈرو
ظلمتِ شب سے اُلجھ جاؤ
اندھیروں میں بھٹکتا ہوا سورج ڈھونڈو۔

اپنے دشمن کو کبھی دوست نہ سمجھو
اُسے دشمن ہی کہو
اُس کی ہر چال پہ نظر رکھو
جب بھی موقع ملے اس کو گھیرو
فتح کے جشن تلک لڑتے رہو۔

بھول جاؤ کہ اکیلے ہو
اکیلے ہی چلو
بیچ رستے میں جو بچھڑے ہیں
بچھڑ جانے دو
ہاں! یہ سمجھو
وہ فقط چھاؤں کی خاطر ہی چلے آئے تھے
جب بھی رستے میں کوئی چھاؤں ملی
وہ تھکے ہارے وہیں بیٹھ گئے۔

ساتھیو
پھر چلو
اس دھند سے ٹکرا کے چلو
تم اکیلے ہو، اکیلے ہی چلو۔

شیوراج بہار

موجِ بہار

نا اُمیدی بھی کیا سہارا ہے
اب تو ہر موج اِک کنارا ہے

غنچہ چٹکا تو یُوں ہوا محسوس
جیسے تم نے مجھے پکارا ہے

لذّتِ درد سے نہ کر محروم!
زندگی کا یہی سہارا ہے

خوب چمکا ہے چہرۂ ماحول
اُن کی زلفوں کو جب سنوارا ہے

کوئی وعدہ ہے اور نہ کوئی اُمید
پھر بھی دل منتظر تمھارا ہے

پھُول چُننے کا ہم کو حُکم نہیں
یُوں تو سارا چمن ہمارا ہے

جب بھی ڈوبا ہوں قُلزمِ غم میں
بڑھ کے موجوں نے خود اُبھارا ہے

اپنی ناکامیوں پہ کیوں روئیں ؟
کس کو توہینِ غم گوارا ہے

غرقِ صہبا رہو مُدام بہار!
چشمِ ساقی کا یہ اشارا ہے

ارمان شامرنگری

گُناہ

میں ہوں اک
مرمریں جسم کی نازنیں
تیکھی چتون
سجل روپ
لب انگبیں
میرے غمزوں کا جس پر
نشہ،
چھائے ہے
رین اندھیر
پہلو میں آجائے ہے
اور
سحر ہوتے ہی
کہہ کے
ڈائن مجھے
چاہتا ہے
مرا ہی گلا دابنا !

★

زاہد عبداللطیف میرجکر

لارڈ ارل برٹرینڈ رسل

وقت ایک ایسا ماہر سنگ تراش ہے جس نے صدہا شخصیتوں کو ڈھال کر شہرت و ناموری کی انتہائی بلندیوں پہ پہنچا دیا ہے جہاں تک پہنچتے ہوئے طائرِ خیال کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔ ارل برٹرینڈ رسل عصرِ جدید کی سحر انگیز شخصیتوں میں سے ایک تھا، جس کی شخصیت نصف صدی تک علم و ادب، علم فلسفہ، ریاضی اور منطق پر ابرِ رحمت بن کر چھائی رہی۔ برٹرینڈ رسل دنیا کا ایک نامور فلسفی، ایک عظیم ریاضی داں، انسانیت کے اقدار کا علمبردار اور ایک بدیع المثال مفکر تھا۔ رسل موجودہ اقتدار کی جنگ، نسلی امتیازات اور تخریبی قوتوں کا زبردست مخالف تھا۔

رسل کی پیدائش ایک امیر گھرانے میں ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء کو ہوئی۔ رسل خاندان انگلینڈ کے امیر خاندانوں میں سے ایک تھا۔ سترہویں صدی سے اس کے خاندان کے لوگ "ڈیوک آف بیڈ فورڈ" ہوا کرتے تھے۔ رسل خاندان سیاست میں بہت زیادہ دخیل تھا۔ لارڈ ولیم رسل کنگ چارلس دوم کے خلاف بغاوت میں مارا گیا تھا۔ رسل کا دادا لارڈ جان رسل ایک مشہور سیاست داں اور ملکہ وکٹوریہ کے وزرائے اعظموں میں سے ایک تھا جس نے ۱۸۳۲ء میں ریفارم بل پاس کیا تھا۔

تین سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی اس کے والدین اسے داغِ مفارقت دے گئے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد اس کے دادا نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ رسل کا بچپن خلوت نشینی اور تنہائی میں گزرا۔ وہ اسکول جانے کے بجائے گھر ہی میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس کی دلچسپی ذہنی علوم خصوصاً علم ریاضی تک ہی محدود رہتی۔ گیارہ سال کی عمر میں اس نے یوکلڈ Euclid کا علم ہندسہ پڑھنا شروع کیا، مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ یوکلڈ نے جانے پہچانے مسئلوں سے ابتدا کی ہے جو بغیر ثبوت کے بھی قبول کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مایوس کن صورت حال رسل کو فلسفہ کی طرف لے گئی۔

۱۸ سال کی عمر میں جب رسل کیمبرج میں داخل ہوا تو اس نے ریاضی اور فلسفہ دونوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس نے علم منطق اور علم ریاضی پر کتابیں بھی لکھنا شروع کر دیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ بعد ازاں وہ ٹرینٹی کالج میں لیکچرار مقرر ہوا۔ اس وقت وہ سیاسی طور پر "فے بین سوسائٹی" کا ایک سرگرم رکن بھی تھا۔ ۱۹۰۸ء میں ۳۶ سال کی عمر میں وہ رائل سوسائٹی کا عملی طور پر سرگرم ممبر بنایا گیا۔ برٹرینڈ رسل نے ۱۹۰۰ء کو اپنی زندگی کا سب سے اہم سال قرار دیا ہے۔ اس سال وہ پیرس میں "بین الاقوامی مجلس فلسفہ" میں شامل ہوا اور اطالوی ریاضی داں گیوسوپے پیانو کے خیالات کو اس نے بغور سنا۔ گیوسوپے کے اخذ کردہ نتائج نے اسے اصول ریاضی پر

کام کرنے کی ترغیب دلائی۔ ۱۹۰۳ء میں اس موضوع پر اس نے
اپنی کتاب PRINCIPA OF MATHMATICS شایع کی۔
برٹرینڈ رسل نے ان فلسفیانہ مسئلوں کو بھی منطق میں
سمودیا، جن کا تعلق علم ریاضی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۹۲۴ء
میں اس نے لکھا تھا "فلسفہ پر زبان کا اثر گہرا ہو چکا ہے
مگر غیر محسوس طریقے سے"۔ موجودہ دور میں رسل کی جدوجہد کے
نتیجے کے طور پر کم از کم یہ اثر انگیز فلسفیوں کے لیے ایک مسلّمہ
حقیقت ہے۔ منطقی تعمیر (LOGICAL CONSTRUCTION)
اس کی دوسری کوشش تھی جس میں اس نے فلسفیانہ مسئلوں کے
حل منطقی طریقے پر پیش کرنے کی پرخلوص کوشش
کی۔ تاریخ فلسفہ مغرب (A HISTORY OF WESTERN
PHILOSOPHY) علم فلسفہ پر رسل کی ایک نہایت دلچسپ
کتاب ہے۔

اپنی سوانح عمری میں جو ۱۹۶۴ء میں شایع ہوئی تھی،
رسل لکھتا ہے کہ "تین خواہشات نے میری زندگی کو سنوارنے
میں کافی مدد کی ہے، محبت کی خواہش، علم کی تلاش اور انسانی تکالیف
کے لیے ایک ناقابلِ برداشت ترحم کا جذبہ۔ یہ خواہشات
مجھے ہوا کے دھارے کی طرح کہیں بھی لے کر اڑ جاتیں۔ کبھی یہ
ہوائیں مجھے خود رائی کی طرف لے جاتیں، کبھی مایوسی اور ناامیدی
کے انتہائی سروں کو چھونے کی ناتمام کوشش کرتی ہوئی غم اندوہ
کے گہرے سمندر کی جانب۔"

نازیوں کے جرمنی میں عروج سے پہلے رسل دلی طور پر
مصالحت پسند تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے دوران جب لوگوں
کو جبراً فوج میں داخل کیا جانے لگا تو رسل کی رگ حمیت پھڑک
اٹھی۔ اور رسل کی مخالفت اسے براہِ راست اقتدار کی جنگ
کے قریب لے گئی۔ اسی طرح ۱۹۴۰ء میں جب رسل نے
نیویارک کالج میں پروفیسرشپ قبول کی، اس وقت معاشرتی نظریات،
خصوصاً اس کی کتاب شادی اور اخلاق (MARRIAGE
AND MORALS) نے دقیانوسی حلقوں میں ایک زبردست
تعصب پیدا کر دیا۔ اور اس کے تقرر پر ایک طوفان سا آگیا،
جو بعد میں نیویارک سپریم کورٹ کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔

۱۹۶۰ء کے آخر میں رسل ایک زبردست تنظیمی جدوجہد
میں مصروف رہا۔ یہ جدوجہد جنوبی ویت نام میں امریکہ کے جرائم
انسان سوزی اور ظلم و تشدد کے خلاف تھی۔ مئی ۱۹۶۷ء میں
"اسٹاک ہوم" میں ایک بین الاقوامی جنگی جرائم کی عدالت کا افتتاح
کرتے ہوئے اس نے کہا: "ہر شخص جانتا ہے کہ امریکہ نے ویت نام
میں کئی جرائم کا ارتکاب کیا ہے جو دونوں ملکوں کے درمیان نسلی
خلیج کا باعث بنا ہوا ہے۔" اس مصنوعی عدالت کے قیام سے
جس کا مقصد امریکہ کے ظلم و تشدد، جبر و بربریت اور انسان
سوزی کا غیر جانبدارانہ انصاف کرنا تھا، یہ واضح کر دیا کہ رسل
نے بذاتِ خود اس تمام صورتِ حال کو دیکھا ہے۔

۱۹۴۹ء میں اسے ORDER OF MERIT کے اعزاز سے
نوازا گیا۔ اس کے دوسرے سال اسے نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۵۷ء
میں یونیسکو (UNESCO) نے اسے "کلنگ انعام" کا حقدار
قرار دیا۔۔۔ دیگر تمام ذہنی اور علمی خوبیوں سے کہیں زیادہ
گراں قدر خوبی رسل کی انسان دوستی اور انسانی ہمدردی
تھی۔ اس ایٹمی دور میں انسانی تحفظ اور امن کے قیام کے
سلسلے میں لکھتے ہوئے اس نے کہا تھا: "میں اپنے دماغ
کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ تمام نسلی امتیازات، اقتدار کی جنگیں،
نفرت و خوف کے دھند لے بادل چھٹ گئے ہیں۔ میں ایک
نیا سنہری دور دیکھ رہا ہوں جس کی مثال دینے سے تاریخ
کے صفحات قاصر ہیں۔ یہ تمام باتیں ممکن ہیں۔ ضرورت صرف

اس بات کی ہے کہ انسانیت میں اتنی فہم ہو کہ وہ زندگی اور موت میں صحیح انتخاب کرسکے۔

۳ فروری ۱۹۷۰ء کی صبح کو سورج طلوع ہوا۔ مگر اداس اداس سا، چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی، کیوں کہ ۳ فروری کو دنیا ایک عظیم فلسفی، ایک عظیم ریاضی داں، انسانیت کے محسن، امن کے پیامبر اور ایک عظیم مفکر سے محروم ہوگئی ــ لارڈ ارل برٹرینڈ رسل کی روح اس دنیائے شور و شر سے ہمیشہ کے لیے آسمان کی لامحدود وسعتوں میں گم ہوگئی۔ موت نے ایک عظیم فلسفی اور تاریخ کے باغی کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ سرزمین انگلستان صدیوں کے انتظار کے بعد بھی شاید ایسی پُرسحر شخصیت پیدا نہ کرسکے گی۔

★

شری آر. ایس. گپتا
ڈائرکٹر نیشنل فائر سروس کالج، ناگپور

آگ بجھانے کی خدمات

گزشتہ صدی کے آخر میں کلکتہ اور بمبئی میں آگ بجھانے کی خدمات بہم پہنچانے کے لیے گھوڑا گاڑی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ملک میں ۱۸۲۰ء میں ہاتھ سے چلانے والے پمپوں کا استعمال شروع کیا گیا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں ان کی جگہ اسٹیم فائر پمپوں نے لے لی۔ پھر ۱۹۰۸ء میں پٹرول سے چلنے والے پمپوں کا استعمال شروع کیا گیا۔ کلکتہ فائر بریگیڈ ۱۸۲۲ء میں قائم کیا گیا جو ملک کا سب سے پرانا فائر بریگیڈ ہے۔ اس وقت یہ کلکتہ پولیس ہی کا ایک حصہ تھا۔ ۱۸۶۵ء میں پانچ فائر انجن انگلینڈ سے منگوائے گئے۔ ان میں سے تین گھوڑوں کی مدد سے اور دو ہاتھ سے چلائے جاتے تھے۔

۱۹۰۷ء میں بمبئی میں پہلا موٹر انجن منگایا گیا اور ۱۹۱۲ء تک کلکتہ فائر بریگیڈ نے گھوڑے کی قوت سے نیز ہاتھ سے چلائے جانے والے پمپوں کی جگہ پٹرول سے چلنے والے میری ویدر فائر انجنوں کا استعمال شروع کر دیا جو برطانیہ سے درآمد کیے گئے تھے۔

آج کے دور میں یہ بہت ضروری ہے کہ آگ بجھانے والی مشین خواہ وہ موٹر فائر انجن ہو یا بمپیدا اسکیپ، واٹر ٹینڈر ہو یا ایسکیپ ٹینڈر یا معمولی قسم کا پمپ کارگزدگی کی اعلا صلاحیت رکھتی ہو اور ایسی ہو جو بوقت ضرورت کم از کم چار گھنٹے تک مسلسل چلائی جا سکے۔ موٹر فائر انجن میں بالعموم ۱۸۰۰ ہزار لیٹر فی منٹ کی صلاحیت رکھنے والا ایک فائر پمپ ہوتا ہے جو انجن سے پیدا ہونے والی قوت سے چلایا جاتا ہے۔ پانی کا ایک چھوٹا ٹینک بھی ہوتا ہے جس میں کم از کم ۴۵ ہزار لیٹر پانی جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ۶۰ میٹر لمبی ربڑ کی چھوٹی ہوز ریل ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو آگ بجھانے کے لیے فوری طور پر کام میں لایا جاتا ہے۔ آگ بجھانے والے عملے کے پاس ۳۲۵ میٹر لمبے ڈلیوری ہوز کے علاوہ سانس لینے میں مدد دینے والا سامان، آگ بجھانے والے آلات و اشیا مشکل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو امداد پہنچانے میں کام آنے والی چیزیں اور رکاوٹوں کو توڑنے والے اوزار بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان چیزوں کا بوجھ کافی زیادہ ہوتا ہے پھر بھی یہ اشد ضروری ہے کہ ان کو آنا فاناً میں پہنچانے کے لیے موٹر گاڑی ۷۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار پکڑ سکتی ہو۔ اس کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ جب اس پر پورا بوجھ لادا جا چکا ہو تو وہ اسٹارٹ ہونے کے بعد ۴۰ سیکنڈ کے اندر ۴۸ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار پکڑ سکے۔

بھارت میں ہر سال آتش زدگیوں سے تقریباً

۲۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ اس نقصان کو کم کرنے کے لیے بہت سے جدید ترین طریقے اور آلات دریافت کیے گئے ہیں۔

تربیت یافتہ عملے کی ضرورت

آگ پر جلد قابو پانے کے لیے عمدہ آلات کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ عملے کا ہونا بھی بہت ضروری ہے تاکہ وہ جدید ترین سازوسامان کو پوری اہلیت اور اعتماد کے ساتھ استعمال کر کے جان و مال اور جائداد کو آگ کی بھیانک لپیٹوں سے بچا سکے۔ اسی مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے بھارت سرکار نے ۱۹۵۶ء میں نیشنل فائر سروس کالج قائم کیا تھا جو جنوب مشرقی ایشیا میں اپنی قسم کا پہلا کالج ہے۔ یہ کالج ناگپور میں ہے اور اس میں تربیت دینے کے لیے جدید ترین آلات موجود ہیں۔ اس کالج میں آتشزدگی سے متعلق مسائل کو حل کرنے اور ان کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے ایک لیبارٹری بھی ہے جس میں نیوکلیر ڈیٹیکٹر اور الیکٹروزیسٹر بھی ہیں۔

پانی ہر آگ کو نہیں بجھا سکتا

شاید کچھ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہر آگ پانی سے نہیں بجھائی جا سکتی۔ مختلف قسم کی آگ مختلف تدبیروں سے بجھائی جاتی ہے۔ لکڑی، سوتی کپڑے، کاغذ، ریکسین، ربڑ، پلاسٹک، چمڑے اور لینولیم وغیرہ کو آگ لگ جانے کی صورت میں پانی کا استعمال بہت بہتر رہتا ہے۔ اگر تیل، چکنائی، رنگ روغن، اسپرٹ، پٹرولیم کی مصنوعات، مٹی کے تیل، پٹرول اور ڈیزل آئل وغیرہ کے سبب آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کے لیے فوم ریت یا خشک کیمیکل پاؤڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کے استعمال سے ایسی آگ اور بھڑکتی ہے۔ بلکہ آگ پکڑنے والی گیسوں (مثلاً کھانا پکانے کے کام آنے والی گیس) کی وجہ سے لگنے والی آگ بجھانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ گیس کے خارج ہونے کے سلسلہ کو فوراً روک دیا جائے۔ سلنڈر کی نالی کو ٹھنڈا کیا جائے، رسوئی کے اندر کی ہوا کو باہر نکالنے کا انتظام کیا جائے۔ نیز گیس سپلائی کرنے والوں اور فائر بریگیڈ والوں کو فوراً بلایا جائے۔ یاد رہے کہ گیس سے نکلنے والی آگ کو پانی سے نہیں بجھایا جا سکتا۔

فائر اسٹیشن کا طریقۂ کار

آگ بجھانے کے لیے تمام درخواستیں فائر اسٹیشن کے کنٹرول روم میں ٹیلی فون یا بازاروں میں نصب شدہ فائر الارموں کے ذریعے وصول کی جاتی ہیں۔ کلکتہ، بمبئی اور دلّی جیسے بڑے شہروں میں جدید طرز کے فائر اسٹیشنوں میں شہر کی اہم پبلک عمارتوں، اسٹریٹ فائر الارموں، ذیلی فائر اسٹیشنوں اور ٹیلی فون ایکسچینجوں کے ساتھ ٹیلی فون کا مستقل رابطہ قائم ہوتا ہے۔
کنٹرول روم میں دن رات تجربہ کار آپریٹر ایک افسر کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ اس افسر کا فرض یہ ہوتا ہے کہ جوں ہی کوئی کال آئے وہ اس کی نوعیت کے مطابق آگ بجھانے اور آگ میں پھنسے ہوئے لوگوں کو امداد پہنچانے کے لیے مطلوبہ سازوسامان عملے کے ساتھ روانہ کرے۔ آگ کی اطلاع دینے والے کو اُس جگہ کا جہاں آگ لگی ہو پورا پتا بتانا چاہیے، اور آگ کے حجم اور نوعیت کے بارے میں بھی مطلع کرنا چاہیے۔
کوئی کال ملنے پر ڈیوٹی افسر اس کا اندراج رجسٹر واردات میں تاریخ اور صحیح وقت کے ساتھ کرتا ہے اور برقی آلہ کی مدد سے فائر الارم بجاتا ہے اور ایک سرخ سگنل روشن کرتا ہے۔
آفیسر انچارج اور اس کا فوری ڈیوٹی والا عملہ اپنی وردیاں پہنے

ہوئے دور کر فائر انجنوں کے کھڑے ہونے کے مقام تک پہنچتا ہے۔ موصولہ ہدایات کے مطابق تمام ساز و سامان لے کر متعینہ عملہ اپنی گاڑیوں کو اسٹارٹ کر دیتا ہے۔ آفیسر انچارج آگ لگنے کی جگہ کا پورا پتا کنٹرول روم سے ایک پرزے پر لے کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے عملے اور ساز و سامان کے ساتھ روانا ہو جاتا ہے۔ آگ بجھانے والی گاڑیاں گھنٹے بجاتے ہوئے نہایت تیزی کے ساتھ آگ لگنے کی جگہ پر پہنچتی ہیں۔

اس دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کو آگ نہ لگ سکتی ہو لیکن کوئی آگ بلا کسی وجہ کے نہیں لگتی۔ شروع شروع میں کوئی آگ بڑی نہیں ہوتی لیکن چونکہ یہ بہت تیزی سے بھڑکتی اور پھیلتی ہے اس لیے آناً فاناً بھیانک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آگ لگنے کے بعد کے چند منٹ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ اگر ایک بالٹی پانی یا ریت کا بروقت استعمال کر لیا جائے تو وہ لاکھوں کی جائداد کو بچا سکتا ہے، لیکن اگر تاخیر ہو جائے تو پھر آگ بجھانے کے لیے ایک ہزار گیلن پانی کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور جو نقصان اس وقت ہو چکا ہوگا اس کو روکنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

بقیہ:۔ سجّاد ظہیر

کی مذمّت کی، مضمون مختصر ہے لیکن تاریخی اور سماجی تجزیہ کی مدد سے شعر و ادب کے تخلیقی عمل کی وضاحت کرتا ہے اور ہر اس ادبی کارنامے کے تہذیبی جوہر کو نمایاں کرتے کی صورتیں بتاتا ہے، جو گہرے انسانی جذبات اور تلاشِ حُسن کے جذبات سے مملو ہے۔

اس مختصر مضمون میں سجاد ظہیر کے ادبی کارناموں کا تفصیلی جائزہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے تخلیقی اور تنقیدی ادب کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے اس کی اہمیت ہے کیونکہ محض نظریاتی اور علمی حیثیت سے ان کے خیالات قابلِ مطالعہ نہیں ہیں، بلکہ ان کے قلم میں وہ تازگی، گرمی اور روشنی ہے جو ادب میں تاثیر انگیزی کو جنم دیتی ہے۔ افسانوں میں منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، استدلال اور ترغیب آمیز دلکشی ہے۔ سجاد ظہیر اپنی بات کو طول دے کر بیان نہیں کرتے، ہر لفظ ناپ تول کر، سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں، ان کے فقرے اور جملے ہی نہیں الفاظ بھی بے کار نہیں ہوتے، اور کہیں کہیں تو صرف چند لفظوں یا جملوں میں وہ ایسی مصوری اور مرقع کشی کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کے محاکاتی حُسن میں کھو جاتا ہے۔ لندن کی ایک رات میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُن کے سوانحی مضمون یادیں میں ان کا یہ کمال ایسے عروج پر پہنچ جاتا ہے جہاں ایک حوصلہ مند، انسان دوست، باشعور نوجوان کے سینے میں آرزوؤں کا امڈتا ہوا طوفان اس بین الاقوامی ہیجان کے پس منظر میں نمایاں ہوتا ہے جس کے بہاؤ میں یورپ گرتا پڑتا، لڑکھڑاتا دوسری جنگِ عظیم کی طرف جا رہا تھا۔ اور کچھ انسان دوست ادیب عوام کی امن دوستی کا سہارا لے کر تہذیب اور علم کے خزانوں کو اس آگ سے بچانا چاہتے تھے۔ سجاد ظہیر بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ وہ گزشتہ پندرہ سولہ سال سے انھیں خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں آرزوؤں کو پورا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں، اور آج جیل خانے کے اندر بھی وہ اس اُمید سے بھرے ہوئے ہیں کہ عنقریب وہ کرن آفتاب بن کر چمکے گی جسے کبھی اپنے سینے میں چھپا کر ہندوستان لائے تھے اور جس کی حرارت اور روشنی انھوں نے بہت سے نوجوان سینوں میں منتقل کی ہے۔

(سنہ ۱۹۵۰ء)

واحد پریمی

غزل

ہر چند حسن ساز ہوں پیکر تراش ہوں
لیکن خود آئینے کی طرح پاش پاش ہوں

دل ہی کی دھڑکنوں سے تھی رفتارِ زندگی
جب دل ہی مر چکا ہے تو پھر زندہ لاش ہوں

آٹھوں پہر سکون میسر نہیں مجھے
ہر لمحہ جو کسکتی رہے وہ خراش ہوں

تصویرِ عہدِ نو ہے مجسم مرا وجود
آلامِ روزگار ہوں فکرِ معاش ہوں

میرے جنونِ شوق کی منزل نہیں کوئی
یعنی رہِ طلب میں سراپا تلاش ہوں

واحد مجھے نہ اتنی حقارت سے دیکھیے
کیا خوش ہوں اگر بد قماش ہوں

شرقی علی گڑھی

غزل

خود اپنی حسرتوں پر اوس سی پڑتی ہوئی دیکھی
بہاروں میں کلی کی آنکھ جب بھی شبنمی دیکھی

حقیقت محفلِ دنیا کی ہم نے بس یہی دیکھی
تڑپتی حسرتیں دیکھیں سسکتی زندگی دیکھی

اسے حسنِ نظر کہیے کہ معراجِ نظر کہیے
جس آئینہ میں دیکھا ہم نے صورت آپ کی دیکھی

مجھے دیکھا سرِ محفل یہ تو نے کیا ستم توڑا
نظر ہر ایک کی میں نے مجھی کو دیکھتی دیکھی

نگاہِ برق ساماں کی کرم فرمائیاں توبہ
جدھر بھی اٹھ گئی ہے آگ سی اٹھتی ہوئی دیکھی

خراج اپنا لیا ذوقِ عمل نے لڑ کے طوفاں سے
دعاؤں کے سہارے ناؤ اکثر ڈوبتی دیکھی

بھلا اب اور کیا دیکھیں دو روزہ زیست میں شرقی
جہانِ درد بھی دیکھا فضائے عیش بھی دیکھی

کیفؔ لکھنوی

نویدِ مشرق

شاہدِ حسنِ ازل کی ستم آرائی ہے یا نئے طرز سے اک تازہ بہار آئی ہے
ولولے جوہرِ ذرّات میں محشر بہ کف عقلِ انسانی کا انسان تماشائی ہے
ذرّہ ذرّہ سے اناالحق کی صدا آئی ہے

جاگ اُٹھ جاگ کہ مشرق میں سحر ہوتی ہے ہاں سحر ہوتی ہے باانوارِ دگر ہوتی ہے
سُرمۂ چشم تھی ظلمات کی جو موجِ سیاہ فطرتِ وقت سے پھر نور بصر ہوتی ہے
سونے والے تجھے بے وقت کی نیند آئی ہے

رنگ لے آئی ہے دیوانگیٔ عیش و نشاط نہ اُلٹ جائے کہیں بازیٔ ہستی کی بساط
وقت آیا ہے زمانہ کی لہر کہتی ہے گر طرب خیز نہ ہو نانک و چشتی کا رباط
سازِ ہستی نہیں بے وقت کی شہنائی ہے

آسمانوں میں نظر آتی ہے پھر سے ہلچل آندھیاں آ گئے ہیں پیچھے ہیں طلسمی بادل
جن میں ہیں کوثر و تسنیم کے قطرے رقصاں آبِ زمزم میں سمویا ہوا ہے گنگا جل
برقِ توحید نئے ڈھنگ سے لہرائی ہے

ملک و دولت کے یہ پروانے چلے جاتے ہیں عقل و حکمت کے وہ کاشانے چلے جلنے یا
مشعلِ ظلم جلا کرتی تھی راتوں کو جہاں وہ سیاست کے صنم خانے چلے جاتے ہیں
صبح ہونے کو ہے خود شمع کو نیند آئی ہے

تھک گئی اپنے اندھیرے سے بالآخر شبِ تار شفقِ سُرخ سے ہو ہی گیا گردوں گلنار
زمزمہ ریز ہے اس طرح جہانِ بیدار سُرخ پو ہے جو فریبِ نظر پر اسرار
مہرِ توحید درخشاں کی خبر لائی ہے

گوشۂ سجّاد ظہیر

غمِ سجّاد ظہیر

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
نہ اب دشتِ جنوں کی شامِ غمگیں
نہ گل گشتِ بتاں کی صبحِ رنگیں
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غم ہائے وطن میں اشک باری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایّامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلّم
سحر اور اس کا آغازِ تبسّم
خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہیں تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اسی کے نام ساقی
کرو اب ختم دورِ جام ساقی
بڑھاؤ شمعِ محفل ، بزم والو!
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو!

فیض احمد فیض

★

खाद्यान्न का अपव्यय कर पैसों को कूड़ा कचरा न बनाव

खाद्यान्नों का अपव्यय
करने का अर्थ है
हजारों लोगों को
खाद्यान्न न देना

खाद्यान्न जाया करना नैतिक अपराध है।

महाराष्ट्र शासन, सूचना और जनसंपर्क महासंचालनालय, सचिवालय, मुंबई ४०० ०३२.

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

سید احتشام حسین مرحوم

سجّاد ظہیر۔ ادیب کی حیثیت سے

ہندوستان اور پاکستان کی ترقی پسند ادب کی تحریک کو جس فردِ واحد کی تنظیمی اور ادبی صلاحیتوں نے سب سے زیادہ آگے بڑھایا وہ سجّاد ظہیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی تحریکوں اور اداروں کو بھی افراد کی رہنمائی اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے (حالاں کہ افراد کو طاقت جماعت ہی سے حاصل ہوتی ہے)، اس لیے ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں سجّاد ظہیر کی اہمیت خاص طور سے دیکھے جانے کی چیز ہے۔ کسی ادبی تحریک کی بنیاد ڈالنے، اس پر مضبوط عمارت آراستہ کرنے، اس کے بسنے والوں میں اس کی محبّت اور حفاظت کا جذبہ پیدا کرنے اور اس کے حدود میں اضافہ کرنے کا کام زبردست تنظیمی اور تعمیری صلاحیت چاہتا ہے اور جب اس میں سجاد ظہیر کے دوسرے سیاسی اور عملی کارناموں کو جوڑ لیا جائے تو ان کی شخصیت کا وہ خاکہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جس سے فکر و عمل کے ایک مخلص رہنما کے خد و خال بنتے ہیں۔

سجّاد ظہیر سب سے پہلے ایک ادیب کی حیثیت سے اُردو ادب کے میدان میں اپنے اُن افسانوں کے ساتھ آئے جو انگارے میں شایع ہوئے تھے، اور جنھوں نے ہندوستان کی ادبی اور سماجی زندگی میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ انگارے کے نوجوان مصنف زندگی کی بے کیفی اور یک رنگی سے اُکتائے ہوئے، جذباتی انقلابی تصوّرات سے بھرے ہوئے نئے ادبی تقاضوں اور اسلوبوں سے واقف، ذہین اور باغی تھے، وہ پھپھوند لگے ہوئے گلے سڑے ہندوستان کے سماجی نظام کی عفونت اور گندگی کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے شعور میں مستقبل بہت ہی واضح نہیں تھا لیکن اتنا وہ سمجھتے تھے کہ حال کے پاس معاشی خوش حالی، اقتصادی توازن، سماجی انصاف اور ذہنی سکون کے لیے کچھ نہیں ہے، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ قابلِ اعتماد نہ تھی لیکن انھیں غلامی کے شدائد، بیرونی حکومت کے استحصال اور انقلاب کی ضرورت کا احساس تھا۔ ہندوستان کی مذہب پرستی سے جھنجھلا کر انھوں نے یہ رائے قایم کی تھی کہ جب تک لوگ مذہب سے بیزار نہ ہوں گے، قدم ترقی کی جانب نہ بڑھا سکیں گے، ان کی نگاہ بدحالی، جہالت اور قدامت پرستی کے اصل اسباب تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس لیے وہ دلیل کا کام جذباتیت سے لینا چاہتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ان افسانوں نے اس راہ کی طرف اشارہ کر دیا تھا، جدھر چل کر منزل کی جستجو کی جا سکتی تھی۔ اس مجموعے نے وہ تاریخی فرض ادا کیا تھا جو ناقص ہونے کے باوجود فیصلہ کن نتائج پیدا کرنے والا تھا اس میں سجّاد ظہیر کے افسانے یورپ کے جدید افسانوی ادب کی تکنیک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زندگی کی بھی صحیح

تصویر کشی کرتے تھے، اس لیے ان کی صداقت اور نئے پن نے بہت سے نوجوانوں کو متاثر کیا۔ افسانوں کا یہ مجموعہ ضبط کر لیا گیا، اور اسی نے یہ بات ثابت کر دی کہ اس میں کچھ ایسے تلخ حقائق کا بیان ہے جن سے ملک کے حکمراں طبقے کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ ادبی سے زیادہ ان افسانوں کی تاریخی اہمیت تھی کیوں ان سے اس روایت کی جڑیں مضبوط ہوئی تھیں جنھیں تین سال بعد ترقی پسند ادیبوں نے زیادہ شعوری طور پر اپنایا اور جن کی رہنمائی سجاد ظہیر ہی نے کی۔

انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے سلسلہ میں ان کے ذہن پر جس طرح صیقل ہوئی ان کے شعور نے ۱۹۳۵ء تک جس طرح عمل کے ذریعہ سے ترقی کی منزلیں طے کیں ان کی خوب صورت اور ادیبانہ اور ایمانداراانہ تصویر سجاد ظہیر نے خود اپنے معرکہ آرا مضمون یادیں میں کی ہے، جو آخر ۱۹۳۹ء یا شروع ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں سجاد ظہیر نے بڑی چابک دستی سے وہ بین الاقوامی پس منظر پیش کر دیا ہے جس سے نئی زندگی کے نقش اُبھر کر روشن ہو جاتے ہیں، اور شعلے کی طرح لرزتے ہوئے لفظوں میں تخریب و تعمیر کی کہانی تحریر ہو جاتی ہے، اور زوال پذیر سرمایہ داری اور ترقی پسندی عوامی جدوجہد کی داستان یعنی فاشزم اور سوشلزم کے تصادم کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اسی مضمون میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی تصورات کی داغ بیل پڑتی ہے، جس کے مقاصد بہت واضح ہیں۔ سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے ذہن میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن بنانے کا خیال کس طرح آیا، اس کی ایک دل چسپ مگر تاریخی کہانی ہے۔ جرمنی میں ہٹلر جمہوریت کا گلا گھونٹ رہا تھا، بڑے بڑے مصنف اور سائنسداں وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ آسٹریا میں آمریت قایم ہو گئی تھی۔ فرانس میں ہلچل تھی۔ ہر جگہ محنت کش جیتتے ہارتے سرمایہ داری کا مقابلہ کر رہے تھے، اور سب کی نگاہیں جرمنی پر لگی ہوئی تھیں، جہاں کمیونزم کے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے رہنما دمتروف پر مقدمہ چل رہا تھا۔ ان تمام باتوں کا تعلق اُن ہندوستانی نوجوانوں سے کیا تھا جو انگلستان اور یورپ میں تعلیم کر رہے ہیں اور ادیب بننے کے خواب دیکھ رہے تھے، اسے سجاد ظہیر کے الفاظ میں سنیے:

> دمتروف کا مقدمہ، فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا ناکام مزدور انقلاب، آج ان واقعات کی اہمیت اکثر لوگوں کے لیے کچھ نہیں لیکن ہمارے لیے بہت تھی۔ یہ تو بالکل ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت کے لیے بہت دنوں تک امن، سکون، چین کا خاتمہ ہو گیا ہے، بڑی سخت کشمکش، جدوجہد، بین الاقوامی جنگ، انقلاب کے دور کا آغاز ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے تھے کیا آدمیت کبھی اس سیلاب آتش و آہن سے نجات حاصل کر سکے گی؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ ہم نوجوان جن کی رگوں میں زندگی کا گرم خون گردش کر رہا تھا، اپنے کو اس طوفان سے بچا سکیں؟ ہماری محبت کی دنیا سڈول، اچھے جسم کی کشش، آنکھیں جنھیں ہم دیکھتے ہی رہ جاتے تھے، باتیں جو ہم چاہتے تھے کہ سنا کریں۔ دو لپٹے ہوئے سینوں کی دھڑکنیں اس کا کیا ہوگا؟ اور ہمارے خیالوں کی دنیا، وہ رنگین دنیا، قدامت پرستی کی ٹھوکر لگانے والی ہر بُری چیز سے باغی، حسن پرست، آسمان سے اس کی نیلاہٹ، پھولوں سے خوشبو، پانی سے روانی، غرض ہر مادہ سے اس کا جوہر کھینچ لینے کے لیے بے چین۔ وہ اس آگ لگے سنسار میں کے دن تک

بچے گی؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ہم اپنی نجی زندگی کو سماج کے
مضطرب یا کل جیون سے الگ کرلیں؟"

اس شعور نے ترقی پسندی کی طرف توجہ کیا اور وہاں
کے ہندوستانی نوجوانوں نے ایک ادبی انجمن بنائی۔ سجاد ظہیر
نے اپنا ڈراما بیمار پہلی دفعہ یہیں لندن میں ایک جلسے میں پڑھا
جسے ڈاکٹر تاثیر اور ملک راج آنند نے سراہا۔ لیکن سجاد ظہیر
کے دل میں خود یہ خلش تھی کہ چند افسانے اور ایک چھوٹا سا
ڈراما لکھ کر مصنف بن بیٹھنا بھی کوئی بات ہے۔ چنانچہ انھوں
نے لندن ہی میں اپنا وہ مختصر ناول شروع کردیا جو بعد میں "لندن کی
ایک رات" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے شایع ہوا۔

سجاد ظہیر نے ابتدا میں بھی جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی
ریاضت، محنت اور ادبی معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
وہ لوگ جو ترقی پسند ادب اور تحریک کو محض مغرب کی نقالی
سمجھتے ہیں، سجاد ظہیر کے ان الفاظ سے اس تحریک کی اصل نوعیت
دیکھ سکتے ہیں:-

"ہم تو شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ لندن میں
رہ کر ہندوستانی ادب پر نہ اثر ڈالا جا سکتا ہے اور
نہ کوئی اعلا قسم کا تخلیقی کام ہو سکتا ہے۔ لندن
کی انجمن کے قایم ہونے سے جہاں بہت فایدے
ہوئے وہاں یہ احساس بھی پکا ہوگیا۔ دس پانچ
جلاوطن ہندوستانی، سوا اس کے کہ آپس میں
مل جل کر طرح طرح کے منصوبے باندھیں اور
یورپی کلچر سے اثر قبول کر کے نیم قسم کا ایک ادب
پیدا کریں، زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑی
بات جو ہم نے اس زمانہ میں یورپ سے سیکھی وہ یہی تھی
کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک اسی وقت بار آور
ہو سکتی ہے جب ہندوستان کی مختلف زبانوں
میں اس کی ترویج ہو، اور جب ہندوستان کے ادیب
اس تحریک کی ضرورت کو سمجھ کر اس کے مقاصد کو
عملی جامہ پہنائیں ....."

سجاد ظہیر [illegible] جب پیرس [illegible]
بین الاقوامی مصنفین کی کانگریس ہوئی [illegible]
فاشزم کی تہذیب [illegible] رجعت پسندی اور انسان دشمنی کو
بے نقاب کیا۔ [illegible]
تھا جو کسی نہ کسی شکل میں اس وقت تک زندہ ہے اور وسیع تر
ہو کر آج بھی ان عناصر کا مقابلہ کر رہا ہے جو تہذیب کے
دشمن ہیں۔ سجاد ظہیر کے لیے اس کانگریس کی غیر معمولی تعلیمی
اہمیت تھی، اور گو فرانس کے مشہور شاعر اور مصنف آراگون
نے ہنس کر ان سے کہا تھا کہ دنیا میں کسی اور جماعت کی تنظیم اتنی
مشکل نہیں ہے جتنی [illegible] لیکن سجاد ظہیر نے
ہندوستان کے ادیبوں کی تنظیم کا خیال [illegible] بسا لیا اور
جب سال بھر بعد ہندوستان پہنچے تو انھوں نے بھی انجمن
ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈال دی۔

سجاد ظہیر یورپ کی ادبی، تہذیبی اور سیاسی تحریکوں
سے واقف تھے اور ہندوستان کی سیاسی فضا اس کے لیے
بالکل سازگار تھی کہ سیاسی مطالبات اور ادبی اقدامات سے
عوام ہی کو اپنا رہنما بنایا جائے لیکن کسی وقت بھی قومی روایات سے
رشتہ نہ توڑا جائے۔ چنانچہ شروع ہی سے سجاد ظہیر نے اپنی
تحریروں میں ماضی کے عظیم الشان ادبی ورثہ کی اہمیت پر زور دیا
ہے۔ حالانکہ بہت سے ترقی پسندوں پر یہ دورہ پڑ رہا ہے کہ
ادب کو خالص سیاسی مسایل کا بیانیہ بنا کر رکھ دیا اور اس
سارے ادبی سرمایہ ہی کے منکر بن جائیں جس میں واضح الفاظ

انقلاب کا تذکرہ نہیں ہے۔ رالف فاکس کا ذکر کرتے ہوئے
سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ جب کسی بنگالی نے ٹیگور پر اعتراض
کرتے ہوئے انھیں ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کا نمائندہ
کہہ کر رجعت پسند قرار دیا تو رالف فاکس بہت برہم ہوا۔ اس نے
کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنا مارکسیت کا خاکہ اڑانا ہے کسی شاعر یا
مصنف کو اتنی آسانی کے ساتھ ایک خاص تخیلی خانے میں
بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہی خیال ہمیشہ سجاد ظہیر کے پیش نظر
بھی رہتا ہے، اور ہر ایسے موقع پر انھوں نے اسی صحت مند
نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ سراج مبین کے نام سے انھوں
نے جو مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ سنٹرل جیل میں لکھا اور جس
میں جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کے نئے ادب پر بعض
اعتراضات کا جواب دیا، وہ اس کی اعلا مثال پیش کرتا ہے
سنجیدہ، مدلل اور دل کش انداز میں سجاد ظہیر نے ترقی پسند
ادب کے نظریاتی اور فنی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس مضمون
کو ختم کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھتے ہیں:۔

"کیا ان دونوں طرح کی (براہ راست انقلاب بننے
والی اور بالواسطہ انقلابی شعور پیدا کرنے والی) شاعری
کی ضرورت نہیں؟ کیا اس کے علاوہ بھی شاعری کے
بہت سے میدان نہیں؟ ہر موقع، اور ہر محل، اور ہر
سماج اور ہر ماحول کے لیے ایک خاص قسم کی شاعری
درکار ہے۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی، واسوخت،
قطعہ، گیت وغیرہ تو ہمارے ادبی ترکہ میں شامل
ہیں۔ اگر ہم میں جان ہے تو اس سرمایہ کو بڑھانا، نئی
زمین تلاش کرنا، نئے راستے ڈھونڈنا، نئی زلف کو
نئے زیور سے آراستہ کرنا ہمارا ادبی فرض ہے۔
ایسے مبارک اور مستحسن فرض ادا کرنے والے
کے لیے ترقی پسند ادیب اثر صاحب کو بھی مشکور ہونا چاہیے"

اس سے پہلے بھی سجاد ظہیر نے انقلابی شاعری کے
متعلق لکھتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں کلاسیکی ادب کی اہمیت کو
نظر انداز نہیں کیا تھا اور نہ شاعری کی فنی خوبیوں کو گھٹا کر پیش کیا
تھا۔ سجاد ظہیر کی تخلیق اور تنقید دونوں میں مارکسی نقطۂ نظر کی ترجمانی
کرتے ہیں۔ یہاں اس نقطۂ نظر کی توضیح کی ضرورت نہیں مختصراً
اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی بنی بنائی مکمل شے نہیں ہے اور
کسی ملک، قوم یا طبقہ کی زندگی اس کے ذرائع پیداوار سے
متاثر ہوتی ہے۔ یہ اثر اس کے قانون، فنون لطیفہ اور ادب
وغیرہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادیب یا تو کسی طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے
یا اس کشمکش کو پیش کرتا ہے جو طبقات میں جاری رہتی ہے
اس لیے ادیب شعوری کوشش سے، محنت کش ابھرتے ہوئے
طبقہ کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ ادیب روحِ انسانی کے انجینئر ہیں
اور اپنے فن کے جادو سے انسانی شعور کے افق کو وسیع کر سکتے ہیں۔
جو ادیب ان باتوں کو تسلیم کریں گے وہ ہمیشہ آزادی، مساوات،
جمہوریت، امن اور ترقی کے علم بردار ہوں گے اور انسانوں کے
جمع کیے ہوئے تہذیبی سرمایہ کی حفاظت کرنے اور اس میں اضافہ
کرنے کو اپنا فرض قرار دیں گے۔ سجاد ظہیر نے اپنے افسانوں،
ایک ایکٹ کے ڈرامے بیمار اور ناولٹ "لندن کی ایک رات"
میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے یہی کام لیا ہے اور اپنے تنقیدی
مضامین سے یہی کام لینے پر دوسروں کو آمادہ کیا ہے۔ یہ مضامین
گہری واقفیت، سنجیدگی، سوجھ بوجھ اور لیاقت کے مظہر ہیں۔
اس میں ماضی کا تجربہ، حال کی تنقید اور مستقبل کے لیے
اشارے ملتے ہیں۔ یہی ایک اچھے لکھنے والے کی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔
سجاد ظہیر کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ کئی زبانوں کے ادب
کا براہ راست مطالعہ کر چکے ہیں اور ان زبانوں کے ادب کی رفتار

سے بھی نا واقف تھیں جنہیں وہ نہیں جانتے۔ اس وسیع النظری کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ادب کے تاریخی ارتقا کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ہر دَور کی معاشی اور معاشرتی حقیقت کا جائزہ لے کر ادب کے نمو اور ارتقا کو اس کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مضمون "اردو ادب کی عمومی حیثیت" (۱۹۴۵ء) میں انھوں نے قدیم اردو ادب کے اُن عناصر کا تجزیہ کیا ہے جو زندگی کے عام شعور سے ہم آہنگ تھے۔ اسی طرح اپنے طویل عالمانہ مقالہ "اُردو، ہندی، ہندوستانی" (۱۹۴۵ء) میں سجاد ظہیر نے زبان کی عوامی بنیاد کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ارتقا کی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستقبل کے متعلق تجویزیں پیش کی ہیں۔ زبان و ادب کے عوامی اور ترقی پسندانہ پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے مارکسی اور ترقی پسند نقادوں سے ابتداءً یہ غلطی ہو جاتی تھی کہ وہ ترقی پسندی کو محض دَورِ جدید سے منسوب کر کے قدیم ادب کو سوختنی قرار دیتے تھے، لیکن سجاد ظہیر نے شروع سے اس وقت تک ہر دَور کے اعلا ادب کو اس دَور کے تاریخی تقاضوں اور فنی اصولوں کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اسی طرح ہم ادب کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں، اور سجاد ظہیر نے ہر جگہ اسے ملحوظ رکھا ہے۔

حال ہی میں سجاد ظہیر کے اُن خطوں کا مجموعہ "نقوشِ زنداں" کے نام سے شایع ہوا ہے جو انھوں نے اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کے نام .... لکھنؤ سنٹرل جیل اور کنگ جارج ہسپتال لکھنؤ سے اپنی قید اور نظربندی کے زمانے میں مارچ ۱۹۴۰ء سے مارچ ۱۹۴۲ء تک لکھے۔ یہاں ان خطوط کی سادگی، دلکشی، سچائی اور ادبیت سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مگر ان کے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گو سیاست نے انھیں بالکل اپنا لیا تھا لیکن وہ اس حالت میں بھی اپنے ادبی ذوق کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ کتنے مضامین، رسائل اور کتابوں کے تذکرے ہیں، کتنی کتابیں لکھنے کے منصوبے ہیں اور قید سے رہا ہو کر کس طرح ادبی کام کرنے کے ارادے ہیں، سب ان خطوط میں بکھرے پڑے ہیں۔ جو کتاب انھوں نے جیل میں لکھی وہ شایع نہ ہو سکی، اور نہ ان کے مضامین کا مجموعہ چھپ سکا جس کی انھیں خواہش تھی، پھر بھی جتنا ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہ انھیں اردو کے بہت اچھے ادیبوں میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں سجاد ظہیر نے بہت ہی اہم نظریاتی مضمون "شعرِ محض" لکھا، جس میں فرانس کی انحطاطی شاعری کے کھوکھلے پن کے کھوکھلے تھمیوں کی بے ثباتی اور بے رونقی کا طلسم فاش کیا اور مناسب ترین الفاظ میں اس شاعری کی تنقید کی جو مہمل ہونے کی حد تک انفرادیت پر مبنی تھی، اور یاس، تنفر، بیزاری اور احساسِ شکست کے سوا انسانوں کو کچھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس مضمون میں انھوں نے ادب کی گہری انسانیت، دردانگیزی، گداز اور ہمدردی کو یاس پرستی، واہمہ پرستی اور بے حقیقت خیال آرائی سے الگ کر کے قدیم ادب العالیہ کی اہمیت جتائی ہے۔

پاکستان کی روپوشی کے زمانہ میں سجاد ظہیر نے ایک بہت ہی قیمتی مضمون "غلط رجحان" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ مضمون ۱۹۵۱ء میں اس وقت شایع ہوا جب ترقی پسند ادب ایک بحرانی دَور سے گزر رہا تھا اور ایک خاص طرح کی تنگ نظری اس زندہ ادبی تحریک کو بڑھنے اور پھیلنے سے روک رہی تھی، ادب محض ایک مخصوص نقطۂ نظر کی ترجمانی سے عبارت تھا اور جو خیال ایک بنے بنائے سانچے میں ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا اسے یک جنبشِ قلم رد کر دیا جاتا تھا۔ ٹھیک ایسے وقت میں سجاد ظہیر نے واضح الفاظ میں اس غلط رجحان اور تنگ نظری

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

سجاد ظہیر مرحوم

"ترقی پسند ادب" اور ہندوستانی آزادی و سماجی ترقی کی جد و جہد

ساری جدید ہندوستانی زبانیں کلاسیکی ہندوستانی ادب سے، ویدوں، پرانوں سے، مہابھارت اور رامائن سے اور ادب کے اس وسیع ذخیرے سے متاثر ہوئی ہیں جو بودھ مت اور بھگتی کی تحریک کے زیر اثر لکھا گیا۔ یہ ایسی روایت ہے جو آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ اس لیے کہ گاؤں میں رہنے والے ہندوستان کے عام لوگوں میں آج بھی مہابھارت اور رامائن ہی مقبول ترین کتابیں ہیں۔ جو عہدِ متوسط کے ادیبوں نے عوام کی زبانوں میں لکھی تھیں، جیسے کہ تلسی داس کی رامائن جو ۱۶ صدی میں لکھی گئی اور بنگالی، مراٹھی، تامل وغیرہ زبانوں کی دوسری رامائنیں۔ اس ادب میں انسان دوستی کی حیثیت روحِ رواں کی ہے، اور اسی چیز نے لوک گیت، لوک ناچ اور ناٹکوں کے ساتھ مل کر صدیوں کے بے رحم جاگیردارانہ استحصال، خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں...... اور سب سے آخر میں ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کے برطانوی سامراجی تسلط کے دور میں ہمارے عوام کی تہذیبی زندگی کو برقرار رکھا۔

لیکن انیسویں صدی کے وسط سے ہندوستان کی بڑی زبانوں میں ایک نئے قسم کے ادب کی نشو و نما شروع ہوئی جس میں وطن دوستی کا گہرا جذبہ، ہمارے عوام کی عظیم تہذیبی روایات اور بیرونی محکومی کے تحت ان کی جو حالت تھی اس کا شدید غم اور کرب رچا بسا ہوا تھا۔ اس ادب میں ایک قسم کی دروں بینی بھی تھی — ان سماجی اور سیاسی خرابیوں کا خود انتقادانہ تجزیہ جنھوں نے ہمارے ملک کو اور ہمارے عوام کو کمزور کر دیا تھا اور جنھوں نے ان کو ملکی اور غیر ملکی استحصال کاروں کا شکار بنا دیا تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالی غالباً اردو کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے اردو میں "حبِ وطن" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں مصنف نے ہندوستان والوں سے، خاص طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے اتحاد کی پرجوش اپیل کی اور کہا کہ ہندوستان کے لوگوں کی نااتفاقی ہی نے انھیں تاریخ میں بیرونی حملہ آوروں کا شکار بنایا ہے۔ انھوں نے عوام کو متحد ہونے کی، جدید صنعت کے ہنر سیکھنے کی اور جہالت اور تعلیم کی کمی کو دور کرنے کی تلقین کی۔ حالی نے کہا کہ ہم جدید روش اختیار کر کے ہی اپنی غریبی سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم، ایشیائی ملکوں خاص طور سے ایران، افغانستان، ترکی، مصر اور چین میں قومی آزادی کی تحریک کی بڑھتی ہوئی لہر اور ۱۹۱۷ء کے عظیم روسی انقلاب کے ساتھ ساتھ ہمارے ادب میں ایک صفاتی تبدیلی آئی۔ ہمارے ادب کے انتہائی بلند آہنگ اور حوصلہ افزا شاعر محمد اقبال نے اپنی بعض مقبول ترین اور وجد آفریں نظمیں اسی دور میں لکھی ہیں۔ ہمارے شاعروں میں سب سے پہلے اقبال ہی نے روسی انقلاب کا

خیر مقدم کیا تھا ؂

آفتابِ صبح پیدا بطنِ مشرق سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اقبال ہی نے سب سے پہلے لینن پر ایک نظم لکھی جس میں انھوں نے لینن کی زبان سے سامراجیت اور سرمایہ داری کی مذمت کی اور سرمایہ داری کے جلد ختم ہونے کی پُرجوش اُمید کا اظہار کیا۔ ع

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہمارے عوام کی تحریکِ آزادی نئی بلندیوں پر پہنچ گئی اور اس سے اُردو نثر بھی متاثر ہوئی۔ ہماری تحریکِ آزادی کے ممتاز رہنما مولانا ابوالکلام آزاد ایک عظیم عالم، خطیب اور ادیب بھی تھے۔ اردو زبان کی نثر کے بہترین نمونے انھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں جن میں آزادی اور سامراج دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی تحریروں میں اس بیان کو شمار کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلائے جانے پر ایک انگریز مجسٹریٹ کی عدالت میں دیا تھا۔ اس مقدمے میں مولانا آزاد نے اپنی کوئی صفائی نہیں دی۔ اُنھوں نے بغاوت کے جُرم کا اقبال کیا۔

اس صدی کی چوتھی دہائی میں ہندوستانی آزادی کی تحریک ایک بلند ترین اسٹیج پر آگئی۔ نہرو نے ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں سوویت یونین کی اور وہاں ایک نئے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کی تعریف کی اور اسے ایسا آدرش بتایا جس کی طرف ساری نوعِ انسانی بڑھ رہی ہے۔ کانگریس کے اندر بائیں بازو کے عناصر نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل کی۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے غیر قانونی حالات میں کام کرتے ہوئے اپنا اثر دور دور تک بڑھا لیا۔ ٹریڈ یونین تحریک، کُل ہند اسٹوڈنٹس فیڈریشن، کسان سبھائیں بائیں بازو کے اثرات کے تحت اور زیادہ کارگر اور پُراثر ہوگئیں۔ اسپین کی خانہ جنگی، فرانس اور اسپین کی متحدہ محاذ کی تحریک، میکسم گورکی، ہنری باربوس اور رومان رولاں کی رہنمائی میں فاشسٹ دشمن ادیبوں اور دانش وروں کی تحریک نے بھی نوجوان ہندوستانی دانش وروں کو متاثر کیا اور وہ مارکسزم لینن ازم کی طرف کھنچنے لگے۔

ایسی ہنگامہ خیز قومی اور بین الاقوامی صورتِ حال نے جو سماجی اور سیاسی شعور پیدا کیا تھا اس کے نتیجے میں اور مندرجہ بالا پس منظر میں ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنم ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ اس کی صدارت اردو اور ہندی کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس پریم چند نے کی جنھوں نے نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا پوری طرح ساتھ دیا۔ ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کی اس زمانے کی ہمارے ملک کی عظیم ادبی اور سیاسی شخصیتوں نے سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جن میں رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، سروجنی نائیڈو، ولاٹھول، حسرت موہانی، جواہر لال نہرو اور اقبال کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ تحریک ساری اہم زبانوں کے دانش وروں اور ادیبوں میں زور شور سے پھیلی۔ نوجوان ترقی پسند ادیب صرف شاعر، ناول نگار، افسانہ نویس، ڈرامہ نگار، نقاد اور صحافی ہی نہ تھے بلکہ وہ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں بھی سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔ انھوں نے مزدوروں، کسانوں اور استحصال کا شکار متوسط طبقے کو اپنی تحریر کا مرکز بنایا۔ انھوں نے آزادی کے خیال کو نیا متن اور مواد عطا کیا۔ محنت کش عوام کے لیے آزادی، مزدوروں اور کسانوں کی حکومت، انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ۔

دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے اور خاص طور سے

سوویت یونین پر ہٹلری فاشسٹوں کے حملے کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے فاشزم کے خلاف ایک واضح اور قطعی موقف اختیار کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے اپنے عوام کی اور ساری نوعِ انسانی کی آزادی کا دارومدار جرمنی کی شکست پر ہے، کہ سُرخ فوج نازی حملہ آوروں سے یورپ اور ایشیا اور افریقہ کی بھی مدافعت کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے سامراجیوں کے ہاتھ سے اقتدار لینے کے لیے ہمارے عوام کو متحد ہونے کی آواز دی جو برطانوی ظالم حکمرانوں کے جور وستم کا شکار تھے۔

ہم ہندوستان والے ہٹلری جرمنی اور جاپانی فاشسٹ خطرے کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے اور ہمارے سروں پر برطانوی سامراج طرح طرح کے جبر وظلم توڑ رہا تھا۔ اسی دور میں فیض نے اپنی مشہور نظم "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" لکھی۔

کیفی اعظمی نے سُرخ فوج کی جانبازانہ جنگ کے بارے میں اسٹالن گراڈ کی لڑائی اور فتح برلن کے بارے میں انتہائی پُرجوش اور پُرقوت نظمیں لکھیں۔ سردار جعفری نے اپنی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" لکھی۔ فاشسٹوں پر عظیم الشان فتح ہمارے ادب میں سچ مچ بڑی دھوم سے منائی گئی۔ جنگ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ہمارے عوام کی تحریکِ آزادی نئی انقلابی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ برطانوی ہندوستانی نیوی (بحریہ) میں برطانوی ہندوستانی ایرفورس اور ہندوستانی فوج میں بغاوتیں ہوئیں۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں اور طالب علموں نے اور مزدور طبقے نے بڑی بڑی ہڑتالیں اور مظاہرے کیے۔ ملک کے مختلف حصوں میں کسانوں کی بغاوتیں ہوئیں۔

اور پھر اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صبح ہوئی۔

اس طرح طلوعِ آزادی تک کی ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقی کاوشوں کا باب ختم ہوا جو ایسا روشن اور شایانِ شان باب ہے کہ ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اب ہم اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں ہیں اور جب اس نئے دور کی تاریخ لکھی جائے گی، اس کے نئے اور زیادہ پیچیدہ مسایل کا تجزیہ کیا جائے گا تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان کے ترقی پسند ادیب اپنے عوام کے ساتھ ہیں، ان کی جمہوری اور سوشلسٹ آرزوؤں کے ساتھ ہیں اور اپنا فرض کما حقہٗ ادا کر رہے ہیں۔

★

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
(غالب)

مرتب: ف بن صاد

اخبار و افکار

مستری ہائی اسکول کی مرہٹی کے مقابلے میں نمایاں کامیابی

رتناگری میں گوکل اشٹمی کے موقع پر "رادھا کرشن وکتر مستھا" کی طرف سے ثانوی مدرسوں کے طلبا کے لیے مضمون نویسی کا انعامی مقابلہ رکھا گیا تھا جس میں مرہٹی اور اردو ہائی اسکول کے کل ۴۳ طلبا شریک مقابلہ تھے۔ اس مقابلہ میں مستری ہائی اسکول رتناگری کے طالب علم نظام الدین محمد کوتوالیکر کو تیسرے درجہ کا انعام ملا۔ مرہٹی مضمون نویسی میں اردو ہائی اسکول کے طالب علم کا انعام حاصل کرنا باعث افتخار ہے۔ اس کی رہنمائی جناب عبداللہ علیمی قاضی ایم اے بی ایڈ نے کی تھی۔

اردو اسکول راجیواڑی تعلقہ مہاڈ

راجے واڑی ضلع قلابہ میں فل پرائمری بیسک اردو اسکول اس کے صدر مدرس اور معاون مدرسین کی محنت اور جانفشانی سے ایک معیاری اسکول بنتا جا رہا ہے۔ حال ہی میں یہاں اساتذہ اور والدین کی ایک مشترکہ انجمن بنام "شکشک پالک سنگھ" وجود میں آئی جس میں گاؤں کے سرپنچ بحیثیت صدر اور اسکول کے صدر مدرس جنرل سیکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوں گے۔

اسکول میں ایک مجلس مباحثہ ہے جو معلم آمنہ گودھرچھڑ کی زیر نگرانی ہفتہ وار جلسہ منعقد کیا کرتی ہے۔ ایک بچوں کا اسٹور ہے جہاں اسکولی اشیا دستیاب ہیں۔ اس کی نگرانی جناب اسمٰعیل جیلانی (مدرس) کیا کرتے ہیں۔ اسکول کے سامنے ہی ایک عمدہ باغیچہ ہے اور معاون مدرس غلام محمد پٹیل کی زیر نگرانی اس کی نشو و نما جاری ہے۔ ایک ریڈیو سیٹ بھی حاصل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں باغیچہ میں کھیلنے کا سامان جھولا چکر وغیرہ نصب کیے گئے ہیں نیز ایک دستی رسالہ جاری کرنے کی زور دار کوشش کی جا رہی ہے۔

کامیاب طلبا کی ہمت افزائی کی خاطر اول اور دوم آنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی پہلی تقریب امسال یوم آزادی کے موقع پر شروع کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اساتذہ کرام نے باشندگان وطن کو سمجھا بجھا کر تعاون حاصل کیا اور منجملہ سبھوں کی کوششوں سے اسکول نے ایک نیا روپ اختیار کیا ہے۔ خدا کرے یہ تا دیر قائم رہے اور اسکول ایک معیاری و مثالی اسکول ثابت ہو۔

کھیل کود کے لیے نئے وظائف کا اعلان

کھیلوں میں دلچسپی رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت مہاراشٹر نے ۱۳۰۰ وظائف مختلف کھیلوں کے لیے دینے کا فیصلہ کیا ہے جو کہ ریاست کے ثانوی اسکولوں میں پڑھنے والے آٹھ سے گیارہ تک کے طالب علموں کو دیے جائیں گے۔

عید مبارک
بمبئی میں رہائش کا بہترین انتظام
بمبئی آنے والے مسافروں کی رہائش اور قیام کے لیے بہترین لوجنگ
امین ہوسٹل
آپ کوکن سے تشریف لائیں
یا ہندوستان کے کسی بھی گوشے سے
یا غیر ممالک سے تشریف لائیں
جہاں آپ کو قیام کی ہر طرح کی سہولت ملے گی۔
ہمارے ہوسٹل میں قیام کر کے یقیناً خوش ہوں گے۔
★ ہوادار کمرے جدید فرنیچر سے آراستہ ہیں ★ ریلوے اور ٹیکسی کی سہولتیں
★ ارزاں اور معقول کرایا، بہترین لوجنگ ★ ہوسٹل صنعتی اور تجارتی علاقے میں واقع ہونے کے سبب
آپ کو ہر طرح کی آسانی ہوگی۔
فون نمبر :۔ 336472
پتہ :۔ امین ہوسٹل ۔ رحمانی منزل ۔ ۴۴ - ۲۴ نشان پاڑہ روڈ ۔ کراس لین ۔ ڈونگری بمبئی ۹
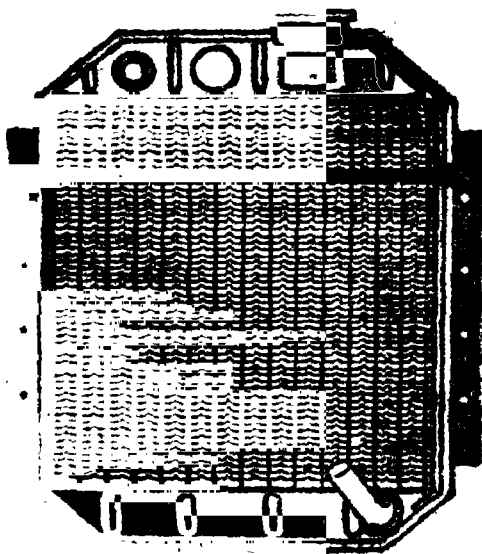
محمدیہ سوسائٹی نیگاری بمبئی کا قیام

تعلیمی کمیٹی نیگاری (بمبئی) مقرر کردہ جماعت المسلمین نیگاری (صدر دفتر بمبئی (رجسٹرڈ) کو محمدیہ سوسائٹی نیگاری بمبئی، میں تبدیل کرکے یہ سوسائٹی سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت بمبئی عظمیٰ میں رجسٹرڈ کی گئی ہے۔ یہ سوسائٹی فی الوقت مختلف سرگرمیوں کے علاوہ محمدیہ مدرسہ قصبہ نیگاری تعلقہ دالپولی ضلع رتناگری میں چلا رہی ہے۔ بر دست مدرسہ ہذا میں تقریباً ۷۰ بچے دینی اور اردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اسمائے گرامی اراکین منیجنگ کمیٹی محمدیہ سوسائٹی نیگاری (بمبئی):

(۱) جناب علی عبدالقادر انعامدار (صدر) (۲) جناب عبداللہ عبدالرحیم انعامدار (نائب صدر)۔ (۳) جناب شوکت علی ابراہیم بروڈے (ناظم اعلیٰ) (۴) جناب عبدالکریم لالہ میاں انعامدار (سیکریٹری)۔ (۵) جناب کمال الدین علی رومانے (جوائنٹ سیکریٹری)۔ (۶) جناب عمر علی مرزا (خازن)۔ (۷) جناب عبدالغنی قاسم بروڈے (ممبر) (۸) جناب ابراہیم علی مرزا (ممبر) (۹) جناب ایوب عبدالرحمٰن رومانے (ممبر) ناظم محمدیہ سوسائٹی مقیم نیگاری (بمبئی)۔ مرزا داؤد مرزا احمد بیگ۔

منجانب: عبدالکریم لالہ میاں انعامدار
سیکریٹری محمدیہ سوسائٹی نیگاری (بمبئی)
۷۶ نشان پاڑہ روڈ گراؤنڈ فلور روم ۱۲ ڈونگری بمبئی ۹

پی۔ ایچ۔ ڈی مدرسین کے لئے زائد تنخواہ

حکومت مہاراشٹر نے ہدایت کی ہے کہ سرکاری و غیر سرکاری ثانوی اسکولوں، جونیر کالجوں اور ٹیکنیکل ہائی اسکولوں کے مدرسین جن کے پاس پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ہے ان کو یکم جولائی ۱۹۷۳ء سے ۲۵ روپے ماہانہ زائد تنخواہ دی جائے بشرطیکہ ان کی ڈگری انگریزی، ریاضی، سائنس، تاریخ وغیرہ میں ہو جو کہ اسکول کی سطح پر پڑھائے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ اس شرط پر دیا جائے گا کہ مدرس کو کل زائد تنخواہ جو ملے وہ مقررہ ۴۰ روپے ماہانہ کی زائد تنخواہ کی حد سے زیادہ نہ ہو۔

۸ اکتوبر سے طالب علموں کو ٹیلی ویژن پر سبق

بمبئی ۲۸ ستمبر: بمبئی کا ٹیلی ویژن مرکز ۸ اکتوبر سے درجہ پانچ اور آٹھ کے طالب علموں کے لئے انگریزی میں اور درجہ آٹھ کے لئے سائنس کا سبق ٹیلی کاسٹ کرے گا۔ آغاز میں یہ پروگرام پیر اور جمعہ کے روز دن کے گیارہ بجکر پچاس اور بارہ دس تک ہوگا۔ چونکہ پونا ٹی وی ریلے اسٹیشن امید ہے جلد ہی کام شروع کر دے گا جس سے تقریباً ۱۵۰۰ ثانوی اسکول فائدہ اٹھائیں گے۔ مسٹر اے۔ این ناجوشی وزیر تعلیم اور اسپورٹس (ہندوستانی کھیلوں کے علاوہ) اس پروگرام کا افتتاح ٹیلی ویژن پر ۸ اکتوبر کو کریں گے۔

رمضان کے سلسلہ میں گیٹ کنٹرول حکمنامہ میں نرمی

حکومت مہاراشٹر نے ۲۷ یا ۲۸ اکتوبر کو ختم ہونے والے ماہ رمضان کے دوران مساجد میں نماز کے لئے شریک ہونے والے افراد کو شام کی نماز کے اختتام پر غیر اناج کی اشیاء فراہم کرنے کی اجازت دی ہے، جس کے لئے اس نے گیٹ کنٹرول حکمنامہ میں نرمی کر دی ہے۔

غیر اناج کی غذا کا مطلب ایسی اشیاء جن میں چاول، گیہوں، جوار، ملو یا ان کی ضمنی پیداوار کا استعمال نہ کیا گیا ہو بیکری ڈبل روٹیاں (پاؤ) حالانکہ ان میں میدہ استعمال ہوتا ہے دینے کی اجازت ہوگی۔ تقسیم کی جانے والی اشیاء کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔

کئی مسلم مذہبی جماعتوں کی جانب سے نمائندگی کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ مسجدوں میں افطار روزہ میں شرکت ایک کار خیر سمجھا جاتا ہے اس لئے گیٹ کنٹرول آرڈر میں نرمی کی گئی ہے۔

ف۔ بن صاد

سرزمین کوکن کا مایہ ناز سپوت

بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے

جس کی قیادت پر سیاست ناز کرتی ہے

سماج کے ٹھکرائے ہوئے کسی محروم و نامراد کرایہ دار
کے پڑوس میں آنے والا نیا کرایہ دار اس بد قسمت شخص کی پیٹھ پر
شفقت کا ہاتھ رکھ دے۔ دُکھ کے آنسو پونچھ ڈالے اور حسرت
و یاس کی جگہ اُمید و آرزوؤں کے چراغ روشن کردے تو اس غریب
کی خوشیوں کا کیا ٹھکانہ۔

عزت مآب بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے وزیر تعمیرات حکومت
مہاراشٹر نے جنوری تا مارچ ۱۹۷۳ء ان تینوں مہینوں میں رتناگری
ضلع میں دورہ کرکے ان کے مسائل کا بغور مطالعہ فرمایا۔ ان کے
دکھوں کا اندازہ لگایا، بلکہ محروم و نامراد آنکھوں سے یاسیت
کے آنسو پونچھ ڈالے اور ایک فرض شناس پڑوسی کی طرح دکھی
و ابھاگی مکین کا سہارا بنے۔ مہاپرل سے ساونت واڑی تک
چار سو میل پھیلے ہوئے علاقہ میں بیچ چوراہے پر، عالی شان
شامیانوں کے زیر سایہ، سجے سجائے ہالوں اور جلسہ گاہوں
کے اندر یا ندی کے کنارے جہاں جہاں آپ گئے اپنی باوقار
شخصیت، عظیم الشان صلاحیت اور لوگوں کے دُکھ درد دُور
کرنے کی پیدائشی تڑپ سے لوگوں کے دل جیت لیے ہیں۔

پچھلے ۲۵ سالوں میں رتناگری والوں کو جو چیز نصیب
نہیں ہوئی تھی وہ ان تین مہینوں میں انھیں نصیب ہوئی ہے۔
پچھلے پچیس ۲۵ سالوں میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا، مگر ان
تین مہینوں نے انھیں ایک نیا احساس دیا ہے، اعتماد پیدا کیا ہے
اور اب انھیں ایک طاقتور اور باعمل رہنمائی نصیب ہوئی ہے۔

بیرسٹر انتولے صاحب ۱۹٦۹ء میں وزیر مملکت بنے۔
اس وقت آپ نے اپنی تمام تر توجہ اپنے ضلع قلابہ پر مبذول فرمائی۔
غالباً آپ کے پیش نظر مشہور مقولہ ہوگا کہ "پہلے اپنے گھر میں
چراغ جلاؤ پھر مسجد میں جاؤ۔" اور یہ صحیح بھی تھا۔ قلابہ ضلع جو
حزب مخالف کا گڑھ تھا، آپ نے اپنی حکمت عملی سے قلیل مدت
میں وہاں کانگریس کی پوزیشن مضبوط کی اور اپنے رائے دہندگان
کی بیشتر توقعات پوری کیں۔

۱۹۷۲ء میں آپ با اختیار (Ful Fldge) وزیر
مقرر ہوئے۔ اب اسے خوش نصیبی کہیے یا آزمائش کہ وزیر اعلیٰ شری
وسنت راؤ نائیک نے ماہی گیری، رسل و رسائل تعمیرات وغیرہ
شعبے جو کوکن کی ترقی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے تھے
آپ کے ذمہ دئے اور "اقتدار کو امانت الٰہی" سمجھتے ہوئے
انتولے صاحب نے کوکن کو نیا رنگ و نیا روپ دینے کا مصمم
ارادہ کرلیا۔

مارچ ۱۹۷۳ء میں آپ کا کوکن کا دورہ ایک وزارتی
دورہ نہیں تھا بلکہ "کیا تھا کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے" اس

حساب و کتاب کا گوشوارہ تھا۔ اور اس گوشوارہ کا معائنہ
کرنے والوں کا اندازہ ہے کہ یہ پہاڑی اور پتھریلی زمین کل سونا
بننے والی ہے۔

کوکن جو مہاراشٹر کا سب سے پس ماندہ علاقہ ہے، اور
اربابِ سیاست نے اسکو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ مگر اب
بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے صاحب کے عمل و دخل سے اس
علاقہ کی صورت بدلتی جارہی ہے۔ جلسے جلوسوں میں یا حکومت
کے ایوانوں میں انتولے صاحب نے اس علاقہ کے ترقیاتی
منصوبوں کا جو ذکر کیا ہے وہ صرف الفاظ نہیں بلکہ حقیقت
بن کر سامنے ہے۔ وہم و گمان سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ
صورتِ حال بدل رہی ہے اور ایک فعال وزیر باتدبیر کے
قول و عمل کی صداقت اپنا سکہ جمارہی ہے۔

ساحلِ سمندر کے متوازی "ریوس - ریڈی شاہراہ"،
"مانڈوا میں ہوائی اڈہ"، کوکن کی ممتاز سڑکوں پر تار کول، ماہی
گیری سے متعلق ایک کارپوریشن کا قیام کبھی یہ خواب تھے اور
اب شرمندۂ تعبیر ہو رہے ہیں۔ موچے مونڈ، جاپرل اور کھرتر
وغیرہ پلوں کی تعمیر سے زمین کی طنابیں کھینچ گئی ہیں اور بمبئی کوکن
والوں کے لیے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے
دریاؤں میں آمد و رفت کے وسائل بہتر بنانے کے لیے ڈریجر
کام کر رہے ہیں۔ الغرض پس ماندگی کے خلاف ایک جنگ
ہے جو تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ مگر اس جنگ سے صرف
پس ماندگی کا قلع قمع ہی نہیں یا اقتصادی بدحالی کا شکار یہ
علاقہ کل خوشحال ہوجائے صرف یہی مقصود نہیں ہے بلکہ ان
تعمیرات سے بالخصوص جاپرل پل بن جانے کے بعد رتناگری و
قلابہ ان دو اضلاع کے باشندوں کے دل جوڑنے کا سماجی کام
بھی انجام پائے گا۔

دلوں کی بات آئی تو یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ضلع رتناگری
کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا خیال عرصۂ دراز سے لوگوں
کے دلوں میں گھر کر گیا تھا۔ اور اس کے خوشگوار یا ناگوار
اثرات پر ہمیشہ بحث ہوتی رہتی تھی۔ مگر انتولے صاحب
نے اپنے دورۂ کوکن میں اس خوف کو بھی لوگوں کے دلوں سے
نکال ڈالا۔ ساڑھے تین سو میل طویل اس ضلع میں آمد و رفت
کے ناکافی وسائل کے انتظامی امور میں سخت دشواری پیدا
ہوتی تھی اور اسی خیال سے ضلع دو ٹکڑوں میں بانٹ کر
ان امور کو تیز تر کرنے کا منصوبہ زیرِ غور آیا تھا مگر ایک ماہر
نباض کی طرح انتولے صاحب نے دُکھتی رگ پکڑلی اور
۱۲ جنوری ۱۹۸۱ء کو رتناگری میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے
ہوئے آپ نے فرمایا کہ ضلع کی تقسیم سے میں متفق نہیں ہوں۔
اگر آمد و رفت کے وسائل بہتر کر دیے جائیں، سڑکیں تعمیر
ہوں تو دیہی علاقہ شہروں سے جُڑ جائے گا، قریب بھی
ہو جائے گا۔ پھر تقسیم کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسی خیال سے
آپ نے رتناگری کی تقریباً ۔۔ ایڈی سڑکوں کو تار روڈ بنانا، سو
لوگوں کی آبادی والے گاؤں تک سڑک تعمیر کرنا، بیل باندھنا
اور ندی نالوں پر ساکو ڈالنا وغیرہ کام تیزی سے شروع کر دیے ہیں۔
انتولے صاحب کے دردمند دل میں غریبی، بے علمی، پسماندگی کے خلاف
جو آگ بھڑک رہی ہے اور ان خرابیوں کو حتی الامکان دور کرنے کی جو تڑپ
ہے رتناگری کے ان دوروں میں عوام کو اس کا بھرپور اندازہ ہوا ہے اور پچھلے
۵۰ سالوں کی تلافی کا یقین ہونے لگا ہے۔ مگر فی الوقت جو تلافی ہوتی ہے
وہ ایک عظیم رہنمائی کی موجودگی ہے۔ آج کوکن والوں کو ایک لیڈر ملا ہے
جو نڈر بھی ہے اور باصلاحیت بھی۔ خدا اسے صحت و سلامتی کے
عمر دراز عطا فرمائے ۔۔۔ اور آسمانِ سیاست پر چمکنے والا یہ ستارہ
ماہِ کامل بن جائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تیل کے ذخائر کی تلاش

ملک میں تیل کے ذخائر کی تلاش کا کام زیادہ تر تیل اور قدرتی گیس کمیشن کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ ایک دوسرا ادارہ آئل انڈیا لمیٹڈ بھی محدود پیمانے پر آسام اروناچل پردیش پر مشتمل شمال مشرقی خطے میں تیل کی جستجو میں مصروف ہے۔

تیل اور قدرتی گیس کمیشن نے گزشتہ چند برسوں کے دوران تیل یا گیس کے حامل ۱۴ علاقے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ملک کے دوسرے علاقوں میں تیل کے امکانی ذخائر کا پتہ لگانے کے لیے مختلف نوعیت کے سروے کیے جا رہے ہیں۔ تیل کے ان ذخائر سے متعلق بہتر اعداد و شمار کے حصول کی غرض سے کمیشن نے بیرونی ممالک سے پیچیدہ آلات درآمد کیے ہیں۔

آئل انڈیا لمیٹڈ نے گزشتہ پانچ برسوں کے دوران تیل کے ۴۶ کنوؤں کی برمائی کی ہے۔ جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

تیل اور قدرتی گیس کمیشن نے تیل کی جستجو سے متعلق ایک پنج سالہ منصوبہ مرتب کیا ہے جو ۱۹۷۳-۷۴ء سے شروع ہوگا۔ اس منصوبے کے مقاصد میں چھے کروڑ چالیس لاکھ ٹن تیل کے فاضل ذخیرے کا قیام، سال ۱۹۷۷-۷۸ء کے دوران ۸۰ لاکھ ٹن کی پیداواری شرح کے حصول کی غرض سے خام تیل کی پیداوار میں اضافہ اور سال ۱۹۷۷-۷۸ء کے آخر تک گیس کی تقریباً ایک ہزار ملین کیوبک میٹر سالانہ کے بقدر پیداواری شرح کا حصول شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تیل اور قدرتی گیس کمیشن بحیرۂ عرب سے متصل خلیج کھمبات میں ساحل سے دور برمائی کا ایک پروگرام بھی شروع کر رہا ہے۔

★